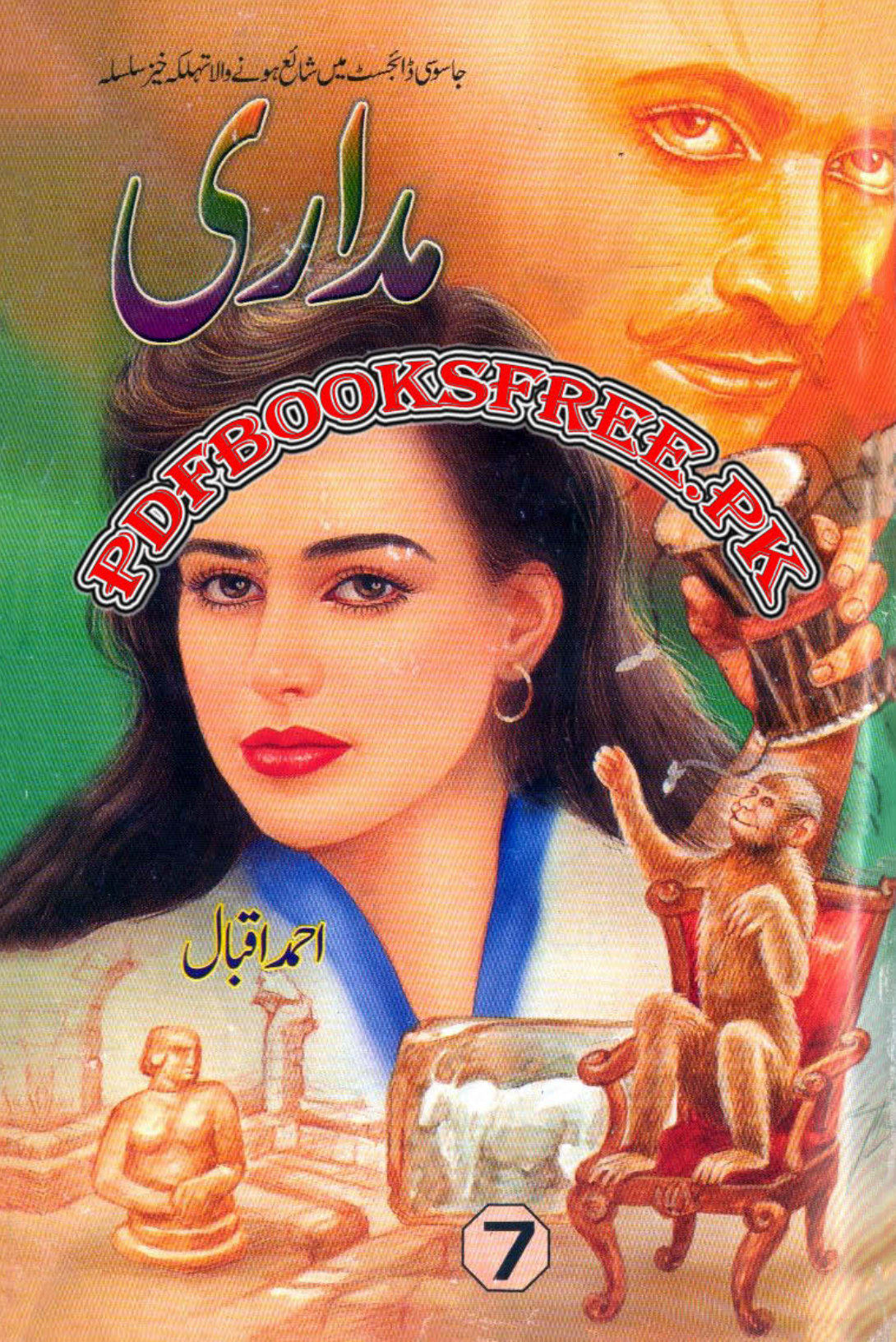


جاسوسی ڈائجسٹ میں شائع ہونے والا تہلکہ خیز سلسلہ

مداری

PDFBOOKSFREE.PK

احمد اقبال



7

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

پاکستان ورچوئل لائبریری پر موجود تمام کتابیں
قارئین کے مطالعے اور دعویٰ و اصلاحی مقاصد کے
لئے اپلوڈ کی جاتی ہیں۔

تنبیہ

کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر
استعمال کرنے کی سخت ممانعت ہے، اور ان کتب کو
تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی
، قانونی و شرعی جرم ہے۔



PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

وطن عزیز کے پر آشوب حالات کے پس منظر میں لکھی جانے والی داستان

مداری

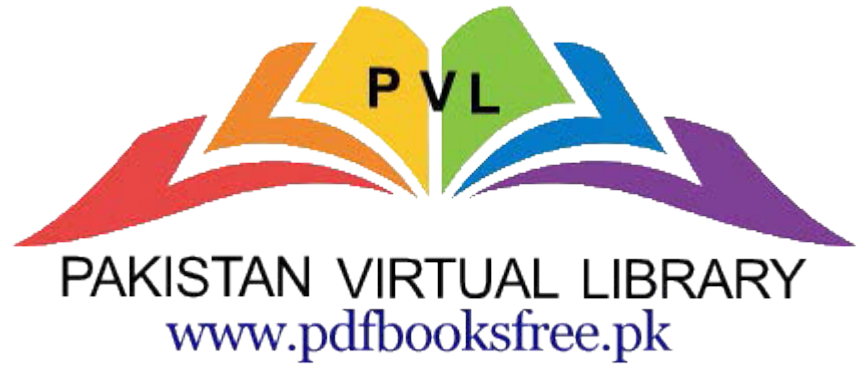
ساتواں حصہ

احمد اقبال

کتاب پر مرتبہ لکھی گئی
کتاب پر لکھنے والے کی حیثیت سے

ناشر
علی میاں پبلی کیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ فون ۷۲۴۷۴۱۴



رہیں خفا ہونے لگا "تم بھی کیا باتیں کرتے ہو۔ اپن سالا گھوٹنے والا جھولا بنا ہوا تھا۔ لگتا تھا اس پاس کی ہر چیز چکر کمار ہی ہے سارا بدن ایسے ٹوٹ رہا تھا جیسے بیرونی نہیں ملی ہے بیرونی کو۔"

"تو ایسے بات کر رہا ہے جیسے تجربہ ہے تجھے۔ کبھی ہو چکا ہے ایسا؟"

رہیں جھینب کر بولا "ابے یار۔ مثال دے رہا تھا۔ کہنے کا مطلب یہ تھا کہ مجھے اپنا ہوش نہیں تھا۔ سبک میل کیسے دیکھا۔ پھر بھی میں نے کوشش ضرور کی کہ دماغ جلد از جلد ٹھکانے آجائے۔"

"وقت کا بھی کوئی اندازہ نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"وقت دیکھا تھا میں نے اپنی گھڑی میں۔ رات کے سوا نو بجے تھے۔ اس وقت بھی مین روڈ پر تے اور پیچھے سے آنے والی بڑی گاڑیوں کی لائٹ کافی تھی۔ چھوٹی سڑک پر مشکل ہو جاتا۔"

خشم نے کہا "سوا نو بج اب ذرا یاد کرو اندازاً کیا وقت ہو گا جب وہ لوگ ملے تھے؟"

"گند سوال!" میں نے کہا۔

"سب صرف اتنا اندازہ کر سکا کہ ٹیکسی وہی ہے مگر چلا کوئی اور رہا ہے۔ پھر ٹھنڈی ہوا لگی تو میرے حواس بحال ہونے لگے۔ اس وقت بھی میرا سر گھوم رہا تھا اور درو سے پھٹ رہا تھا۔ مگر میں نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص کو دیکھ لیا۔ وہ مجھے پھر نظر آیا تو پہچان لوں گا۔ اس کے ہاتھ میں ریوا لور تھا اور وہ بڑی خباثت سے ہنس رہا تھا۔"

"میلے اس کی صورت دیکھی تھی کبھی؟" میں نے کہا۔

رہیں نے انکار میں سر ہلایا "نہیں۔ وہ نیا چہرہ تھا۔ ٹیکسی چلانے والا کچھ جانا پہچانا لگتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ فیکے کے گھر میں آکے مار کھانے والوں میں شامل تھا وہ۔ پیچھے والی سیٹ پر صرف ہم دو تھے۔ میں اور میرا پاؤں گاڑا۔ میں نے باہر دیکھا تو رات کے وقت سڑک کو پہچاننا مشکل تھا مگر وہ باہر جانے والی بڑی سڑک تھی۔ اس پر بسیں اور ٹرک زیادہ نظر آ رہے تھے۔ میں کچھ دیر سیٹ کے پیچھے سر کئے لیٹا رہا۔ پھر گاڑی نے دائیں جانب موڑ کا تو میں نے آنکھیں کھول کے دیکھا۔ وہ کوئی چھوٹی سڑک تھی اور اس وقت خالی بڑی تھی۔ اندھیرے میں صرف ٹیکسی کی بیل لائٹس کا اجالا تھا۔ اس میں مجھے درخت، کھیت اور کہیں کہیں کچے مکان نظر آئے۔"

"تو نے کوئی سبک میل نہیں دیکھا؟ وہ جس پر لکھا ہوتا ہے، کراچی اسٹے کلو میٹر یا پٹا ور اسٹے کلو میٹر؟" میں نے کہا۔

خشم بولی "ہاں۔ اس سے سمت کا اندازہ ضرور ہو جاتا۔"

میں نے کہا "ٹا بور" سے لنگھنے میں ہی ان کو بند رہ جس منٹ ضرور لگے ہوں گے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جہاں انہوں نے چھوٹی سڑک پکڑی تھی وہ جگہ ٹا بور سے زیادہ دور نہیں ہو سکتی۔ اور پھر یاد ہے؟

"یاد تو مجھے یہ بھی ہے کہ میں کہاں پیدا ہوا تھا۔ تم بولنے بھی دو" اپنی جرح میں لگ گئے ہو "وہ ناراض ہونے لگا۔

میں نے کہا "اوسکے سرا اب ہم خاموش۔ ایک دم چپ۔"

"ذائیں طرف نیکی کے مڑتے ہی ایک نے کہا کہ بار پٹرول ڈالواتے تو اچھا تھا۔ دوسرے نے کہا کہ پگل خانے سڑک پر اتنے پٹرول پب گزر گئے، یہاں آکے یہ بات کہہ رہا ہے۔ گاڑی چلانے والے نے کہا کہ بھول چوک ہو جاتی ہے بندے سے۔ انہی داپس جا سکتے ہیں بہم دوسرے نے کہا کہ دس پندرہ کلومیٹر تو چل جائے گی گاڑی۔ پہلے نے کہا کہ ہاں اتنا تو جائے گی۔ اس پر دوسرے نے کہا کہ فیول میٹر کچھ کے بات کر رہا ہے یا اندازے سے۔ ڈرائیور بولا کہ سولی تو خالی کے نشان تک بس پہنچ گئی ہے۔ مگر چار پانچ فیٹر پٹرول ہو گا انہی۔ اس پر دوسرے نے کہا کہ پھر چل سیدھا۔ وہاں

جا کے ڈال لیں گے۔ اس پر ڈرائیور نے کچھ جرائی ظاہر کی کہ پٹرول ہو گا وہاں۔ اور اس کے سامھی نے کہا کہ ہاں ہو گا۔ ڈرائیور شاید پانی بار جا رہا تھا اور پولا کوئی پب ہے۔ پیچھے والے نے کہا اوسکے گاؤں میں کبھی پب دیکھا ہے تو نے ڈرائیور نے کہا کہ پھر کیا یہ چون کی دکان پر لے گا۔ پیچھے والا بولا کہ گھر میں ہی مل جائے گا تو فکر مت کر۔ ڈرائیور خاموش ہو گیا۔ مگر اس سے میں نے دو اندازے لگائے۔ ایک یہ کہ جہاں ہم جا رہے ہیں وہ جگہ پندرہ کلومیٹر کے اندر ہی ہوگی۔ دوسری بات یہ کہ وہاں پٹرول مل جائے گا کم سے کم بھی دس لیٹر۔ ایسے گھر میں کون رکھتا ہے فالو پٹرول۔

ختم نے کہا "ہاں اگر کوئی مین روڈ سے پندرہ کلومیٹر دور رہتا ہے تو ایسی کوئی بات نہیں۔ لوگ جو زیادہ دور گاؤں دیسات میں رہتے ہیں وہ پب یا ٹرنک بس دیکھیں اور اپنی کار کے ٹینک خالی رہتے ہیں۔ ورنہ پندرہ کلومیٹر تو بندہ سا کیل پر چلا جاتا ہے پٹرول لینے۔"

"میرا خیال ہے کہ وہاں پٹرول کسی اور کام کے لیے تھا۔ جب گاڑی رکی تو میں نے دیکھا کہ وہاں شس پانچ دوسرا کوئی گھر نہیں ہے۔ کوئی گاؤں تھا پھر دور۔ لائٹ تو بھی نہیں۔ مگر اندھیرے میں ٹھہر کھائی دے رہے تھے اور کتے

بھوک رہے تھے۔ گھر کے باہر چاروں طرف تار لگے ہوئے تھے بار بار اتر۔"

"BARBED WIRE" میں نے صبح کی "جانی کی اولاد کاٹنے دار تار کہہ سکتا ہے تو اگر انگریزی نہیں آتی۔" "اب ہاں نہیں آتی۔ بار بار اتر میں کیا برائی ہے" وہ ہنسنے لگا۔ "ایسے ہی رعب مت ڈال کر ہم پر۔"

میں نے کہا۔ "YOU MAY PROCEED"۔ ختم نے فوراً ترجمہ کیا "ناصر کا مطلب ہے مجھ سے غلطی ہو گئی۔"

رہیں نے مطمئن ہو کے کہا "تاروں پر کچکر اور بول کاٹ کے ایسے لگا دیے گئے تھے کہ ہاڑھ بن گئی تھی۔ کوئی آسانی سے گزر کے نہیں آ سکتا تھا۔ اونچائی بھی چھ فٹ سے زیادہ تھی۔"

"جانوروں کے لیے ہوگی یہ روک۔ انسان کے لیے کیا ہے چھ سات فٹ کی ہاڑھ۔" میں نے کہا۔

"تم عبور کر سکتے ہو؟"

"اوہ نہیں۔ اس کے دو آسان طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ آپ قریب کے کسی درخت پر دس بارہ فٹ کی رسی باندھیں۔ پھر اسے پکڑ کے چاروں کی طرح آواز نکالتے

جھولے کے ساتھ اندر جا کریں۔ یا ایک لمبا بانس ہو۔ اسے نیوے کی طرح پکڑ کے دوڑتے ہوئے آئیں اور زمین میں گاڑ کے اوپر اٹھ جائیں۔ پول والٹ اسٹائل۔ مگر دونوں کام میں نہیں کر سکتا" افسوس۔

"پھر یہ کہنے کی کیا ضرورت ہے" ختم نے کہا "ہم آسان طریقہ ہے۔"

"بار" مشکل طریقے سے میں ہر جگہ پہنچ سکتا ہوں۔ خیر، سرا! آپ آگے فرمائیں۔"

رہیں نے کہا "ہاڑھ کے اندر چاروں طرف کوئی مین گز جگہ خالی تھی۔ میرا خیال ہے کہ ایک ایک جگہ ہوگی۔ درمیان میں گھربنا ہوا تھا۔ کی اینٹوں کا اور پکی چھت والا۔ تاروں کے درمیان میں ایک گیٹ تھا۔ گیٹ سے گھر تک دس فٹ چوڑا صاف راستہ تھا جس پر گاڑیاں آتی جاتی ہوں گی۔ وہ نیا بنا ہوا گھر نہیں تھا۔ پرانے اسٹائل کا کول خرابوں وانا برآمدہ تھا باہر۔ چاروں طرف نیس تو تین طرف برآمدہ ضرور تھا۔"

میں نے کہا "کھیرل کی نیچی چھت والا۔ اندر کی طرف کھڑکیاں تھیں بڑی بڑی۔ ایک دروازہ ایک کھڑکی۔ پھر ایک دروازہ اور دوسری کھڑکی۔"

رہیں حیران ہوا "تو نے دیکھی ہے وہ جگہ؟" میں نے کہا "بابا۔ مجھے پتا نہیں چلا مگر ہم تیرے ساتھ تھے۔"

"جو اس مت فرمائیں اب بلا وجہ" ختم نے کہا۔ "ہم معنی طور پر اس کے ساتھ تھے۔ ہمارے جذبات اور خیالات اس کے ساتھ تھے۔ ہم نے ٹیلی ویژن کی ٹیلی اسکوپ لگا کے سب دیکھا۔"

رہیں نے کہا "اب یا رچتا" مجھے کیسے پتا چلا؟" ختم کہنے لگی "تم ان کی باتوں میں مت آکر پرانے انگریزوں کے دور کے ریشٹ ہاؤس اور ڈاک بنگلے۔ سرکاری رہائش گاہیں اور دفتر ایسے ہی ہوتے تھے۔"

رہیں نے سر ہٹا لیا "مجھے انہوں نے ایک کمرے میں بند کر دیا۔ وہاں نہ لائٹ تھی اور نہ ہوا کا گزر تھا۔ کھڑکی کے شیشوں کے باہر بھی اندھیرا ہی نظر آتا تھا۔ کچھ دیر بعد میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو گئیں تو میں نے کھڑکی کھولنے کی کوشش کی۔ تب مجھے پتا چلا کہ کیلیں ٹھوک کے پٹ بند کر دیے گئے ہیں۔ ایک دو شیشے ٹوٹے ہوئے تھے۔ میں نے ان کے پاس ہی کرسی ٹھیک لی۔ بڑی بیماری کرسی تھی۔ اس کے علاوہ کمرے میں بیماری بخرم مسری تھی اور ایک

پرانی لکڑی کی انٹاری تھی۔ ایک ڈرننگ فیبل تھی اور ایک میز تھی۔ گرمی اور ٹھنکن سے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد میں بند پر لیٹ گیا۔ مگر اسی وقت وہ دونوں آگئے۔ تیسرے کے ہاتھ میں ایک مٹی کے تیل سے جلنے والا لیمپ تھا اور وہ صورت سے ہی برا خیال اور جلد نظر آتا تھا۔ چوتھا شخص بعد میں آیا وہ ساتھ کا ضرور ہو گا کیونکہ اس کے سر کے سارے بال سفید تھے لیکن بہت گتے تھے۔ اس کی مونچھیں، بھوئیں اور فرج کٹ داڑھی سب سفید تھے۔ صحت اس کی عمر کے حساب سے یقیناً اچھی تھی۔ اس نے سیاہ فریم کا چشمہ لگا رکھا تھا اور ٹائٹ سوٹ پر گاؤں پہن رکھا تھا۔"

"یعنی وہ فقیر یا پتہ اور مذہب آدمی تھا؟" میں نے کہا۔ "ہاں۔ اس کے لیے ایک اور کرسی لائی گئی اور وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔ اس نے پہلا سوال مجھ سے ہی کیا کہ میرا کیا تعلق ہے ختم سے۔ میں نے کہا کہ تعلق کوئی نہیں۔ وہ کہنے لگا کہ پھر تم اس کے بازی گاڑو کے فرائض کیوں انجام دے رہے تھے؟ میں نے کہا کہ یہ غلط ہے۔ اس پر وہ جلد ایک دم مجھ پر چل پڑا۔ اس نے مجھے کرسی سے ٹھیک کر پٹے کر دیا اور میرے سینے پر سوار ہو کے مجھے پیچھے اور کے مارنے لگا۔ اس کا پیچھے میرے گال پر ایسے پڑا تھا

جیسے تیرہ نمبر کے جوتے کا سول ہو۔ سکے اس نے میرے پیٹ میں اور میری پسلیوں میں مارے۔ اس کے حلق سے عجیب وحشت اور پاگل ہو جانے والے گوریلے جیسی آوازیں نکل رہی تھیں۔ دو منٹ میں اس نے میرا آلیٹ بنادیا۔ پھر کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص نے اس کو ہاتھ کے اشارے سے کہا "جہو۔ ٹھہر جا۔"

"جہو۔ یہ تو نام بھی گوریلے جیسا ہے۔"

"وہ آدمی سے زیادہ بن مانس کی اولاد گنتا تھا۔ چھ فٹ سے زیادہ قد اور تین سو ڈیڑھ وزن والا۔ اس کے بدن پر بال بھی بہت تھے۔ بعد میں دیکھنے پر مجھے باقی جسم اور ٹانگوں کے مقابلے میں اس کے ہاتھ بہت لمبے لگے۔ وہ گونگا تھا اور حلق سے خوفناک آوازیں نکالتا رہا تھا۔ جہو مجھے چھوڑ کے پھر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اس شخص نے کہا کہ جھوٹ بالکل مت بولنا ورنہ جہو بالکل درندہ ہے۔ میرے اشارے پر ہاتھوں سے تمہارا سارا جسم اور کھال ٹوچ سکتا ہے۔ دانتوں سے تمہارا گوشت چبا سکتا ہے اور تمہارا خون پی سکتا ہے۔ یہ آدم خور ہے۔ پس بڑا اپنی تو حالت خراب ہو گئی۔ حالت پہلے کون سی اچھی تھی۔ میں نے کہا کہ جناب میں ایسے ہی کام کرتا ہوں۔ پہلے ایک سیاست دان کے ساتھ تھا اور وہ مجھ سے مختافوں کو اٹھوانے ان کے جلے جلوس خراب کرانے۔ ایکشن میں ان کے خلاف مظاہرے کروانے اور دشمنوں کے گھروں پر فائرنگ کرانے یا ان کے حامیوں سے ہٹنے کے لیے استعمال کرتا تھا۔ لیکن اس کا قتل ہو گیا اور میں نے بھی سیاسی بد معاشی چھوڑ دی۔ ختم جانی تھی کہ میرا ایک گروہ بھی ہے۔ میرا پولیس ریکارڈ بھی اچھا نہیں تھا لیکن سیاسی پشت پناہی کی وجہ سے کبھی اندر نہیں گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ کچھ دن سے اسے نامعلوم لوگ فون کر کے دھمکیاں دیتے رہے ہیں اور مجھ سے شاہ عالم کا پتا پوچھ رہے ہیں۔"

میں چونکا "کہا تو نے؟"

"ہاں یا۔ کچھ تو کہنا ہی تھا مجھے کہ ختم کو آخر میری ضرورت کیوں محسوس ہوئی اور میں نے وہ بات کہی جو ایک سو ایک فیصد ٹھیک تھی۔ وہ کہنے لگا کہ کیا تم جانتے ہو۔ شاہ عالم کہاں ہے؟ میں نے کہا کہ میں کیسے جانتا ہوں۔ اس پر وہ گورلا ہو پھر آگے بڑھا اور اس نے مجھے مارا کم، رگڑا زیادہ وہ مجھے زمین پر ادرست اڑھ کر اتارنا، ٹھیکتا رہا۔ میرے اوپر چڑھتا کودتا رہا اور مجھے ٹھنٹوں سے دبا کے چپا کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ واقعی درندہ ہے؟ پس اس نے مجھے اندھا خا کے چٹا نہیں فرش پر ورنہ میری ہڈیوں کا سرمہ بن

جاتا۔ اسے ضرور اشارہ کیا جاتا ہو گا کہ اب کیا کرتا ہے اور وہ اشارے کی حد تک اپنی زندگی کا مظاہرہ کرتا تھا۔ جب اس نے پھر میری جان چھوڑی تو میں مرنے کے قریب ہو گیا تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے مجھے کنکریٹ کسر میں ڈالنے کے خوب گھمایا گیا ہے یا بہت سے لوگ رات بھر مجھے کشن والے ڈنڈوں سے کوئے رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد جب میں بولنے کے قابل ہوا تو میں نے کہا کہ تم لوگ مجھے مارنا چاہتے ہو تو ہمارے کی کیا ضرورت ہے۔ جبو سے کہو کہ مجھے کھانے اپنی بھوک ملا۔ مگر مرنے مرنے بھی میرا جواب کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ ہاں ایک بات جو سب کو معلوم ہے وہ میں بھی بتا سکتا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ ہمیں معلوم ہو گا۔ شاہ عالم لندن میں عیش کر رہا ہے۔ اس نے وہاں دوسری شادی بھی کر لی ہے۔ میری بات پر انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص نے کہا کہ یہ تمہیں کس نے بتایا؟ میں نے کہا کہ اخبار دیکھ لو آج صبح کا۔ ایسی خبریں پہلے بھی شائع ہوئی ہیں۔ بھٹ چکے تھے۔ دو ہولاکہ اچھا میں معلوم کروں گا اور اٹھ کر چلا گیا۔ جبو بھی چلا گیا۔ جو مجھے وہاں لے گئے تھے میں نے ان سے کہا کہ مجھے پانی پادو اور کچھ کھانے کو لادو۔ وہ انہوں نے ہاتھیں کرنے لگے کہ یہ کھالو۔ وہ لی لو ان کی گفتگو میں دہرا نہیں سکتا۔ وہ کرے کو بند کر کے چلے گئے۔ میں کافی دیر وہیں برا رہا۔ پھر اٹھ کے بیڈ پر لیٹ گیا۔ پوری رات کوئی لوٹ گئے نہیں آیا۔ مجھے نیند کیا تھی۔ میں چاہتا تھا کہ بے ہوش ہو جاؤں تاکہ اذیت کا احساس نہ رہے۔ میں دروازے بجا رہا اور چلا رہا مگر ایسا لگتا تھا کہ وہاں کوئی بھی نہیں ہے۔ اگر میں بالکل تندرست ہوتا تب بھی وہ بھاری دروازے ٹوٹنے والے نہیں تھے۔ میں کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشوں میں منہ ڈال کے بیٹھا رہا اور انہیں گالیاں دیتا رہا۔ صبح تک میں نے اپنی حالت اور خراب کر لی۔ کافی دن چڑھے وہ شخص پھر آیا جو علیے سے کہلی پروفیسر لگتا تھا۔

”پروفیسر؟“ میں نے اور شبخیم نے ایک ساتھ کہا۔

”کیا وہ پروفیسر ہاشم رضا ہو سکتا ہے؟“ ریکس بولا۔

میں نے کہا ”ہوئے کو دنیا میں کیا نہیں ہو سکتا۔ مگر وہ پروفیسر ہاشم رضا تھا تو ملک اسے لاہور بول میں کیوں تلاش کر رہا تھا؟“

”اور ملک کو اس کے ٹھکانے کا علم کیوں نہیں تھا؟“

شبخیم نے کہا ”ان تمام سوالات کا جواب۔“

”میں کیسے دوں ان سوالوں کا جواب۔ تم بھی کمال لڑکی

ہو۔“ ریکس ناراض ہوئے لگا۔
شبخیم بھی ”میں تو کتنا جانتی تھی کہ ایسے تمام سوالوں پر ہم فرصت میں غور فرمائیں گے۔“

ریکس سہلانے لگا ”اچھا پھر ٹھیک ہے۔ وہ جب میرے پاس آیا تو ایسا ہی تھا مگر مجھے پتا تھا اس کے پاس ریوالور ہو گا۔ مجھ سے تو سالوں نے سب چھین لیا تھا۔ ریوالور کے علاوہ سواکل فون، گھڑی اور میرا ہوا۔ اس میں چھ سات ہزار روپے تھے۔ پروفیسر کا وہ پالتو بن مانس بھی قریب ہی ہو گا۔ میرا اندازہ بعد میں صحیح ثابت ہوا۔ پروفیسر نے ایک سیل بجائی اور وہ خرخر کرنا لگیا۔ وہ صرف اس حد تک انسان تھا کہ دو پیروں پر چلتا تھا ورنہ جانور ہی تھا۔ انسان کی زبان تو کتنا بھی سمجھ لیتا ہے اور طوطا بول بھی لیتا ہے۔ خیر وہ میرے سامنے بیٹھ گیا۔ کہنے لگا کہ تمہاری بات کی تصدیق کر لی ہے۔ ہم نے اخبار کی یہ خبر چند خانے کی بات بھی نہیں لگتی۔ خبر بھاری کرنے والی انجینیئر ہے۔ ہمیں معلوم ہے کچھ کہ لندن میں اس کا ٹھکانا کمان ہو تا ہے؟ میں نے کہا کہ تم بھی عجیب آدمی ہو، وہ میرا بھائی تھا اور نہ لگھو نیا دوست۔ اور ہوتا تب بھی یہ سوچو کہ وہ روپوش ہے۔ اس نے یو پی چھوڑ دی۔ پارٹی چھوڑ دی۔ سیاست چھوڑ دی۔ ہاں آخر پاکستان بھی چھوڑ گیا۔ یہ تو اسے کسی نے اتفاق سے لندن میں دیکھ لیا ہو گا۔ خبر کی اشاعت کے بعد وہ پھر روپوش ہو جائے گا۔ اس نے اپنے سارے پرانے ٹھکانے بدل دیے ہوں گے۔ مجھے تو پہلے بھی پتا نہیں تھا کہ لندن جا کے وہ کہاں رہتا ہے اور کیا کرتا ہے۔ پروفیسر کی صورت سے کچھ پتا نہیں چتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے اور کیا سمجھ رہا ہے۔ اس کی آنکھیں سائب جیسی ہیں۔ وہ ہلکے جھپکے بغیر دھکتا ہے تو گنتا ہے اس کی نظریں آ رہا رہوری ہیں۔ میں نے کہا کہ ”خبر مجھے کس جرم کی سزا مل رہی ہے یہ تو مجھے بچپن سے مار کھانے اور بھوکا رہنے کی عادت ہے۔ اس لیے میں ابھی تک فوت نہیں ہوا مگر ایسے میں کب تک زندہ رہ سکتا ہوں۔ وہ شور کا بچہ کہنے لگا کہ آخر تمہارا زندہ رہنا کیوں ضروری ہے؟“

میں نے کہا ”سوال بہت منطقی تھا اس کا۔ کیوں ضروری ہے تیرا زندہ رہنا آخر کبھی غور کیا تو نے؟“

”یہی سوال میں نے اس سے کیا تو سوچ میں پڑا پھر بولا کہ چلو میں سوالی واپس لیتا ہوں۔ تمہارا کیا خیال ہے یہ لڑکی شبخیم جتنی بولی شاد عالم کے بارے میں؟ میں نے کہا کہ مشکل ہے۔ جب وہ نیوی کو چھوڑ گیا۔ پروفیسر نے لگا میری بات پر۔ پھر بولا کہ یا ریوی کو بھلا کون چھوڑنا نہیں چاہتا۔

لگتا ہے شادی نہیں ہوئی ہے تمہاری۔ بس سب میں بہت نہیں ہوئی یا انہیں موقع نہیں ملا۔“
میں نے کہا ”ہاں تو اس نے لاکھ روپے کی کسی ایک اتفاقی سیالی بیان کر دی۔“
شبخیم نے مجھے پر ملاحت نظروں سے دیکھا ”یعنی تمہارے نزدیک وفا اور جذباتی رفاقت، زندگی اور موت کا ساتھ یہ سب کچھ اس ہے۔“

میں نے کہا ”پروفیسر نے اپنی یا میری بات نہیں کی تھی۔ ایک انسانی حقیقت بیان کی تھی۔ ازدواجی حقیقت کتنا زیادہ مناسب ہو گا۔“

”مگر تم اتفاق کر سکتے ہو اس بات سے؟“ شبخیم نے ناراضی سے کہا۔

”ہرگز نہیں۔ وہ جو ایک بہت چھوٹی سی اقلیت ہے، بے وقوف شوہروں کی، میرا نام شامل ہے۔ میرا مطلب ہے شامل ہو گا۔ مگر تم کیوں جڑ بڑبڑا رہی ہو اس اعتراف سے۔“

ریکس نے کہا ”میں نے کہا کہ شاہ عالم کے ان اصول ہیں اور نہ جذبات۔ وہ شبخیم کو آخر کیوں نہیں چھوڑ سکتا۔ وہ بولا کہ بالکل ٹھیک کما تم نے محروم لڑکی کہل ہے۔ وہ ناگہ جان چمڑائے محروم اس کو چھوڑنے والی نہیں ہے۔ اسے یقیناً پتا ہو گا اور پتا نہیں ہے تو وہ پتا چلا لے گی۔ اخبار دانے عام لوگوں سے زیادہ پہنچ رکھتے ہیں مگر یہ لڑکی تو چھلا وہ ہے۔ سب جانتے ہیں اس کی عادت کو۔ وہ جس کے پیچھے پڑ جائے وہ بچ بکے کہیں نہیں چا سکتا۔“

شبخیم نے میری طرف دیکھا ”کوئی مجھ سے بچنے کے لیے مرنا بھی چاہے تو میں اسے دوسری دنیا سے واپس لے آؤں۔“

میں نے کہا ”جو تم پر مرنا ہو وہ مر کیسے سکتا ہے، تمہارے بغیر۔“

”پروفیسر کی رائے بڑی اچھی ہے شبخیم کے بارے میں“ ریکس مسکراتے لگا ”مگر رہا کسے تاروں کیا کہ رہا تھا؟“
”مجھے فرق نہیں پڑتا۔ میں بھی ہوں، بس ہوں“ شبخیم نے کہا۔

”مجھے بھی فرق نہیں پڑتا۔ اس کی رائے میرے لیے سند نہیں ہو سکتی۔“ میں نے کہا۔

”مگر رہا تھا کہ اس لڑکی کا ایک کیریکٹر ہے۔ کوئی اچھا سمجھ گیا یا راہ پر انہیں کرتی۔ بدنامی بھی ہوئی اس کی شاہ عالم کی وجہ سے مگر بھی کیا لڑکی ہے؟ اس نے شرمندہ کو کیا ان

مشہور عالم خواتین، شیریں کو اور لیلی کو۔ فریاد اور جھٹکوں کس میں کسی کیریکٹر کا مظاہرہ نہیں کیا انہوں نے۔ بعض بھوک جاتیں ان کے ساتھ۔ خود کشی کر تھیں یا قتل کر دیا ہو، اپنی راہ میں حائل ہونے والوں کو۔ محبت کا سارا اتفاقی فتنہ چار نظروں میں بیان کر دیا گیا ہے فلم منغل اعظم کے ایک گانے میں۔ پتا کیا تو ڈرنا کیا۔“

میں نے کہا ”یہ پروفیسر کچھ سکی ہے۔“

”ہاں، کچھ ایسا ہی ہے۔ جب وہ میری حالت پر رحم کھائے اور میری بات سننے کے بجائے ایسی فضول باتوں میں مصروف تھا تو مجھے سخت ٹیش آ رہا تھا۔ میری وہ حالت بورسی تھی جب آدمی سوچتا ہے کہ ایسی کی ایسی صورت حال ہو رہی کی۔ مصیقت اور دور اندیشی کی۔ اور مرنے مارنے پر قن جاتا ہے۔ میں نے بھی موقع پا کے اس پر حملہ کر دیا۔ میرا خیال تھا کہ بڑھا آدمی ہے، میں ایک دم تھک کر گوا تو سنبھل نہیں پائے گا اور میں اسے گرا کرے ریوالور چھین لوں گا۔ مگر یہ بالکل پتہ تھا میرا۔ ایک تو اس کی صحت بہت ہے جو انہوں نے اچھی سمجھی۔ پھر میرے جسم میں کھڑا ہونے کی طاقت بھی کہاں تھی۔ میں نے اسے کرسی سمیت گرا دیا مگر خود بھی گرا۔ وہ مجھے دھکا دے کر کھڑا ہو گیا اور اس نے منہ میں اتنی ڈال کے سینی بجا لی۔ ایک دم وہ بن مانس کی اولاد ہو گیا۔ اس وقت وہ ذرا بھی انسان نہیں لگ رہا تھا۔ اس کے جسم پر پہلے ایک کپڑا بندھا ہوا تھا جیسے کوئی تولیا لپیٹ لے۔ اب وہ بھی نہیں تھا۔ پروفیسر کے اشارے پر اس نے مجھ سے ٹھیک شروع کیا۔ وہ بڑا ظالمانہ کھیل تھا۔ جیت ملی گیتی ہے چوہے کے ساتھ۔ اس نے پہلے مجھے دہرا کیا۔ میری ٹانگیں سمیٹ کے گردن ان میں پھنسا دی اور میرے ہاتھ پھیلا کے کھنکھوں سے دبا کے اب پروفیسر میرے سامنے آکے بیٹھ گیا۔ میں سخت اذیت میں تھا۔ میری کمر لگتا تھا، درمیان سے دو ٹکڑے ہو جائے گی یا ریوی کی بڑی کے سارے سرے نکل جائیں گے۔ وہ کہنے لگا کہ شاہ عالم کا پتا بتادو تو جوہو چھوڑ دے گا۔ میں نے چیخے ہوئے کہا کہ شاہ عالم میرا باپ ہو تا تب بھی میں اس کا پتا ضرور بتا دیتا۔ مگر مجھے نہیں معلوم تو کیا بتاؤں؟ وہ بولا کہ اچھا یہ بتاؤ کہ شبخیم کو بھی معلوم نہیں؟ اس نے تم پر بھروسہ کیا اور تمہیں باڈی گارڈ رکھ کیونکہ تم پر شاہ عالم بھی بھروسہ کرتا تھا۔ میں نے کہا کہ شبخیم کی بات شبخیم سے ہو چھو، میرے سامنے اس نے بھی شاہ عالم کی بات نہیں کی۔ پھر پروفیسر نے اس کو جانور کچھ اشارہ کیا اور وہ میرے ہاتھوں پیروں کو بھٹل میں دبا کے کھڑا ہوا۔ دو نو۔ دو ایک ایک بھٹل میں دو نوں ہاتھ دوسری بھٹل میں۔ مجھ

میں مزاحمت کی طاقت بالکل صفر ہو گئی تھی۔ وہ مجھے سامنے لٹکا کے گول گول گھومتا لگا۔ اتنا تیز کہ لٹکتا تھا جتنی کی موڑ سے چل رہا ہے۔ مجھے تو کچھ نظری نہیں آ رہا تھا۔ ذرا سی دیر میں چکر آئے سے بے ہوش ہو گیا۔ تو خود سوچا یا رہا ہوں؟ میں نے ہونے لگے تھے مجھے کچھ کھائے پئے بغیر۔ اور اس پر میرے ساتھ جو کچھ جہونے رات کو کیا تھا اس کے بعد میں پتا نہیں زندہ کیسے رہا۔ جب ہوش آیا تو میرے لیے سانس لینا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ مجھے متلی سے ایسا کیا آ رہی تھی مگر بیٹ میں کچھ ہوتا تو لگتا۔ میرے حلق میں کانٹے بھر گئے تھے۔ میں نے سوچا کہ مجھے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لینا چاہیے مگر یہ آسان نہیں تھا۔ وہاں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس سے خودکشی آسان ہو جاتی۔ اور خود کو حالات اسٹائل میں آزار بند سے بچا کر لگایا دیوار سے سرنگار کے مرناس کے لیے طاقت کہاں بھی ہوں میں۔ میں بڑا رہا۔ کچھ دیر بعد وہی دونوں آئے جو مجھے نیکی میں ڈال گئے تھے اور انہوں نے مجھے کھینچنے کے کھڑا کر دیا۔ وہ مجھے دھکیلے ہوئے باہر لے گئے۔ میں کئی بار لڑکھڑاکے گرا مگر انہوں نے پھر اٹھا کے کھڑا کر دیا۔ سالے مسلسل گالیاں دے رہے تھے کہ ذرا مت کر۔ یہ مکر نہیں چلے گا۔ قسمت اچھی ہے تیری کہ زندہ بچ کے واپس جا رہا ہے ورنہ حکم یہی تھا کہ صبح اسے گھڑوں پر باندھ دیکھ اپنی قرب۔ انہوں نے مجھے ایک گڑھا دکھایا۔ خدا جانے وہ کس مقصد کے لیے کھودا گیا تھا۔ مگر اس وقت تو اتنی مجھ پر لڑہ طاری ہو گیا اور اب تم سے کیا رہا رہا میرا بیٹابا نکل گیا تھا اس وقت ذرا سے میرے اعصاب بالکل جواب دے چکے تھے۔ انہوں نے مجھے نیکی میں ڈالا جو رات بھر وہیں کھڑی رہی تھی اور جیسے لائے تھے، ویسے ہی واپس ساتھ لے کر روانہ ہو گئے۔ جاتے وقت بھی میری حالت ٹھیک نہیں تھی اور پھر اندھیرا تھا۔ واپسی میں دن کا ابلا تھا مگر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ میں ذہنی طور پر ہوش میں تھا اور یہ جانتا تھا کہ ابھی میں زندہ ہوں اور انہوں نے مجھے نیکی سے فرش پر ڈال دیا ہے۔ میں باہر کچھ دیکھتے بھی تو نظر نہ آتا۔

میں نے کہا "اس نیکی ڈرائیور کے بارے میں تو نے نہیں پوچھا؟"

"پوچھا تھا۔ اس وقت جب وہ مجھے باہر گرائے گئے میں نے کہا کہ جس کی نیکی تھی وہ کہاں سے؟ ان میں سے ایک نے کہا کہ جنم میں 'دوسرا زیادہ حرامی تھا' کہنے لگا کہ وہ میں ہی ہوں۔ غور سے دیکھو پھر انہوں نے مجھے ایسے باہر پھینک دیا۔

پر ہاتھ رکھا 'یار' تو نے لاج رکھ لی دوستی کی۔ اس پر و فسر کو کچھ نہیں بتایا۔"

وہ ہنسنے لگا "اب بڑی پریکٹس ہے ہمیں سختی جھیلنے اور کچھ نہ جاننے کی۔ تھانے والے استاد ہیں اپنے اس معاملے میں۔"

وہ نیکی والا خواہ مخواہ مارا گیا اس پکر میں۔"

رکس بولا "ہاں یار۔ مجھے بھی بہت افسوس ہے اس کا۔ پتا نہیں اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ان لوگوں نے؟"

جنم نے کہا "میرا خیال ہے اسے انہوں نے شرمیں ہی کہیں چھوڑ دیا ہو گا۔"

"پھر تو ہوش آنے کے بعد وہ گیا ہو گا سیدھا پولیس اسٹیشن اور اپنے بیان میں اس نے جنم کا ذکر بھی کیا ہو گا۔ جو کچھ میں نے کہا تھا وہ سب بتا دیا ہو گا اور پولیس نے مجبوراً نیکی جینے جانے کی اور اغوا کی رپورٹ لکھی ہو گی۔"

"مجبوراً کیوں؟"

رکس بولا "اب وہ کہاں لکھتے ہیں ایسی رپورٹ۔ پہلے تو جانتے ہیں کہ صبر کرو۔ نیکی مل جائے گی کہیں۔ اور عموماً جھجھج جانے والی گاڑیاں مل جاتی ہیں۔ کوئی واردات نہ کی گئی ہو اس میں تو وہ مالک سے ملھائی کے نام پر دو چار ہزار وصول کر کے گاڑی کسی قانونی کارروائی کے بغیر اس کے حوالے کر دیتے ہیں۔"

میں نے کہا "ہاں۔ قانونی چکر تو بہت لمبا ہوتا ہے۔ گاڑی پھر اسے ایم کیو ایف کے حکم سے ملتی ہے اور تب تک تھانے میں کھڑی رہتی ہے۔ اس کے تمام اعضائے رعبہ غائب ہو جاتے ہیں پراسرار طور پر۔"

"واردات ہو جائے تو پھر مالک بھی مشکوک افراد میں شامل۔ لیکن یہ معاملہ تھا ایک اخباری رپورٹر کا۔ کچھ لوگ اسے اغوا کرنا چاہتے تھے۔ میں ان پر نظر رکھے ہوئے تھا چنانچہ پہلے انہوں نے مجھے اغوا کر لیا۔ بعد میں جنم کے ساتھ کیا ہوا۔ پولیس والے یہ معلوم کرنے کے لیے آزاد صاحب کے گھر یا دفتر ضرور گئے ہوں گے۔"

میں نے کہا "یار" ایسا ہوتا تو آزاد صاحب کا فون ضرور آتا میرے پاس کہ وہ اپنی فون جنم سلسلے کے بارے میں ہے خبر گرم کر گیا کہ اسے خدا خواست اغوا فرمایا گیا ہے تو تم کیا روشنی ڈال سکتے ہو اس تشویشناک صورت حال پر۔"

جنم نے کہا "پھر صبح ساڑھے تین بجے تو ہم مل چکے ہیں ان سے۔"

رکس بولا "اس جگہ کے بارے میں ایک خاص بات

بتانا بھول گیا میں۔ انہوں نے یعنی جو مجھے لے گئے تھے انہوں نے باتوں باتوں میں کہا تھا کہ وہاں پٹرول مل جائے گا۔ رات بھر مجھے وہاں پٹرول کے علاوہ کچھ عیب سی ہو آتی رہی۔ جب دروازہ کھلتا تھا تو بونیاہ ہو جاتی تھی۔"

میں نے کہا "وہ کس قسم کی بو تھی؟"

"یار" بھاننا مشکل تھا۔"

میں نے کہا "دیکھو ایک بو ہوتی ہے سڑی ہوئی چیزوں کی۔"

"تیرا مطلب ہے گوشت سڑنے کی؟ لاشوں کی۔ نہیں، وہ پٹرول جیسی بو تھی۔ مگر پٹرول کی نہیں تھی اور کچھ گیس جیسی۔"

"کیمیکل کی بو تھی۔ اسپرٹ، بنزین، کاربن ٹریآکسائیڈ اور کھور فارم وغیرہ۔ یا ایسویا اور کلورین گیس جیسی؟"

"اب" ایسی ہی ہو گی۔ ملی جلی بو تھی۔ پتا نہیں وہاں کیا کام ہوتا ہے۔ پورے تو کوئی نہیں تھا وہاں۔ لیکن صبح کے بعد وہاں اندر سے کام کرنے کی آوازیں ضرور آ رہی تھیں۔ کچھ لوگ باتیں کر رہے تھے۔ ٹھک ٹھک کی آوازیں تھیں جیسے کوئی کچھ کوٹ رہا ہو یا پھیل رہا ہو۔"

قلم کے نواب محی الدین نواب کا ایک طویل ناول

اندھیرنگری

150 قسطیں طویل

چار جلدوں میں مکمل

محی الدین نواب

• ایکشن اور تھرس کا درجنے والا سلسلہ آپ کی رگوں میں لہو گرما دے گا

• سیاست کے سانپ اور ان کی زہریلی سازشوں کا محال

• پوری دنیا پر حکمرانی کرنے والے "خفیہ ہاتھ" کی سازشوں کا محال

• بھارتی خفیہ ایجنسی "راک" پاکستان میں ترخنی کارروائیوں کی داستان

• سندھ کے ڈیڑوں کی "خدائی" کی ناقابل یقین داستانیں

اپنے بائیں یا پائے شہر کے ہر اچھے بکسٹال سے طلب فرمائیں

ناشر: الرفاعی پبلشرز اینڈ ڈسٹریبیوٹرز، لاہور

”بھوڑے جھنی سے چمکات رہا ہو“ میں نے کہا۔
 ”ہو سکتا ہے گر گر کر کی آواز الگ تھی۔ گراری چلنے کی یا آری سے کچھ کانٹے کی اور کچھ دیسی۔ جیسی فرش رگڑنے والی مشین کے چلنے سے پیدا ہوتی ہے۔ مگر یہ سب آوازیں دور سے آتی محسوس ہوتی تھیں۔ حالانکہ گھراٹا بڑا نہیں تھا کہ اس کا آخری حصہ سوگزر دور ہو۔ اس پاس کا خالی علاقہ نکال کے بیچ میں گھر ہو گا شاید ایک بڑا کھانا پر۔ میں فرش پر پڑا تھا تو مجھے آواز فرش سے آتی لگتی تھی۔“
 میں نے چنگی بجا لی۔ ”اس کا مطلب ہے آواز نیچے سے آ رہی تھی۔ اس عمارت کے زیر زمین کسی حصے سے۔“
 جھنم نے کہا ”وہ پرانی عمارت ہے۔ ریٹ ہاؤس قسم کی۔ ان میں وہ خانے نہیں رکھے جاتے تھے۔“
 ”بعد میں تو بنائے جاسکتے ہیں؟“ میں نے کہا ”خیر جب ہم ٹکڑی کے تو اس جگہ کو بھی تلاش کر لیں گے۔ آج تو آرام کر۔“

”تم پھر کہیں جا رہے ہو؟“
 میں نے کہا ”ہاں۔ ایک تو مجھے جانا ہے کمال اسپتال۔ خانہ جی کو دیکھنا ہے اور یہ معلوم کرنا ہے کہ آخر چند انہیں کہاں لے جا رہی ہے؟“

”بہن فون کر کے آزاد صاحب کے پاس حاضری لگوا دوں اور ان کی بھاڑ کھاؤں۔ کوئی اور ہوتا تو وہ اب تک برطرف کر چکے ہوتے۔ کوئی کام نہیں کر رہی ہوں میں۔ دفتر جانا بھی چھوڑ رکھا ہے۔“ جھنم نے کہا۔
 ”ان کو قسلی دیتا کہ بہت جلد تم ان کے پاس سٹش خیر انکشافات برہنہ خبروں اور کہانیوں کے انبار لگا دو گی۔“
 ”وہ ایسی باتوں سے بھلتے والے نہیں ہیں۔ پھر بھی میں انہیں بھلانے کی کوشش کر سکتی ہوں۔ مگر یہ اندر کیا بیگانہ چل رہا ہے؟“

میں نے کہا ”پہلے تو چھوٹی اور تیس مارخان کی پیار بھری جنگ بھی جو ہر وقت کسی وجہ کے بغیر جاری رہتی ہے لیکن اب اس میں فیکا بھی شامل ہے۔“
 میرا اندازہ ٹھیک نکلا۔ تین افراد کے درمیان لڑائی کے دو الگ الگ اسباب پیدا ہو گئے تھے۔ چھوٹی اور تیس مارخان اپنا روزمرہ کا لڑنا بھول کے اب فیکے سے اٹھ رہے تھے۔ اس پر جوت کا اثر باقی نہیں رہا تھا تو اس نے ہلکی ہلکی باتیں کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ ٹھیکے میں تھا۔ میں نے چھوٹی اور تیس مارخان کا کسٹن جھنم کے سپرد کیا اور فیکے کو اندر ایک کمرے میں لے گیا۔

”کیا بات ہے کیوں چلا رہے تھے اٹا؟“
 اس نے برہنہ سے کہا ”نہ چلاؤں تو کیا کروں؟ تم نے یہاں لاکے بند کر دیا ہے مجھے۔ میں نے مدد کی تھی تمہاری اور تم نے کہا تھا کہ میری بیوی کو ملک رب نواز کے قبضے سے چھڑانے میں میری مدد کرو گے۔“

میں نے کہا ”کسی نے بھی قید میں نہیں ڈال رکھا ہے جس۔ رات کے وقت تمہاری حالت ایسی نہیں تھی کہ ہم کچھ پوچھ سکتے۔“

”سب بتا چکا ہوں میں جو مجھے معلوم تھا۔“
 میں نے کہا ”آج صبح ہم نے ملک رب نواز کو ایک ہوٹل میں دیکھا۔ وہ پوچھ رہا تھا پروفسر ہاشم رضا کو۔“
 ”پھر میں کیا کروں؟“

”کیا پروفسر زندہ ہے؟ اور لندن میں ہے؟“ میں نے کہا۔

وہ بولا ”میں وہی جانتا ہوں جو سب جانتے ہیں۔ اس کا قتل ہو گیا تھا۔“

میں نے کہا ”تم نے اسے دیکھا تھا؟“
 ”ہاں۔ سب سے پہلے ملک کے ڈیرے پر۔ پھر یہاں میں کئی بار آیا تو وہ اکیلا ہی تھا۔“

میں نے کہا ”اس کا حلیہ بتاؤ۔ صورت شکل اور عمر؟“
 فیکے نے سوچ کے ہر بات بتائی۔ اس کا بتایا ہوا حلیہ سو فیصد اس شخص کا تھا جس کو رئیس نے پروفسر سمجھا تھا اور جو کسی دور افتادہ اور گمنام سی جگہ پر رات بھر موجود رہا تھا۔ یہ بڑی حیرت کی بات تھی۔ وہ ملک کا بزنس پارٹنر تھا۔ معلوم نہیں کس وجہ سے ملک نے اس کے بارے میں یہ مشہور کرنا ضروری سمجھا کہ اس کا قتل ہو گیا ہے۔ یہ بات پولیس کے ریکارڈ پر لائی تھی۔ لیکن ہاشم رضا زندہ تھا۔ کسی خاص مقصد سے لندن پہنچ رہا تھا۔ شاید وہ لندن میں ملک رب نواز کے ایجنٹ اور پارٹنر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا جو نوادرات یہاں سے اسمگل ہو کے جاتے تھے۔ ان کی تاریخی اہمیت اور حقیقت کے بارے میں ماہرین کو قائل کرنے کی اہم ذمہ داری پروفسر ہاشم رضا نے قبول کر رکھی تھی کیونکہ وہ تاریخ اور آثار قدیمہ پر سند کی حیثیت رکھتا تھا۔

پروفسر کے معاملے میں بہت سی باتیں ابھی ہوئی اور ناقابل فہم تھیں۔ نہروں یہ کہ اس کو مشغول و مروت کی قانونی حیثیت دینا کیوں ضروری تھا؟ کیا اس لیے کہ پروفسر کو دوسرے نام سے برطانوی شہریت دلا دی جائے؟ وہاں اس کی حیثیت ایک معزز شہری کی رہے۔ وہ پاکستان آنے جانے کے

لیے اصل نام اور اپنے پاسپورٹ کو استعمال کرتا رہے یا برطانیہ سے کہیں اور جانے تو پروفسر ہاشم رضا کے نام سے جانے۔ کبھی پکڑا جائے تو کسی سے اس کا منقذ ثابت نہ ہو۔
 تفتیش کرنے پر معلوم ہو کہ پروفسر ہاشم رضا تو بہت پہلے قتل ہو گیا تھا۔

یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ صورت حال اس کے برعکس بھی ہو سکتی تھی کہ پروفسر ہاشم رضا نے کچھ عرصہ یہاں ملک رب نواز کے پارٹنر کی حیثیت سے کام کیا مگر اسے اندازہ ہوا کہ کاروبار میں جتنی اہمیت اس کے کام کی ہے اس کے تناسب سے ملک رب نواز منافع میں حصہ نہیں دے رہا ہے۔ ممکن ہے ملک رب نواز نے برابری کی بنیاد پر اسے پارٹنر بنانا منظور نہ کیا ہو۔ یہ کہتے ہوئے کہ پروفسر جیسے تاریخ اور تہذیب کے ماہرین اور بہت ہیں۔ مایوس اور مشتعل ہو کے پروفسر نے خاموشی سے مارکٹ میں اپنی جگہ بنائی۔ رابطے پیدا کئے اور وسائل تک رسائی حاصل کی۔ جب اس نے محسوس کیا کہ اب ملک رب نواز کے مقابلے پر آ سکتا ہے تو اس نے خود کو الگ کر لیا اور لندن میں اپنا بزنس سیٹ کیا۔ ظاہر ہے اس کا روپاری رقابت سے ملک کو نقصان ہوا۔ وہاں اور اس کی جائیداد اور سرمایہ دارانہ ذہنیت کو نہیں پہنچی ہوگی مگر لندن میں وہ پروفسر کا کیا جگاڑ سکتا تھا۔ اب ممکن ہے پروفسر اپنے کاروباری دورے پر گیا ہو اس نے دورے کو خفیہ رکھا ہو مگر ملک کو بتا چیل گیا ہو اور وہ اسے ہونٹوں میں تلاش کرنا پھر رہا ہو۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ پروفسر نے کسی اسٹیج پر ملک رب نواز کو بلیک میل کیا۔ اس کے کاروبار کی نوعیت کے بارے میں ثبوت حاصل کر لینے کے بعد اس نے برہنہ کی کا حق مانگا۔ صورت دیگر اس کو افشاء راز کے بعد تباہ کرنے کی دھمکی دے دی۔ رب نواز جیسے لوگوں کو پاکستان میں کوئی پروفسر کیسے تباہ کر سکتا ہے؟ تو کرشنی ’فیوژنل جاگیردار اور ایجنسیوں کی سازشی حکون کے ساتھ تو سندھیکار اور سیاست دان نہیں ٹھہر سکے۔ ایک بزم خود افعلا طون ’ادیب‘ فنکار وکیل پارو فیصر کیا چیز ہے۔

میری خاموشی نے فیکے کو مضطرب کر دیا ”دیکھو جی۔ آپ کچھ نہیں کر سکتے۔“

میں نے کہا ”فیکے یہ کام جوش میں خراب ہو سکتا ہے۔ جوش میں رہو۔“

وہ پھر چلائے گا ”آپ لا رہے دے رہے ہو جی مجھے۔ مجھے پتا ہے۔ جو۔ آپ کی وجہ سے تباہ ہوا میرا گھر۔“
 میں نے کہا ”یہ کیا بات توئی کی بات ہے؟“

”کیوں؟ مجھے بتاؤ کیا آپ کے پاس نہیں ہے وہ مورچی کا سر۔ جس کی وجہ سے مجھ پر آفت آئی؟“
 میں نے کہا ”آئی سی۔ تم نے وہ دیکھ لیا ہے۔ مگر کیا وہ میں نے تم سے جینا تھا یا تمہارے گھر سے چوری کیا تھا؟ تم تو اسے بچھڑا آئے تھے۔“

وہ کچھ نرم نہ ہوا ”وہ تو ٹھیک ہے جی۔“
 میں نے کہا ”کیا میں نے مجبور کیا تھا تمہیں کہ اس کو پھینک دو؟“ وہ غلیں بھاٹکنے لگا ”یہ تو میں نے نہیں کہا جی۔“
 ”پھر میری وجہ سے تمہارا گھر کیسے برباد ہوا؟“ وہ قوتی خود تم نے کی تھی۔ یہ تو اتفاق ہے کہ وہ جنز میرے پاس پہنچ گئی۔ کیا یہاں آنے سے پہلے یہ بات معلوم تھی تمہیں۔“
 فیکا بھلانے لگا ”وہ جس غلطی سے نکل گئی وہ بات میرے منہ سے۔ میرا داغ خراب ہو رہا ہے۔ آپ سوچو جس کی عورت ملک رب نواز جیسے بندے کی قیدی ہو اس پر کیا کر رہے گی۔ وہاں ملک بھینسا ہے تو باقی سب کتے ہیں۔“
 میں نے اس کے کندھے پر دوستانہ انداز میں ہاتھ رکھا۔ ”کچھ صبر اور حوصلے سے کام لو۔ خدا نے چاہا تو ہم آج ہی تمہاری گھر والی کو ملک رب نواز کے قبضے سے چھڑانے کی کوشش کریں گے مگر اس کے لیے ہم فوج لے کر چڑھائی نہیں کر سکتے۔ ہمیں اس چالاک اور عیار آدمی کے ساتھ چالاک اور عیاری سے ہی کام لینا ہوگا۔“

فیکا جذباتی ہونے لگا ”سری۔ میں ساری عمر آپ کا احسان نہیں بھولوں گا۔ میں آپ کا نلام رہوں گا۔“
 ”غلطی کا دور گزر گیا فیکے۔ بس دیکھو وہ زندہ ہو۔“
 وہ گھبرا گیا ”ایسا مت کہو جی۔ وہ زندہ ہوگی ملک نہیں مار سکتا ہے۔“

میں نے بہتر سمجھا کہ اس ذہنی طور پر بدترین صورت حال کے لیے پہلے سے تیار رکھوں۔ ”کیوں نہیں مار سکتا آخر؟ کیا وہ عورتوں کے معاملے میں بہت شرافت کا قائل ہے یا وہ ڈرتا ہے تم سے۔ پہلے کوئی قتل نہیں کیا اس نے۔“

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”غریب کی جان کی کوئی قیمت نہیں ہوتی جی کسی ملک ڈیرے یا چوہدری کے نزدیک مگر اس سرور عورت کی جان میں لے گا وہ شیر کسی چوہے کو نہیں مارا۔“

”ہاں ٹھیک کہا تم سینہ مرہور عورت خود کو اپنی جان لے سکتی ہے۔ جس کا سبب ہو گا کوئی لیس وہ عورت ہاں ملے ہو کے خود اپنے آپ سے اپنی ہی کا انتقام لے سکتی ہے۔“

میں نے کہا مگر مجھے خیال آیا کہ یہ فلسفیانہ بات ہے اور
نیکا فریڈریش یا ڈیپریشن کے نفسیاتی رد عمل وغیرہ کو نہیں
سمجھ سکتا۔

شبنم: اندر آ کے کہا "میری بات ہوگئی آزاد صاحب
سے۔ وہ نیکی ذرا نیور آج صبح آٹھ بجے آزاد صاحب کے
پاس گھر پہنچ گیا تھا۔ اسے نیکی جین کے راستے میں ہی کہیں
گھرا گیا تھا۔ ہوش آنے کے بعد وہ پہلے اپنے گھر گیا بیوی
بچوں کو تسلی دینے پھر اس نے اخبار کے دفتر میں فون کیا مگر
وہاں سے جواب ملا کہ آزاد صاحب تو چلے گئے۔ اس نے گھر
دیکھا تھا۔ وہ پولیس کے پاس جانے سے پہلے ان سے بات کرنا
چاہتا تھا۔"

"تفصیلات آدمی ہے۔ آزاد صاحب نے کیا مشورہ مرحمت
فرمایا گویا۔"

"انہوں نے کہا کہ تم نام کسی کامت لو۔ اسٹوری کوئی
مت بناؤ اور میں یہ رپورٹ لکھوا دو کہ میں ایک مسافر نے کر
جاری تھا اخبار کے دفتر۔ راستے میں کچھ لوگوں نے نیکی جین
کو ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مسافر کو اغوا کرنا
چاہتے تھے۔ مجھے انہوں نے راستے میں پھینک دیا۔ نیکی
ذرا نیور اس مسافر کا اور دونوں اغوا کرنے والوں کا طیلہ
تفصیل سے بتائے۔ نیکی والا ذرا ہاتھاکہ تھا جس نے جانے
اس کے ساتھ کیسا سلوک ہو۔ پولیس اسے پکڑنے کے تم بھی
اغوا کرنے والوں کے ساتھی ہو۔ یہاں رپورٹ کر کے اپنی
بے گناہی کا ثبوت بتانے آئے ہو۔ مگر آزاد صاحب نے کہا کہ
تم جاؤ میں فون کر دیتا ہوں تھا۔"

"طاہر ہے اس کے بعد پولیس نے اپنی مستعدی کا
مظاہرہ کیا ہوگا۔ مجبوراً نیکی پکڑ کے وہاں گئے جہاں اسے
پھینکا گیا تھا۔ انہوں نے دوسرے تھانوں کو اور ہر موبائل
دین کو وائرلیس پر سکتل دیا۔ چنانچہ صبح گیارہ بجے نیکی مرنگ
چوٹی کے پاس لاوارث کھڑی ہوئی مل گئی۔"

"آزاد صاحب نے تمہیں ملازمت سے آزاد کیا یا
نہیں؟"

"وہ پوچھ رہے تھے کہ عزیزہ تمہاری غیر نصابی
سرگرمیاں اگر فراغت منہجی کا باور گراں اٹھانے کی سہولت
عطا نہیں کرتیں گویا تمہاری طرف سے تمہیں اجازت ہے
بلکہ غلغلہ مشورہ ہے کہ یہ کام چھوڑو۔ اور ہمیں اجازت
دے کے ممنون فرماؤ گویا کہ ہم تمہارا کام کسی اور کے سپرد
کریں۔"

"بہت معقول بات ہے گویا۔"

"ان کے لیے میری مسلسل غیر حاضری میں کام چلانا
یقیناً مسئلہ بن گیا ہوگا۔ میں نے کہا دیا کہ میں صحافت نہیں
نہیں چھوڑ سکتی۔ کیونکہ یہ تو اپنا مزاج تھا اور صحت چھوڑنا ہے۔
اور اخبار کو بھی نہیں چھوڑوں گی۔ لیکن ملازمت چھوڑوں
تو بہتر ہے۔ آپ میری جگہ کسی اور کو رکھ لیں۔ میں فری
لائس کام کروں گی۔ جو کچھ بھی کروں گی، آپ کے لیے کروں
گی۔ تنخواہ یا معاوضے کا مسئلہ نہ پہلے تھا نہ آئندہ ہوگا۔"

"یہ بھی بہت معقول بات ہے گویا۔ انہوں نے بھی سکھ
کا سانس لیا ہوگا۔"

"ہاں۔ مگر کہنے لگے کہ اس کا مطلب یہ مت لینا کہ ہم
نے تمہیں این او سی جاری کر دیا ہے بے مہار ہونے کا۔ میں
نے بتایا کہ ایک دھماکا کرنے والی اسٹوری پر کام کر رہی
ہوں۔ ساری تفصیلات اور ثبوت حاصل کرنے میں کچھ وقت
لگے گا۔ انہوں نے کہا کہ وہ تو ہمیں معلوم ہے مگر ایک تو تم اپنا
خیال رکھنا۔ دوسرے ہمارا۔ اپنی راتوں کی خیر تو خود ہم نے
حرام کر رکھی ہے۔ دن کا جین تم پر مات کر رہا۔"

"بہت اچھا۔ ذہن پر ہے جیسے ایک بوجھ تھا جو ہٹ گیا۔
اب میں فری ہوں نیکی سوئی کے ساتھ اور کسی احساسِ مذمت
کے بغیر ایک کام کر سکتی ہوں۔"

"میں نے کہا۔" نیکی نے سورتی کا سر دیکھ لیا ہے۔"

"اور اب نیکا کیا چاہتا ہے؟" وہ بولی۔

"نیکا چاہتا ہے کہ ہم وہ سورتی کا سر ملک رب نواز کو
پیش کرنے کے لیے جائیں۔ نیکا ہمارے ساتھ ہو۔ وہ کہے کہ
ملک صاحب میری غلطی سے آپ کا بہت نقصان ہوا تھا۔
آپ اپنی چیز سنبھالیں۔ مجھے میری چیز واپس کر دیں۔"

"پھر ملک رب نواز کے کہہ دیں ان نیکی۔ تمہاری
گھر والی ایک امانت تھی۔ اسے ہم تمہارے سپرد کرتے ہیں۔
ہم سورتی کو چپک کرتے ہیں۔ تم گھر والی کو چپک کرو کہ ٹھیک
ہے اور جیون ہے۔ وہ ٹھیک ہے اور اگر کے ایک دوسرے سے
مصافحہ کریں اور بارہا نقل و حرکت گری اور سنہری زو میں
آنے والے مناظر سے بھر پور اس قلم کا آخری سین یہ ہو کہ
ملک مسکرا رہا ہے اور سورتی مسکرا رہی ہے۔ نیکا اور اس کی
گھر والی مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔
پس منظر میں گنا چل رہا ہے۔ پھر THE END لکھا ہوا
آجاتا ہے۔"

"میں نے فیس کے کہا۔" مگر جو قلم میں ہو سکتا ہے زندگی
میں نہیں ہوتا۔ ہمارا ملک رب نواز سے ملنا ضروری ہے مگر

"ہم اس سے شرفانہ طریقے پر ملاقات نہیں کر سکتے کہ میں شرفا
کی طرح گھبرا اس کے کسی پرائیویٹ آفس میں جا کے اپنا کارڈ
اس کے سیکرٹری کو دوں اور وہ مجھے ملا کے کہے کہ فرمائیے میں
آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ ہم اس سے بد معاشر کی
طرح بھی نہیں مل سکتے کیونکہ وہ بہت بڑا بد معاشر ہے۔"

"اور ہم تو بد معاشر ہی نہیں ہیں گویا۔" شبنم بولی۔

"میرا خیال ہے کہ اسے بلایا جائے کہیں ملاقات کے
لیے۔"

"یہ ضروری تو نہیں کہ وہ آئے۔" شبنم نے کہا۔

"میں نے کہا۔" یہ ضروری بنایا جاسکتا ہے۔ ضرورت ایسی
ہو کہ ملک رب نواز سر کے مل آنے پر مجبور ہو، جہاں بھی
اسے بلایا جائے۔"

"ضرورت ایجاد کی والدہ ہے۔" شبنم نے مجھ سے اتفاق
کیا۔ "ضرورت میں گدھے کو باپ بنانے کا نظریہ بھی مقبول
ہے۔ مگر ایسی ضرورت کیا ہو سکتی ہے۔"

"ایسی ضرورت یہ ہو سکتی ہے۔" میں نے ایک کونے کی
میر پر پڑے ہوئے سورتی کے سر کی طرف اشارہ کیا۔

"اس سے پہلے کہ شبنم ہاتھ ملا کے میرے خیال کی تائید
کرتی تیں مارخان نے دروازے میں نمودار ہو کے کہا۔ آپ
کے واسطے نیلی فون کال ٹرینڈ لائی، فرید عباسی صاب گفتار
فرمائی۔"

"میں نے اس کے سر پر ایک پٹی بندھی ہوئی دیکھی۔" یہ کیا
ہوا ہے؟"

"اس نے ایک آہ بھر کے سوچیں بلائیں۔" یہ اندوہناک
واقعہ ہوئی صاب۔ ام بعد میں فریاد کرتی۔ آپ انصاف
فرمائی۔"

"میں نے دوسرے کمرے میں جا کے ایک طرف رکھا ہوا
ریسیور اٹھالیا۔" نیلی نے اشارہ کیا۔

"یار بڑی مایوسی ہوئی جب تیں مارخان نے تیرے اور
شبنم کے بارے میں مجھے بتایا۔"

"نیکا بتایا اس نے؟"

"نہیں کہ تم زندہ ہوئی اور خیریت سے ہوئی۔" فرید بولا

"مجھے تو بڑی امید تھی کہ تم ایک ساتھ اللہ کو پیارے ہوئے۔
آج کچھ سوچو وغیرہ ہوگا۔"

"مدلی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے۔"

"اب مدلی کے بچے کہاں ہے آخر تو اور تیری وہ
مدیہ۔ کسی کاجھ پتا نہیں۔ اماں بھی پوچھ رہی تیں۔"

"میں ایک دو دن میں آؤں گا۔"

"نیکا کہاں ہے؟"

"وہ میرے اعصاب پر سوار ہے۔" میں نے کہا۔

"یار! اسے ہم اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتے تھے۔ اماں
اس کی باتوں سے پریشان ہو رہی تیں۔ مجبوراً اسے وہاں
چھوڑا۔"

"تو کہاں ہے اس وقت؟" میں نے کہا۔

"وہ بولا۔" اپنے آفس سے ابھی ابھی گھر پہنچا ہوں یار۔
رختی نے فون کیا تھا۔ اس کا پتا چل گیا ہے۔"

"کس کا؟"

"جو اخباری رپورٹر ہیں کے رختی کو فون کر رہا تھا۔ انٹرویو
کے لیے۔ اور اس سے شاہ عالم کا پتا پوچھ رہا تھا۔ فریڈ نے
کہا۔"

"اس نے خود ہی نام بتایا اپنا، یا رختی نے بلایا تھا
اسے؟"

"میں نے فون پر انٹرویویشن لگوا دی تھی۔ نیلی فون
والوں نے اس کی ساری گفتگو ریکارڈ کر لی۔ مگر ان کا کہنا ہے
کہ اس میں کوئی بات خلاف قانون نہیں ہے اور نہ غیر
اخلاقی۔ چنانچہ فون تو بند نہیں کیا جاسکتا۔"

"فون نمبر معلوم ہوا اس کا؟"

"ہاں۔" اس نے مجھے نمبر بتایا۔ "ڈیل ٹائن ڈیل زبرد
بسم اللہ۔"

"بسم اللہ؟"

"سات سو چھیاسی۔" وہ بولا۔ "اس قسم کے خاص نمبر
خاص لوگ لیتے ہیں۔ اثر رسوخ سے یا رشوت سے۔"

"یہ کس کا نمبر ہے؟"

"تمہارے دوست اور کرم فرما۔ مستقبل کے عوامی
رہنما۔ ملک رب نواز کا۔"

"کیا؟ وہ اخباری نمائندہ بن کے بات کر رہا تھا؟" میں
نے کہا۔

"ہاں۔ اب تو دھمکیاں دیتے لگا تھا۔ میں نے ریکارڈ کی
ہوئی گفتگو کا ٹیپ حاصل کرنے کی درخواست کی تھی مگر وہ مجھے
نہیں ملی۔ رختی مجھ سے زیادہ عقلمند ثابت ہوئی۔"

"اس میں شرمندہ ہونے کی کون سی بات ہے۔ اگر آپ
احسن ہیں۔"

"اس نے گھر کے فون پر کیسٹ ریکارڈ کر لیا۔"

"میں نے کہا۔" دہری گڈ۔ مجھے اس کی ضرورت ہوگی۔
میرا ارادہ ہے آج ہی ملک سے نکلے گا۔"

"پچھپے سے رختی کی آواز آئی۔" کیا اڑھراؤ مہر کی باتیں

کر رہے ہو۔ پہلے پوچھنا تھا کہ نہیں کے بارے میں۔" پھر شاید ریہور اس نے چھین لیا۔

میں نے کہا "سوری بار مجھے بھی یاد نہیں آیا۔" نہیں مل گیا۔

رختی نے کہا "مل گیا۔ کہاں ملا؟"

"فون پر پوری کمانی نہیں سنا سکتا۔ اسے کچھ لوگ اغوا کر کے لے گئے تھے۔ اس سے شاہ عالم کا جاب پوچھنا چاہتے تھے۔ خاصاً تھوڑا سا اس پر مگر وہ جاب کے نکل گیا۔ ابھی ابھی فرید نے اعتراف کیا ہے کہ تم اس سے زیادہ عقلمند ہو۔ یہ بات لکھو الو اس سے۔"

"کوئی فائدہ نہیں وہ لکھے ہوئے سے بھی مگر جائے گا۔" میں نے کہا "میں گواہ ہوں۔"

"چور کا گواہ ڈاکو۔ تم بھی مرد ہو۔ عورت ذات کو ناقص العقل سمجھ کے خوش فہمی میں مبتلا رہنے والے۔"

میں نے کہا "عقلمند خاتون۔ ایک مشورہ ہے آپ کے لیے بالکل مفت۔ آپ کا انتقال ضروری ہے۔"

وہ ہنسنے لگی "اگر مجھے بھی تمہاری طرح مر کے زندہ ہوتا آتا تو میں ضرور اس مشورے پر عمل کرتی۔"

"لا حول ولا قوۃ۔ مرنے تمہارے دشمن۔ میں نے کہا تھا کہ فوری طور پر تمہارا کسی دوسرے گھر میں انتقال فرمنا ضروری ہے۔ جس نے تمہارے گھر کا فون نمبر معلوم کر لیا ہے وہ گھر کا پتا بھی معلوم کر سکتا ہے بلکہ کرچکا ہوگا۔"

"میں اس کا استقبال کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"کیا تیار کی ہے تم نے؟ زیادہ سے زیادہ تھانے دار صاحب نے ایک دیوالیہ رکھا ہوا ہوگا کہ بقول شاعر تو مشق

ناز کو خون دو عالم میری گردن پر۔ پھر تھانے دار کو سات خون تو صاف ہوتے ہیں تم ساڑھے تین نہیں چار کرلو۔"

"وہ کیسے؟"

"بہنی نصف ہوئے ساڑھے تین۔ نصف بہتر کے چار۔"

"کیا فضول بولتے جا رہے ہو۔ ایک تم ہی رہ گئے ہو مجھے بدنام کرنے کے لیے۔" وہ خفا ہوئے لگی۔

"معاف کرنا زبان سے سچ چل گیا۔ میں کہہ رہا تھا کہ ایک دیوالیہ پر اتنا بھروسہ کرنا ٹھیک نہیں" میں نے کہا۔

وہ بولی "پھر کیا کروں؟ گھر کی پھت پر چاروں طرف علما رہتے تو ہیں لگوادوں؟ ہر گھنٹی پر راکٹ لا پھر نصب کرادوں اور دروازے پر ٹینک کھڑا کرادوں؟"

"فرید کو اگر پروا ہو تمہاری تو یہ سب اسے کرنا

چاہیے۔ ورنہ اتار کلی میں یہ سب چیزیں ملتی ہیں۔ تم خود جا کے لے آؤ۔"

"دیکھو مذاق چھوڑو۔ یہ فرید کا بھی خیال تھا کہ میں کچھ عرصے کے لیے اماں کے ساتھ نہیں شفٹ کر جاؤں۔"

"اس سے تو بات ہوتا ہے کہ سارے عقل مند ایک ہی طرح سوچتے ہیں۔"

رختی نے کہا "میں نے تو باہر لکھنا بھی چھوڑ کر کہا ہے۔ پہلے فرید کے آفس میں اچھا وقت گزر جاتا تھا۔ اب گھر میں قید ہو کے رہ گئی ہوں۔"

میں نے کہا "سب ٹھیک ہو جائے گا انشاء اللہ۔ تم ذرا یہ آؤ گفت و شنید اپنے ان کو دودھ وکیل صاحب کو۔"

فرید بولا "رختی نے کیا بتایا؟"

"کس بارے میں؟"

"یار ملک رب نواز کے بارے میں۔"

میں نے کہا "وہ کچھ بتانے کی یوزن میں نہیں ہے۔"

"اچھا! ہوش نہیں آیا ابھی تک مایا حالت زیادہ خراب ہے؟"

میں نے کہا "ایسی تو کوئی بات نہیں۔ وہ ایک دم فٹ فالت ہے۔ مگر وہ ملک رب نواز کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا۔"

"کیوں؟ خدا انخواستہ دماغ کا معاملہ ہے؟ کچھ یاد نہیں ہے اسے؟"

میں نے کہا "نہیں یار۔ اس کی یادداشت تو مزید بہتر ہو گئی ہے۔ اسے تیرہ بار عشق ہوا اور ہر عشق کا انجام منگنی پر ہوا۔ کل چودھریں منگیتری کا بنیں کر رہا تھا۔ مگر وہ ملک رب نواز کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا۔"

"آخر کیوں؟"

"اس لیے کہ اس کو اغوا کرانے والا کوئی اور تھا۔ اور وہ اس دنیا کا رہنے والا ہی نہیں تھا۔"

"کیا پسیلیاں بھرا رہا ہے؟"

میں نے کہا "اسے ایک منتقل نے اغوا کر لیا تھا۔"

"پرو فیضا ہاشم رضائے؟ وہ زندہ ہے۔"

میں نے کہا "ہاں" میں داودیتا ہوں کہ اتنی جلدی تو عالم بالا میں پہنچ گیا۔ اس پر فیضہ تک اچھا اب دھیان سے میری بات سن۔ تو تھی رہیں آسکتا ہے میرے پاس اکیلا۔ جیسے رات کو وہ بلا لگ گئی تھی تیرے پیچھے ایسا پھر نہیں ہوتا چاہیے۔"

وہ بولا "اس سے کوئی خرابی تو نہیں ہوئی۔"

"خرابی کیسے نہیں ہوئی۔ ساری گلی میں ہارن بجاتی پھر رہی تھی وہ۔ لوگوں کی فینڈ خراب ہوئی۔ ہمارا دماغ خراب ہوا۔ اسے ایسا چکر دے کوئی کہ وہ تیزی جاں بخشی کر دے۔"

"آخر معاملہ کیا ہے؟"

میں نے کہا "ہم کو جانا ہے ملک رب نواز سے ملنے۔ کچھ لین دین کا معاملہ ہے۔ اسے ایک مورچی کا سروتا ہے اور اس سے ایک بیوی لینی ہے۔ وہ کیسٹ بھی اپنے ساتھ لے آتا۔ جب ملاقات ہوگی تو دیگر مسائل پر بھی بات کر لیں گے اسے پرو فیضا ہاشم رضا کا سلام بھی دیتا ہے۔"

وہ بولا "تکرمیں آج نہیں آسکتا۔"

"کیوں۔ مندی لگی ہے پاؤں میں یا کسی نجوی نے کہا کہ آج گھر سے مت نکلتا۔"

"میرے ایک آفس کے ساتھی ہیں۔ ان کے والد کا انتقال ہو گیا ہے۔ جنازے میں جانا ہے مجھے۔"

میں سمجھ گیا "پوری گڈ۔ تیری ازدواجی زندگی کا دوسرا دور کامیاب ہوگا۔ تجھے چکر دیا گیا ہے۔ وہ ہر جگہ ساتھ رہنے کے لیے تیار ہو جاتی مگر قبرستان تو نہیں جاسکتی میت کے ساتھ۔ اللہ مرحوم کی مغفرت کرے۔ تو آدھے گھنٹے میں آتا۔"

وہ بولا "..... جنازہ مغرب کے بعد ہے۔ مدفن سے واپس آتے آتے دس تو بج جائیں گے۔ ویسے اماں ہیں گھر پر رختی ہے۔"

فون پھر رختی نے لے لیا "تم آرہے ہو ادھر۔"

میں نے کہا "فرید تو ہو گا نہیں۔"

وہ برامان کے بولی "یعنی مجھ سے ملنے نہیں آسکتے تم؟"

رختی کو اور جھنم کو بھی ساتھ لے آتے۔

"ادکے میں کو شش فرماتا ہوں۔ رختی ابھی سو رہا ہے۔" میں نے ریہور کو رکھ دیا۔

جھنم نے کہا "بڑے افسوس کی بات ہے۔"

میں نے آہ بھری "ہاں۔ موت سے کس کو رستگاری ہے۔"

"جو بیوی سے جھوٹ بول سکے" اسے بے وقوف بنا سکے وہ کامیاب شوہر ہوتا ہے گویا۔" جھنم نے طعنے کہا۔

میں نے کہا "سچ تو یہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ سمجھ دار شوہر کبھی بیویوں کو اس کا احساس نہیں ہونے دیتے۔ بیویاں اس خیال سے خوش رہتی ہیں کہ دوسرے شوہروں جیسا چکریا اس کا شوہر نہیں ہے۔"

"معاف کرنا" یہ بھی ایسی خوش فہمی ہے جس میں مبتلا

رہتا مردوں کو اچھا لگتا ہے کہ ہم بڑے چالاک ہیں۔ انہیں کیا پتا بیویاں بے وقوف ہیں کے ہی انہیں بے وقوف بناتی ہیں۔" جھنم سب بیویوں کی ویل بن کے بولنے لگی۔

"تھیں کوئی تجربہ نہیں ان باتوں کا۔"

"اور تم نے کیا رہسرج کی ہے ازدواجی نفسیات پر۔ آدی جیسا خود ہو اسے دنیا ویسی ہی نظر آنے لگتی ہے۔" وہ جھلا کے بولی۔

"میں نہایت فراخ دلی اور حقیقت پسندی کے ساتھ اعتراف کر رہا تھا کہ سب شوہر جھوٹ بولتے ہیں۔"

"میں نے کبھی گھروالی سے جھوٹ نہیں بولا۔" فیکے نے اچانک کہا۔

میں نے کہا "مگر ہم سے تو بول رہے ہو اس وقت۔ خیر چھوڑو یہ بتاؤ کہ ملک عام طور پر کب ملتا ہے؟ گھر پر کس وقت ہوتا ہے؟"

"رات کے ٹائم دس بجے کے بعد مل جاتا ہے۔ دن میں بھی ہوتا ہے۔ دو بجے تک لوگ آتے ہیں ملنے کے لیے۔"

میں نے کہا "اسلئے رکھتا ہے اپنے پاس؟"

"ہاں۔ ڈب میں ہوتا ہے ریو اور۔"

"اور اندر حفاظتی انتظامات کیسے ہیں؟ کتنے گارڈ ہیں۔ کوئی ایسا سسٹم ہے کہ خطرے کی صورت میں الارم بجنا شروع ہو جائے یا سارے باہر نکلنے کے راستے خود بخود لاک ہو جائیں؟"

"نہیں۔ ایسا تو کچھ نہیں۔ مگر ایک گارڈ دروازے پر ہے۔ دو سرا وہیں موجود رہتا ہے۔ ملک کے پاس۔"

"آتے جاتے لوگوں کی تلاشی لی جاتی ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "جب تک شک نہ ہو۔"

"فرض کرو کہ تم اس سے ملنا چاہو۔ اس سے کہو کہ ملک صاحب میری وجہ سے آپ کا جو نقصان ہوا تھا وہ میں پورا کر دیتا ہوں۔ آپ میری بیوی کو چھوڑ دو۔"

"آپ اس کو جانتے نہیں وہ پہلے تو یقین نہیں کرے گا۔ پوچھے گا کہ سورتی تجھے کہاں سے ملی؟ اتنے دن بعد۔ میں کچھ نمی کوں دو کیجئے گا جھوٹ ہے۔ اسے شک ہی ہوگا کہ میں نے سورتی خود ہی ادھر ادھر کر دی تھی اور اب بیوی پھنس گئی ہے میری تو میں سورتی واپس دینے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ مگر وہ کہے گا کچھ نہیں مجھ سے۔ وہ مجھے کہے گا کہ ٹھیکے چل کوئی بات نہیں۔ غلطی ہو جاتی ہے بندے سے۔ تو آگے لے جا اپنی گھروالی کو مگر ایک بار میں دباں چلا گیا تو پھر میری لاش ہی گلی کی باہر۔ کیس کاٹنے کے لیے یا دریا میں پھینکنے

کے لیے۔

"کیا قتل کرنا اتنا ہی آسان ہے جیسے؟"

"میرے جیسے غریب اور لاوارث بندے کے لیے قتل ہونا بہت آسان ہے۔ کیونکہ ملک جیسے مالک ہیں ہماری تقدیر کے ہماری جان و مال کے۔ اور ہماری ہوشیاری کی عزت کے کوئی ان کا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ قانون وہ خود بناتے ہیں خود توڑتے ہیں۔ خریدتے ہیں اور اپنی مٹھی میں رکھتے ہیں۔" میں نے کہا "اب پھر رونامت شروع کر دیتا۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔"

"آپ کا ساتھ گناہ بن گیا ہے میرا۔ نقصان اٹھا سکتا ہے ملک لیکن تنگ حزامی برداشت نہیں کر سکتا۔ میرا اصل جرم یہ بن گیا ہے کہ میں نے آپ کو سب بتا دیا۔ مجھے جان دے کے بھی منہ نہیں کھولنا چاہیے تھا۔ پھر اس نے مجھے سلت دی تھی مگر میں لوٹ کے ہی نہیں گیا۔ اسے بتا ہے کہ بھاگ کے کوئی نہیں جاسکتا۔ ایک نہ ایک دن میں پکڑا جاؤں گا۔ میرے ہاتھ آنے تک وہ میری گھر والی کو زندہ رکھیں گے۔ کس حالت میں زندہ رہے گی وہ۔ یہ میں جانتا ہوں۔" اس نے میرے منہ سے روک دیا جو بد روٹا شروع کر دیا۔

"اچھا ابھی تم مت بات کرو ملک سے۔ تم بیٹھو آرام سے۔ اب تک اسے یہ بھی پتا چل گیا ہو گا کہ میں کہاں ہوں؟"

میں نے کہا "یہ کیسے معلوم ہو سکتا ہے اسے۔"

"بڑے طریقے ہیں جی اس کے پاس۔ جرات کا پتا چل جاتا ہے اسے۔ اس کے بندے ہر جگہ موجود ہیں اور اسے منٹ منٹ کی خبر دیتے رہتے ہیں۔"

میں نے کہا "تم ایسے ہی بہت زیادہ مرعوب ہو اس سے۔ خوف کا ایک نفسیاتی دواؤں سے تم پر ہم پر بھروسہ کرو۔ ہم تمہارے ملک جیسوں سے ٹھنٹا جانتے ہیں اور وہ بھی جانتا ہے کہ ساری دنیا اس کی زر خرید اور حکومت نہیں ہے۔ ایسی بات نہیں ہے کہ اس جنگل میں وہ اکیلا آدم خور شیر ہے۔"

جب میں نے بھی اسے قتل دی "ابھی فرید آجائے" پھر ہم کوئی طریقہ آج ہی نکالتے ہیں۔

واپس آئی "چاہے تو خود ہی بتانی پڑے گی آج!"

"کیوں؟ وہ دونوں نہیں ہیں کیا؟" میں نے کہا۔

"ہیں مگر اسٹریٹنگ پر ہیں۔ ایک اس دیوار کی طرف من کیے بیٹھا ہے، دوسرا مخالف دیوار کی طرف دیکھ رہا ہے۔ میں نے بہت پوچھا کہ کیا بات ہے۔ کسی نے بھی جواب نہیں دیا۔ من سوچے ہوئے ہیں دونوں گئے۔"

میں نے کہا "پاگل ہیں دونوں۔ یہ چھوٹی آخر ساں کیوں آئی ہے۔"

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟" جبتم ہنسی۔ میں نے کہا "مگر یہ رخصتی کے پاس کام کرتی تھی۔ وہاں کام چھوڑ دیا؟"

"چھوڑا نہیں، رخصتی نے خود نکال دیا اسے۔"

"کیوں نکال دیا؟"

"جب سے تیس مارخان کے جکر میں پڑی ہے کام میں دھیان ہی نہیں ہوتا تھا اس کا۔ دن میں دس دفعہ منہ دھو کے آنکھوں میں کاہل لگاتی تھی اور آئینہ دیکھتی تھی۔ دس بار بال بٹاکے دیکھتی تھی پھر رخصتی کی لپ اسٹک اور میک اپ کا دوسرا سامان استعمال کرنے لگی۔ اس نے برداشت کیا۔ مگر اس نے دن میں دس بار فون کرنا شروع کر دیا۔ لمبی لمبی گفتگو چلنے لگی۔ وہ نہ کرے تو اس کے چاہنے والے کی کھنٹی بجنے لگتی تھی۔ فون کے بل کی بات نہیں، لائن پر وقت بڑی رہنے لگی۔ کوئی فون کرے تو لائن بڑی۔ رخصتی نے ٹوکا تو یہ باہر جانے لگی فون کرنے کے لیے۔ جب اس کی ضرورت پڑے تو چھوٹی غائب کام پڑا ہے اور چھوٹی موجود نہیں۔ رخصتی نے فون دے دیا کہ ایسے گزارا نہیں ہو گا۔ کچھ دن ٹھیک رہی پھر پتا چلا کہ اب معاملہ فون تک محدود نہیں رہا۔ ملاقاتیں ہو رہی ہیں بھری دوسریں اور آدمی رات کو۔"

"کہاں ہوئی تھیں یہ ملاقاتیں؟"

"میاں یا وہاں۔ تیس مارخان خاموشی سے پہنچ جاتے تھے یا وہ غائب ہو جاتی تھی وہاں سے۔ فرید کی ماں بڑی پریشان تھیں کیونکہ یہ بہت عرصے سے ان کے پاس تھی۔ پہلے بھی اس نے شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔"

میں نے کہا "لیکن پہلے کبھی عشق بھی تو نہیں ہوا تھا اسے۔"

جبتم نے کہا "اوہ۔ میں چائے کا پانی رکھ کے آئی تھی۔"

اس کے جانے کے چند سیکنڈ بعد فائرنگ اور گولہ باری کی آوازیں آنے لگیں اور جبتم چلائے گئی تو مجھے جائے

واردات پر پہنچنا پڑا۔ کچن کی حالت میدان جنگ جیسی ہو رہی تھی۔ فرش پر ایک چائے والی ٹینی پڑی تھی۔ ایک کپ کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے ایک طرف چائے کی بی پیلی ہوئی تھی دوسری طرف چینی۔ تیس مارخان نے جیسے دودھ سے غسل فرمایا تھا۔ جبتم کا کسی سے برا حال تھا۔

میں نے کہا "یہ کیا ہو رہا ہے یہاں؟"

"چائے۔ چائے بن رہی تھی" جبتم نے ہنستے ہنستے کہا "یہ بل کے بتا رہے تھے۔"

تیس مارخان نے فریاد شروع کی "آپ امارا دیدار کرتی صاحب۔ یہ بد بخت کا بی بی ام پر یلغار کرتی۔ ام چائے تیار فرمائی، آپ کے واسطے۔"

چھوٹی نے درمیان میں بجنا شروع کیا "ارے زمانے بھر کے جھوٹے لپاڑے، تو کہاں بنا رہا تھا چائے کتنے، جبتم بی بی جو بچے پر پانی رکھ کے کھتی تھیں اس وقت تو ادھر ہوا تھا اپنی مخصوص شکل لئے۔ جیسے مرنے کا دورہ پڑ گیا ہو۔ تجھے ذرا بھی شرم نہیں آئی کہ مالک خود کام کر رہے ہیں۔ تنخواہ کس بات کی لیتا ہے ہاں؟"

تیس مارخان اچھلا "ام ابا صاحب کا تلوار کا قسم نوش فرما کے بولتی، ادا صاحب کا دستار کا قسم نوش فرمائی، ام پہلے آئی، یہ ادھر فرش پر تشریف رکھتی مزار بکری۔"

"یا اللہ، کیسے بھولی تھیں پر تمہیں کھائے چلا جا رہا ہے حرام خور۔ ارے حرام کھا کھا کے پیٹ پھٹ جائے گا تیرا۔"

چھوٹی کانوں کو ہاتھ لگائے لگی۔

"جناب، آپ اس کا خیال نہ کارروائی ملاحظہ فرمائی۔ یہ امارا سرعزیز پر چائے دانی رسید فرمائی۔ آپ یہ گومزد بیعتی اس نے سر جھکا کے کہا۔"

چھوٹی نے چلا کے کہا "صاحب جی، اس کو تو عادت ہے کہ اس کرنے کی۔ اس سے پوچھو کہ کیا اس نے یہ چینی میرے سر پر نہیں ڈالی۔ سارے جسم پر شیرا ہو رہا ہے پسینہ۔ جیو نیواں چڑھ جائیں گی مجھ پر۔"

"ام چینی ڈالتی جیسے مزار شریف پر بھول ڈالتی۔ یہ امارا سرپاش پاش فرمانے کا ٹاکا کو شش کرتی۔ چائے والی شہید ہوئی۔ آپ یہ دوسرا عظیم گومز ملاحظہ فرمائی، اس نے دوسری بار اپنا سر تھکا کے کہا۔"

جبتمی کا اولاد۔ ام کپ ارسال کرتی لیکن صاحب اس کو چھوٹی نہیں کپ، اس کے قریب سے پرواز کرتی۔ دیوار سے تصادم ہوئی، امارا نشانہ خطا نہیں جاتی۔ ام خود خطا فرمائی۔

"اس نے تو زور دیا تھا مجھے غرق کر دیا تھا پانی میں۔ ہائے ہائے مجھے لگ جاتی ٹھنڈ، نمونیا ہو جاتا کم بخت۔ تیرا کیا جاتا، قتل مونیوں والے۔"

تیس مارخان تیسری بار اچھلا "کیسا جلاؤ عورت ہوتی ہے۔ ام ایک گلاس پانی ڈالتی، یہ دلیٹر گرم دودھ ڈال کے ام کو چھوڑا اس کی طرح ابالتی۔"

نہیں مجھے بھی آری تھی مگر میں نے انہیں ڈانٹا "نہیں کرو۔ بند کرو یہ جج جج۔ زبان چلائے چلائے تم ہاتھ بھی چلائے گے ایک دوسرے پر۔ رہیں کرو پتا چلا تو دونوں کو نکال باہر کرے گا۔ دیکھو کتنا نقصان ہوا ہے تمہاری وجہ سے۔"

"صاحب جی، میں نے کیا قصور کیا ہے؟" چھوٹی سننا لگی۔

"اصل قصور وار تم ہی ہو۔ تمہارے آنے سے سارا فساد پھیلا ہے۔ کسی فتنے سے کم نہیں ہو تم بھی۔ اس کو پاگل بنا رکھا ہے۔"

"صاحب جی، یہ تو پیدا انٹی پاگل ہے، چھوٹی نے زہر لب کہا۔"

"شٹ آپ۔ جب تک تم نہیں آئی تھیں۔ یہ ٹھیک تھا۔ میں تھیں واپس بھیج دوں گا وہیں جہاں سے تمہیں رخصت کیا گیا تھا" مجھے غصہ آنے لگا۔

جبتم نے کہا "پلو صاف کرو یہ سب اور فحتم کو اپنی لڑائی۔ چائے بنا کے لاؤ فوراً۔"

جبتم مجھے اپنے ساتھ باہر لے آئی۔ میں نے کہا "اس بہت حوا کا کچھ کرنا پڑے گا۔"

"تم نے اس کی طرف داری کی؟"

"کیا غلط کہا میں نے۔ عشق نے اس کو نکلا کر دیا۔ ورنہ یہ بھی آری تھا کام کا۔ پتا نہیں ان کا گزارا کیسے ہو گا ابھی سے یہ حال ہے۔"

"یہی ہے ان کی محبت کرنے کا انداز" جبتم ہنسی۔

"یہ بھی بیچ کہا تم نے۔ بقول شاعر شاید اسی کا نام محبت ہے شیفہ۔ محبت کا اظہار کوئی گا کے کرتا ہے، کوئی دو سکے کوئی تارے گنتا ہے تو کوئی غزل کہتا ہے۔ یہ لڑتے ہیں۔ جب شادی ہو جائے گی تو سب کی طرح یہ بھی سب بھول جائیں گے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"ایسا کیوں ہوتا ہے ناصر؟" جبتم کچھ افسردہ ہو گئی۔

میں نے کہا "یہ قانون فطرت ہے۔ جذبات کے غبارے

کی ہوا نکل جاتی ہے تو وہ عرش سے فرش پر آجاتا ہے۔
 رئیس کے پاس عباسی کو دیکھ کے میں حیران ہوا "بڑی
 خاموشی سے آئی جناب کی سواری؟"
 "اور کیا بیڑا ہے کے ساتھ آتا ہیں؟"
 شبیم نے کہا "وہ تو ایک دن آئیں گے آپ۔ عمر میں
 نہیں۔"
 فرید نے فوراً جواب دیا "ہاں۔ یہاں کوئی اور آئے گا۔
 بلکہ یہاں سے کوئی اور آئے گا۔"
 ہمارے درمیان ایک لمبی مینگ رات کے کھانے تک
 جاری رہی۔ رئیس نے ایک بار پھر ساری بات بتائی مگر اس
 میں سے ٹیکسی ڈرائیور کی داستان حیات کو خارج کر دیا۔ ہم
 نے تمام اسکانات اور خدشات پر اپنی اپنی رائے دی اور پھر
 اتفاقی رائے سے ایک لائحہ عمل مرتب کر لیا۔
 رات دس بجے شبیم نے ملک رب نواز کو فون کیا۔ اس
 کے لیے وہ فون استعمال کیا گیا جو ANSWERING مشین
 تھا۔ اس میں ساری گفتگو ایک مشین ذبانے سے ریکارڈ بھی
 ہو جاتی تھی اور کسی بھی جاسکی تھی۔
 شبیم نے ریسیور اٹھانے والے سے کہا "یہ ملک رب
 نواز صاحب کا گھر ہے۔"
 "ہاں جی۔!" جواب ملا۔
 "کیا آپ ملک رب نواز بول رہے ہو؟" شبیم نے
 پوچھا۔
 "نہیں جی، میں تو ملک صاحب کا گھر میں ہوں۔ آپ
 کون ہو جی؟"
 "اگر وہ ہیں تو میری ان سے بات کراؤ۔ کتنا کہ اخبار کے
 دفتر سے کوئی بات کرنا چاہتا ہے۔"
 کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ملک کی آواز آئی "جناب
 عالی!"
 "ملک صاحب۔ میں شبیم بول رہی ہوں۔ کون سی
 شبیم۔ وہ فلموں والی شبیم تو آگئی۔ وہ شبیم بھی نہیں جو
 پھولوں پر اترتی ہے کانٹوں پر نہیں۔"
 ملک رب نواز کی خاموشی ایک رد عمل کو ظاہر کرتی
 تھی۔ وہ شبیم جس کا تعلق خیروں کی دنیا سے تھا ایک ہی تھی
 اور شاید ملک رب نواز کو اس کے فون کا انتظار تھا مگر اسے
 ذہنی طور پر سنبھلنے میں کچھ وقت لگا۔
 "اوجی، خیر ہووے آپ کی۔ بسم اللہ!" اس نے بڑی
 گرم جوشی اور زندہ دلان کا مظاہرہ کیا۔
 "یعنی یاد آگیا آپ کہ؟"

"لو جی۔ آپ بھی کوئی بھولے والی تھے ہو خیر۔ آپ
 کے نام کے توڑ کئے ج رہے ہیں شرمیں۔"
 "صرف شرمیں۔" شبیم نے ہنس کے کہا۔
 "اوجی غلطی ہو گئی۔ ملک میں اور سارے جہان میں کتنا
 چاہیے تھا ہم کو۔ خیر حکم کرو اس وقت کیسے یاد کیا؟" ملک
 نے کہا۔
 شبیم نے کہا "آپ حاکم لوگ ہو، آپ کو حکم دے سکتا
 ہے کوئی؟"
 "آپ کے لیے کون حاکم۔ سارے محکوم ہیں خیر سے
 آپ کے۔ ہمارا مطلب ہے اخبار والوں کی ہے اصل
 حکومت۔" وہ ایک گھٹیا اور نااہل سیاست دان کی طرح بول
 رہا تھا۔
 "وہ تو بہت سی باتیں کہتی تھیں مجھے آپ سے۔"
 "پھر کسی دن غریب خانے پر قدم رنجہ فرماؤ خیر۔ ہم
 حاضر ہیں، جتنی باتیں چاہو کرلو۔"
 "ابھی مجھے دو باتیں پوچھنی ہیں۔ ایک یہ کہ کیا کل آپ
 نے مجھے کسی کام سے بلایا تھا؟"
 "ہم نے؟ نہیں جی، ہم ضرور بلائیں گے آپ کو کسی
 دن۔"
 شبیم نے کہا "کل رات کچھ لوگ آئے تھے کہنے لگے
 کہ ملک رب نواز صاحب یاد کر رہے ہیں آپ کو۔ میں ان
 کے ساتھ چلی گئی۔ شاید رے سے آگے کوئی پروفیسر باشم رضا
 رہتے ہیں، آپ جانتے ہیں انہیں؟"
 "کیا نام بتایا۔ باشم رضا؟"
 "یعنی آپ نہیں جانتے۔ خیر میں ان کی کوئی نہیں آپ
 کا انتظار کرتی رہی رات بارہ بجے تک۔ وہ مجھے بٹھا کے چلے
 گئے تھے۔"
 "عجب بات ہے۔ آپ کہتی ہو انہوں نے ہمارا نام لیا
 تھا؟ ہم بھلا ایسی غلط حرکت کر سکتے ہیں؟ بلائیں گے آپ کو
 تو خود حاضر ہو کے درخواست کریں گے خیر سے۔ یا فون پر اٹھا
 کریں گے۔"
 "ممکن ہے کسی نے آپ کا نام استعمال کیا ہو؟"
 "ممکن کیا جی، کسی نے ہمیں بدنام کرنے کی کوشش کی۔
 ہم کسی صحابی اور وہ بھی خاتون۔ اتنے رات بارہ بجے تک
 انتظار پر مجبور کر سکتے ہیں؟ آپ نے شکیں دیکھی تھیں ان
 کی؟"
 "جی بالکل دیکھی تھیں۔ دوبارہ نظر آئے تو پچپانے
 جائیں گے۔"

وہ بولا "بہت افسوس ہے جی مجھے۔ آپ کے ساتھ کسی
 نے زیادتی تو نہیں کی خیر ہے؟"
 "جی۔!"
 "ہمارا مطلب ہے بدتمیزی؟ رب نواز نے فوراً
 معذرت کی۔
 "بالکل نہیں۔ وہ بہت شرافت سے پیش آئے خیر
 چھوڑیں یہ بات۔ پتا چل جائے گا کہ یہ پروفیسر باشم رضا کون
 ہے۔ اس وقت فون کرنے کا اصل مقصد کچھ اور تھا۔ یہ
 فائق علی عرف فیکا کون ہے؟"
 ظاہر ہے دوسری طرف ملک رب نواز چونکا ہوگا
 "فیکا۔ ہے اپنا ایک تنگ حرام ملازم۔ آج کل بھاگا ہوا ہے
 ڈر سے۔"
 "کوئی غلطی کی تھی اس نے؟"
 "اوجی ایسی ویسی غلطی! اس کا جرم تو ناقابل معافی ہے
 بالکل۔ اس نے ہمارا لاکھوں کا نقصان کر دیا۔ اور ہماری
 آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کی خیر ہے۔"
 "آپ کچھ باتیں گے مجھے کہ کیا نقصان کیا تھا اس
 نے؟"
 "ہاں۔ ہم نے کوئی رپورٹ تو نہیں لکھوائی ہے اس کے
 خلاف ابھی تک۔ آپ کو بتا سکتے ہیں اس شرط پر کہ آپ خبر
 مت بتانا خیر ہے۔"
 "یہ بات آپ کے اور میرے درمیان ہے۔ کسی بھی
 تیسرے شخص کو کچھ معلوم نہیں ہوگا۔"
 "ایک بات پوچھیں ہم آپ سے۔ آپ کیوں تفتیش
 کر رہی ہو اس معاملے کی؟ کیا فیکا آپ کے پاس آیا تھا؟"
 "جی۔ وہ صرف مجھ سے ملا تھا۔ پچھتا چھٹا آیا تھا اور
 بہت ڈرا ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں پہلے آپ سے
 بات کروں۔"
 "پہلے کا کیا مطلب ہے آخر؟ بد میں وہ پولیس کا نفرنس
 کرنا چاہتا ہے ہمارے خلاف دھمکی دیتا ہے ہمیں۔"
 "نہیں ملک صاحب۔ وہ بے چارہ آپ کو کیا دھمکی دے
 گا۔ اس میں بہت نہیں ہے آپ سے فون پر بھی بات کرنے
 کی۔"
 ملک نے کہا "آخر کیا کہتا ہے وہ؟"
 "وہ کہتا ہے کہ آپ کا نقصان پورا کر دے گا" شبیم نے
 کہا۔
 "شاباش ہے بھی۔ دو ٹکے کا ملازم اور بات کرتا ہے
 ہمارا لاکھوں کا نقصان پورا کرنے کی۔"

شبیم نے کہا "آپ کی کوئی قیمتی چیز ہم ہو گئی تھی اس کے
 پاس سے؟"
 ملک نے کہا "مہم نہیں ہوئی تھی، اس ختم حرام نے
 پھینک دی تھی۔"
 "وہ اب مل گئی ہے۔"
 ملک کو شاید بھانکا "مل گئی ہے۔ کیسے۔ کہاں سے؟"
 "اب یہ مت پوچھیں ملک صاحب۔ ویسے تو آپ چیز مل
 جانے کے بعد بھی اسے پولیس کے حوالے کر سکتے ہیں اور
 پولیس سب معلوم کر سکتی ہے اس سے مگر اس کی کیا ضرورت
 ہے۔ چلیں، غلطی ہو گئی تھی اس سے۔ آپ بڑے آدمی ہیں،
 اسے معاف بھی کر سکتے ہیں۔"
 "ہاں کر سکتے ہیں۔ اور ہم معاف کر دیتے اگر وہ چیز ملے
 کر ہمارے سامنے آجائے اور تسلیم کر لیتا کہ چیز نہ ہم ہوئی تھی
 اور نہ اس نے غلطی سے پھینکی تھی۔ اصل بات یہ بھی کہ
 نیت خراب ہو گئی تھی اس کی۔ اس نے سوچا تھا کہ ملک رب
 نواز کو بے وقوف بنا کے چیز غائب کی جاسکتی ہے۔"
 شبیم نے کہا "اگر ایسا ہوتا تو وہ خود ہی اسے واپس نہ
 کرتا۔"
 ملک نے ایک دن والا قہقہہ لگایا "اوجی بی۔ ہم ان کہیں
 کہیں کی فحش کو سمجھتے ہیں۔ ان سے نمٹنا جانتے ہیں۔
 اس کا تو باپ بھی قبر سے نکل کے وہ چیز ہمیں لوٹانے کے لیے
 آتا۔ ہاتھ جوڑ کے اور سر کے بل آتا۔"
 "اس لیے کہ آپ نے بھی اس کی کوئی چیز ضبط کر لی
 ہے۔ مگر وہ چیز نہیں ملک صاحب، یوپی ہے اس کی۔"
 "ہاں۔ یوپی نہ ہوتی تو ہم نے اٹھایا تھا اس کی ہن کو خیر
 سے۔ پولیس بھی ایسا ہی کرتی ہے۔ ماں بہن کے ساتھ
 حوالات میں۔ تفتیش ہوتی ہے تو خود حاضر ہو جاتا ہے ضرور
 مجرم۔"
 "آپ بھی ویسی ہی تفتیش کر رہے ہو خیر ہے؟"
 "میں شبیم! آپ خیال کرو کچھ ہمارا۔ ہم عزت دار
 لوگ ہیں۔ عوام کے خادم ہیں۔ ان کے دوت سے اسٹیبل میں
 آتے ہیں۔ پرانی ہو بیٹیوں کی عزت کو سمجھتے ہیں۔ اس کی
 یوپی بڑے آرام سے ہے۔"
 "اسی دنیا میں؟"
 "کیا مطلب ہے آخر آپ کا؟" ملک رب نواز گرم
 ہو گیا۔
 "دراصل فیکے نے اس خدشے کا اظہار کیا تھا۔ کہ
 کہیں۔"

ملک گر جا "بکواس کرتا ہے وہ۔ بھوکتا ہے کتا۔ وہ ہے کماں آخر؟"

خشم نے گالی کو نظر انداز کر دیا "اسی شر میں کہیں ہے۔"

"آپ کب تک چھپاؤگی اسے خیر۔ ہم نے تو گھیرا ڈال لینا ہے پورے شہر کا۔ جنگل کا گھیرا ڈالتے ہیں ہم تو سانپ چھو بھی نکل آتے ہیں مل سے۔ بھجڑیئے پکڑے جاتے ہیں چوہوں کی طرح۔ اس سے کوک۔"

"ملک صاحب۔ وہ صرف ایک بار آیا تھا میرے پاس۔ اور اس وقت میں نے نیکی کا چھچکا کر کے اس کا ٹھکانا نہیں دیکھا تھا۔ دوسری بار اس نے فون کیا اخبار کے دفتر میں۔ میں کیوں چھپاؤں گی اسے۔ یہ بتائیں آپ اپنی چیز لے کر اس کی یوٹی کو رہا کرنے کے لیے تیار ہیں یا نہیں؟"

"اگر ہم کہیں کہ نہیں۔ پھر۔"

"پھر کیا۔ میں آپ کا جواب اسے بتا دوں گی۔ پھر فون آیا تو۔ ویسے یہ چیز ہے کیا جس کے لیے آپ نے ایک شخص کی بیوی کو قید کر رکھا ہے۔ ایک عورت کو اٹھانا اور جس سے بے جا پس رکھنا۔"

ملک نے اس کی بات کاٹ دی "دیکھو بی بی۔ ہمارے ساتھ ایسی قانونی زبان مت بولو۔ آپ نیکی کو تھانے لے جا کے ہمارے خلاف پچا کٹاؤ خیر۔ اپنی گواہی بھی ڈال دو بے شک۔"

"ملک صاحب، میں چاہتی تھی کہ یہ معاملہ ختم کرادوں۔ اگر بات نہ بنی تو بکڑ جائے گی۔ نیکی جیسے معمولی حیثیت کے آدمی کو آپ پڑا سکتے ہیں۔ جیل میں ڈال سکتے ہیں کسی بھی الزام میں۔ یا مروا سکتے ہیں۔ مگر جو مرے سے نہ ڈرنا ہو اس سے آپ کو بھی ڈرنا چاہیے۔"

"ہمارا کیا بگاڑ سکتا ہے وہ؟" ملک نے پھر اسے ایک فٹش گالی دی۔

"آپ کے پاس ایک چیز دی ہے جو نیکی کے پاس بھی ہے۔ جان جس کا مول ہوتی ہے صرف دو انچ کی ایک گولی۔ ایسی گولی امریکی صدر کی جان بھی لے چکی ہے اور ہمارے ایک وزیر اعظم کو شہید ملت بنا چکی ہے۔ اس سے بچنا مشکل ہی نہیں، ناممکن ہوتا ہے ملک صاحب۔ آپ سن رہے ہیں؟"

"سن رہا ہوں بی بی، ایک چوہا جان لے سکتا ہے شیری۔ یہی سمجھا رہی ہو آپ مجھے خیر ہے۔"

"جینوئی کے لیے بھی مشہور ہے کہ وہ باجی کو گرا دیتی

ہے۔ مقابلہ جسمانی طاقت کا اکھاڑے میں ہوتا ہے ملک صاحب۔ روالہ کے لیے اس کا اور آپ کا ہاتھ ایک برابر ہیں لیکن نہ نیکی میں اتنی جرات ہے اور نہ اس نے ایسا کما ہے۔ میں تو بات کر رہی تھی مرنے مارنے والے کی۔ ابھی ایسی نوٹ نہیں آئی۔ جان سے بڑی چیز ہے آپ کے لیے عزت۔ جیسے اس کے لیے یوٹی کی عزت ہے۔"

ملک چلانے لگا "یعنی وہ۔ اغوا کر کے لے جائے گا میری بیوی کو؟"

خشم نے کہا "کسی بات کر رہے ہیں ملک صاحب۔ جو آدمی آپ سے فون پر بات نہیں کر سکتا وہ ایسا سوچ سکتا ہے؟ میرا مطلب تھا کہ مجھ سے مایوس ہو کے وہ کسی اور کے پاس جائے گا۔ آپ کے دشمن بھی ہیں۔ وہ اسے استعمال کر سکتے ہیں۔ اسے آپس کلب لے جا کے مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ بھوک ہڑتال کا ڈرانا کر سکتے ہیں۔ پھر بیان بازی اور خواہ خواہ کی الزام تراشی۔ بے شک آپ کا اثر سوخ ہے مگر ملک صاحب، جس نے سفید کپڑے پہن رکھے ہوں اسی کو ڈر ہوتا ہے کہ کچھ میں پتھر گرے گا تو چھینٹے آئیں گے۔ جو نکا ہوا سے کوئی کچھ نہیں بچ سکتا دے۔"

ملک کی خاموشی یہ ظاہر کرتی تھی کہ خشم کی دلیل نے اثر کیا ہے۔ بالآخر اس نے کہا "تم سیانی ہو بہت، اپنی عمر کے حساب سے۔"

"میریانی ہے آپ کی کہ آپ ایسا سمجھتے ہیں۔"

"چلو، تم اس کو ساتھ لے آؤ ہمارے ڈیرے پر" ملک نے کہا۔

"یہ تو مشکل ہے ملک صاحب۔ ایسا ہو سکتا تو میں آپ سے فون پر بات کیوں کرتی۔ اسے گاڑی میں بٹھائی اور پہنچ جاتی آپ کے دولت خانے پر۔"

"پھر کیا میں جاؤں چل کے اس حرام زادے کے پاس؟"

"وہ کتا ہے باہر کہیں۔"

ملک پھر پھٹ گیا "سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آخر اس کی اوقات کیا ہے۔ ہمارے برابر سمجھتا ہے وہ اپنے آپ کو؟"

"سوچ لیں اچھی طرح۔ اس کا کتا ہے کہ بیوی کا اٹھ مالک ہے۔ اب مل بھی گئی تو کس کام کی۔ تھانے سے نکلے والی گاڑی جیسے بھی نہیں ہوگی۔"

ملک کچھ مایوس ہوا "ایسا کتا ہے وہ؟"

"یہ تو قدرتی بات ہے ملک صاحب۔ وہ بھول جائے گا بیوی کو۔ دوسری شادی کرے گا کہیں جائے۔ مگر آپ کا

نفسان پکا ہو جائے گا۔ وہ آپ کی چیز پر ویسے براہم رضا کو فروخت کر دے گا۔"

"کیا؟ پروفسر کو۔ لندن جا کے؟"

خشم کا دار اٹا کاری تھا کہ ملک رب نواز کے ہوش مگر ہو گئے۔ وہ بھول گیا کہ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے پروفسر براہم رضا کے نام سے بھی واقف نہ ہونے کی بات کی تھی۔ میں نے خشم تصور میں اس کو اچھلتے اور پھر سنبھلتے دیکھا۔

"پروفسر آج کل میاں ہے خیر۔"

ملک رب نواز غرا کے بولا "یعنی تم سب جانتی ہو؟"

"خبرداروں کو دنیا کی خبر ہوتی ہے ملک صاحب۔ آپ اسے تلاش کرتے پھر رہے تھے ہوٹلوں میں۔ صبح ساڑھے سات بجے آپ لاہور ہوٹل میں تھے۔ آپ نے نیلے رنگ کا بہت معمولی شلوار قمیض پہن رکھا تھا اور سر پر ٹوپی لگا رکھی تھی۔ از ویٹ رائٹ؟"

"کون۔ کتا ہے ایسی بات۔ ہمیں نام بتاؤ اس کا" ملک بڑھا لکھا ہونے کے باوجود جاہل تھا اور خواتین سے بات کرتے ہوئے بھی اپنی عادت کے مطابق گندی گالیاں دے جاتا تھا۔ اسے شاید احساس بھی نہیں ہوتا تھا یا ہوتا تھا تو سوری کتا وہ اپنی شان کے خلاف سمجھتا تھا۔

"یہ تو کتا ہے" خشم بولی۔

"تم کیا اس کے ساتھ مل کے ہمیں بیک میل کرنا چاہتی ہو خیر ہے؟"

"مجھے نہ آپ سے دلچسپی ہے نہ نیکی سے اور نہ اس چیز سے جو جھگڑے کا سبب بنی ہوئی ہے۔"

"تمہیں ضرور معلوم ہو گا کہ وہ چیز کیا ہے؟"

"ہیں۔ وہ ایک مورتی کا سر ہے۔ اور اس مورتی کے سر کی اتنی اہمیت کیوں ہے۔ یہ مجھے پروفسر براہم رضا سے بھی معلوم ہو سکتا ہے۔ آپ کے علم میں ہوگی یہ بات کہ شر میں تاج اور تہذیب پر کوئی بین الاقوامی کانفرنس وغیرہ ہو رہی ہے۔ پروفسر براہم رضا اس میں شرکت کے لیے آیا ہے۔ اسے مدعو نہیں کیا گیا ہے۔ وہ خود اپنی دلچسپی کی وجہ سے آیا ہے۔ چوری چھپے۔ ظاہر ہے وہ کسی سے نہیں ملے گا مگر میں ایک اخباری نمائندہ کی حیثیت سے ملنا چاہوں تو وہ انکار نہیں کر سکتا۔"

"ہم بھی ملیں گے اس سے انشاء اللہ۔ ضرور ملیں گے۔"

خشم خنسی "مگر آپ نے تو کہا تھا کہ آپ اس نام کے کسی آدمی کو نہیں جانتے؟"

طاہر جاوید منگل کے طلسم ہوشربا
تلم سے ایک خوبصورت
ناول

اندھی

ایک آپ بیتی، خونچکا
اور ولولہ انگیز داستان
ایک نہ رکنے والا ایڈوچر جس
میں آپ بہتے پگلے جاتے ہیں
قیمت: ۱۵۰ روپے
جلد اول: ۱۵۰ روپے
جلد دوم: ۱۵۰ روپے

اپنے ہاگرمیاقربی بکسٹال سے طلبہ فرمائیں
براہ راست منگوانے کا پتہ:

ناشر: علی میاں پبلیکیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ اردو بازار، لاہور۔ فون: ۳۳۳۸۵۳

اشاکٹ، علی بک سٹال

نسبت روڈ چوک میوہ پیتال لاہور۔ فون: ۳۳۳۸۵۳

"یہ اب کچھ میں آ رہا ہے ہماری کہ تم نے کیوں فون کیا تھا؟"

جینم نے کہا "اچھا ہے کہ بات جلدی سمجھ گئے آپ۔"

"دیکھو۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم پروفیسر باٹم رضا کو جانتے ہیں۔ اس سے لندن میں ملاقات ہوئی تھی۔ مگر جب ہم یہاں آئے تو ہمیں عجیب بات معلوم ہوئی۔"

"آپ کو پتا چلا کہ ایک مقتول سے مل کے آئے ہیں آپ؟"

"ہاں۔ ہمیں اس نے اپنے گھر کی دیکھ بھال کے لیے پاور آف اٹارنی دے دی تھی۔ یہاں آ کے معلوم ہوا کہ اسے قتل کر دیا گیا ہے۔ یہ ابھی پچھلے مہینے کی بات ہے۔ اب ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم کیا کریں۔ سب سے اچھا ہے کہ ہم اس کاغذ کو بھاڑ کے پھینک دیں۔"

جینم نے کہا "لیکن ملک صاحب کسی شخص کی موت کے بعد پاور آف اٹارنی ویسے ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اس کی قانونی حیثیت صفر ہو جاتی ہے۔"

"یہ بھی ٹھیک کہا آپ نے۔" ملک رب نواز خروس ہو گیا تھا۔

"اور اگر وہ پاور آف اٹارنی آپ نے لندن میں ہی تھی تو ظاہر ہے کوئی شخص پروفیسر باٹم رضا کی حیثیت سے آپ کے ساتھ لندن کی کورٹ میں بھی گیا ہوگا۔ کورٹ شناخت مانگتی ہے۔ اس نے اپنے آپ کو شناخت بھی کرایا ہوگا۔ یہ قانونی معاملات ذہن میں رکھیں۔"

ملک رب نواز نے سوچے سمجھے بغیر ایک جھوٹ بولا تھا۔ پھر اسے دس جھوٹ اور بولنے پڑے۔ جلال کے ایک پھندے میں پھنس جانے کے بعد وہ الجھتا چلا گیا۔ شروع میں اسے اندازہ ہی نہیں ہوگا کہ ٹھیک کی معافی سے شروع ہونے والی بات مورٹی کے سر اور پروفیسر باٹم رضا تک پہنچ جائے گی۔ جینم نے اسے بڑی ہوشیاری سے سوالوں کے جال میں پھنسا تھا اور وہ خود اپنے جوابوں سے ہر حلقہ دوام کو مضبوط سے مضبوط تر کر رہا تھا۔ ابتدا میں شاید اسے شک نہ ہوا ہو کہ ٹیلی فون پر کی جانے والی گفتگو خود اس کے خلاف استعمال کرنے کے لیے ریکارڈ بھی کی جاسکتی ہے مگر اب وہ اس خیال سے بھی پریشان ہوگا کہ بے احتیاطی میں وہ کتنا زیادہ بھول گیا ہے۔ زبان سے نکل ہوئی بات اگر ہوا میں تحلیل ہونے کے بجائے کیسٹ کے محتاطیسی ٹیپ برقیق ہو جائے تو اسے منایا نہیں جاسکتا۔ ایک کیسٹ یا ایک قلم کا ٹیگٹیو کسی کیجھوے کی طرح ہو جاتے ہیں کہ اسے کاٹنے جاؤ اس کے منہ بجنے جاتے

ہیں۔ ایک سے دو اور دو سے چار ہو جاتے ہیں۔ ملک رب نواز نے کہا "میں جینم دیکھنے، ہم ملنے کے لیے تیار ہیں۔ اگر آپ کہتی ہیں تو۔" ٹھیک کو بھی معاف کر دیں گے، اب اور ٹھیک کی بیوی کو ہم نے اس کے بارے میں پوچھنے کے لیے بلوایا ضرور تھا۔ مگر اپنے پاس رکھا نہیں تھا۔ وہ ایسے ہی غلط فہمی میں جتا ہے کہ ہم نے اسے قید کر لیا ہے۔ ذرا اسے ڈرانے کے لیے یہ بات مشہور کی تھی۔"

"یعنی آپ کی تحویل میں نہیں ہے وہ؟" جینم نے کہا۔

"نہیں جی۔ ہم نے کیا چار ڈالنا تھا اس کا۔"

"اس وقت وہ کہاں ہے؟"

"پتا نہیں جی۔ ہوگی اپنے گھر میں، ہمیں کیا معلوم۔ اگر فون کرے فیکا تو آپ اسے بتادیں۔ ہم آجائیں گے جہاں آپ کیس کی۔ فیکا سامنے نہیں آتا چاہتا تو وہ چیز آپ کو دے سکتا ہے۔"

"میں ملک صاحب میں اس سے بات کر کے کل آپ کو بتاؤں گی۔ آپ بھی معلوم کر لیں کل تک۔"

"کیا معلوم کرنا ہے اب؟"

"میں۔ کہ کل جو مجھے اپنے ساتھ لے گئے تھے وہ کیس آپ کے اپنے بندے تو نہیں تھے؟" جینم نے کہا اور فون رکھ دیا۔

"یا ہو" میں نے ایک نعرہ لگایا "اس وقت جی چاہتا ہے منہ چوم لوں تمہارا۔"

جینم کا رنگ لال ہو گیا "ہوش میں نہیں ہو کیا؟"

"وہ۔ دراصل محاورہ ہی ایسا ہے" میں نے سر کھجایا۔

"محاورے غلط نہیں ہوتے" فرید بولا "اور ویسے بھی آدمی کو دل کی بات ماننی چاہیے۔"

میں نے کہا "اب بانی بائیں بعد میں۔ پہلے آزاد صاحب کو فون کرو۔"

"میں پھر فون کروں؟"

"اچھا میں بات کرتا ہوں" میں نے کہا اور آزاد صاحب کا نمبر لایا۔

معمول کے مطابق وہ کام کے رش میں الجھے ہوئے تھے۔ آدھی رات سے کچھ پہلے اخبار کی آخری کاپی اشاعت کے لیے بیٹھ جاتی تھی۔

ٹھنکی کائی دیر بھتی رہی پھر آزاد صاحب نے ہی ریسپوز اٹھایا "ہاں میاں شزاوے" ہم تو انتظار میں آہ سے ابھو رہے تھے۔

میں نے کہا "میں معافی چاہتا ہوں۔"

"بھئی معافی وغیرہ کی فکر میں وہ مت کرو، تفتیح اوقات گویا۔ تم نے یہ ابھی کی چوری بقلم خود تو نہیں فرمائی۔ خبر ایجاد کرنے کے لیے گویا؟"

میں نے کہا "حضرت" میں ناصر عظیم ہوں۔ میں نے کوئی ہاتھی نہیں چوری کیا۔"

"اچھا اچھا تو پھر معافی پیش کرنے کی کیا ضرورت ہے گویا۔ ہم تو ویسے بھی یہ سمجھتے ہیں کہ ایسی کوئی صلاحیت تم میں نہیں ہے۔ ہاتھی وغیرہ چوری کرنے کی۔"

میں نے کہا "مجھے کچھ عرض کرنا تھا۔"

"بھئی عرض کرتا رہے ہو تم۔"

میں نے کہا "دیکھئے" ہو سکتا ہے ابھی آپ کو ملک رب نواز فون کرے۔"

"یہ ذات شریف کون ہیں گویا؟" ان کا دھیان کام کی طرف تھا چنانچہ انہیں سوچنے کی فرصت نہیں تھی۔

میں نے انہیں یاد دلایا "وہ جینم کے بارے میں پوچھ سکتا ہے۔"

"جی وہ کیا پوچھے گا؟" نامعقول "باکار" نامتبار وغیرہ ہم پوچھیں گے مزاج اس کا۔ کیا بتایا تم نے؟ کہاں سے بازیاں کیا تھا تم نے گویا جینم کو۔"

میں نے کہا "آپ اس سے کچھ مت پوچھئے اور کچھ مت کہئے۔ وہ پوچھے گا کہ آپ کی رپورٹ جینم کہاں مل سکتی ہیں۔ کہاں ہیں اس وقت؟"

آزاد صاحب نے "بھئی یہ سوال تو گویا لا جواب ہے۔ ہم ہوئے تم ہوئے کہ میرے ہوتے اس جینم کے بارے میں عرض کر سکتے ہیں کہ ممکن جن میں اترتی ہے بھولوں پر صبح مگر وہ خاتون سرا کے بارے میں یقین سے کون کہہ سکتا ہے۔"

میں نے کہا "آپ یہ کہہ دیں کہ ابھی چند منٹ پہلے ہمارے سامنے تھی اور کام میں مصروف تھی، شام سے یہاں تھی۔"

انہوں نے ہر تشویش لیے میں کہا "یہ تم کسی جائے واردات سے اس کی غیر حاضری تو ثابت نہیں فرما رہے ہو گویا ہمارے ذریعے سے۔ ویسے جرم کی نوعیت کیا ہے۔ کسے قتل کیا ہے اس نے کیوں اور کیسے؟"

میں نے کہا "ایسی کوئی بات نہیں۔ ابھی ابھی جینم کی ملک رب نواز سے فون پر خاصی لمبی بات ہوئی تھی۔ آپ اسے یقین دلادیں کہ جینم نے تو کسی سے بھی بات نہیں کی۔ دو گھنٹے سے وہ سر جھکا کے کام میں مصروف تھی۔ اس دوران کسی نے اسے فون کیا۔ جینم نے نہیں سنا۔ اسے بے وقوف

بنایا ہو گا کسی نے۔"

"بھئی وہ کیا ہے اپنے ناصر صاحب کہ یہ بے وقوف اور عقلمند اور گدھایا الودغیرہ بنانا تو گویا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ ہاں وہ عرض کر سکتے ہیں ہم اس کی خدمت میں۔ مطلوبہ جواب۔ اور دلائل سے قائل بھی کر سکتے ہیں اسے گویا کہ جینم سے تو آج خیالوں میں بھی گفتگو نہیں کی کسی سے اور ہم تو اس کی طویل خاموشی کے اس ریکارڈ سے تشویش میں مبتلا ہو گئے ہیں گویا۔ یعنی شام سے اس نے زبان نہیں کھولی گویا۔ ایک تاریخی واقعہ ہے یہ۔"

میں نے مطمئن ہو کے ان کا شکریہ ادا کیا اور فون بند کر دیا۔

ماہی 'خوف' امید اور خوشی کے ملے جلے جذبات کا عکس اس کے چہرے پر ایسے بدل رہا تھا جیسے وی اسکرین پر منظر کے ساتھ رنگ بدل جاتے ہیں۔ جینم کی ملک رب نواز سے۔ دینے والی ساری گفتگو سن لینے کے باوجود وہ پرتشیں اور پراعتاد نہیں تھا۔

"اب کیا ہو گا جی؟" اس نے پوچھا۔

"اب ہم تمہارے ساتھ چلیں گے" میں نے گھڑی دیکھی "گھر کہاں ہے تمہارا؟"

"مجھے ڈر لگتا ہے جی۔"

میں نے کہا "دیر مت کرو" اٹھو۔ کیا اپنی بیوی سے ملنا نہیں چاہتے تم؟"

جینم نے کہا "چلو وہ گھر تمہاری راہ دیکھ رہی ہوگی۔" ریس کچھ تشویش کا شکار ہو گیا "یار" ابھی نہیں۔

میں نے کہا "ابھی اور اسی وقت۔ اس سے پہلے کہ ملک اس کی بیوی کو گھر بھیجے۔ جینم کو ہاں موجود ہونا چاہیے۔"

"جینم کہاں کیا کام ہے؟"

میں نے کہا "جینم ہی انہیں پہچانے گی۔ مجھے امید ہے کہ جو لوگ ٹھیکے کی بیوی کو اٹھا کے لے گئے تھے وہی اسے واپس پہچانے آئیں گے۔ کم سے کم بھی دو بندے ہوں گے۔"

جینم نے سر ہلایا "یہ دونوں وہی ہو سکتے ہیں۔"

ر میں نے کہا "تم انہیں دیکھ لینا دور سے ان سے الجھتا نہیں پارے۔"

"ہاں۔ اگر وہ خود الجھے" میں نے کہا۔

فرید بولا "وہ ریس کو انوار کرنے والے بھی ہو سکتے ہیں؟"

"بالکل ہو سکتے ہیں۔ ملک رب نواز کے پاس بھروسے

کے آدمی دو چار ہی ہوں گے جو ایسے سب کام کرتے ہوں گے "میں نے کہا۔

رہیں بولا "ابھی ان کی شناخت کافی ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں یا زندہ صحبت بات۔"

میں نے کہا "ان کا ملنا ضروری بھی نہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ نیکی کے بیوی کو گھر میں پھینک کے بھاگ جائیں لیکن زیادہ امکان یہ ہے کہ وہ ملک رب نوازی کے مطابق چھپ کر اس کا انتظار کریں گے۔ دیکھیں گے کہ کیا آتا ہے یا نہیں۔"

رہیں نے کہا "رابطہ رکھنا مجھے ہے یا را۔"

ریو اور صرف فرید کے پاس تھا۔ وہ نیکی کے ساتھ بیچے بیٹھ گیا۔ ذرا نیوگ سیٹ پر میرے ساتھ جھٹم رہی۔ اس کے بیک میں عام خواتین کی طرح لپ اسٹک وغیرہ بھی ہوتی تھی محروہ ایک صفائی کا بیگ تھا۔ اس میں وہ اپنے ساتھ ہمیشہ چھوٹا سا پور نیل شپ ریکارڈ رکھتی تھی۔ ایک عام کیمرا اور ایک رات کے وقت اندھیرے میں تصویریں اٹارنے والا۔ کب کماں کس چیز کی ضرورت پڑ جائے اس خیال سے یہ سب سامان بالکل تیار اور قابل استعمال حالت میں رہتا تھا۔ اس شوئزر بیک میں فالتو کیسٹ اور بیٹری سیل۔ قلم اور نوٹ بک بھی تھے اور میں نے اس میں چھوٹا سا لیڈر ریو اور بھی دیکھا تھا۔ ایک صفائی کی حیثیت سے اس کی پیشہ ورانہ زندگی میں ہر قدم پر خطہ موجود رہتا تھا۔

فرید نے راستے میں کہا "راہ میں سوچ رہا تھا۔ اس سے کیا فائدہ ہوگا آخر۔ اگر آزاد صاحب نے ملک رب نواز سے کہا کہ فون کرنے والی جھٹم نہیں تھی تو تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ مان جائے گا؟"

میں نے کہا "نہیں۔ مگر کتنی ضرور ہو جائے گا۔"

"جو باتیں جھٹم نے اسے بتائی ہیں کسی اور کو معلوم نہیں۔ مثلاً پرویسراٹم رضا کا حوالہ۔ ملک رب نواز نے جھٹم کو وہاں بلایا تھا۔ اسے زبردستی اسے ساتھ لے جانے والے ملک کے آدمی تھے۔ یہ بات ملک کے سوا اور کوئی کیسے جان سکتا ہے۔ جھٹم کے سوا کون کہہ سکتا ہے کہ اسے انوار کے کہاں لے جایا گیا تھا؟"

"ہم بھی کتنی ٹون کا شکار ہیں بہت سے معاملات میں۔" میں نے کہا "ملک کہتا ہے کہ اس نے جھٹم کو نہیں اٹھوایا تھا۔ حالانکہ اس کے سوا اور کوئی یہ حرکت کر ہی نہیں سکتا۔ اسے بھی پریشان ہونے دو کہ فون پر بات کرنے والی جھٹم نہیں تھی تو پھر کون تھی۔ اس کے سفید جھوٹ کے

مقابلے میں ایک سفید جھوٹ ہمارا۔ جیسے ہمیں یقین ہے کہ انوار ملک نے کرایا تھا ایسے ہی اسے یقین ہوگا کہ بات کرنے والی جھٹم تھی مگر اس کا انکار تو ہمارا بھی انکار۔"

فرید زیادہ قائل نہیں ہوا "یہ بات بھی میری سمجھ میں نہیں آتی کہ ملک جیسا چالاک اور ہوشیار آدمی ایسی غلطی کیسے کر سکتا ہے کہ اخبار کے دفتر کے سامنے سے ایک رپورٹر کو اٹھوالے اور پھر جس مقصد کے لیے یہ کام کیا تھا وہ بھی پورا نہ ہو۔ وہ ملے نہیں آیا۔"

"تم چل جائے گا اس کا بھی۔ ممکن ہے وہ کہیں چھپ گیا ہو۔ کسی زیادہ اہم کام میں۔"

"چلو مانا۔ مگر پھر جھٹم کو وہاں جس طرح قید کیا گیا۔ نہ کوئی ملازم نہ محافظ۔ وہ آسمانی سے نکل آئی۔"

میں نے کہا "یہ آسمان بتایا ہمارے لیے نیکی نے۔ جھٹم کو وہاں چھوڑ کر جانے والے باہر سے گھر کو تالا ڈال کر گئے تھے۔ اس گھر کا راستہ بھی بیچھے دوسرے پلاٹ پر تھا۔ کھڑکیاں دروازے جھٹم نے ضرور چیک کیے ہوں گے۔"

جھٹم نے کہا "کھڑکیوں میں گرل تھی اور دروازے مقفل تھے۔ اگر میں کھڑکی کھول کے جتنی چلائی تھی کسی کو مدد کے لیے پکارتی تو میرا خیال ہے کہ کوئی بھی نہ سنتا۔ میری آواز سڑک کے پار والے گھر کے بند دروازوں کے بیچھے تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔"

میں نے کہا "سب اپنے اپنے گھر کے دروازے بند کئے گپ شب کر رہے ہوں گے یا بیوی دیکھ رہے ہوں گے۔ ساتھ والے دونوں پلاٹ خالی تھے اور فون ون دے تھا۔ اس سے زیادہ اطمینان بخش حفاظتی انتظامات کیا ہو سکتے تھے؟"

جھٹم نے کہا "تم لوگوں کا وہاں پہنچ جانا اتفاق تھا۔"

"تم اتفاق کہتی ہو اسے۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔"

میں نے کہا "میری ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔ کتنی ذہانت اور بہت کے ساتھ میں نے ایک پرائیویٹ سراغ رساں کی طرح تمہارا پتہ چلایا۔"

وہ ہنسی "اتفاق نہیں تھا تمہارا وہ نیلی فون نمبر دیکھنا جو میں نے اپنی گاڑی کے بیچھے شیشے کی گرد پر انگلی سے لکھا تھا۔ اس کے بغیر تم کیا کرتے؟"

"ایک رومانی ڈائلاگ سوچا ہے۔ بالکل اور مکمل۔ عرض کرتا ہوں شاید پسند آئے۔ کہ وہ نمبر نہ ہوتا تب بھی میرے دل کا قلب نما اسی سمت میں میری راہنمائی کرتا تب ہر سے تمہارے دل کی دھڑکن مجھے پکار رہی تھی۔"

نیکی نے کہا "ادھر سے سیدھے ہاتھ پر جو تھی گلی ہے۔ میرا گھر سیدھے ہاتھ پر چھوٹا ہے۔"

میں نے گاڑی روک لی "پھر ہم اس سے آگے نہیں جا سکتے۔ اب تم اتر کے آگے جاؤ۔"

"نہیں جی ڈر لگتا ہے مجھے۔"

"ابے ڈر کے گھوڑے۔ یا تو گھر والی کے لیے بائبل ہو رہا تھا اور اب اپنے ہی گھر میں جاتے ہوئے مر رہا ہے۔" میں نے کہا "کیا میں جاؤں اسے کہوں کہ تمہارے شوہر نامدار گلی کے کنارے کھڑے خوف سے تھر تھرا کاپ رہے ہیں۔ تم چل کے سنبھلو۔"

فیلا اتر گیا۔ اس نے چند قدم گلی کی طرف بڑھائے اور پھر پلاٹ کے دیکھا۔ فرید نے اسے گالی دی "یہ ہمیں بھی موائے گاہ سب کو پتا چل جائے گا کہ یہ ہمارے ساتھ آیا ہے۔"

میں نے اسے اشارے سے آگے جانے کے لیے کہا۔ پھر فرید اپنا ریو اور چیک کر کے نیچے اتر اور گلی کے آغاز میں پان سکریٹ والے کی دکان پر رگ گیا۔ میں نے گاڑی کو کچھ آگے لے جانے کا ایک شوروم کے سامنے روک دیا۔ وہاں بہت سی کاریں ایک قطار میں کھڑی تھیں اور ایک چوکیدار بندوق لیے کھڑا رہا تھا۔

"ابھی شوروم بند ہے" چوکیدار نے جھٹم کو غور سے دیکھ کے کہا۔

میں نے کہا "چھپا؟ پھر ایک گاڑی لینی تھی۔"

"صح آتے۔" وہ بولا "ابھی ادھر سے جاؤ۔"

میں نے کہا "کیا صبح تک میں اسی جگہ انتظار نہیں کر سکتا؟ اب واپس کیا جانا۔"

وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے بہتر سمجھا کہ میرے منہ نہ لگے میں نے جھٹم سے کہا "تمہاری چھٹی حس کسی خطرے کی خبر دے رہی ہے یا نہیں؟"

"وہ دیکھو سامنے کباب بن رہے ہیں۔ پراٹھے تلو جارہے ہیں۔ خوشبو مجھے یہاں تک محسوس ہو رہی ہے لیکن قسمت میں دیکھ کھانا لکھا ہو تو پراٹھا کباب کیسے مل سکتا ہے۔ ادھر دیکھو لوگ چرے کھا رہے ہیں۔"

میں نے کہا "تم اطمینان سے دیکھو یہ سب آتا ہوں میں دو منٹ میں۔"

"تھینک یو۔ یہی امید تھی مجھے تم سے۔ سب آتا ہوں دو منٹ میں۔ یہی کہا ہے تم نے سب کھا سکتی ہوں میں اس وقت اتنی بھوک لگی ہے۔"

میں نے فرید کو دیکھا۔ ابھی تک وہ پان سکریٹ کے کپڑے سے کچھ لینے میں مصروف تھا۔ گلی کے موڑ پر ایک بس خالی کھڑی تھی۔ یہ کسی روٹ کی بس تھی۔ شاید اس کا مالک کہیں قریب ہی رہتا تھا۔ اس کے دروازے کھڑکیاں کھلے پڑے تھے اور اندر اندر جھٹم کے سر کے شیشے کے بیچھے غور سے دیکھا تو مجھے ڈرائیور کی سیٹ پر کوئی بیٹا ہوا دکھائی دیا۔ وہ بالکل سیدھا اور ساکت تھا۔ یہ بات مجھے عجیب لگی۔ وہ ڈرائیور یا کھیز ہوتا تو کسی کام میں مصروف نظر آتا۔ سارا دن اسی سیٹ پر گزارنے والا بس ڈرائیور تفریح کے لیے پھر وہاں آئے بھی نہیں بیٹھ سکتا۔ وہ کوئی آوارہ گرد ہوتا تو بس کی بیچلی سیٹوں پر لیٹ جاتا۔ ایسا لگتا تھا کہ بے حس و حرکت بیٹھا ہوا شخص خود کو کم دکھنا چاہتا ہے۔ اس نے کمرے رنگ کے کپڑے بھی اسی لیے پہنے تھے۔

میں اسے مسلسل نظر جمائے دیکھا تو وہ ملک میں پڑ جاتا۔ بس سے کچھ فاصلے پر ایک گاڑی تڑپتی کھڑی تھی مگر اس کے سب دروازے کھلے ہوئے تھے۔ بیچھے والی سیٹ پر کوئی بے نظری سے لیٹا ہوا تھا۔ اس کی ٹانگیں باہر تک نکلی ہوئی تھیں۔ مجھے ایسا لگا کہ وہ گاڑی میں نے پہلے بھی کہیں دیکھی ہے اور داغ پر تھوڑا سا زور دینے سے مجھے یاد آگیا کہ ایک رات اسی گاڑی نے میرا اور جھٹم کا پیچھا کیا تھا۔ اس رات میں نیکی کی پک اپ میں لیٹ کر ملک رب نوازی کو تھیں میں پہنچ گیا تھا اور جھٹم میرے بیچھے بیچھے اپنی گاڑی میں آئی تھی۔ ملک رب نواز کو اس رات میں نے کئی برس بعد دوبارہ دیکھا تھا۔ محروہ مجھے پہچان نہیں سکا تھا۔ جیسے ہی میں وہاں سے اٹھا نیکی نے شور مچایا تھا اور میں جھٹم کے ساتھ ایک کوٹھی کے باہر تھڑیوں میں چھپ گیا تھا۔ وہاں میں نے اس گاڑی کو دیکھا تھا جس میں ملک کے وفادار مجھے تلاش کرتے ہوئے آئے تھے۔

اس کے ساتھ ہی خطرے کا احساس ایک نفوس حقیقت بن گیا۔ میں شلتا ہوا واپس گیا اور میں نے گاڑی کے پاس جھک کے کہا "جھٹم کچھ دیر بعد مڑ کے دیکھنا۔ ایک شخص خالی بس کی اگلی سیٹ پر بیٹھا ہے۔ ڈرائیور کی جگہ۔ دوسرا اس گاڑی میں لیٹا ہے جو کچھ دور کھڑی ہے۔ یہ گاڑی ملک رب نوازی کی ہے۔"

"ARE YOU SURE"

میں نے کہا "لیں۔ شک کی گنجائش ایک فیصد بھی نہیں۔ تمہارے پاس وہ تھا مٹا پیارا سا جان لیوا ریو اور ہے۔ جس کی گولی تیرے گاہ سے زیادہ قائل ہے۔"

"ہاں۔ کے شوٹ کرنا ہے؟"

میں نے کہا "میں جاتا ہوں گلی میں۔ فرید بھی ادھر ہی گیا ہے۔ تم گاڑی لے کر آگے نکل جاؤ۔ پھر گھوم کے آؤ۔ رب نواز کی گاڑی سے کچھ فاصلے پر اتر کر پیدل جاؤ۔ اس طرح کہ گاڑی میں لیٹے ہوئے شخص کو پتا نہ چلے۔ گولی چلانے کی ضرورت نہیں پڑنی چاہیے۔ تم اسے وہیں جام کرو۔ شرافت سے بتادو کہ اس کی گھوڑی کے وسط میں گولی کھس جائے گی اگر اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ وہ جیسے لیٹا ہے، لیٹا رہے۔ منہ سے آواز نکلی تو دوسری طرف سے کیا ہو گا؟"

"طاہر روح قصصِ عمری سے براؤز کر جائے گا۔"

"رائٹ۔ اور جب تم ایسا کوئی تو میں بھی پس ڈرائیور کی جگہ بیٹھنے ہوئے مجھ بندے کو یہی حکم دوں گا۔"

"اور اس کے بعد؟ اگر انہوں نے مزاحمت کی یا گولی چلائی۔ وہ اتنی آسانی سے اور خاموشی سے SURRENDER نہیں کریں گے۔ ایک آدھ بندہ مارا گیا ادھر کا یا ادھر کا تو مشکل ہو جائے گی۔"

"پس ڈرائیور کی ڈنٹے داری میں لے سکتا ہوں۔ اس کی آواز تک نہیں نکلے گی۔ مقابلے کا خیال آنے سے پہلے وہ لیٹ جائے گا۔"

"میں ایسا نہیں کر سکتی۔ یہ کام مجھے نہیں آتا۔"

"اور اب تک سیکھا بھی نہیں تم نے؟" میں نے اسے ڈانٹا "کب سیکھو گی آخر؟ فضول باتوں میں وقت ضائع کرتی رہتی ہو۔"

"اگر اس نے مجھے عورت سمجھ کے بہادری اور پھرتی دکھائی تو میرے پاس گولی چلانے کے سوا چارہ نہیں رہے گا۔ اور گولی چلائی تو ہم بھنس جائیں گے خود بھی۔ شوروم کے چوکیدار نے دیکھا ہے ہمیں۔ کیا پتا گاڑی کا نمبر بھی نوٹ کر لیا ہو۔ جو لوگ آس پاس کھانے پینے میں مصروف ہیں۔ ان میں کوئی ہیرو بھی ہو سکتا ہے جو اپنی گاڑی میں ہمارے پیچھے لگ جائے۔ یہ رسک مت لو۔"

"اُنہی باتوں سے تم مجھے بزدل بنا رہی ہو۔"

"رہیں نے کیا کیا تھا۔ یا زندہ صحبت باقی۔ ابھی صرف دیکھو۔ یہ بھی بیس اور ہم بھی۔ پھر جلدی کیا ہے؟"

"رہیں ایک گیدڑ سے اور تم ایک لومڑی ہو۔ تمہاری صحبت میں رہ کے شیر گھاس کھانے لگے گا اور میاؤں میاؤں کرنے والی ملی سے ڈرے گا۔"

شبنم سے بات کرتے ہوئے میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ فرید کو گلی میں غائب ہوئے دس منٹ گزر گئے تھے۔ یہ پچھلے

متوسط طبقے کی عام سی آبادی تھی جہاں قدیم شر کے تہذیبی اثرات اب بھی واضح نظر آتے تھے۔ آہم تعلیم سے زیادہ۔ ٹی وی کچھ نے ماحول میں سننے پرانے کے فرق کو بڑھا دیا تھا۔ پرانے لوگ لباس، زبان، تعلقات اور معمولات میں وضع داری کے قائل تھے۔ ان کا لباس وہی تھا۔ وہ جان بٹانے کے قائل تھے چنانچہ ہاتھتے میں لسی، تیلچے یا حلو پوری اور سری پائے کے کھانے کے شوقین تھے اور رات کو بڑے بڑے پانوں میں ملائی والا گرم دودھ پڑے ڈال کے پیتے تھے۔ تنواروں اور تقریوں میں بھنگوٹے ڈالتے تھے۔ یاری میں بچے اور سلوک میں فراخ دل تھے۔ محبتوں میں اپنی سوتیلی مینوال تھے تو دوتاؤں میں بچے اور سوتیلی دار۔ نئی نسل پر گراور پہنی چھری چھاپ رکھتی تھی۔ وہ جینز اور رنگین شرٹس پہنتے تھے۔ ان کے ہیرو غمگین دو گانے گانے والے وحید مراد یا دلپ کمار نہیں، جیمز بانڈ یا شاندار بازی رکھنے والے سلمان خان تھے۔ وہ عید سے زیادہ VELENTINE ڈے کو سنسنی خیز سمجھتے تھے اور نو جوان یا مہدی حسن کو پوپ میوزک کے مقابلے میں ایسا ہی سمجھتے تھے جیسے جیٹ انجی والی اسپورٹس کار کے مقابلے میں بیل گاڑی۔ سننے پرانے کا یہ فرق ہر جگہ کی طرح یہاں بھی نظر آ رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر ایک اسٹیک بار کے سامنے کھڑی گاڑی کے بونٹ پر ایک نئی نسل کا نو جوان اپنے لمبے بالوں کی پونی باندھ رہا تھا۔ ایک باہر کھڑا رہا تھا۔ ان کے دو ساتھی گاڑی کے چاروں دروازے کھولے زبردست دھک والے اسپیکرز پر مائیکل جیکسن کا ایالیم سن رہے تھے۔ دوسری طرف پرانے لاہور کی نمائندگی کرنے والی حلوائی کی دکان کے سامنے لوگ بے تکلفی سے بیٹھوں اور چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔ کڑاہی گوشت اور بریانی اڑا رہے تھے۔ کسی کے گھاس خانی کر کے ڈکاریں مار رہے تھے اور سکھوں کے لطیفوں پر ہنستے لگ رہے تھے۔

ہر جگہ ایسا ہی ہو رہا تھا۔ فاصلے ختم ہو رہے تھے اور دنیا سمٹ کر ایک گھول VILLAGE کا تصور عملی صورت میں سامنے آ رہا تھا۔ دنیا کے ایک حصے میں رونما ہونے والا واقعہ دوسری طرف کی دنیا کے لوگ فوری طور پر ایسے دیکھتے تھے جیسے وہ خود وہاں ہوں۔ پہلی اور سیکڑو نلڈ ہر بر اعظم میں تھے۔ جینز سب پہن رہے تھے۔ موسیقی کی زبان ایک ہی تھی۔ اتنی بڑی دنیا کے بارے میں لوگ ایسے سب کچھ جانتے تھے جیسے گاؤں کے لوگ ایک دوسرے کے بارے میں جانتے ہیں۔

شبنم نے کہا "میں منٹ سے زیادہ ہو گئے۔"

میں چونکا "میرا خیال ہے کہ مجھے جاکے دیکھنا چاہیے۔" وہ گاڑی سے نکل آئی "ایسے نہیں میں بھی ساتھ چلوں گی۔"

میں نے کہا "میری فکر مت کرو۔ میرا حلیہ اب اتنا بدل گیا ہے کہ مجھے دیکھ کر کسی کا دھیان شاہ عالم کی طرف جانی نہیں سکتا۔"

"مجھے کون پچھتا ہے؟ سب شبنم کا نام جانتے ہیں" وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

گلی میں رات ڈیرا ڈال چکی تھی مگر کچھ لوگ جاگ رہے تھے۔ ایک گھر کے باہر تین عورتیں بڑی خاموشی سے تازہ ترین افواہیں ایجاد کرنے میں مصروف نظر آتی تھیں یا شاید اپنے سرالیوں اور خلاف یکب کی بذاتِ خوائیں کے بارے میں معتبر ذرائع سے ملنے والی خبروں پر تنک مرچ لگا کے ایک دوسرے کو رازداری سے سن رہی تھیں۔ انہوں نے ہمیں بنظرِ غائر ملاحظہ فرمایا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں سوال کیا کہ کون ہیں یہ۔ آخر چکر کیا ہے ان کا؟ میں نے ان میں سے ایک کو بد معاشی سے آنکھ باری مگر اس کے رونق عمل سے پہلے آنکھ ملنے لگا جیسے اس میں کچھ گر گیا ہو، وہ خاصی مایوس ہوئی۔

جو تھی گلی تک پہنچتے ہوئے ہمیں اجنبی کی حیثیت سے گھومنے والے تین بوڑھے بھی تھے جو ایک گھر کے دروازے پر بیٹھے تھے کڑکڑا رہے تھے اور شاید نئے زمانے میں قریب قیامت کی نشانیاں تلاش کر چکے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہاں بھی مکمل داری کا نظام پرانے رشتوں اور آبائی گھروں میں بڑھ کے جوان ہونے والی نسلیں کی جان بچان پر استوار ہے۔ کسی اجنبی کا داخلہ یہاں منع نہیں تھا۔ ہر گھر میں مسمان آتے ہی رہتے تھے مگر مکمل داری کی شناخت کے ٹیکے دار اپنے پرانے اور باہر کے آدمی کو جان لیتے تھے۔ جو تھی گلی میں جھانکتے ہی مجھے گڑبڑ کا احساس ہوا۔ ٹیکے نے اپنا گھر چھوڑا تھا یا تھا اور چوتھے گھر کے دروازے پر کم سے کم دس افراد کھڑے تھے۔

میں نے شبنم سے کہا "آخر معاملہ کیا ہے؟"

"مجھے ان میں فرید نظر نہیں آ رہا ہے" شبنم نے کہا۔ قریب پانچ کے میں نے ایک شخص سے پوچھا "یہاں فائق علی کس گھر میں رہتا ہے؟"

"کون فائق علی؟" وہ بولا۔

میں نے کہا "نیکا بھی کہتے ہیں لوگ اسے۔ اس نے کہا تھا کہ جو تھا گھر ہے اس کا اسی گلی میں۔"

"ایک عورت کا قتل ہو گیا ہے" اس نے بڑی دلچسپی سے بتایا "ابھی تو مڑی در پہلے۔"

اب دوسرا شخص ہماری طرف متوجہ ہو گیا "وہ یار! میں ہے ٹیکے کا گھر۔ قتل اس کی بیوی کا ہوا ہے۔"

میں چونکے بتانہ وہ سکا "قتل کس نے کیا ہے؟ ٹیکے نے؟"

دوسرے شخص نے نفی میں سر ہلایا۔ "اسے ہم نے پکڑ لیا ہے" قاتل کو پولیس آنے والی ہے۔" میں نے مکمل دروازے کے قریب جاکے اندر جھانکا۔ ایک شخص ہاتھ میں سر ہاتھ فرید کا راست روکے کھڑا تھا۔ اس کے دائیں بائیں بھی دو افراد موجود تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں رتی تھی۔

اگر میں جذبات سے مغلوب ہو کے سب کو پیچھے دھکیلا ہوا اندر گھس جاتا اور فرید سے سوال کرنا کہ آخر اس پر قتل کا حقائقہ الزام کیسے لگایا یا براہِ راست احمقوں سے پوچھتا کہ انہوں نے فرید کو قاتل کیسے فرض کر لیا تو سب سے بڑا احمق خود میں ہوتا۔ وہ مجھے بھی پکڑ لیتے کہ یہ بھی قاتل کا ساتھی ہے۔ اس پر ہم ہنسنے لگتے۔

یہ لطیفہ کچھ یوں ہے کہ کسی گیدڑ کو بدحواسی میں فرار ہوتے دیکھ کر ایک لومڑی نے پوچھا کہ برادر! کیا پریشانی ہے آخر؟ گیدڑ نے کہا کہ عزیزہ! کیا بتاؤں! سرکاری اہلکار اونٹوں کو پکڑ رہے ہیں۔ لومڑی ہنس پڑی کہ بے وقوف! اگر اونٹ پکڑے جارہے ہیں تو مجھے کیا گیدڑ نے کہا کہ بھی وہ سرکاری اہلکار ہیں! ان کا کیا بھروسہ! کہہ دیں میرے بارے میں کہ یہ بھی اونٹ کا بچہ ہے! پھر؟

فرید کو کسی نے بھی کچھ پوچھے بغیر پکڑ لیا تھا اور چونکہ وہ جائے واردات پر موجود تھا اس لیے قاتل تھا یا پھر عہدِ خود قاتلوں نے حالات کی شواہد کو فرید کے خلاف کر دیا تھا اور اسے پھنسا کے خود اس SMOKE SCREEN کی آڑ میں فرار ہو گئے تھے۔ اسوک اسکرین کو آنکھوں میں دھول جھونکنا بھی کہا جاسکتا ہے۔

ابھی تحقیق اور تفتیش کے مرحلے شروع بھی نہیں ہوئے تھے۔ فرید کو اپنی بے گناہی کا ثبوت دینے کا سوچ دینے کے لیے کوئی تیار نہ تھا۔ عوامی موقف ایک ہی تھا۔ جو کہنا ہو تھا نہ جانے کتنا "اسے قاتل سمجھنے والے فرید کو ٹیکے کا قاتل دینے کے سوا میں نہیں تھے جو بالکل جائز بات تھی۔ قتل جیسے سنگین جرم میں مجرم نظر آنے والے کی حمایت میں بولنے کا رسک کوئی نہیں لیتا۔

میں نے ختم کی طرف دیکھا تو وہ چبھے کھڑی مجموعی صورت حال کا جائزہ ایک صفائی کی نظر سے لے رہی تھی۔ وہ کوئی عام لڑکی ہوتی تو بدحواس ہو کے رونادھونا شروع کر دیتی یا خود غرضانہ بزدلی کا مظاہرہ کرتی تو مجھے بھی کھینچ کے اپنے ساتھ لے جاتی کہ اس گھٹے میں بڑکے خود کو مصیبت میں ڈالنے کی کیا ضرورت ہے۔ مگر وہ اس سے ہزار گنا خطرناک اور دشوار حالات کا سامنا کرنے کا حوصلہ رکھتی تھی۔ صرف چار سال کی صحافتی زندگی میں اس نے اپنے کارناموں سے جو شہرت حاصل کی تھی وہ بڑے پرانے جرات مند اور سچے سمجھے جانے والے صفائی دس برس میں نہیں کما سکتے تھے حالانکہ وہ ایک نازک سی لڑکی تھی جس کی ذہانت یا حوصلے کا احساس تو اسے جان لینے کے بعد ہوتا تھا۔ اس پر پہلی نظر کرنے والا

جہنم کے اداے حسن سے محصور ہوئے یا نہیں رہ سکتا تھا۔
جہنم کی طرف سے مطمئن ہونے میں نے ایک قدم
آگے بڑھایا اور قتل کے بارے میں ابتدائی معلومات فراہم
کرنے والے کو پیچھے کر دیا۔ میرے دائیں بائیں اب بھی چار
افراد بڑی مستقل مزاجی سے کدھے ملائے کھڑے تھے۔ میں
میرے پیچھے تھے اور دو میرے سامنے عین دروازے کے بیچ
میں تھے۔ انہوں نے اپنی طرف سے قاتل کے لیے فرار کے
راستے میں ایسا دیوار کھڑی کر دی تھی کہ قلبی چوبیٹن ہوتی تو
قاتل ان کی لاش پر سے ہی گزر کے باہر جا سکتا تھا۔

”آگے کوئی میلہ لگا ہوا ہے؟“

میں نے اسے کچھ دیر گھورا ”سیلہ دیکھ کے ہی آیا ہوں
میں۔ یہاں قتل ہوا ہے۔ کوئی مجرا تو نہیں ہو رہا ہے۔ کیوں
کھڑے ہیں یہاں اتنے لوگ اور ہم دونوں دروازے کے دو
پٹ بنے کیوں کھڑے ہو؟“

میرے سخت غراہٹ جیسے لہجے سے متاثر ہو کے تین چار لوگ فوراً کھٹک کھٹکے گئے ہوئے سردالے نے دوسرے ساتھی کو دیکھا اور پھر راستہ چھوڑ دیا۔ غالباً میرے لہجے سے انہیں یہ اندیشہ لاحق ہو گیا تھا کہ میں سادہ لباس میں کوئی پولیس والا ہوں۔ دائرہ می والے پولیس فورس میں نظر کیوں نہیں آتے یا اتنے کم کیوں ہوتے ہیں کہ ان کا وجود محسوس نہیں ہوتا؟ ایک بار یہ سوال میں نے ایک پرانے پاپی سے کیا تھا جس کی عمر کا زیادہ حصہ تھانے پچھری یا جیل میں بسر ہوا تھا۔

☆ 28 ☆ ساداتوں حصہ

سرمایہ دار کے سرچاٹنے کی دھمکی دینے والا اور فرد کی راہ میں دیوار بن کر کھڑے ہوئے سب لوگ پریشانی اور بدحواسی میں مبتلا نظر آنے لگے۔ اتنی بہت کسی میں نہ تھی کہ مجھ سے میری شناخت ملتا۔ عام خیال یہی ہے کہ خفیہ پولیس اور ایف آئی اے جیسے قفیشی اداروں کے لوگ کوئی دوسری نہیں بننے اور حملے سے بھی رھو کا دیتے ہیں۔

”میں نے بتانے کی کوشش کی تھی مگر تم نے ہوئے تھے
 سہی! آپ نے ہمیں پہلے ہی بتا دینا تھا۔“

پھر ملنے نے سرا پھینک کے گویا ہتھیار ڈال دیے
 ”جناب عالی۔ میں۔ میں۔ میں۔“
 ”یہ کیا میں میں لگا رکھی ہے؟“ میں نے کہا ”تم آدمی ہو یا
 بکر۔“

”میں بعد میں آیا۔ تھا۔“ سرے والا بولا ”جب یہ
 قاتل قاتل کہہ پڑے تھے مجھے کیا کیا۔ کیا۔ کیا۔“
 میں نے کہا ”اگر آپ آرام سے سب بتاؤ مجھے یہ
 کیا معاملہ ہے۔ یہ عورت کون ہے اور تم یہاں کیا کر رہے
 ہو؟“

"میں اس عورت کو نہیں جانتا۔ میں یہاں کسی سے ملنے آیا تھا۔ اس کا نام فائق علی ہے مگر فرما کہتے ہیں سب۔"

"یہ۔ یہ۔ بدمذبی۔ بیوی ہے۔ نیچے کی۔" ہکا بولا
میں رہتا ہوں۔ سا۔ سا۔ ساتھ والے گھر میں۔
کوس گولی کی آواز سن کے آیا تھا۔ اس وقت۔
یہ۔ یہ۔ ریلوے کھڑا تھا۔"

فرید نے کہا "میں نے پہلے باہر سے فیکے کو آواز دی پھر دروازہ بجا یا اور جواب کوئی نہیں ملا تو اندر گیا۔ اس وقت یہی وہ عورت یہاں پڑی تھی اسی طرح۔ میرا خیال ہے اس طرح ہونے والے دوسرے ہو چکی ہے۔"

میں نے فرید کے خیال کی تائید کی "ایسا ہی لگتا ہے۔
 س کا جسم ٹھنڈا ہو کے اکڑ چکا ہے۔"
 "پھر دو گے۔ دو گے۔ گولی۔ گولی۔ ٹمس نے چلائی۔ تمہی "ہٹکا

”جب میں اندر آیا تو کوئی شخص فرار ہو رہا تھا۔ وہ ادھر سے صحن کی طرف سے دیوار پر چڑھ چکا تھا۔ میں نے اسے روک جاؤ تو اس نے میری طرف نشانہ لے کر گولی دی۔ میں بال بال بچ گیا۔“

”وہ کون تھا“ فیکا یا کوئی اور؟“ میں نے پوچھا۔
 فرید نے نفی میں سر ہلایا ”وہ فیکا نہیں تھا۔ جب میں
 اس کے پیچھے دوڑا اور اسے پکڑنے کی کوشش کی تو اس نے
 دیو الور سے میرا نشانہ لیا عمروہ آخری چلا چکا تھا۔ میں نے
 اس کی ٹانگ پکڑ لی تھی مگر اس نے دیو الور میرے ہاتھ پر مارا
 اور ٹانگ چھڑا کے بھاگ گیا۔ میرے ہاتھ پر سخت چوٹ آئی
 تھی لیکن میں نے اس کو اچھپا نہیں چھوڑا۔ میں دیوار پر چڑھ
 کر اس کو پکڑنا چاہتا تھا مگر اس نے پھرت ر سے دیو الور مجھے
 کھینچ مارا۔ دیو الور میرے سر میں لگا۔ میں چل کر پھر صحن میں
 گر گیا۔ وہ صوبع پائے نکل گیا۔ میں سنبھل کے اٹھا اور وہ
 دیو الور بھی اٹھا لیا جو میرے پاس پڑا تھا۔ اتنی دیر میں یہ لوگ
 ختم ہو گئے۔“

ایک پراسرار اور خوفناک ناول

125

راکشس
ساحر جمیل سید

راکشس کی بھکتی ہوئی روح ایک مردہ جسم میں داخل ہوئی تو اس نے کیا عمل کھلائے۔

ایک شیطان آدمی کی کہانی جو ہر رشتے سے انکاری تھا۔ وہ ہندو بھی نہیں تھا اور خود کو مسلمان بھی نہیں سمجھتا تھا۔ ایک ایسے کیدہ حُصن کی کسنی خیزی جو صرف ایک پاگل عورت کا احترام کرتا تھا۔

ڈاک خرچ 30 روپے

رقم پیشگی منی آرڈر اور سالانہ کرے بیرونی ایک خرچ بیڑہ اور ہوگا

میں نے سوچ کے کہا "ہوں۔ تو یہ معاملہ ہے خیر کسی نے تھانے میں اطلاع دی ہے؟"

باہر کھڑے ہوئے ایک شخص نے چلا کے کسی سے پوچھا "اوتے گون کیا تھا پولیس کو بلائے؟"

دوسرے نے اس کے قریب سے کہا "اپنے قریبی صاحب کے گھر کا فون تو خراب ہے، حسب معمول۔"

"کیا حسب معمول؟" وہ غالباً خود قریبی صاحب ہی تھے جو اس بات سے غافل نظر آتے تھے۔

"جب کسی کو ضرورت پڑتی ہے، آپ کا فون خراب ہو جاتا ہے۔" الزام عائد کرنے والے نے بے خوفی سے کہا۔

"یہ غلط ہے۔ مجھے بدنام کرتے ہیں لوگ بلاؤ۔" قریبی صاحب نے احتجاجاً ردِ اعلیٰ اختیار کرنا ہر سمجھا۔

"او بار" ویسے ہی تھانے والے فون کہہ رہے ہیں۔

ریسورٹ اٹھا کر دیتے ہیں ایک طرف۔

"اسی لیے اپنے بٹ صاحب خود گئے ہیں گاڑی لے کے۔"

باہر اب صرف تین افراد رہ گئے تھے۔ جو اندر تھے وہ بھی صورت حال کے بدل جانے سے پریشان نظر آتے تھے۔

جیسے انہوں نے قائل سمجھے ہوئے جان کی بازی لگا کے پکڑ لیا تھا، وہ خود پولیس والا تھا۔ اب ان کی حیثیت صرف ایک گواہ جیسی ہو گئی تھی اور تھانے جاکے گواہی کے پلر میں خوار ہونے سے بچنے کے لیے کسی ہمارے کی تلاش میں تھے۔

میں خود بھی پولیس کے آنے سے پہلے اکل جانا چاہتا تھا مگر ہمارا غیر ذمہ دار انداز میں جانے والے سے ایک ساتھ رخصت ہونا شکوک پیدا کر سکتا تھا۔ میں نے اپنا اعتبار قائم کر لیا تھا اور فرید کی پوزیشن بھی میری ذرا مالی مداخلت سے کلیئر ہو چکی تھی۔ اب یہ ضروری تھا کہ ہم ہوشیاری سے باری باری جائیں اور ایسے جائیں کہ دیکھنے والے دیکھتے رہ جائیں۔

میں نے کہا "اس عورت کو مارنے کے بعد یہاں لا کے ڈال دیا گیا ہے۔ کیا نام تھا تھانے میں اس کے شوہر کا؟"

"میں نہیں کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔" کہیں فائق علی کی بیوی ہے۔ میں فائق علی کو جانتا ہوں۔" فرید بولا۔

"جیسے تم نے فرار ہوئے دیکھا وہ فائق علی نہیں تھا؟"

فرید نے نفی میں سر ہلایا "اسے میں نے پہلے بھی نہیں دیکھا۔"

"کیا پچھلی طرف سے فرار ہونے کا راستہ نہیں تھا۔ گلی نہیں ہے پیچھے؟"

فرید نے کہا "دروازہ ہے مگر وہ قاتل تھا۔ اگر میں نہ آتا تو وہ اسی طرف سے نکل جاتا ہر سے آیا تھا۔"

میں نے کہا "غالباً لاش ڈالنے مگر وہ اکیلا نہیں ہو سکتا۔"

"یہ دلی چکی عورت ہے۔ زیادہ وزن نہیں ہوگا" فرید بولا۔

میں نے کہا "پھر بھی کسی نے دیکھا ہوگا۔ لاش کوئی پچھ ہاتھوں پر اٹھا کے یا کندھے پر ڈال کے نہیں لاسکتا۔ گاڑی گلی میں آ نہیں سکتی۔"

"وہ شاید چادر میں لپیٹ کر لایا تھا" فرید نے ایک بیڑ پر انگ رکھی ہوئی چادر کی طرف اشارہ کیا۔

"پھر چادر میں لپیٹا ہوا کیوں نہیں پھونکا؟ خیر پولیس کرتی رہے گی یہ نقشہ۔ تمہارا یہ جاننے والا فائق علی کون ہے؟"

"ذرا نیو رہے ملک رب نواز کا۔"

"کون ملک رب نواز؟ وہ ممبر صوبائی اسمبلی؟" میں نے کہا۔

فرید نے سر ہلایا "اس کی بیوی کو ملک نے اغوا لیا تھا لیکن وہ ملک کے خلاف رپورٹ لکھوانے سے ڈرتا تھا۔ میں بھی اسے یہی سمجھتا تھا کہ فائق علی کی کوئی مدد نہیں کرے گا۔"

ری والے نے افسوس سے سر ہلایا "آپ بھی ایسا کہتے ہوئی!"

میں نے کہا "ہم سمجھتے ہیں۔ تجربہ ہے ہمارا۔ ملک جیسے لوگوں کی طاقت کے سامنے ہمارے اختیارات کی کوئی حیثیت نہیں۔"

گلے نے بڑے دکھ سے کہا "غریب پھر کیا۔ کیا کیا کرے۔ کس کے پاس۔ پاس جانے فریاد لے۔ لے۔ لے کر۔"

"کیا فائق علی نے بلایا تھا تمہیں یہاں؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ اس نے کہا تھا کہ وہ ملنا چاہتا ہے مجھ سے۔ میرا خیال ہے کہ ملک رب نواز کے ذمے وہ خود بھی گھر سے چلا گیا۔"

"کہاں چلا گیا؟" میں نے کہا۔

فرید بولا "اس گلی کے آخر میں اس کا سرال ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں وہاں دیکھ لوں۔"

میں نے باہر دیکھا۔ خیمہ جو چند منٹ پہلے تک موجود تھی، خاموشی سے غائب ہو گئی تھی۔ فرید بڑے اطمینان سے

گیا اور جاتے ہوئے رپوالتور مجھے دے گیا۔ میں نے اسے ایک روٹی اخبار میں لپیٹ کر لاش کے قریب رکھ دیا۔

گلے نے کہا "سچی۔ میں۔ جا۔ جاؤں؟ ماں میرا انتظار کر رہی ہوگی۔"

میں نے کہا "اسے انتظار کرنے دو۔ تمہاری گواہی ضروری ہے۔"

"میں نے تو کچھ نہیں دیکھا جی" اس شخص نے پریشانی سے کہا جو اپنے ہاتھ میں سر ہلے کھڑا تھا۔

"تم مجھے کچھ نہیں دیکھا ہوگا؟" میں نے کہا۔

"اوتی" میں کیسے چشم دید گواہ ہو گیا جناب عالی! میں نے تو نہیں دیکھا اس بندے کو فرار ہوتے۔"

"مگر فائق کی آواز پر تم ہی سب سے پہلے پہنچے تھے۔ تم ساتھ والے گھر میں رہتے ہو نا؟ وہ شخص تمہاری چھت پر چڑھ کے فرار ہوا ہو گا یا تمہارے گھر کی چھت کے ساتھ جو چھت ملتی ہے۔ میں پچھلی طرف سے گلی کا جائزہ لینا چاہتا ہوں لیکن یہاں تو دروازے میں آلا جا ہوا ہے۔"

"آپ آگے سے دیکھ سکتے ہوئی" کسی نے گلی میں سے کہا۔

میں نے کہا "اچھا۔ دیکھو جو لوگ یہاں کھڑے ہیں۔ اپنی جگہ سے نہ ہلے کوئی۔ لاش کے پاس کوئی نہ جائے۔ جو اندر ہیں وہ کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائیں پولیس کے آنے تک۔"

میں نے ایک شخص کو اپنے ساتھ لیا "تم پچھلی گلی کا راستہ بتاؤ۔"

وہ میرے آگے آگے چلنے لگا۔ میں نے اس سے پوچھا "یہ نیکا کیسا بندہ ہے۔ کب سے رہتا ہے یہاں؟"

"دو سال سے دیکھ رہا ہوں جی میں۔ کرائے دار ہے۔ محلے میں کسی سے زیادہ ملنا نہیں تھا اس کا۔ کسی کو شکایت بھی نہیں تھی اس سے۔"

"اور اس کی بیوی؟"

"وہ جی۔ اس کے بارے میں مجھے۔ زیادہ نہیں پتا۔ اس کے لیے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کچھ بتانا نہیں چاہتا۔"

"چلو تمہارا بٹ ہی بتاؤ۔"

"میں کیا بتاؤں جی۔ عورتوں کی باتیں ہیں۔ میری بیوی نے بھی سنا تھا کسی سے۔ کوئی شریف عورت نہیں سمجھی۔ رب جانے سچ کیا ہے۔ عورت کو تو خراب کرتا ہے مرد۔ ادھر سے راستہ ہے جناب عالی۔"

میں نے کہا "تم یہاں ٹھہرو۔ اب اس طرف سے گلی میں

کسی کو مت جانے دو۔ یہ حکم ہے میرا۔"

"جی جناب عالی!" وہ سمجھے بغیر بولا۔

میں گلی میں اگلے ہاتھ گھوم کے پیچھے والی نسبتاً تنگ گلی میں داخل ہوا اور سیدھا چلنا گیا۔ شامت اعمال یا حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کے باعث ہم ایک نظر نہ آنے والے جال میں گرفتار ہو گئے تھے۔ غالب کی زبان میں دام ہم رنگ زمین کا احساس ہمیں اس میں پنشن جانے کے بعد ہوا تھا۔

یہ ایک اچھا سبق تھا کہ سوچ سمجھ کے منصوبہ بندی کئے بغیر اور مخالف امکانات کو ذہن میں رکھتے بغیر کوئی قدم اٹھانا کس حد تک خطرناک صورت حال کو جنم دے سکتا ہے۔ خصوصاً دشمنی کے اس کھیل میں جہاں حرف ملک رب نواز جیسا عیار اور بے تمیز شخص ہو۔ ویسے بھی عقلمندوں نے کہا ہے کہ دشمن کو کبھی بے وقوف یا کمزور نہیں سمجھنا چاہیے۔

پیچھے والی گلی کے آخر میں وہی نسبتاً کشادہ گلی تھی جس کے بعد سڑک تھی۔ پہلے نیکا پھر اس کے پیچھے فرید اور میں منٹ بعد فرید کے پیچھے ہم ایک ہی راستے پر چل کے اس گھر تک گئے تھے جہاں اپنے تازہ گناہ کی سزا پانے والی ایک مظلوم عورت کی لاش پڑی تھی۔ اسے شکار گئے لیے چارے کے طور پر آستہاں کیا گیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ شکار جال میں گرفتار ہونے کے نکل گیا مگر شکاری کو یقیناً اپنے مقصد میں توقع سے بچ کر کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ ملک رب نواز کو یقین ہو گا کہ نیکا اپنی بیوی سے ملے ضرور جائے گا مگر اسے یہ امید نہیں ہوگی کہ اس کے پیچھے پیچھے کچھ لوگ اور بھی آ رہے ہیں۔

ابھی تک ملک رب نواز سے میرا تعارف کسی پرانے حوالے سے نہیں ہوا تھا۔ وہ مجھے بھی پہچان جاتا اور شاید مجھ سے نہیں کے بارے میں بھی پوچھتا۔ یہ پوچھنا کہ میرے اب بھی نیلم سے مراسم ہیں یا نہیں؟ آٹھ نو سال پہلے کی باتیں وہ بھول نہیں سکتا تھا۔ اس کا اور میرا صرف ایک بار چند لمحوں کے لیے آسانا سامنا ہوا تھا پھر میں فرار ہو گیا تھا لیکن میری صورت کے علاوہ میرا حلیہ اتنا بدلا ہوا تھا کہ ملک رب نواز کا ذہن ناصر عظیم کی طرف جاسی نہیں سکتا تھا۔ فرید عباسی کا نام بھی اس کے لیے آج بھی ہو گا مگر خیمہ کا نام وہ نلی فون پر ہونے والی ایک گفتگو کے بعد ان افراد میں شامل کر چکا ہو گا جو آگے چل کے کسی مرحلے پر خطرناک ثابت ہو سکتے تھے۔

سمجھ میں نہ آنے والی بات صرف ایک تھی کہ ملک رب نواز کا مقصد اگر نیکو کو اپنی بیوی کے قتل کے الزام میں

پکڑا تھا تو پولیس یہاں پہلے سے موجود کیوں نہیں تھی اور اگر اس کے آدمی فیکے کو اٹھا کے لے گئے تھے تو پھر انہوں نے اس کی بیوی کی لاش لاکے یہاں ڈالنے کا تلف بھی کیوں کیا تھا؟ وہ لاش کو کیس بھی پھینک سکتے تھے۔ دیا میں یا کسی دیر نے میں۔ ملک رب نواز کے پاس لاش کو ٹھکانے لگانے والے ماہرین کی کیا کمی۔

اس کے ذاتی کردار کے بارے میں عمومی تاثر سے قطع نظر مجھے فیکے کی بیوی کے یوں مارے جانے کا افسوس تھا۔ کسی بھی عورت کے لیے عزت کی قیمت اپنی جان سے زیادہ ہوتی ہے مگر عزت کو ذاتی برائی کی طرح سمجھتی ہوتے بچا اور خرید جاسکے۔ اس کے لیے زندگی ایسے گوانے کے لیے نہیں ہوتی۔ شاید اسے پتا ہی نہیں ہوگا کہ اسے کس جرم کی سزا دی گئی۔ اس کا فیکے کے معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ فیکا ملک صاحب کے لیے کیا کرتا ہے؟ اس نے ملک صاحب کا کتنا نقصان کیا ہے؟ تنگ حرام فیکا سرکشی اور غدار کی کاہی نہیں، ملک صاحب سے محاذ آرائی کے جرم کا مرتکب ہو چکا ہے اور آج کل مغرور ہے۔ یہ سب باتیں جان لینے کے بعد بھی اسے اندازہ نہیں ہوگا کہ شوہر کے گناہ کی پاداش میں اسے اپنی جان کا نذرانہ دینا پڑے گا۔ جسم کا نذرانہ تو ملک صاحب جیسے لوگ اپنا حق سمجھ کے وصول کرنے کے عادی تھے۔ اس کے سوا کسی کمزور عورت کے پاس دینے کے لیے کیا ہوتا ہے۔ ملک صاحب اسے جب تک چاہتے اپنی حویلی میں اور اپنی خواب گاہ میں رکھتے اسے قتل کیوں کر دیا؟ وہ بلاشبہ ایک خسیں اور پرکشش جسم رکھنے والی عورت تھی۔ فیکے کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو دیوانگی کی حد تک چاہتا ہے مگر دوسری طرف محلے کے لوگ اس کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ فیکے کی بیوی شریف عورت نہیں تھی مگر اس کو خراب کرنے والا خود فیکا تھا۔

سڑک پر پہنچے کے میں نے جینم کو فرید کے ساتھ گاڑی کے قریب کھڑا دیکھا تو میں نے اپنے آپ سے کہا۔ آخر میں فیکے کے بارے میں کیوں سوچ رہا ہوں؟ میرا کیا تعلق ہے اس سے۔ کیا ضرورت ہے مجھے اس کی بیوی کے لیے جذباتی ہونے کی یا اس کے لیے کسی مشکل میں پڑنے کی۔ اسے ملک نے انھو الیا ہے تو مجھے کیا اور پولیس اسے بیوی کے قتل کے جرم میں پکڑ لیتی ہے تو مجھے فکر کیوں؟ نہ وہ میرا دوست تھا اور نہ آشنا۔ اس کے اور میرے مفادات الگ تھے۔ راستے جدا تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کچھ عرصہ پہلے وہ میرا دشمن تھا اور

ملک رب نواز کے حکم پر میری جان بھی لے سکتا تھا۔ حالات کی ایک کڑھٹ نے یا بد قسمتی نے اسے ملک کے اعتماد سے محروم کر دیا تھا اور اس کا نام جاں نثاروں سے غداروں کی فہرست میں شامل ہو گیا تھا۔ اس نے مجبوری میں صرف اپنی فرض کے لیے میرا سارا لیا تھا۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ ملک جیسے طاقتور اور ظالم شخص کے مقابلے میں اس کی حیثیت کچھ بھی نہیں۔ ملک جسے چاہے اسے کڑے کوڑے کی طرح جوتے کی اڑی سے روند سکتا ہے لیکن وہ ملک کے کسی دشمن کی پناہ میں پہنچ جائے تو اپنے تحفظ کی ضمانت کا سوا کر سکتا ہے۔ سوا کرنے کے لیے اس کے پاس اندر کی باتیں تھیں اور وہ راز تھے جس کے افشا ہونے سے ملک کو مالی نقصان اٹھانا پڑتا یا اس کے لیے قانونی مسائل کھڑے ہو جاتے۔ اس کی سادھ سادھ ہوتی یا اس کا بزنس سیٹ اپ کچھ اپ سیٹ ہو جاتا لیکن اس تنگ دشمنی کے مشترکہ مقصد کے سوا میرے اور فیکے کے درمیان تعلق کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ ہم اس دشمنی کے اسباب تک الگ رکھتے تھے۔ فیکے کی دشمنی ذاتی، بہت چلی سلیپر اور مایوسی کی انتہا کے رد عمل کا نتیجہ بھی جبکہ میری دشمنی غیر ذاتی اور ملک کے وطن دشمن، غیر اخلاقی اور غیر قانونی کاروبار کی وجہ سے تھی۔

میں گاڑی سے کچھ دور تھا جب میں نے پولیس والوں سے بھری ہوئی جب کوٹھی میں داخل ہوتا دیکھا۔ جب کے پیچھے ایک کار بھی جو بٹ صاحب کے سوا اور کس کی ہو سکتی تھی۔ پولیس کو تھا نے سے لانے کے لیے انہی کو بھیجا گیا تھا۔ جینم نے آگے آگے میرا بازو کھینچا "کیا دیکھ رہے ہو اور۔"

میں نے پلٹ کے اسے دیکھا "تم چاہتی ہو کہ ہر وقت تمی کو دیکھتا رہوں میں؟"

"یعنی میری صورت نہیں دیکھنا چاہتے اس لیے دوسری طرف دیکھ رہے ہو؟" وہ ہنسی۔

میں نے کہا "کیا ایک قتل کی رپورٹ رتھانے کی ساری نفی ایسے آتے دیکھی ہے کبھی؟ جیسے کوئی آپریشن کلین اپ شروع ہوا ہو اور سخت مقابلے کی امید ہو۔"

فرید نے کہا "خدا کا شکر ادا کرو کہ ہم بروقت نکل آئے یہ لوگ آس پاس کی ساری گلیوں کا محاصرہ کریں گے۔"

میں نے کہا "قاتل کو گرفتار کرنا اتنا ضروری اور اہم ہے گویا۔"

"شاید اوپر سے کچھ ایسا ہی اشارہ ملا ہو گا ورنہ قتل تو

ہوتے ہی رہتے ہیں۔ پولیس ایف آئی آر محض خانہ پر ہی کے لیے لکھتی ہے اور شک میں بھی کچھ لوگوں کو پکڑا جاتا ہے تو تعیش کے اغراض و مقاصد کچھ اور ہوتے ہیں۔" فرید بولا۔

"اب یہاں رکے گا کوئی فائدہ نہیں" جینم بولی۔

میں نے کہا "وہ گاڑی کہاں گئی؟"

"جو تھمارے خیال میں ملک رب نواز کی گاڑی تھی۔"

فرید نے کہا "وہ ہمارے واپس آنے سے پہلے ہی جا چکی تھی لیکن وہ جو بس میں ڈرائیور کی جگہ بیٹھا ہوا تھا وہ اپنی جگہ موجود ہے۔"

میں نے کہا "یار فرید۔ کیا یہ بات عجیب نہیں ہے۔ ایک آدمی اتنی دیر سے اندھیرے میں بے حس و حرکت بیٹھا ہوا ہے۔ کچھ بھی نہیں کر رہا ہے۔ بس میں کوئی کام نہیں کر رہا ہے۔ کسی سے باتیں نہیں کر رہا ہے۔ گانے نہیں سن رہا ہے۔ ریڈیو پر۔ سگریٹ تک نہیں پی رہا ہے۔ کیا ہمیں دیکھنا نہیں چاہیے؟"

جینم نے کہا "کیا نہیں دیکھنا چاہیے؟ یہ کہ وہ زندہ ہے یا سیٹ پر اس کی لاش رکھی ہے؟ اس وقت تھمارے دماغ میں ایسی ہی باتیں آئیں گی۔"

"اور اگر لاش رکھی ہے تو رکھی رہے۔ کوئی ضرورت نہیں ہمیں اور کسی جگہ میں پڑنے کی" جینم نے کہا "تم بیٹھو گاڑی میں۔ اس فیکے کی خاطر ہم نے بلاوجہ اپنا وقت ضائع کیا۔"

"اور بال بال بیچ گئے دو دن مشکل میں پڑ جاتے" فرید بولا۔

"تجھے تعریف کرنی چاہیے میری ذہانت اور حاضر دماغی کی" میں نے کہا۔

"ہم ایک سپانسامہ پیش کریں گے مل کے آپ کی خدمت میں مگر ابھی چلو یہاں سے۔"

میں نے کہا "یار" اب کس بات کی جلدی ہے۔ اس ڈرائیور کا ڈراپ سین تو دیکھ لیں "تھوڑی دیر ٹھہر جاؤ۔"

"جو ہو گا صبح اخبار سے معلوم ہو جائے گا۔" جینم نے کہا "ابھی معلوم ہو جاتا لیکن میں دوبارہ انہی لوگوں کے سامنے جانا نہیں چاہتی۔"

میں نے کہا "بس میں ڈرائیور کی جگہ بیٹھے ہوئے شخص کا خیال مجھے بہت پر اسرار لگتا ہے۔ دیکھو ڈیڑھ گھنٹا ہو گیا ہے تقریباً۔ یہ کتنی عجیب بات ہے۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس کو ایک خاص مقصد کے تحت بٹھایا گیا ہے یہاں۔"

"کیا ہو سکتا ہے وہ خاص مقصد آخر؟" جینم نے چڑ کے

کہا۔

"میں تو معلوم کرنا چاہتا ہوں میں۔ کیا پتا وہ ہمیں دیکھ رہا ہو۔ اپنی دانست میں وہ چھپ کر بیٹھا ہے اندھیرے میں۔ یہ سمجھ رہا ہے کہ ہماری نظریں اسے نہیں دیکھ سکیں۔" جینم نے کہا "ناصر یہ کیا بے سرو پا مفروضات قائم کر رہے ہو تم۔"

میں نے کہا "اچھا پولیس چلی جائے واپس پھر ہم بھی چلے جائیں گے۔"

فرید نے کہا "دیکھو" میں یہاں رات بھر بیٹھا نہیں رہ سکتا۔ تم دونوں تو فارغ ہو گھر کی طرف سے۔ کوئی پوچھنے والا نہیں۔"

"اچھا؟ اور تمہاری بڑی گھڑی ڈسے داریاں ہیں۔" جینم نے آستینیں چڑھا کے کہا "گھر پہنچے رو رہے ہیں۔ بیوی دروازہ کھولے بیٹھی ہے تمہارے انتظار میں۔"

فرید جینم پر ہنسا "بیوی نہ سہی ماں تو ہے۔"

میں نے کہا "ماں کا ہانہ مت کرو۔ تو جھوٹ بول کے آیا ہے۔ ناس سے" اسی سے ڈرتا ہے۔ حالانکہ ابھی شادی کی بات بھی شروع نہیں ہوئی۔"

فرید نے برہمی سے کہا "ہاں ڈرتا ہوں اس سے اور شادی کے بعد بھی ڈروں گا۔ تم کرتے رہو اپنی بکواس میں جا رہا ہوں۔ خواہ جھوٹ بول کے آیا تھا کہ دوست کے ابا کے جنازے میں جا رہا ہوں۔ میرا اپنا جنازہ نہ اٹھ جائے کسیں۔"

میں نے کہا "میرا ایک بار اٹھ چکا ہے۔ بڑی دھوم دھام سے۔ رشتی کو بھی معلوم ہے۔"

فرید چلا گیا تو میں نے گروپش کا جائزہ لیا۔ جہاں ہم نے گاڑی کھڑی کی تھی وہ ایک سونڈوں کا شوروم تھا۔ اس کا چوکیدار اب سامنے والے حصے میں چارپائی پر لمبی تانے سوراہا تھا۔ آس پاس کی زیادہ تر دکانیں پہلے ہی بند ہو چکی تھیں۔

اب کچھ فاصلے پر رابع دور ریٹورنٹ محلے ہوئے تھے یا دوسری سمت میں ایک طوائی دودھ کے کڑواؤ میں ٹھیکر چلا رہا تھا لیکن پہلے کے مقابلے میں رونق کم ہو گئی تھی۔

میں خالی گھڑی ہوئی بس میں ڈرائیور کی جگہ جھجھ بیٹھے ہوئے شخص کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا مگر نہ جانے کیوں میں اپنے ذہن سے اس کے خیال کو نکالنے سے قاصر تھا۔ بظاہر اس کا کسی بھی معاملے سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا تھا مگر اس کا یوں پتھر کے بت کی طرح بیٹھے رہنا ہی مجھے شک میں مبتلا کر رہا تھا۔

خشم کے ساتھ بیٹھ کے میں نے کہا "آخر ہم کب تک ایسے ہی بیٹھے رہیں گے یہاں؟ شک ہو جائے گا لوگوں کو۔ ویسے بھی یہ کتنی محبوب اور غیر اخلاقی بات ہے۔ انتہا ہے بے شری کی۔ شریف لوگوں میں ایسا ہوتا ہے کیسے؟" خشم کا پارا چڑھ گیا "کیا فضول ایک ایک لگا رکھی ہے۔ مجھے کیوں ستار ہے ہو یہ باتیں۔ میں لائی تھی تمہیں یہاں میں نے روک رکھا ہے تمہیں؟" میں نے کہا "یہ لوگوں کو کیا معلوم لوگ جو دیکھیں گے وہیں کہیں گے۔"

"بھاڑیں مکے لوگ۔"

میں نے معصومیت سے کہا "دیکھو نا۔ صورت سے میں ایک بڑھا لکھا شریف اور خاندانی پابند شرع اور نیک آدمی نظر آتا ہوں۔ تمہارے مقابلے میں۔"

"اور میں آوارہ بد کردار گتھی ہوں؟ جاہل اور بیخ خاندان کی نظر آتی ہوں؟" خشم نے غصے میں لال پیلا ہو کے کہا "مجھے تم ڈیل کرنے کے لیے لائے تھے یہاں؟"

میں نے بے وقوفوں کی طرح کہا "پتا نہیں۔" "کیا پتا نہیں تم آخر سمجھتے کیا ہو خود کو؟" خشم کا چہرہ احساس ذلت سے سرخ ہو گیا۔

"بیچ بتاؤں میں خود کو وہی سمجھتا ہوں جو میں ہوں اور تم جانتی ہو کہ میں اور کچھ ہو بھی نہیں سکتا۔"

"تم ایک فضول بے ہودہ اور بد فیض آدمی ہو۔" مجھے ہنسی آگئی "نہیں۔ میں صرف پرستار ہوں تمہارا۔ کیا تم اسے جھوٹ اور بکواس کہہ سکتی ہو۔ تم جانتی ہو کہ یہ سچ ہے۔"

اس نے مجھے شعلہ فشاں نظروں سے دیکھا "تم پریشان کر رہے تھے مجھے؟"

"ذرا اپنا چہرہ دیکھو آئینے میں" میں نے اس کے گالوں کو انگلی سے چھو کر دیکھا "لال رنگ میری انگلی پر لگ گیا ہے۔ تمہارا چہرہ سرخ گلاب کی طرح ہو رہا ہے بالکل۔ کاش اس وقت میرے پاس کوئی ایسا کیرا ہوتا جو تمہارے عارض کے اس سہرے گلابی ایلے رنگ کو اسی طرح تصویر میں اتار سکتا پھر اس تصویر کا عنوان ہوتا خشم اور عشق۔ نہیں۔ آدمی رات کی شفق۔ مونالیزا کی مسکراہٹ کی طرح اسے بھی حسن کا ایک لازوال شہکار تسلیم کیا جاتا۔"

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ایسے جھیل گئی جیسے مگرے بادلوں کی کسی درز سے دوسرے کے سورج کی اجلی دھوپ چھوٹی ہے۔ وہ بہر حال ایک

لڑکی تھی۔ الفاظ کا جادو اس پر کیسے کام نہ کرتا۔

"تمہاری یہ باتیں۔" وہ بولی۔ "میں نے کہا تمہیں اچھی نہیں لگیں، تم سمجھتی ہو میں جھوٹ بول رہا ہوں؟ بے وقوف بنارہا ہوں تمہیں۔" "نہیں۔ ایسی باتوں سے کچھ ہونے لگتا ہے مجھے۔ مجھے واقعی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تم بے وقوف بنارہے ہو مجھے۔ جھوٹ ایسے بول رہے ہو کہ میرے لیے یقین نہ کرنا مشکل ہو جائے۔"

"ایسا کیوں سمجھتی ہو تم آخر؟"

"اس لیے کہ۔۔۔ یہ الفاظ یہ لہجہ یہ جذبات۔ سب انہیں میں میرے لیے شاہ عالم ایسے بات کرنا چاہتا ہے بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ اس کے بس کی بات ہی نہیں تھی اور اسی لیے مجھے یہ خیال آتا ہے کہ تم بے وقوف بنارہے ہو اور میں بے وقوف بن رہی ہوں۔ جانتے ہو مجھے۔ مجھے بے وقوف بننا بھی اچھا لگنے لگتا ہے اب۔ تن اگر مجھے کوئی مٹھی طاقت ایسی حاصل ہو جائے کہ میں حقیقت جان سکوں۔ شک نہ ہونے کے باوجود کوئی ایسا طریقہ میرے ہاتھ لگ جائے کہ میں جھوٹ سچ کو پرکھ سکوں اور مجھے پتا چل جائے کہ تم شاہ عالم نہیں ہو۔"

میں نے کہا "تم یہ معلوم ہو جانے کے بعد کیا ہوگا؟" وہ سانس و کھیتی رہی "شاید کچھ نہیں۔ میں اس مٹھی طاقت کو جھٹانا پسند کروں گی۔ سچ معلوم کرنے کے طریقے کو غلط کہہ دوں گی کیونکہ اب تم جو بھی ہو میرے ہو۔ میرے لیے ہو۔ اس سے زیادہ مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔ کوئی فرق نہیں پڑتا مجھے کہ تم شاہ عالم ہو یا ناصر علی۔ مجھے تمہاری محبت حاصل ہے اتنا کافی ہے مجھے۔"

میں نے اسے رشک اور مسرت کے ساتھ دیکھا "اتنا چاہتی ہو تم مجھے؟"

"نہیں۔ تم سے کم یہ سوال مت کرو مجھ سے۔ صرف اتنا یقین دلادو مجھے کہ تم مطلب نکالنے کے لیے بے وقوف نہیں بنارہے ہو مجھے۔ جھوٹ نہیں بول رہے ہو مجھ سے کہ تم مجھی مجھے اتنا ہی چاہتے ہو۔ جتنا میں چاہتی ہوں تمہیں۔"

"تمہارے اس سوال کا جواب میں ضرور دوں گا" میں نے کہا "لیکن یہاں نہیں۔"

"یہاں کیا ہے؟" میں نے کہا "ہم بہت دیر سے موجود ہیں یہاں۔ خدا کا شکر ہے کہ ابھی تک کسی کو شک نہیں ہوا۔ کوئی پوچھنے آ جاتا کہ کون ہو تم لوگ اور یہاں کیا کر رہے ہو تو کیا جواب دیتے

ہم؟"

"پولیس والے تو صاف کہتے ہیں کہ نکاح نامہ یا جرمانہ نکالو ورنہ چلو تھانے۔" خشم بولی "مگر کوئی مجھ سے کرے ایسی بات۔"

"تم کیا کرو گی؟" میں نے گاڑی اشارت کر کے پچھنے کی۔ "میں اس سے کہوں گی کہ کبھی اپنے ماں باپ کا نکاح نامہ دیکھا ہے اور تھانے تو میں لے جاؤں انہیں پکڑ سکے۔ جینی اترا دوں ان کی۔"

میں نے کہا "تم اخبار والے بھی کم بلیک میٹر نہیں ہوتے۔ خوب فائدہ اٹھاتے ہو اپنی پوزیشن کا۔"

"تم اسے بلیک میٹنگ کیسے کہہ سکتے ہو۔ ہم اپنی عزت کی حفاظت کے لیے اپنے قانونی حق کی بات کریں تو اس میں غلط کیا ہے اور فائدہ تو دنیا اخبار ہی ہے اپنی پوزیشن کا۔" میں نے کہا "کیا خیال ہے تمہیں رگ کے کچھ کھائیں؟" "کیا ضرورت ہے۔ رات ایسے ہی گزر جائے گی۔ پیسے بیچ جائیں گے کچھ تمہارے" وہ ہنستے ہوئے۔

میں نے کہا "سوری بھی ذرا اصل پریشانی میں بھوک کا خیال ہی نہیں آتا۔"

"میرا تو دم نکلنے والا تھا بھوک سے۔"

"کمال ہے" ایسے حالات میں بھی۔ "میں نے کہا۔ وہ بولی "حالات کا بھوک سے کیا تعلق۔ خند کے لیے کہتے ہیں کہ سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ تو ایسے ہی بھوک لگتی ہے" خواہ آدمی میدان جنگ میں ہو جہاں ہر طرف گولے پھٹ رہے ہوں اور گولیاں برس رہی ہوں۔"

میں گاڑی کو سیدھا آگے لے گیا پھر محکم کے دوسری طرف سے واپس آیا اور گاڑی کو ایک ریسٹورنٹ کے باہر کھڑا کر دیا۔ اب ہم ایک ٹرک کی اوٹ میں تھے میں اپنے بیک ویو مرر میں بس کو دیکھ سکتا تھا جس میں ایک شخص پر اسرار انداز میں دوپٹے سے ایک سی پوز بنائے بیٹھا تھا۔ اس کا فلک رب نواز اور۔۔۔ فیکے کے معاملات سے کوئی تعلق ثابت نہیں ہوتا تھا مگر نہ جانے کیوں ایک تجسس کی خلش تھی جو مجھے اس پر نظر رکھنے کے لیے مجبور کر رہی تھی۔ اتنی دور سے آئینے میں صرف بس نظر آتی تھی مگر وہ دروازہ کھول کے اتر آیا بس چلا کے لے جاتا تو مجھے یقیناً پتا چل جاتا۔

"بھئی یہ کیا ہے" اب تم منہ اٹھا کے آئینے کو گھورتے رہو گے؟" خشم نے چند منٹ بعد کہا "میری طرف دیکھو۔" "میں خشم اب اس وقت تمہیں دیکھوں گا تو ادھر کیسے دیکھوں گا۔"

"پھر گاڑی کا رخ موڑ لیا ہم گاڑی سے باہر نکل کے بیٹھے ہیں ورنہ تم کھانا بھی کیسے کھاؤ گے؟"

مجھے دوسری تجویز زیادہ قابل عمل لگی۔ ریسٹورنٹ کے باہر رکھی ہوئی بہت سی میزوں کے میزوں کے علاوہ چارپائیوں پر بے فکرے لوگ آتے پاتے مارے فراغت سے بیٹھے تھے۔ انہوں نے ہمیں داہنی سی دیوڑھی کے ساتھ دیکھا اور پھر اپنی باتوں میں لگ گئے۔ میں یہاں پہلے نہیں آیا تھا مگر رش کو دیکھ کے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کڑا ہی گوشت کے شوقین لوگوں کے لیے ایک نیا پسندیدہ ٹھکانا ہے۔

دبڑا آرڈر لے کر چلا گیا تو خشم نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا "بہن! اب فرمائیے۔ میرے سوال کا جواب پہلے ٹال گئے تھے؟"

میں نے کہا "سوال کیا تھا" ہاں۔۔۔ تم نے پوچھا تھا کہ مجھے کتنی محبت ہے تم سے کب سے ہے اور کیوں ہے؟" "مذاق مت کرو۔ سچ بتاؤ تم بھی اتنی ہی چاہتے ہو مجھے جتنا میں چاہتی ہوں تمہیں؟"

میں نے کہا "میں خشم میرے پاس ابھی کوئی ترازو نہیں ہے جس میں محبت کو تولد جا سکے۔ ایسا کوئی آلہ سائنس دان ابھی تک ایجاد کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے جس نے خون کے دباؤ یا برقی رو کی طرح محبت کے جذبات کی پیمائش کی جا سکے۔ شاعری زبان میں بات کہوں تو کہہ سکتا ہوں کہ میری محبت ہمال کی بلندی اور سمندر کی گہرائی، آسمان کی وسعت اور ازل سے ابد تک چلے ہوئے وقت سے بھی زیادہ ہے مگر محبت کوئی خیالی یا تصور نہیں۔ ایک حقیقت ہے آہستہ آہستہ تمہاری محبت نے اپنا وجود تسلیم کرا لیا ہے۔ میں بے بس محسوس کرتا ہوں اب۔"

وہ کچھ باؤس ہوئی "چلو تم یہ یہ تو مانتا۔" میں نے کہا "میں اعتراف کر رہا ہوں کہ محبت صرف ایک جذبہ یا احساس ہی نہیں، ایک اہل اور ناقابل تردید باوری وجود رکھنے والی حقیقت ہے سب سے پہلے شاد کے عشق نے باہل کیا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ شاد نہ رہی تو میرے لیے محبت کا لفظ ہی بے وجود ہو جائے گا۔ کسی اور لڑکی کے لیے میرے وہی جذبات ہوں؟ یہ کیسے ممکن ہے مگر ایسا ممکن ہو گیا۔ میں اتنی ہی دار قتل کے ساتھ چند اکو چاہنے لگا۔ کیا یہ شرم کی بات ہے کہ میں شاد کی یاد کے ساتھ وفادار نہ رہا؟ یہ ایک افسوس ناک اور تلخ حقیقت ہے کہ ہمارے زندہ انسانوں کے لیے زندگی کی ایک ضرورت ہے۔ آئینہ کی طرح اور پانی اور خوراک کی طرح جب چندا نے میرے ساتھ ہے

رفی کا تو بہن آمیز اور نفرت کا رویہ اختیار کر لیا تو میں نے بہت کوشش کی کہ اس کا اعتماد بحال ہو جائے مگر مجھے ناکامی ہوئی۔ ایک وقت آیا جب میں اپنی نظریے سے گریبا اپنے آپ سے نفرت کرنے لگا۔ شادو کا مرنے اور چندا کا مجھے چھوڑ دینا میرے لیے ایک ہی بات تھی۔

”یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کہ محبت میں بدگمانی کیسے آسکتی ہے۔ محبت آخر نفرت میں کیسے بدل سکتی ہے۔“

میں نے کہا ”میں تو فرق ہے تم میں اور چندا میں۔ فرق چندا اور شادو میں تھا۔ شادو میں اور تم میں ہے۔ چندا ابھی شادو یا ختم نہیں چندا نہیں ہو سکتی۔ اس فرق سے سارا فرق پڑتا ہے۔ چندا نے مجھے مسترد کر دیا تو مجھے ایسا لگتا تھا کہ اب جینائی لا حاصل ہو جائے گا مگر دیکھو میں زندہ ہوں اور تمہارے ساتھ ہوں اور تمہاری محبت کا اعتراف کر رہا ہوں۔ شاید افلاطونی اور کثباتی محبت کے نظریے کی عظمت اور تقدیس کے پجاری مجھے برائی ہو رہی ہو۔ پرست اور محبت کے نام کو سوا کرنے والا قرار دینا میرے لیے محبت ایک رد عمل ہے۔ محبت صرف محبت کا جواب ہے۔ نفرت کے سامنے محبت نہیں ٹھہر سکتی۔ جیسے دھوپ میں چاندنی نہیں رہتی۔ انگوروں میں برف نہیں رہ سکتی اور برف میں جراثیم نہیں رہ سکتی۔ شاید عجیب لگے جس میں میری باتیں مگر یہ میرے نظریات ہیں کسی اور کا ان سے تعلق ہونا ضروری نہیں۔“

وہ ہنس پڑی ”اور ان خیالات کے جملہ حقوق محفوظ ہیں۔“

”میں سمجھ لو۔ میں کب تک چندا سے یکطرفہ محبت کرتا جبکہ میرے لیے اس کی نفرت بڑھتی جا رہی تھی۔ بالآخر اس کی نفرت نے محبت کے وجود کو ایسے نکل لیا جیسے آگ پھولوں کو جھلسا کے راکھ کر دیتی ہے۔ یہ یقیناً بد قسمتی تھی میری۔ چندا انتہا پسند تھی۔ محبت میں بھی اور نفرت میں بھی۔ اس کے لیے مفادیت اور مصالحت کی گنجائش بھی نہیں تھی حالانکہ محبت کرنے والے سب انسان ہوتے ہیں۔ جو غامی اور کوتاہی سے برہا نہیں ہوتے۔ وہ گھڑور اور خطا کار بھی ہوتے ہیں۔ جرم بھی کر سکتے ہیں اور گناہ بھی۔ ان کی مجبوری کو حالات کے تاثر میں سمجھنا چاہیے۔ چندا نے ایسا نہیں کیا۔ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتی تھی شاید پھر میں کیا کرتا ہوں اسے بھول جانے کے ساری زندگی ایک پتھر کی دیوار کے سامنے دوڑتا میرا مذہب نہیں اور پھر اس وقت جب میں اکیلا تھا اپنی تمنائوں کے صحرا میں بھٹک رہا تھا۔ تم نے مجھے اپنا بتایا۔“

”میں نے تو بہت پہلے اپنا بتایا تھا تمہیں۔“

میں نے کہا ”دیکھو۔ وہ بات میں تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں وہ کچھ اور ہے۔ تم نے ضرور اپنا بتایا تھا مجھے مگر میں تمہاری محبت میں نے رنجش سے شادی کے بعد بھی تمہاری محبت کو ایسے تسلیم نہیں کیا تھا جیسے آج کر رہا ہوں۔ اس وقت تم میرے لیے بس ایک خوبصورت لڑکی تھیں۔ تم جیسی اذیت جانے لگتی تھیں۔ تم سے مجھے ایک اضافی فائدہ یہ حاصل تھا کہ تم بڑی قہر کی جڑ لگتی تھیں اور میرے جیسے شخص کو تمہاری سپورٹ کی ضرورت تھی۔ آج وہ سب نہیں ہے اور معلوم ہے تمہاری محبت کی گہرائی اور عظمت کو میں نے کب سمجھا اور کب پہچانا؟ مرنے کے بعد۔“

وہ مسکراتے لگی ”مرنے کے بعد؟“

”ہاں۔ تم پاگل ہو گئی تھیں اس کیلئے شاہ عالم کے مرنے پر۔ تم کسی صورت یہ ماننے کو تیار نہ تھیں کہ وہ تمہیں چھوڑ کے جا سکتا ہے حالانکہ وہ ذلیل آدمی تھا۔“

”اب خود کو گالیاں کیوں دے رہے ہو۔“

”میں واقعی ایسا تھا۔ کینہ اور ذلیل۔ تم نے اس کی خاطر بڑی بدنامی برداشت کی۔ لوگوں نے کیا کچھ نہیں کہا تمہیں اور اس نے کس کس طرح استعمال نہیں کیا تمہیں پھر بھی تمہاری دیوانگی کم نہیں ہوئی۔ تم ساری دنیا کے خلاف اکیلی لڑتی رہی تھیں۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ زندہ ہے۔“

”دیکھ لو“ اس نے فخر اور مسرت سے کہا ”ساری دنیا کے مقابلے میں میری محبت کا یقین برحق تھا۔“

”میں مانتا ہوں“ اور جب درمیان میں ایک بار تمہارا یقین شکست کے اندیشے سے دوچار تھا تو تم بچ پھاگل ہو گئی تھیں۔ ایسی محبت نہ میں نے دیکھی نہ سنی۔ میں خود پاگل تھا چندا کے لیے مگر تمہاری محبت نے مجھے بھی شرمندہ کر دیا اور مجھے احساس ہوا کہ یہ محبت کتنی اتمول ہے اس لیے جب میں نے سب کچھ چھوڑ دیا۔ اپنی سیاست اپنا گھر بار اپنے رشتے اور اپنا کاروبار۔ تو میں نے تمہیں نہیں چھوڑا۔“

اس نے بیباکی ہو کر میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا ”میں تمہارے ساتھ تھی ہوں اور رہوں گی۔ زندگی کی آخری سانس تک۔“

میں نے کہا ”تھنک یو۔ ایک ذرا خیال رکھو کہ ہم سنیہا کے پردے کی طرح لوگوں کی نظر میں ہیں۔ ایسے رومانیک سین اصل زندگی میں میرا عام بے حیائی کا مظاہرہ کیجے جاتے ہیں۔“

”جس کا جو دل چاہے سمجھ نہ میں نے پہلے کبھی پروا کی اور نہ اب کرتی ہوں۔ فاشی اور بے حیائی آدمی کی نظر میں ہوتی ہے یا اس کی سوچ میں ہوتی ہے“ اس نے میرا ہاتھ نہیں چھوڑا۔

میں نے کہا ”وہ تو ٹھیک ہے عزیزہ“ لیکن ایسے میں کھانا نہیں کھا سکتا۔ تم نے میرا دایاں ہاتھ پکڑ رکھا ہے۔ ایسے تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔“

وہ ہنسنے لگی ”تم فیکے کے بارے میں سوچ رہے ہو یا اس کی بیوی کے بارے میں؟“

”ایک ہی بات ہے ہم باتیں بہت کرتے رہے مگر اس کی بیوی کو نہ پہچانے۔“ میں نے کہا۔

”معلوم نہیں وہ خود کہاں ہے؟“ خجمن بولی۔

”جن بھوت کی طرح غائب ہو گیا وہ اپنے گھر جانے کے لیے ہمارے سامنے ہی لگی میں کیا تمہارے گھر نہیں گیا۔ وہ وہاں جاتا تو اپنی بیوی کی لاش دیکھ کے صدمے سے بے ہوش ہو جاتا یا پاگل ہو جاتا۔ بیوی کے مردہ جسم سے پٹ کے روٹا۔ چونچلا تا مگر اس کی جگہ پکڑا گیا فرید جو وہاں سب سے پہلے پہنچا تھا۔ اس وقت جب قافل بھی وہیں موجود تھے فرید نے مجھے فرار ہونے دیکھا وہ فکاس نہیں تھا۔ اس نے یا کسی نے بھی فیکے کو وہاں نہیں دیکھا۔“

”یہ ہو سکتا ہے کہ فیکے نے گلی میں داخل ہوتے ہی خطرے کو محسوس کیا ہو۔ جو لوگ اس کی بیوی کی لاش کا خندہ لائے تھے وہ انہیں پہچانتا ہوگا۔ وہ ملک رب نواز کے آدمی تھے۔“

”شاید تھوڑے سے فرق کے ساتھ ہم سب یہاں ایک ساتھ پہنچے تھے۔ ملک رب نواز کی گاڑی ہمیں پہلے سے موجود نظر آئی تھی مگر ممکن ہے وہ دو چار منٹ پہلے آئے ہوں۔ دو آدمی لاش اٹھا کے لے گئے تیسرا گاڑی میں بیٹھا رہا۔ گاڑی کے دروازے کھلے ہوئے تھے اور انجن بھی چل رہا تھا۔ خدا نخواستہ ان کے پروگرام میں کوئی گڑبڑ ہو جاتی تو وہ چند سیکنڈ میں فرار ہو جاتے۔“ میں نے کہا۔

خجمن بولی ”تصور سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب تم نے ملک رب نواز کی گاڑی کو دیکھا اور فوراً پہچان لیا۔ تو کیا فیکے نے گاڑی کو نہیں دیکھا تھا؟ وہ ملک رب نواز کا ڈرائیور تھا۔ ڈرائیور لوگ اپنی گاڑی کو ایسے جانتے ہیں جیسے باپ اپنے بیٹوں کو۔ ان سے شناخت میں غلطی ہو جائے ناممکن۔“

میں نے اس سے اتفاق کیا ”وہ گاڑی کیا اس کی تصویر کو ایک نظر دیکھ کے پہچان جاتے ہیں۔“

”تم تصویر کی بات کرتے ہو۔ میرا خیال ہے کہ نیکیو دیکھ کے ایک ڈرائیور اپنی گاڑی کو پہچان سکتا ہے۔“

میں نے کہا ”یہ تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ تم مجھے نیکیو دکھاؤ۔ میں بتا دوں گا کہ یہ کار ہے ٹرک ہے یا بس۔ انگریز دیکھ کے بتا سکتا ہوں کہ کسے نے تم پر بری نظر ڈالی تھی یا تمہیں بارخان کی محبوبہ دلوانا زہر۔“

وہ ہنسی ”کیا کبھی بھی بری نظر ڈالتا ہے؟“

”کیسے رے کو اچھا نہیں سمجھا جاتا“ میں نے کہا ”صحت کے لیے نقصان دہ ہوتی ہیں تو بری ہی کہلاتی ہیں۔“

خجمن نے ایک اخبار کا ٹکڑا اٹھایا اور ہاتھ صاف کرنے لگی ”یہ ہو سکتا ہے کہ فیکالوٹ کر واپس آنے کے بجائے سیدھا نکل گیا ہو۔ اس نے اپنے گھر میں داخل ہونے سے پہلے ہی ملک رب نواز کے بندوں کو دیکھ لیا ہو اور اپنی جان بچانے کے لیے کسی طرف بھی نکل گیا ہو۔“

”اب وہ پھر ہمارا دشمن ہو جائے گا۔ ہم اس کی بیوی کو نہیں پہچانے۔ ہم اسے روکتے رہے کہ صبر سے کام لو۔ یہ کام جوش سے نہیں ہو ش سے ہو گا مگر ہوا کچھ بھی نہیں۔ نہ خدا ہی ملان وصال صبر نہ اوھر کے رہے نہ اوھر کے رہے۔ اب وہ پھینچتا رہا ہو گا کہ ملک رب نواز سے عداوت اور ٹھک حرامی کر کے اس نے ہمارا سارا کیوں لیا۔ اس سے تو اچھا ہوتا کہ وہ ملک رب نواز کے در پر کتابیں کے پڑا رہتا۔ اس کے کتے چاٹتا رہتا اور ذلت برداشت کرتا رہتا۔ اس کے ساتھ یا اس کی بیوی کے ساتھ کچھ بھی ہوتا۔ یہ امید تو رہتی کہ بالآخر ملک ان کی جاں بخشی کرے گا۔ بے حرحمی اور بے ضمیر کی آخری تماشے کے بعد شاید ملک کے دیتا کہ چلو دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ دو بارہ اپنی صورت مت دکھانا مجھے اور وہ اپنی خستہ جاں ویدہ بدن بیوی کی زندہ لاش ان درندوں کے سامنے سے اٹھا کے لے آتا تو شاید خدا کا شکر ادا کرتا۔ ایک اکڑی ہوئی سرو لاش کے سوا کیا ملا اسے ہم پر بھروسہ کر کے۔“

خجمن نے افسوس سے کہا ”بڑی محبت کرنا تھا وہ اپنی بیوی سے۔“

”ہاں لگتا تو ایسے ہی تھا۔“

”تمہیں شک کیوں ہے؟“

”کیونکہ زبان خلق کچھ اور کہہ رہی تھی۔ وہ دو سال سے کرائے کے گھر میں تھا اور اس کی بیوی کے اطوار بچے والوں کی نظر میں قابل اعتراض تھے۔“

”غریب آدمی کی اتنی خوبصورت بیوی ہو تو لوگوں کی زبانیں کھل جاتی ہیں“ خجمن نے سختی سے کہا۔

میں نے کہا "ملک نے بہت جلدی کی۔ شاید وہ اپنا غصہ برداشت نہیں کر سکا۔ دو نکلے کا نمک حرام ملازم اس سے سودا کرتا چاہتا تھا۔ ٹیکے نے کہا تھا کہ ملک اپنا نقصان برداشت کر سکتا ہے، کسی کی سرکشی اور غداری نہیں۔ ملک نے ہمیں مورتی کے سر کے بدلے کچھ بھی دینا اپنی توہین سمجھا۔ اس نے دھمکی اور دباؤ قبول نہیں کیا اور ایک طرح سے ہم تک بھی یہ پیغام پہنچا دیا کہ ملک دی کر رہا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ وہ کسی سے مذاکرات کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ کسی صفائی کے لیے سے نہیں آتا اور کسی قانونی دھمکی کی پروا نہیں کرتا۔ شاید یہ ثابت کرنے کے لیے اس نے ٹیکے کی بیوی کو مار دیا اور اس کی لاش کو ایک چٹیلج بنا کے ارسال کر دیا کہ اب میرا جو بگاڑ دیکھتے ہو بگاڑ کے دکھاؤ۔"

ختم نے کہا "تو تاریخہ اینڈ سنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ فرعونیت کے لیے بت خود اپنے غور سے پاش پاش ہوتے ہیں۔ اگر یہ چٹیلج ہمارے لیے ہے تو ہم اتے قبول کرتے ہیں۔"

میں نے اسے حیرانی سے دیکھا "تمہیں اڑ نہیں لگتا؟"

"اڑ لگتا ہے مگر اس ڈر کی وجہ سے میں جدوجہد نہیں چھوڑ سکتی۔ کیا تم نہیں ڈرتے؟ یہ جو حلیہ تم نے بنا رکھا ہے یا بگاڑ رکھا ہے، دشمنوں کے ڈر سے ہے۔ اس کے باوجود تم نے خود غرضی کے ساتھ جھنے کا نہیں سوچا، اگر تم چاہتے تو اپنی ساری دولت کے ساتھ کہیں بیرون ملک چلے جاتے اور بالی زندگی میں گزارتے۔"

"تم بھی ایسا کر سکتی تھیں۔ تمہارے لیے ماڈل یا فلم اشارہ بنا بھی آسان تھا اور فائدہ مند تھا۔ تم کسی ملک، تجارت یا پرس کے ساتھ سونڈر لینڈ کے کسی قصبہ عالی شان میں خیش سے باقی زندگی گزار دیتیں۔"

وہ جسنے گئی "پس ثابت ہوا کہ ہم دونوں بے وقوف اور پاگل ہیں کہ گھاسنے کا سودا کرتے ہیں اور اپنی اسی زندگی سے خوش اور مطمئن ہیں۔ کیا اب ہمیں چننا نہیں چاہیے۔"

میں نے کہا "کچھ دیر اور ٹھہر جاؤ۔ ہوش والے خود ہی اٹھادیں گے۔"

"پولیس تو واپس چلی گئی" ختم نے گاڑی میں بیٹھ کے کہا۔

"ان کا آنا اور جانا رسمی کارروائی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ یہ بھی وہ بہت مجبوری میں کرتے ہیں۔" میں نے گاڑی کو آگے بڑھایا۔

ختم نے سہلایا "پولیس کو لوگوں نے ضرور بتایا ہوگا کہ

انہوں نے تو ایک قاتل کو جائے اداوات پر ہی پکڑ لیا تھا مگر نہ جانے کہاں سے ایک دھوکے باز ایف آئی اے کا جعلی افسر بن کے آیا اور سب کو چکر دے کر اپنے ساتھی کو چھڑا لے گیا۔"

"میرا خیال اس کے برعکس ہے۔ جیسے ہی لوگوں کو یہ احساس ہوا ہوگا کہ مجرم انہیں بھانسا دے کر نکل گئے۔ وہ خود بھی کھٹک لیے ہوں گے کہ اب پولیس کو حقیقت کاظم ہو گا تو وہ سب بے وقوف بننے والوں کو پکڑ لے گی۔ انہاں پر الزام تجائے گا کہ انہوں نے مزم کو فرار ہونے میں مدد دی۔" میں نے گاڑی کو بس سے کچھ فاصلے پر روک دیا۔

ختم نے کہا "چلو اب ہمیں یہ سب سوچنے کی کیا ضرورت ہے۔ جو ہوتا ہے، ہوتا رہے گا۔ جاں پٹی سولاحوں پائے، خیر سے ہم بدھو گھر چلتے ہیں۔"

میں نے کہا "نہیں، تم جانا چاہو تو چلی جاؤ اپنے گھر۔"

"تم بس میں بیٹھے ہوئے شخص سے ضرور ملو گے، میں کہتی ہوں۔"

"تم کچھ مت کہو۔ میرا دل کہتا ہے کہ یہ معاملہ کچھ تفتیش طلب ہے۔ کیا تم نے اس بس پر لکھے ہوئے نام پر غور کیا؟"

ختم نے پلیٹ کے دیکھا "ایم آر این اینڈ سونڈر۔ ملک رب نواز اینڈ سونڈر؟"

"راٹ! اس وقت ہم بس کو سامنے سے دیکھ رہے ہیں۔ سامنے مجھے وینڈ اسکرین کے پیچھے پلاسٹک کی ایک سفید تختی نظر آتی تھی جسے الٹ کر رکھ دیا گیا تھا مگر میں نے اٹنے نظر آنے والے الفاظ آسانی سے پڑھ لیے تھے۔ اس پر لکھا ہوا تھا لاہور سے کوئٹہ۔ اب اگر تم مزید غور فرماؤ تو کوئٹہ سے براستہ جن تم افغانستان تک جا سکتی ہو اور خانہ جنگی کا شکار یہ ملک اس وقت اسمگلنگ میں فیصل آباد کا گھنا گھر ہے۔"

"جہاں غالباً آٹھ سو کس ملتی ہیں۔"

"افغانستان سے وسط ایشیا کی ریاستوں کا راستہ ہے۔ دوسرا ایران کی طرف سے ترکی اور یورپ تک خشکی کا راستہ ہے۔ افغان ٹرانزٹ ٹریڈ کی آڑ میں دنیا بھر سے سامان پاکستان کے راستے افغانستان پہنچ رہا ہے۔ پاکستان نے تو یہ سولت خانہ جنگی کی بد حالی سے مستار ہونے والوں کی مدد کے لیے دی تھی۔ تم سے کم سرکاری فائلوں کی پالیسی میں یہی کہا گیا ہے مگر کون یہ نہیں جانتا کہ بد عنوان یورو کریسی نے یہ پالیسی کس کے لیے بنائی تھی۔ پالیسی بنانے والے تھے ہمارے ملک میں غیر ملکی سامان کے انبار لگانے والے بڑے بڑے تاجر۔"

انہوں نے پالیسی سازوں کو اپنے منافع میں شریک رکھا۔ نتیجہ یہ کہ جو سامان افغانوں کی مدد کے لیے ڈیوٹی عائد کے بغیر پاکستان کی بندرگاہوں سے گزرا وہ یا تو تیسریں رک گیا اور کاغذات میں ان کی افغانستان میں وصولی دکھادی گئی یا پاکستان کی سرحد ایک جگہ سے پار کرنے والا سامان دوسری جگہ سے لوٹ کے پاکستان آ گیا۔"

"یہ سب میں خود جاکے دیکھ چکی ہوں۔ پاک افغان بارڈر پر شاید اسمگلنگ کی سب سے بڑی منڈی سرکاری سرپرستی میں چل رہی ہے اور ایک بد عنوان وطن فروش مافیا کے ارکان یہ مال پورے پاکستان کے ہر شہر میں پہنچا رہے ہیں۔ اس سے ملکی صنعت تباہ ہو رہی ہے اور اسپورٹس سامان استعمال کرنے کا رجحان بڑھ رہا ہے کیونکہ وہ سستا ہے۔ اچھا ہو یا نہ ہو۔ ملک رب نواز بھی اس کا روبرو میں شریک ہے تو حیرانی کیسی؟"

"حیرانی کوئی نہیں۔ حیران میں اس وقت ہوتا جب ایسا نہ ہوتا مگر جو بات تمہاری عقل شریف میں نہیں آ رہی ہے وہ کچھ اور ہے۔ ملک رب نواز کی ایک بس کوئٹہ جاتی ہے۔ اس میں افغان تاجراں ان کے نمائندے اپنا سامان سو فیصد قانونی طریقے سے لے جاتے ہیں۔ پاکستان سے کوئٹہ اور کابل تک جانے والے مال کو کسی جگہ چیک نہیں کیا جاتا۔ اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔ سامان پر کسی قسم کی کسٹم ڈیوٹی نہیں۔ دستاویزات کی رو سے وہ سب افغان ٹرانزٹ ٹریڈ کے قواعد و ضوابط کے مطابق ہے۔ اس میں کوئی منشیات چھپا کے نہیں لے جاتا اور لے جاتا ہے تو لے جائے انہیں پکڑے افغان گورنمنٹ۔ ہم اپنے ملک میں بیرون نہیں آتے دیں گے۔ بیرون کو آسانی سے چیک کیا جاسکتا ہے۔ کتے اس کی بوسنگھہ سکتے ہیں مگر کتے نوادرات کی بونہیں محسوس کر سکتے۔"

ختم چونگی "تمہارا مطلب ہے۔"

"بس۔ افغان ٹرانزٹ ٹریڈ کے مال میں نوادرات افغانستان جا رہے ہیں۔ افغانستان سے ساری دنیا کے راستے کھلے ہوئے ہیں اور کوئٹہ سے واپسی میں اگر اسمگلنگ کا مال لاہور پہنچ جائے تو آرم کے آم مٹھلیوں کے دام۔ ملک رب نواز شاید پہلے سمندری راستے سے اپنا مال یورپ امریکا بھیجتا تھا۔ ہوائی جہاز کے کرائے زیادہ ہوتے ہیں اور انٹرپورٹس پر چیکنگ بھی زیادہ ہے۔ بندرگاہوں پر تجارتی مال بردار جہاز ہزاروں فن سامان آتا رہتے ہیں۔ زیادہ اسمگلنگ سمندری راستوں سے ہوتی ہے۔ یہ خشکی کا راستہ سب سے سستا اور محفوظ ہے۔ افغان ٹرانزٹ ٹریڈ تو ملک رب نواز کے حق میں

ایک ایسی لاٹری ہے جس کو قانونی حیثیت حاصل ہے اور جس کی آمدنی پر ڈیوٹی کسٹم اور انکم ٹیکس وغیرہ کا مسئلہ ہی نہیں۔ لاہور کوئٹہ بس سروس کا آئیڈیا کشنا شانداز ہے۔"

"کیوں نہ ہم اس شانداز سروس سے سفر کریں" ختم نے پر جوش لہجے میں کہا۔

"مجھے پورا یقین تھا کہ تم یہی کوگی۔"

"جو حقیقت ہے سامنے آجائے گی۔ چل کے دیکھتے ہیں۔"

میں نے کہا "ایک دن ہم اس ایڈونچر میں ضرور شریک ہوں گے مگر ابھی میں اس بس کو اندر سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ بس اتنے لمبے سفر کے لیے کس حد تک آرام دہ ہے۔"

ختم نے میرا بازو پکڑ لیا "میں بھی چلوں تمہارے ساتھ۔"

"یہ کیا ہے تو فنی ہے۔ ہر جگہ تم کیسے جا سکتی ہو میرے ساتھ۔ تم کو عام جذباتی لڑکیوں کی طرح سوچنے سے گریز کرنا چاہیے۔ تم یہاں سے دیکھو اور جو کس رہو۔ ذہنی اور جسمانی طور پر ALERT بنو۔ تاکہ ضرورت پڑنے پر میری مدد کر سکو" میں نے کہا۔

"ریو اور ہے تمہارے پاس؟" وہ بولی۔

"نہیں۔"

"یہ میرا لے جاؤ" اس نے اپنے بیگ میں ہاتھ ڈالا۔

میں نے کہا "اسے رکھو اپنی حفاظت کے لیے خاتون۔ مجھے یہ دو ہاتھ کالی ہیں اور کسی زنانہ ریو اور سے اپنی جان بچانے سے بہتر ہے کہ میں مردانہ وار لڑتا ہوں شہید ہو جاؤں۔"

بس تک شاید دو سو فٹ کا فاصلہ تھا جو میں نے بندرگاہوں کے ساتھ چلتے ہوئے طے کیا۔ یہ ٹکلی ٹکلی کی عام دکانیں تھیں۔ دھوئی ٹائی، پریچون۔ دودھ، سبزی اور گوشت کی۔ ایک سائیکل مرمت کرنے والا پھر ایک وڈیو شاپ۔ ایک فرنیچ مرمت کرنے والا۔ سب دکانوں کے شکر کرے ہوئے تھے اور لائنیں آف تھیں۔ کہیں کہیں کسی غالی ریزمی پر یا چارپائی ڈالے وہ محنت کش سو رہے تھے جن کے گھر نہیں تھے یا تھے تو کسی دوسرے شریا گاؤں میں تھے۔ ایک فقیر یا ہیرو جی کے ساتھ ایک کتا سو رہا تھا۔

میں نے بس کے پیچھے پہنچ کے دیکھا۔ ختم گاڑی چلا کے کچھ اور قریب لے آئی تھی۔ بس نے ماڈل کی اور بہت خوب صورت تھی۔ اس کی میٹیں بھی جہاز کی سیٹوں جیسی تھیں اور اس کے بڑے بڑے شیشوں کے پیچھے پردے دیکھ کے

اندازہ ہوتا تھا کہ بس ان کا کھینڈ ہے۔

کوئٹہ کے لیے بس ایسی جگہ سے روانہ ہوتی تھی۔ اس کے پیچھے بس سروس کا آفس تھا جو تین دکانوں کو ملا کے بنایا گیا تھا۔ ایک حصہ بنگ آفس تھا۔ دوسرے حصے میں اے سی لگا ہوا تھا اور یہ شاید منیجر کا کمرہ تھا یا مالک خود بیٹھے ہوں گے تیسرے حصے کو شنگ روم کی حیثیت دے دی گئی تھی۔ شیشے کے بند دروازوں کے پیچھے صرف ایک ٹیوب لائٹ جل رہی تھی۔

آفس میں کسی چوکیدار کا نہ ہونا میرے لیے تعجب کا سبب بنا۔ عام طور پر اتنا بڑا کاروبار چلانے والے حفاظت کے خیال سے غافل نہیں ہوتے۔ بس کا دروازہ بند رکھ کے مجھے کچھ مایوسی ہوئی۔ ایسی بسوں کے دروازے خود کار ہوتے ہیں۔ انہیں ڈرائیور ایک ٹین دبا کے کھولتا ہے اور ان کا نظام ویکیم سے کام کرتا ہے۔ اسے میں طاقت آزمائی سے نہیں کھول سکتا تھا لیکن میں نے قریب جاکے اسے آہستہ سے پش کیا تو دروازہ اندر دب گیا۔ میں نے اسے اور دھکیلا تو کسی آواز کے بغیر دروازہ سٹ کے ایک طرف ہو گیا۔

میں ہینڈل پکڑ کے اور چڑھا۔ دروازہ اگلے حصے میں تھا۔ اندر داخل ہو تو میری نظر ڈرائیور کی سیٹ پر گئی۔ وہاں کوئی سرنگ سیاہ چادر یا کپڑا کھیل میں پٹنا ہوا بیٹھا تھا۔ یہ سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی کیونکہ بس ہر طرف سے بالکل بند تھی۔ اگر اسے سی نہ چل رہا ہو تو بس میں شدید جس اور گرمی ہوتی ہے اور اس پر سزاوہ ٹھنڈی کھنکھناتے ہوئے روپوش بیٹھا تھا۔ میرا یہ شک اب یقین میں بدل رہا تھا کہ کپڑا کھیل میں کوئی زندہ انسان نہیں ہو سکتا۔ تین گھنٹے سے زیادہ ہو گئے تھے اور میری نظر کے سامنے اس نے پہلو تک نہیں بدلا تھا۔

اسے چمکرو کیسے سے پہلے میں نے کہا ”بھائی صاحب۔ ڈرائیور صاحب!“

سب سے پیچھے والی لمبی سیٹ پر لیٹا ہوا ایک شخص تڑپ کے اٹھ بیٹھا اور چلانے لگا ”اوئے کون ہے تو؟ اندر کیسے آ گیا؟“

میں نے کہا ”جیسے تم اندر آئے تھے“ اس دروازے سے۔

وہ چھ فٹ سے نکلے قد کا جوان آدمی تھا جو اب اپنی کلا شگوف کا رخ بڑے خطرناک انداز میں میری طرف کرچکا تھا ”اوئے چل یا ہر۔ چوروں سے بڑے تیرے باپ کی بس ہے۔“ میں نے آرام سے کہا ”نہیں۔ بس تو تمہارے ہی باپ کی ہے۔ کیا تمہاری ماں کا ملک رب نواز کے ساتھ۔“

اس نے مشتعل ہو کے مجھے گالی دی ”کیو اس کرتا ہے۔“

میں تیری ہڈیوں کا سرسہ بتا دوں گا۔“

میں نے کہا ”اس کے لیے تمہیں یہ توپ رکھ کے میرے قریب آنا پڑے گا یا تمہارا خیال ہے کہ تم کلا شگوف سے بھی ہڈیوں کا سرسہ ہو جاتا ہے۔“

میرے لیے نے اس کو مختار ہونے پر مجبور کر دیا۔ ”آخر کیا چاہتا ہے تو کیوں تو سہی رات کو مٹھے لگتا ہے۔“

میں نے کہا ”میں تمہاری شکل دیکھنے نہیں آیا تھا۔ اس ڈرائیور سے کام تھا مجھے۔ تم اچھے ہی پاگل کتے کی طرح بھونکنے لگے۔ غالباً تم چوکیدار ہو۔“

وہ ڈر گیا ”آخر کام کیا ہے جی آپ کو۔ میں کبھی کا گاڑو ہوں۔“

میں نے اسے مزید ڈرایا ”گاڑو کو کبھی تنخواہ دیتی ہے؟ بس کے اندر لمبی تان کے سونے کی؟ اور کام سے آنے والے شریف لوگوں کے ساتھ گالی گلوچ کرنے کی؟ پیکوئی گاڑو کو گمن کے ساتھ کھڑا رہنا چاہیے۔ کرسی بھی نہیں دی جاتی اسے بیٹھنے کے لیے خیر۔ یہ سب میں بتاؤں گا ملک رب نواز کو۔ مجھے منجھوئے بھی شادمان جاتا ہے۔“

چوکیدار کی حالت غیر ہو گئی ”سرجی۔ غریب آدمی ہوں۔ میری نوکری چلی جائے گی۔ غلطی ہو گئی مجھ سے۔ معافی دے دیں۔“ وہ ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہو گیا۔

میں نے کچھ دیر اسے گھورا ”مجھے کام تھا اس ڈرائیور سے۔“ اس کے ساتھ ہی میں نے ایک دم ہاتھ بڑھایا اور کپڑا کھینچ لیا۔

چوکیدار چلایا ”خودار۔ یہ ڈرائیور نہیں ہے۔“

میرا سے بہت دیر ہو گئی تھی۔ کپڑا کھینچنے کے بعد میں آیا تھا اور اس کے پیچھے سے ڈرائیور نہیں آیا۔ ایک کے اوپر ایک رکھے ہوئے چھوٹے بڑے گتے کے ڈبوں کا ایک ڈھیر بڑا ہوا تھا۔ ایک بڑا کارٹن نیچے تھا۔ اس کے اوپر دو کارٹن بہت چھوٹے تھے سب سے اوپر والا ڈیبا سب سے چھوٹا تھا۔ ڈبوں کو اس ترتیب کے ساتھ رکھنے کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ ڈرائیور کی سیٹ پر محو طی شکل کا ایک ڈھیر بن گیا تھا جس کی چوڑائی اوپر کی طرف کم ہوتی جاتی تھی۔ ظاہر ہے اس کا مقصد ڈبوں کو مگرنے سے بچانا تھا اور اس ڈھیر پر کپڑا کھینچنے کی حفاظت کے خیال سے ڈالا گیا تھا لیکن اس کا دوسرا مقصد پردہ پوشی بھی ہو سکتا تھا۔

یہ میرے تخیل اور تصور کی کرشمہ سازی تھی کہ میں نے اس ڈھیر کو مشکوک نظموں سے دیکھا اور مجھے ڈرائیور کی

سیٹ پر ایک آدمی بے حس و حرکت بیٹھا نظر آیا۔ تین گھنٹے کیا میں ساری رات دیکھتا رہتا تو یہ ڈھیر ایسے ہی پڑا رہتا۔ مجھے اس خیال سے بڑی سخت ہوئی۔ خوف کا مارا ہوا آدمی کسی کو بھی سانس نہ دیتا تھا۔ مجھ کو چاند بدلتی کی طرح لگتا تھا۔ میں نے گتے کے ڈبوں کے ڈھیر کو سیٹ پر بیٹھے ہوئے آدمی کے روپ میں دیکھا۔ مجھ پر کو معلوم ہو گا تو وہ کتنا ہنسے گی۔

چوکیدار ایک دم آگے آیا اور اس نے میرے ہاتھ سے کپڑا کھینچ لیا ”آپ بھی کمال کرتے ہوئی ڈرائیور اپنے کھر پر سو رہا ہے۔ ایسے سیٹ پر بیٹھ کے سو سکتا ہے کوئی؟“

میں نے کہا ”آئی ایم سوری لیکن مجھے آفس میں اور باہر کوئی نظر نہیں آیا اور ایسا لگا کہ ڈرائیور سیٹ پر کوئی کپڑا اوڑھے بیٹھا ہے۔“

”اس گرمی میں کپڑا؟“

میں نے کہا ”وہ دراصل کچھ لوگ ایسے کپڑا میں چھپ کے نشہ بھی کرتے ہیں۔ ویسے سارا تصور میری نظر کا نہیں۔ تم بھی باہر سے دیکھو گے تو ایسا ہی لگے گا تمہیں بھی۔ سیٹ پر ایسے سامان کون رکھتا ہے؟“

”کیا سیٹ پر سامان رکھنا منع ہے۔ خلاف قانون ہے۔“ چوکیدار نے سامان پر دوبارہ کپڑا ڈالنے ہوئے بڑبڑاتا جاری رکھا۔ ”وہ ڈرائیور خود رکھ کے گیا تھا یاں۔ بول گیا تھا کہ اس کو چھیننا نہیں۔ نازک سامان ہے۔“

”چلو کوئی نقصان تو نہیں ہوا۔ ویسے نازک سامان تھا تو اندر رکھ کے جاتا، آفس میں جگہ ہوگی۔“

”آفس بند تھا اس وقت۔ میں گیا تھا روٹی کھانے لیکن آپ کو جرح کرنے کی ضرورت نہیں۔“

میں نے کہا ”یہ تو میں ضرور پوچھوں گا کہ کیا تم روزا سی طرح بس کے اندر سوتے ہو؟ تم نہیں بتاؤ گے تو ملک رب نواز سے پوچھوں گا۔“

وہ پھر عاجزی پر اتر آیا ”صاحب جی۔ کیا کریں؟ انسان ہیں آخر ہم بھی۔ سارا دن ایک دفتر میں نوکری کرتا ہوں۔ چہرہ اس کی تنخواہ میں گزارا نہیں ہوتا۔ رات کی چوکیداری میں تھوڑا سا عام نکال ہوں سونے کے لیے ورنہ صبح دفتر میں ڈیوٹی کیسے دوں گا۔ وہاں تو سارا دن بیٹھتا ہوں ہے اور ہر سے اوجھڑا آپ نے ٹھیک بولا۔ چوکیدار کو کھڑے رہنا چاہیے۔ بندوبست اٹھا کے۔ اور ایک کرسی ملی ہے۔ اس پر بیٹھ کے بھی نیند آتی ہے۔ اندر بس کی سیٹ پر لیٹنے کی جگہ ہوتی ہے۔“

میں نے کہا ”اگر بھی کوئی ایسی دیکھی بات ہو گئی تو مارے جاؤ گے۔“ اور کیا ہو گا رات کے وقت صاحب! آفس میں بھی

کچھ نہیں۔ یہ بس کھڑی ہے۔ اسے تو کوئی چوری کر کے نہیں لے جاسکتا۔“

میں نے کہا ”مگر نقصان تو پہنچا سکتا ہے۔ لاکھوں کی چیز ہے رب نواز کے دشمن بہت ہیں۔“

”آپ دوست ہو ملک صاحب کے؟ مجھ سے غلطی ہوئی جناب! آئندہ خیال رکھوں گا۔ رات کے وقت بھی جاگتا رہوں گا۔ آپ میری شکایت مت لگاتے۔ گیارہ بجے ہیں دو گھنٹوں کا خرچہ ہے۔“

میں نے افسوس سے کہا ”دو بیویاں پال رہی ہیں تم

علیم الحق حق کے قلم سے ایک اچھوتی کہانی اسے بلاتے بے درمیاں کے کہانی جس کا نام عالمی دہشت کے علامت ہے۔ انہیں بھگے ہوئے کے داستان جو اپنے ہاتھوں دُنیا میں اپنے لیے جہنم تعمیر کرتے ہیں

اچھوت

قیمت : ۸۰ روپے

اپنے ہا کر یا قریبی بک سٹال سے طلب فرمیں

برادر راست منگوانے کا پتہ:
ناشر: علی میاں سبلی کیشنرز
۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار لاہور

نے آفریں ہے تم۔ لوگ ایک کر کے روٹے ہیں اور چار بچے نہیں پال سکتے ٹھیک سے۔ تم نے پوری ٹیم بنائی ہے اور ابھی تو ماشاء اللہ جوان ہو۔ دو مشینیں ہیں بچے پیدا کرنے کی۔ ایک ٹیم اور نکل آئے گی بارہویں کھلاڑی سمیت۔ عام کیا ہے تمہارا؟

”عنایت“ وہ سر جھکا کے بولا۔

”کس دفتر میں کام کرتے ہو تم عنایت؟“ میں نے نرمی سے کہا۔

”اسے جی جناب کے دفتر میں جناب!“

میں نے کہا ”تمہیں ضرور معلوم ہو گا کہ سرکاری ملازم دوسری جگہ ملازمت نہیں کر سکتا۔ خیر میں نہ تمہارے دفتر میں بیٹاؤں گا اور نہ رب نواز سے کوئی بات کروں گا۔“

”آپ کی بڑی مہربانی۔“

میں نے پرس نکالا اور اس میں سے ایک ہزار روپے نکال کے اپنے ہاتھ میں پکڑ لیے۔ ”مجھے بہت افسوس ہوا تمہاری مالی پریشانیوں کا سن کے غلطی تمہاری اپنی ہے مگر تقدیر کا لکھا ہو کے رہتا ہے۔“

اس نے نوٹوں کی طرف دیکھا مگر اپنا ہاتھ آگے نہیں بڑھایا ”ہاں جی“ اگر ماں باپ نے پہلی میری مرضی سے کی ہوئی تو دوسری کی قیمت کیوں آتی۔“

”تین سال بعد آئی یہ قیمت؟ اور کتنے بچوں کے بعد؟“

”سات سال بعد۔“ وہ کچھ جھینپا ”پانچ بچے ہو گئے تھے تب تک۔ دو بعد میں ہوئے۔“

”یعنی اس کے باوجود کہ تم کو اپنی پہلی بیوی بالکل پسند نہیں تھی؟“ خیر یہ تم رکھ لو۔ دو تیس میں رب نواز سے کچھ نہیں کہوں گا۔“

”لیکن جناب یہ کیوں دے رہے ہیں مجھے آپ؟“

میں نے کہا ”یہ میرا ذاتی کام نہیں ہے۔ سرکاری کام ہے۔ اس کا تمہیں بہت معقول معاوضہ ملے گا آئندہ بھی۔“

”آپ۔ کون ہو جی؟“

میں نے کہا ”یہ میں تم کو بتا سکتا ہوں مگر کسی اور کو کچھ بھی معلوم ہوا تو اس کے ذمے دار تم مجھے جاؤ گے۔ میں خفیہ پولیس کا افسر ہوں۔“

اس کی حالت غیر ہو گئی ”خفیہ پولیس۔!“

”ہاں۔ اس بس کے ذریعے کچھ لوگ پاکستان اور

افغانستان آ جا رہے ہیں اور وہ خطرناک لوگ ہیں“ اسٹھل۔

”یہ غلط ہے جناب!“

”مفتول بات مت کرو۔ تم ہم سے زیادہ نہیں جانتے۔ اگر تم دیکھنا چاہتے ہو تو ان ڈبوں کو کھول کے دیکھو کیا ہے ان میں؟“

”مجھے۔ مجھے نہیں معلوم، مگر میں نہیں کھول سکتا ان کو۔“

”میں یہ ڈبے کھول کے تمہیں دکھا سکتا ہوں اور یہ ثابت ہو جائے کہ بعد کہ ان میں کیا مال ملک سے بھیجا جا رہا تھا“ میں تم کو اسی وقت گرفتار بھی کر سکتا ہوں۔ تمہاری تحویل میں ہے اس وقت سارا مال۔ باقی لوگ صاف انکار کر دیں گے کہ ان کا اس مال سے کوئی تعلق نہیں پھر تم جنس جاؤ گے تمہاری کوئی نہیں سنے گا کہ تم صرف چوکیدار ہو۔“

چوکیدار کی صورت روٹنے والی ہو گئی ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہو جناب!“

”کیا میں فارسی بول رہا ہوں؟“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”یہاں سے تم کو سیدھا تھانے لے جا کے تفتیش کرنے والوں کے سپرد کر دیا تو وہ تم سے ہر بات منوالیں گے۔ یہ بھی کہ تم اسمگل کرنے والے گروہ کے لیے کام کرتے تھے۔ رب نواز تمہاری کوئی مدد نہیں کرے گا اور نہ بس ڈرائیور جو یہ مال لے جاتا ہے۔ وہ انہیں ختم بنا دیں گے۔ یہی کہیں گے کہ چوکیدار اگر کسی کے لیے کام کرتا تھا تو ہمیں کیا معلوم۔ دو بڑیاں ہیں میاں رہے۔ دو جگہ نوکری کر کے ہی پورا کیے ہو سکتا ہے۔ بڑیاں غلط چکر میں۔“

چوکیدار ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہو گیا۔ ”جناب عالی! آپ تعین کریں مجھے کچھ نہیں ہوا۔ میرا کوئی تعلق نہیں اس مال سے۔ میں نے تو بھی ہیروئن کی شکل نہیں دیکھی۔“

میں نے کہا ”ہیروئن نہیں ہے ان ڈبوں میں۔“

”پھر کیا ہے جی، سونا یا امیرے؟“ چوکیدار کے نزدیک ایسی ہی چیزیں اسمگل ہوتی تھیں۔

اب میں نے اطمینان سے ایک قدم آگے بڑھایا اور کبل پٹنا کے گتے کا سب سے اوپر والا ڈبا اٹھایا ”میں دکھاتا ہوں تمہیں۔“

وہ بدحواس ہو گیا ”ایسا مت کریں جناب! میں مشکل میں پڑ جاؤں گا۔ ان پر سیل لگی ہوئی ہے۔“

”مشکل میں تم پڑ چکے ہو عنایت پہلے ہی۔ میں یہ مال ضبط کر کے تمہیں اپنے ساتھ لے جاتا ہوں۔ تھانے میں ہر ڈبا تمہارے سامنے کھولا جائے گا اور مشیر نامہ بنانے کے تم سے

دستخط لیے جائیں گے۔ اس کے بعد ڈبوں پر مجسٹریٹ سیل لگائے گا۔ تمہارے خلاف ایف۔ آئی آر لکھی جائے گی اور ظاہر ہے اس کے بعد سرکاری ملازمت تو خود بخود ختم ہو جائے گی۔ ملک رب نواز بھی اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے تم کو ہر طرف کروے گا۔ نہ تمہارا کوئی وکیل ہو گا اور نہ گواہ۔ رب نواز کے جرم کی سزا تم کاٹو گے۔ قریبی کا بکرا تم بنو گے۔ اس کا دھندا ایسے ہی چلتا رہے گا۔ تمہاری جگہ وہ

دوسرا چوکیدار رکھ لے گا کل ہی۔“

دہشت زدہ چوکیدار کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ”میں بہت غریب آدمی ہوں جی۔ کچھ بھی نہیں ہے میرے پاس۔ میرے بچے بھوکے مر جائیں گے۔“

میں نے کہا ”یہ لو ایک ہزار۔ آئندہ ہفتے بھر ایک ہزار مل سکتے ہیں تمہیں۔ اگر تم عقل سے کام لو۔ تمہارے دوسرے مسائل بھی حل کئے جاسکتے ہیں لیکن انکار کی صورت میں تمہارے لیے بہت سنگین مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ تمہیں شاید اندازہ نہیں ہے کہ یہ اسمگلر ٹاپ لوگ کتنے بے ضمیر اور خطرناک ہوتے ہیں۔ اگر ان کا باپ پکڑا جائے اور خطرو ہو کہ ان کا راز فاش کر دے گا تو یہ اسے بھی ختم کر دیتے ہیں۔ تم کیا چاہو۔“

عنایت نے ہاتھ آگے بڑھا کے چیخ کر لیا۔ ”مجھے کیا کرنا ہو گا جی؟“

میں نے کہا ”سب سے پہلی بات یہ کہ تم کسی کے سامنے کوئی بات نہیں دہراؤ گے جو میرے اور تمہارے درمیان ہوئی۔ نہ اس ملاقات کا ذکر کرو گے۔ ہوں سمجھ لو کہ ہم نے ہی نہیں۔ صبح تم معمول کے مطابق اٹھو گے اور اپنے آفس جاؤ گے۔ رات کو ہر روز کی طرح ڈیوٹی پر حاضر ہو جاؤ گے۔ کچھ لوگ یہ بے وقوفی کرتے ہیں کہ اپنی بیوی کو اپنی قسم دے کے رازدار بنالیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ بات کسی کو معلوم نہیں ہوگی مگر ایسا نہیں ہے۔ بیوی ہواں یا بس! سب ایسی ہی قسم دے کے بات کسی تیسرے کو بتا دیتی ہیں۔ کسی پر بھروسہ مار کے اپنے پاؤں پر کھلاڑی مت مارنا۔ جب اسمگلر پکڑے جائیں گے تو ان کے ساتھ تمہیں بھی دھریا جائے گا۔“

”لیکن انہیں معلوم ہو گیا کہ میں ان کے خلاف پولیس کو خبریں دیتا تھا۔“

”مگر مت کرو۔ کسی کو کچھ بتا نہیں ملے گا اور نہ تمہارا نام آئے گا کہیں۔ میں کسی کے سامنے تم سے لٹنے نہیں آؤں گا۔ خود رابطہ کروں گا اگر ضرورت پڑی ورنہ تم مجھے رات کے وقت فون کرو گے، آفس میں فون تو ہے؟“

”مگر تم کرو۔“

”اس لیے تو میں نے ہاں کوئی جناب۔ مگر۔“

”مگر کیا۔ جو شک ہے دور کرو ابھی“ میں نے کہا۔

”شک کوئی نہیں جناب! مگر خطو بہت بڑا ہے میرے

”آفس کی چابی میرے پاس نہیں ہوتی۔“

”ایک چابی بڑا“ میں نے کہا۔

وہ انکار میں سر ہلانے لگا ”نہیں جی۔ یہ کام نہیں کروں گا میں۔ اگر مالکوں کو پتا چل گیا تو قتل کرادیں گے مجھے۔ وہ بڑے ظالم لوگ ہیں۔“

میں نے کہا ”انہیں کیسے پتا چل سکتا ہے۔ کون بتائے گا انہیں جا کے؟“

وہ بدستور لٹی میں سر ہلاتا رہا ”اندرو کچھنی کی کوئی چیز رازدار اور ہومو تو میں پکڑا جاؤں گا۔ دیسے تو اندر ایسی کوئی چیز نہیں۔ فائلیں ہیں اور رسید ہیں۔ رجنز، کنکٹوں کی کاپیاں اور پرانی مشینیں۔ کچھ وہ اور نہیں چھوڑتے۔“

”پھر تو ذرا نیکی کوئی بات ہی نہیں۔ ویسے تو فون آدمی کہیں سے بھی کر سکتا ہے پیسے دے کے مگر میں نہیں چاہتا کہ تمہاری اور میری مصفا کسی اور کے کان میں پڑے۔ احتیاط اچھی چیز ہے۔“

”ہاں جی کسی نے میری باتیں سن کے ڈرائیور کو بتا دیا۔ یا اتنا کہ داکہ تمہارا چوکیدار روز ریاں کسی کو فون کرنے آتا ہے تو میری چھٹی۔“

میں نے کہا ”یہ روز کا معاملہ نہیں ہے۔ جب یہاں سے ایسا مال جائے تو مجھے بتا دو۔“

”مال تو ہفتے دس دن میں ایک بار جاتا ہے“ وہ بولا۔

میں نے کہا ”یہ عام سا ڈر لاک ہے اس کی چابی بتانا آسان ہے۔ ممکن ہے اس میں دوسری چابی لگ جائے۔“

اس نے سوچ کے کہا ”چابی کا میں کروں گا۔ ڈپلی کیٹ اندر پڑی رہتی ہیں۔ سیٹھ کا مشی مع ملا کھولتا ہے تو چابی ایسے ہی دروازے میں لگی رہتی ہے۔ وہ میں نکال لوں گا۔ وہ سمجھے گا کہیں گرجنی یا کھو گئی۔ ڈپلی کیٹ سے کام چلا لے گا۔“

”دیر کی گز۔ تم ذہن آدمی ہو۔“

”لیکن سب آدمی کو اول تو برا کام کرنا نہیں چاہیے مگر چہ ایسی چیز ہے جس کے لیے عزت ایمان بھی بیچ رہے ہیں لوگ۔ چوہاں کر رہے ہیں اور ڈاکے ڈال رہے ہیں اپنے ہی گھر میں۔ دیکھو جی۔ پیسہ میری بھی ضرورت ہے مگر میں اس کے لیے کوئی غلط کام نہیں کروں گا۔“

”یہ غلط کام نہیں، ملک اور قوم کی خدمت ہے۔ تم قانون کی مدد کرو گے“ میں نے کہا۔

”اس لیے تو میں نے ہاں کوئی جناب۔ مگر۔“

”مگر کیا۔ جو شک ہے دور کرو ابھی“ میں نے کہا۔

لے اور خطرے کے مقابلے میں یہ رقم بہت چھوٹی ہے۔ پوی
بچوں کا خیال آتا ہے کہ خدا انخواستہ میں مارا گیا تو وہ کیا کریں
گئے جتنا کما۔ ہوں اس میں گزارا کرتے ہیں مگر بچانے کے
نام پر ایک۔ نہیں۔ اب سوچنا ہوں کہ آپ جو دس وہ
انہیں بتائے خیر چیک میں ڈالتا جاؤں۔ کچھ تو ہو برے وقت
کے لیے ایک ہزار آپ کے لیے کچھ بھی نہیں۔ ایک
روپے کے برابر ہوں گے۔ وہ رک رک کے بول رہا۔
میں نے کہا "صاف اور کھل کے بات کرو۔"
"صاف بات یہ ہے جناب کہ آپ کون سا اپنی جیب
سے کچھ دو گئے سرکاری خزانے سے ہی ایک کی جگہ دو
دلو اور۔ آپ کی سفارش سے غریب کا بھلا ہو جائے گا۔ مینے
کے آٹھ ہزار ملین تو سال کے لاکھ بن جاتے ہیں۔"
میں سمجھ گیا کہ غریب آدمی لایچ میں سودے بازی کرنا
چاہتا ہے۔ اسے شاید دو جگہ ملازمت کر کے بھی چار ہزاری
ملے ہوں گے مگر وہ مجھ سے دگنی رقم انہیں کی فکر میں تھا۔
میں نے کہا "چلو ٹھیک ہے۔ دو ہزار ہر ہفتے مگر اس کے
بعد کام ہونا چاہیے۔ سولہ آنے میری مرضی کا۔"
اس کا چوہا کھل اٹھا "بالکل ہوگا جناب۔ کیوں نہیں
کریں گے آپ کی مرضی کا کام۔ آپ حکم کریں۔"
میں نے کہا "یہ بس مجھے بتئے جائے گی؟"
"ہیں وہ سہارا دے دے روانہ ہوگی" وہ بولا۔
"اور ڈرائیور کون ہوگا؟"
"ظلام علی مستان۔ جب خاص مال جاتا ہے تو وہی ہوتا
ہے۔ اس کے ساتھ ہوگا رحیم شاہ دیوانہ ان کی جوڑی
ہے۔"
"دیوانے مستانے کی کیا جوڑی ہے۔ خیر تم یہ دو ہزار
پکڑو" میں نے پرس میں سے ایک ہزار اور نکال لیے۔
اس نے دو ہزار لیے تو شاید خوشی سے اس کے ہاتھ
کانپ رہے تھے غریبی اور ضرورت مندی انسان کو کتنی کم
قیمت پر قابل فروخت بنا دیتی ہے۔ اس نے صرف دو ہزار
روپے ہفتے کے لیے کہنی کے ساتھ اپنی وفاداری کو ختم کر دیا
تھا اور اپنے فرض کو بھلا دیا تھا۔ اگر میں سچ خفیہ پولیس کا
افسر ہوتا تب بھی چوکیدار کی ذستہ داری یہ بھی کہ وہ ساری
بات مالکوں کو بتائے اور مجھ سے کسی قسم کی سودے بازی نہ
کرے۔ مجھے ایسی کوئی معلومات فراہم نہ کرے جس سے اس
کہنی کے مفادات کو نقصان پہنچے کا اندیشہ ہو جس کا ٹمک وہ
کھاتا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ انکار سے نقصان صرف اسے ہوگا۔
مالک اس کی فرض شناسی کا صلہ تعریف کے دو جملوں کی

صورت میں بھی ادا نہیں کریں گے وہ کہیں گے کہ اچھا
پولیس آئی تھی؟ ٹھیک ہے، ہم منٹ لیں گے ان سے اور
ضرورت پڑی تو ہمیں ملائیں گے اس بندے کی پہچان کے
لیے جو چھاپا مارنے آیا تھا۔
میں نے کہا۔ "کیا اب میں دیکھ سکتا ہوں کہ ان ڈیوں
میں کیا ہے؟"
اس نے سر ہلایا "ذرا خیال سے جناب! سیل لگی ہوئی
ہے اوپر۔"
میں نے کہا "فکرت کرو۔ میں احتیاط سے پہلے سیل کو
اتاروں گا اور پھر چکادوں گا۔"
سیل ایک گول کانڈ پر لگی ہوئی مگر تھیں جو ڈبے کے جوڑ پر
گوند سے چکادی گیا تھا۔ ڈبے پر اوپر کسی طرف ایک چھپا
ہوا کانڈ تھا جس پر کسی "سن رائزر کارپوریشن" کا نام اور پتا
لکھا ہوا تھا۔
ان سب ڈیوں کو کھول کے دیکھنا ایک مشکل کام تھا اور
اس میں مجھے اوجھا کھٹنا لگ جاتا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ جینم پہلے
ہی میرے لیے پریشان ہوئی کیونکہ عینیت سے مذاکرات میں
بھی پندرہ بیس منٹ گزر گئے تھے جینم کے لیے مزید اوجھا
کھٹنا میرے خاموش بیٹھ کے انتظار کرنا ناممکن ہوگا۔ اس کا
مجھے بخوبی اندازہ تھا۔ عینیت سے مال کو چیک کرنے کی
اجازت ملنے کے بعد میں نے بہتر سمجھا کہ جینم کو اپنی صورت
دکھانے کے مطمئن کر دوں کہ میں بالکل خیریت سے ہوں اور پھر
واپس آکے اطمینان سے اپنا کام کروں۔
مگر جینم کا خیال آیا تو مجھے یہ خیال بھی آیا کہ اس کے
بیک میں کبیرا ہوگا۔ وہ سارے مال کی تصویریں کھڑا پ میں
بنا سکتی تھی۔ اگر میں چوکیدار سے تصویریں بنانے کی اجازت
طلب کرتا تو وہ یقیناً انکار کر دیتا یا پھر اس اجازت نامے کے
خطرات کا بہت خطرہ معاوضہ مالک۔ رات کے وقت کبیرے کا
فلش بلیس کے اندر چمکتا تو اس کی روشنی شیشوں سے گزر کے
دور دور تک لوگوں کو متوجہ کرتی۔
میں اتفاق سے ہاتھ آنے والے اس موقع کو مٹوانا
نہیں چاہتا تھا۔ مال کی نوعیت معلوم ہو جانے سے ملک رب
نوازی کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ نہ جانے کتنے لوگ اس
کے کاروبار میں بالواسطہ طور پر شریک تھے ایک معمولی بس
ڈرائیور سے بیرون ملک کے بزنس پارٹنر تک یہ سیکڑوں افراد
کانیٹ درک تھا جس میں ہر شخص اپنی خدمات کا معاوضہ اپنی
حیثیت اور طاقت کے مطابق وصول کر رہا تھا اور یہ سب نہ
سہی ان کی اکثریت کو علم تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور کس کے

لے کر رہے ہیں۔ جس ہاتھوں سے گزر کے مال منڈی تک اور
پھر خریدار تک پہنچتا تھا وہ سب مال کی نوعیت سے پوری
طرح جانبر تھے۔
لیکن میں باہر کا آدمی اگر اس مال کی تصویریں حاصل
کر لیتا ہوں جو کسی خاص دن کو منڈ جانے والی بس سے بھیجا گیا
تو یہ ثبوت بڑی اہمیت کا حامل ہوگا اور اس سے ملک رب نواز
کے لیے پریشانی کے اسباب پیدا ہو جائیں گے کہ آخر وہ
اندرا کا آدمی کون ہے اور کہاں ہے جس نے کسی باہر کے آدمی
کو تصویریں اتارنے کا موقع فراہم کیا۔ پاکستان سے یورپ یا
امریکا اسمگل کئے جانے والے نوادرات ایک طویل اور
دشوار راستے سے گزر کر منزل تک پہنچتے تھے اور راستے میں
سیکڑوں جگہ مشکل مرحلوں کو آسان بنانے کے انتظامات اس
کاروبار کا ایک حصہ تھے۔ ملک رب نواز کہاں کہاں پوچھے گا
اور کس کس سے معلوم کرے گا کہ وہ اندرا کون تھا جس نے
پیسے کے قانون کی مدد کا فائدہ اٹھایا۔
اب رات کا ایک بج گیا تھا۔ کچھ فاصلے پر واقع ہوٹل
بھی خالی ہو گئے تھے اور ملازم کرسیاں میزیں اٹھانے میں
مصروف تھے۔ باہر کی ساری لائٹس آف کر دی گئی تھیں۔
گھروں کے روشن در سے بھی تاریخ ہو چکے تھے اور ہر طرف
رات کی دیرانی کا راج تھا۔
میں نے کہا "عینیت۔ میں ابھی ایک منٹ میں آتا
ہوں۔"
وہ کچھ متحکرم ہوا "کیا مسئلہ ہو گیا جناب عالی!"
میں نے کہا "مسئلہ کیسا۔ دراصل گاڑی میں میری
سیکرٹری بیٹھی ہوئی ہے۔ اسے تسلی دے آؤں۔ وہ ڈر رہی
ہوگی۔"
عینیت نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا مگر اس کا چہرہ
اندرا کی کشش کا آئینہ دار تھا۔ وہ کچھ خوف زدہ تھا اور کچھ
احساس کی طاقت کا شکار تھا۔ پیسے کی طاقت غالب تھی اور
دو ہزار لے کر واپس کرنے کا خیال خود اپنی شکست کی آواز بن
گیا تھا جو اتنی کمزور پڑ چکی تھی کہ سنائی بھی نہ دیتی تھی۔ اس کا
بچتا ابھی مجبوری اور ابے کسی کی سزا ہو گیا تھا۔
مجھے جا کے آنے میں پانچ منٹ بھی نہیں لگے۔ میں نے
کم سے کم الفاظ میں جینم کو ساری صورت حال سمجھادی اور
وہ اتنی EXCITED ہوئی کہ گاڑی کو لاک کے بغیر میرے
ساتھ چل پڑی۔ اس کے کبیرے میں بیش کی طرح قہم پہلے
سے موجود تھی مگر فلش کے لیے اس نے سبیل ڈالے اور
بولی "چلو۔"

"یہ گاڑی جس کا جی چاہے لے جائے؟" میں نے کہا
"چابی تک لگی چھوڑ دی ہے تم نے۔"
وہ مسکرائی "تو دیر سے میں ایکی تھی۔ کوئی مجھے لے
جاتا پھر؟"
میں نے کہا "تو اتنی تقدیر کو۔ بعد میں سوچنا کہ اس
سے تو بہتر تھا گاڑی ہی لے آتے ایک لاکھ کا تادان لانا مجھے
ادرا کر کے جاتا۔"
"یعنی صرف ایک لاکھ تادان کی چیز ہوں میں؟" وہ خفا
ہونے لگی۔
میں نے کہا "ہیرے کی قدر تو جو ہری جانتا ہے اور میری
نظر میں تمہارا کیا مول ہے؟ یہ پھر کبھی سوچ کے بتا دوں گا"
اب چلو۔"
عینیت نے دلچسپی اور تردد کے ساتھ جینم کو دیکھا۔ اس
کی دلچسپی ایک فطری بات تھی۔ تردد اس لیے تھا کہ ایک نہ
شدہ دو شدہ۔ اس نے کبھی پولیس یا خفیہ پولیس میں ایسی
ساحرانہ لڑکی کا تصور بھی نہ کیا ہوگا جیسے بی وی پر انگریزی
فلموں میں چوروں، بد معاشوں اور مجرموں سے مختص نظر آتی
ہیں۔ عینیت کی خاموشی سے اس کی فکر مندی کا اندازہ ہوتا
تھا۔
میں نے جینم کو مال کی طرف متوجہ کیا "یہ کسی سن رائزر
کارپوریشن کا مال ہے۔"
"اچھا! کیا بیچتے ہیں یہ سن رائزر کارپوریشن والے
سورج کی روشنی؟"
میں نے کہا "ابھی دیکھ کے بتاؤں۔"
میں نے سب سے اوپر والا ڈبہ اٹھایا۔ اس کا وزن اچھا
خاصا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق تین کلو سے بھی
زیادہ۔ اس کے اوپر اور نیچے جہاں جوڑ تھا، ایک انچ قطر کا
گول کانڈ چکادیا گیا تھا جس پر سن رائزر اور نصف دائرے
میں لکھا ہوا تھا اور سچ میں اوجھا سورج بنا ہوا تھا۔
میں نے نیچے والی سر کو احتیاط کے ساتھ ناخن سے کھج
کے ایک کنارے سے اٹھایا۔ یہ اٹھیکر پھر تھا۔ "یہ پھر چیک
جائے گی" میں نے عینیت کو مطمئن کرنے کے لیے کہا۔
"جناب عالی۔ کسی کو شک ہو گیا تو میرا خانہ خراب
ہو جائے گا۔ منٹے پڑ جائیں گے یہ دو ہزار۔" وہ بولا۔
میں نے کہا "میں نے ڈبے کے اوپر والی سیل کو نہیں
چھیڑا ہے۔ اول تو ڈرائیور کو شک نہیں ہوگا۔ آخر وہ پہلے بھی
مال چھوڑ کے جاتا رہا ہوگا۔ کبھی ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔
اس کے علاوہ ڈرائیور ڈیوں پر نظر ڈالے گا تو اسے اوپر والی
سیل سے متوجہ ہو جائے گا۔"

بیل بالکل ٹھیک نظر آئے گی۔ ڈبے بھی اپنی جگہ اسی طرح رکھے ہوں گے جیسے وہ چھوڑ گیا تھا۔

بیل کے اٹک ہوتے ہی میں نے ڈبے کو کھولا۔ اس کے اندر تین انچ لمبی اور دو انچ چوڑی گتے کی ڈیاں بھری ہوئی تھیں۔ ایک ڈیا پر لکھا ہوا تھا کہ اس میں آدھا انچ لیے کٹ اسکرپو ہیں۔ ان کی تعداد ایک گرس یعنی بارہ درجن تھی۔ دوسری میں ایک انچ لمبائی والے اسکرپو تھے۔ مجھے کچھ مایوسی ہوئی۔ میں نے ایک ایک کر کے دوسری ڈیوں کو دیکھا۔ ہر ڈیا میں کٹ اسکرپو تھے۔ آدھا انچ سے دو انچ تک مختلف سائز اور موٹائی کے کچھ لوہے کے کچھ پیتل کے۔

آدھا ڈیا خالی ہو جانے کے بعد میں نے وہ چیز دیکھی جس پر "ش" تھی۔ پلاسٹک کی دو پتلی شیٹوں کے درمیان جو رہی تھی۔ میں نے اس پر غور کئے بغیر جینم سے کہا "اس کی تصویر اتار لو فوراً۔"

جینم نے اس پر کمرے کو دھس کیا "یہ تو کسی جینم کی تصویر ہے۔ پھر غلطی چکا اور جینم نے کہا "تاپا کسی خریدار کو معائنہ کے لیے بھیجی جا رہی ہے۔ وہ دیکھ کے قیمت لگائے گا۔"

میں نے تصویر کو پھر پیل کی طرح پیک کر دیا "تصویر سے کون کیسے اندازہ کر سکتا ہے آخر؟"

"ماہرین کر لیتے ہوں گے۔ اس کے بعد اصلی چیز دیکھتے ہوں گے۔ یہ ایک طرح سے کیٹلاگ ہے۔ پہلے آپ دیکھ لیں کہ اس جینم سے آپ کو دلچسپی ہے یا نہیں؟ اصل نقل اور مالیت کا فیصلہ اس کے بعد۔"

عنایت کیمبرے کی فلیش لائٹ سے پریشان ہو گیا تھا۔ "فوٹو مت اتاریں جناب عالی! کوئی آجائے گا۔ یہ سمجھ کر کہ بس میں کہیں تار تو شارٹ نہیں ہوئے تھے۔ آگ سمجھ گادی کھینے والا۔"

میں نے کہا "کون ہے دیکھنے والا۔"

"آپ نے تصویر اتارنے کی بات نہیں کی تھی؟ عنایت بولا "صرف یہ کہا تھا۔"

میں نے کہا "میں ثبوت چاہیے مجرموں کے خلاف۔"

"مگر آپ نے بولا تھا کہ جب مال جائے تو بتاؤ۔ میں آپ کو اس کی اجازت نہیں دے سکتا جناب! "

"مگر تم سے کسی نے اجازت مانگی ہے؟" میں نے دوسرا ڈیا کھول لیا "دوسرا طریقہ یہ ہے کہ میں تمہیں اس مال کے ساتھ تھانے لے جاؤں اور یہ ڈبے وہاں کھولے جائیں گے۔ صبح تک کیس درج ہو جائے گا تمہارے خلاف۔ اصل مجرم

کون ہے اور پکڑا جاتا ہے یا نہیں؟ یہ بعد کی بات ہے۔ ممکن ہے ملک رب نواز اپنی جان بچانے کے لیے تمہیں قربانی کا بکرا بنادے۔ وہ خود آسانی سے ہاتھ آنے والا نہیں ہے۔ اس سے پہلے کہ تم اس کے خلاف گواہی دو یا کسی کو بچھڑاؤ تمہاری زبان بیش کے لیے خاموش کر دی جائے گی۔"

"میں تو بڑی مشکل میں پڑ گیا ہوں جناب! " وہ بولا۔

جینم نے پھر غلطی چکایا "یہ تو ہے۔ ہر صورت میں غریب آدمی پیلے مارا جاتا ہے۔"

میں نے کہا "لیکن قانون کی مدد کر کے تم بچ سکتے ہو۔"

"بچ کے کہاں جاؤں گا میں جناب! " وہ مایوسی سے بولا۔

"رہنا تو ادھر ہی ہے۔ یہ بڑے ظالم لوگ ہیں۔"

"مجھے بار بار بتانے کی ضرورت نہیں" میں نے کہا "تمہیں بھروسہ ہونا چاہیے ہم پر۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوگا اور یہ کوئی لمبا کام نہیں ہے جو سالہا سال ایسے ہی چلتا رہے گا۔ اگر تم ہمارے کام کے آدمی ثابت ہوئے تو ہمیں انعام الگ ملے گا۔ زمین یا کوئی مکان۔ نقد انعام اس کے علاوہ ہوگا۔ تم یہ نوکری چھوڑ سکتے ہو۔ گورنمنٹ کی نوکری بھی چھوڑ سکتے ہو۔ ہم تمہیں باہر بھجوا دیں گے۔"

اس کی آنکھوں میں پھر لالچ کی چمک اچنی "باہر کہاں؟" دینی؟

"ہاں۔ اگر تم دینی جانا چاہو۔ امریکا، کینیڈا۔ ہمارے لیے یہ معمولی بات ہے۔ حکومت کہیں بھی تمہارا سکتی ہے تمہیں۔"

میں نے پہلے ڈبے کو پوری احتیاط کے ساتھ بند کیا اور انٹیکر والی سیل پھر ایسے چسپاں کر دی کہ بہت غور سے دیکھنے والے کو شک ضرور ہو سکتا تھا مگر اصل بات یہ تھی کہ شک نہ ہو تو غور سے دیکھنے کی ضرورت کوئی محسوس نہیں کرتا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ دیوانہ اور مستانہ اسے مال کو اپنی جگہ باکے سیٹ پر سے اٹھائیں گے اور بس کے محفوظ خانوں میں منتقل کر دیں گے۔ کسی وجہ کے بغیر انہیں یہ خیال کیسے آ سکتا ہے کہ اوپر نیچے کی سیل کو چیک کریں۔

دوسرے ڈبے میں ایک اور فوٹو پرنٹ تھا۔ آٹھ انچ بارہ انچ کے اس پر نگین پرنٹ کو سخت پلاسٹک کی دو شیٹوں کے درمیان رکھنے کا مقصد حفاظت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ فوٹو پرنٹ پر لکیریں پڑنے اور خشکوں سے بچانے کے لیے یہ مٹاؤ اور کم خرچ طریقہ تھا۔ دونوں پلاسٹک شیٹیں کی مجموعی موٹائی پانچ چھ میٹر تھی اور گتے کی دو درجن ڈیاں اس کے اوپر تھیں تو اتنی ہی تھیں۔ شیت ایسے دہلی ہوئی تھی کہ فوٹو

پرنٹ مل بھی نہیں سکتا تھا۔

دوسرے فوٹو پرنٹ میں مختلف اشیاء دکھائی گئی تھیں جو یقیناً کسی میوزیم کے شویس کا حصہ تھیں۔ تیسرے اور چوتھے ڈبے کا سائز بڑا تھا۔ ان میں نٹ بوتل کی ڈیاں بھری ہوئی تھیں۔ نٹ بوتل بھی آدھا انچ سے دو انچ تک اور مختلف موٹائی کے تھے مگر اس کا حجم اور وزن زیادہ تھا۔ اس کے درمیان میں سے سگار باکس جیسا ایک انچ موٹائی کا آٹھ انچ لمبا چوڑا باکس برآمد ہوا۔

عنایت کی پریشانی جائز تھی مگر وہ یہ سمجھنے پر مجبور تھا کہ وہ آگے کواں پیچھے خندق والی پوزیشن میں پھنس گیا ہے۔ انکار کرتا ہے تو تھانے جانا پڑتا ہے اور مال اس کی تحویل سے برآمد ہونے کی صورت میں جرم براہ راست صرف اس کے کھاتے میں ڈال دیا جائے گا۔ اقرار کا نتیجہ کیا نکلے؟ یہ سوچ کے بھی وہ ڈرتا تھا۔ وہ ہمیں منع بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ لو اپنے دو ہزار اور چار سو۔ یا جو کارروائی کرنی ہے ملک رب نواز کی موجودگی میں کرنا۔ میں ان کو بلاتا ہوں۔ اس کو انعام کے لالچ نے کم اور باہر جانے کا موقع ملنے کے خیال نے زیادہ امیر کر رکھا تھا۔

جینم جب تیسری تصویر بنانے لگی تو عنایت نے کہا "بی بی صاحب! ایک منٹ ٹھہرو۔ ایسے تصویر مت بناؤ۔"

"پھر کیسے بنائوں؟" جینم نے کہا "سر کے مل کھڑے ہو کر؟ تم کیا سمجھتے ہو؟" جینم نے فوٹو گرافر ہو؟

عنایت نے باکس کو نیچے فرش پر رکھا پھر پچھلی سیٹ پر سے اپنا سیلا کھینچ اٹھا کے لایا جسے وہ چادر کی طرح سیٹ پر بچھائے سو رہا تھا۔ یہ اس نے دو سیٹوں پر پھیلا دیا کہ جینم کے سر پر چھت سی بن گئی۔ اس سے فلیش کی روشنی کے باہر پھیلنے کا خطرہ نہیں رہا۔

"ایسے لائٹ نظر نہیں آئے گی کسی کو؟" وہ بولا۔

"تم تو واقعی مجھ سے بڑے فوٹو گرافر ہو۔" جینم نے معذرت آمیز لہجے میں کہا اور بس کے فرش پر گھٹنوں کے مل بیٹھ گئی۔ اس نے ایک طرح سے کھینک کو اوڑھ لیا اور فلیش کی چمک غائب ہو گئی۔ سگار یا چولہی باکس جیسے ڈبے میں محل کی ٹیلی منظر پر تین پرانے کتے رکھے تھے۔ جینم نے ان کی تصویریں دونوں رخ سے اتاریں اور پھر سکوں کو پہلے والی پوزیشن میں رکھ دیا۔

دو ڈیوں میں سے زیادہ کارآمد چیزیں دریافت ہوئیں۔ ایک سنہرے نقشیں دستے والا خنجر تھا۔ اس پر بہت نفیس کام تھا اور جینم نے بعد میں بتایا کہ دستہ خالص سونے کا تھا اور

اس کے نقش و نگار میں فیہ سلطان کا نام سارے القاب و آداب کے ساتھ صاف پڑھا جاتا تھا۔ یہ بلاشبہ ایک انمول چیز تھی مگر مجھے اس کی اصلیت پر شک رہا۔ آٹھ انچ کا ایک صراحی جیسا کچھ بھی اصلی نہیں لگتا تھا۔ اس پر خطا کوئی میں قاری کا ایک قطعہ لکھا ہوا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کشمیر کے مہاراجا نے یہ انگریزوں کو سرانے کو دہلی دربار کے موقع پر نذر کیا تھا۔ اس میں یہ دعا بھی کہ جب تک واتر آئے اس جام سے سے خوشی کرے اس کے لیے ہر جام ایک جام صحت ہو۔

نیچے والے سب سے بڑے ڈبے میں مسابادہ کا ایک مجسمہ تھا جو تقریباً دو فٹ لمبا اور ایک فٹ چوڑا تھا۔ اس میں بدھ کو گلیاں کے آسن میں ڈھالا گیا تھا اور یہ نروان سے پہلے کی کیفیت تھی۔ مجسمہ یقیناً اصل تھا لیکن میرے خیال کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ حقیقت اس کے برعکس بھی ہو سکتی تھی یعنی جسے میں جعلی سمجھ رہا تھا وہی اصل ہو اور جو میری نظر میں اصلی تھا وہ جھلساڑوں کے کمال فن کا نمونہ ہو۔ اس کا فیصلہ ماہرین کر سکتے تھے۔ عام خریدار جو نوادرات اور ANTIQUE جمع کرنے کا ذوق رکھتا ہے۔ اپنے علم اور تجربے کے باوجود دھوکا کھا جاتا ہے۔ قدیم چیزوں کی اصلیت کا پتا چلانے کے سائنسی طریقے بہت پیچیدہ ہیں اور ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

جب ہم اس کام سے فارغ ہوئے تو رات کے دو بج رہے تھے میں نے ہر ڈبے کو اپنی اصل جگہ پر اسی ترتیب کے ساتھ رکھا جیسے غلام علی مستان رکھ کے گیا تھا۔ عنایت نے سکون کا سانس لیا اور میں نے رخصت ہونے سے پہلے پھر اسے تسلی دی کہ قانون کے ساتھ تعاون کر کے اس نے بڑی عقلندی کی تھی اور خود کو بڑی پریشانیوں سے بچالیا تھا۔ اب اس پر آج نہیں آسکتی اور حکومت کی طرف سے اس کی خدمات کے اعتراف میں جو کچھ ملے گا وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس پر خوش قسمتی کے سارے دروازے کھل گئے ہیں اور اس کا مستقبل روشن ہو گیا ہے۔

میں جانتا تھا کہ یہ سب جھوٹ ہے لیکن اس کے دل کو سکون دینے والے کسی خیال سے بھلائی کوئی گناہ نہیں تھا۔ ہم زیادہ سے زیادہ اسے نقد انعام دے سکتے تھے مگر اس کی ندراری کے سونے کا ملک رب نواز کو پتا نہ چلے، اس کی ضمانت فراہم نہیں کر سکتے تھے۔

گازی کی طرف جاتے ہوئے جینم نے خوش ہو کے کہا۔ "یہ تو بڑا کام ہو گیا آج۔"

”مگر صرف تصویریں اتار لینے سے کیا ہوگا؟“
 ”میں ابھی گھر جا کے یہ تصویریں تیار کرتی ہوں۔ صبح ہم آثار قدیمہ کے ماہرین کی رائے لیں گے اور پھر کوئی قدم اٹھائیں گے۔“ اس نے کہا۔
 ”کیا قدم اٹھائیں گے؟“

جنیم مجھے سمجھانے لگی ”دیکھو۔ ہم اس وقت پولیس کے پاس جا کے کوئی رپورٹ نہیں لکھوا سکتے۔ ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں۔ یہ تصویریں صرف تصویریں ہیں۔ میں پولیس کے آئی جی کو بھی اس معاملے میں بھروسے کے قاتل نہیں سمجھتی۔ خود آزاد صاحب اس کے سامنے یہ تصویریں رکھ کے اسے بتائیں کہ کوئی جانے والی بس سے یہ نوادرات اسمگل کئے جا رہے ہیں تو وہ بڑی فرض شناسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فوراً احکامات جاری کرے گا کہ اسی وقت بس پر چھاپا ملا جائے اور مال برآمد ہو تو اسے تحویل میں لے لیا جائے مگر اس کے بعد دو سرافون ملک رب نواز کو کرے گا کہ ایک گھنٹے میں مال غائب کر دو۔ ملک رب نواز آدھے گھنٹے میں بس کو غائب کر دے گا۔ پتا چلے گا کہ بس تو کسی ورکشاپ میں سروس کے لیے گئی ہے چنانچہ اخبار والے بکواس کرتے ہیں۔ کسی نے ان کو بیڑہ کھلایا ہے ملک کے خلاف ہم چلانے کے لیے۔ یعنی انہیں ہم پر الزام آجائے گا۔ خود فریڈی کا ملک رب نوازی کو وارنٹی کا اور بلیک میلنگ کا۔ ملک رب نواز بعد میں کچھ بھی کر سکتا ہے۔“

میں نے ایک آہ بھری ”سچ کہا تم نے۔ جدوجہد لا حاصل ہے۔ دنیا میں جھوٹ کا بول بالا ہے۔ سچ کا منہ کالا ہے۔“

”میں نے ایسا نہیں کہا۔“
 میں نے گاڑی کو اشارت کیا ”کیا تم نے نہیں کہا کہ کوئی قانونی قدم اٹھانے سے کچھ نہیں ہوگا؟“

”میں نے کہا ہے کہ یہ کام سوچ سمجھ کے عقل سے ہوگا۔“
 ”پھر تو مجھے ہی کرنا پڑے گا کیلے“ میں نے کہا۔
 اس نے میرے الفاظ پر غور نہیں کیا ”دیکھو بس جاتی ہے دوپہر بارہ بجے کم سے کم جو میں سمجھنے کا سفر ہو گا کوئی تنک ہمارے پاس کل کا پورا دن ہوگا۔ ہم ماہرین سے مشورہ کر سکتے ہیں کہ یہ نوادرات اصلی ہوں تو ان کی مالیت کیا ہوگی اور کیا تصویر دیکھ کے وہ کوئی فیصلہ کر سکتے ہیں۔ پاکستان میں لاہور، کراچی اور پشاور کے تین بڑے میوزیم ہیں۔ اگر کوئی طریقہ ہو کہ وہاں کے CATALOGUE سے تصدیق کی جاسکے یہ معلوم ہو جائے کہ کون سی چیز کہاں کی ہے؟“

”یہ ضروری نہیں کہ انہیں میوزیم سے چوری کیا گیا ہو۔ لوگوں کے پاس بھی قدیم تاریخی چیزوں کا بہت بڑا ذخیرہ گھروں میں محفوظ ہے اس کے علاوہ یہ ہو سکتا ہے کہ کسی میوزیم سے اصل چیز ہٹا کے نقل رکھ دی گئی ہو۔ تصدیق کیا خاک ہوگی، وہ کہیں گے کہ ہماری چیز ہمارے پاس محفوظ ہے اور اپنی جان بچانے کے لیے انہیں ایسا کہنا پڑے گا۔“

”ٹھیک کہتے ہو تم۔ یہ کام اتنی جلدی نہیں ہو سکتا۔ اگر میں لاہور میوزیم کو دیکھوں، پشاور اور کراچی میں اپنے نمائندے کو بھیج دوں۔ تب بھی تصدیق کی راہ میں سرکاری قاعدے اور ضابطے حائل ہوں گے کھلنا کرنے والے خود رکاوٹ بن جائیں گے۔ خیر۔“

”کیا خیر۔ ہم کچھ کر نہیں سکتے تو کیا خاموش بیٹھ جائیں۔ جانے دیں اس مال کو؟ یہ مال ہے چوروں کے لیے۔ ہمارے لیے ملکی خزانہ ہے ہمارا تمدنی ورثہ ہے ہماری ثقافت اور تاریخ ہے۔“

”افوہ! تقریر مت کرو۔ وہ سب معلوم ہے مجھے۔ پہلے میں پرنٹ بنائوں پھر جو کریں گے سب کے مشورے سے کریں گے۔“

”پرنٹ تم خود بناتی ہو؟“
 ”ہاں۔ میری لیبارٹری ہے۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ وہ بولی۔

”میرا خیال ہے کہ اب ملک رب نواز سے ہماری ملاقات بہت جلد ہوگی۔ ہم دشمنی میں ایک دوسرے کے بہت قریب آگئے ہیں۔“

جنیم نے کہا ”ہاں۔ ابھی تک اسے کچھ اندازہ نہیں کہ اس سے کون چکا لے رہا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اسے سب نقصان شاہ عالم کی وجہ سے ہو رہا ہے مگر شاہ عالم غائب ہے اور ملک صاحب اتنے وسائل رکھتے ہیں کہ باوجود اس کا سراغ لگانے میں ناکام ہیں۔“

میں نے کہا ”ابھی تک اس کے اور ہمارے درمیان اجنبیت کی ایک دیوار حائل ہے۔ ملک رب نواز صرف اندازہ کر سکتا ہے کہ دوسری طرف کون ہے جو دشمنی کے کھیل کا آغاز کر چکا ہے۔“

”ممکن ہے فیکا ہمارے بارے میں بتا دے۔“
 ”اگر وہ پکڑا گیا ہو تو یقیناً سب اگل دیتا لیکن میرا خیال ہے وہ سچ کے نکل گیا۔“ میں نے کہا ”پکڑا گیا فریڈ!“
 ”اسے غلط لوگوں نے غلطی سے پکڑ لیا تھا اور بے وقوف لوگوں نے بے وقوفی سے چھوڑ دیا۔“ جنیم بولی ”اصل بندے جو

فیکے کا انتظار کر رہے تھے“ فریڈ کو چھوڑ کے بھاگے تھے بلکہ اس سے جان چھڑا کے فرار ہوئے تھے۔“

میں نے کہا ”فیکا اب ان کے ہاتھ نہیں آنے والا۔ پہلے تو یوپی کی وجہ سے مجبور تھا۔ اب کوئی مجبوری ایسی نہیں رہی۔“

جنیم بولی ”کہیں وہ انتقام کے جذبات میں پاگل ہو کے خود ملک رب نواز کو قتل کرنے نہ پہنچ جائے۔“
 ”اگر اس نے ایسا کیا تو یہ خودکشی ہوگی۔ مجھے امید ہے کہ وہ اس کام کے لیے بھی ہم سے مدد مانگے گا۔“

آزاد صاحب کے گھر کے دروازے پر جنیم اتر گئی ”اب تم سیدھے گھر جاؤ گے اور کہیں نہیں۔“

میں نے کہا ”جو حکم سرکار۔ دیے بھی مجھے گھری جانا تھا۔ رئیس پریشانی میں مبتلا ہو کے جاگ رہا ہوگا۔“

”میں صبح تصویریں لے کر آؤں گی۔ آزاد صاحب کی ڈانٹ ڈپٹ کا نشانہ کرنے کے بعد“ وہ ہنسی اور چال سے تیار کھول کے اندر چلی گئی اور چند سیکنڈ بعد پھر آئی ”اب کیوں کھڑے ہو؟“

میں نے کہا ”اگر میں گاڑی میں کھڑا ہوا نظر آتا ہوں تمہیں تو غالباً تھپوٹا ہے میرا۔ میں بیٹھا ہوا تھا۔“

”اور انتظار کس کا کر رہے تھے؟“ وہ ہنسی۔
 ”ظاہر ہے تمہارا۔ مجھے میرے دل نے کہا تھا کہ غصہ“ وہ پھر آئے گی۔ ”خیر، صبح تک شب بخیر۔“ میں نے کہا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

”جی نہیں۔ صبح بخیر صبح تک۔“ اس نے کہا اور ہاتھ ہلا کے غائب ہو گئی۔

یہ بے مقصد باتوں والا ایک عام سا جذباتی ”رومانی سین“ تھا۔ میں نے وہی ڈائلاگ بولے جو جنیم سننا چاہتی تھی۔ میں کہہ سکتا تھا کہ گاڑی بند ہو گئی تھی اور اسے پھر اشارت کرنے میں چند سیکنڈ تو لگتے ہی ہیں۔ تم یہ فضول سوالات کرنے دوبارہ کیوں آئی ہو مگر میں نے ایسا نہیں کہا۔ مجھے اس کی دلدادگی کا خیال بہت وقت رہنے لگا تھا۔

پہلے میں اس کے سامنے محبت کا اظہار کرتا تھا یا محبت کے نظریات پر بات کرتا تھا تو اس کا مقصد جنیم کے اعتماد کو قائم رکھنا ہوتا تھا۔ اسے یہ احساس دلانا ہوتا تھا کہ ناصر عظیم وہی شاہ عالم ہے چنانچہ میرے جذبات اس کے لیے بدل نہیں سکتے۔ اسے مایوسی کے نفسیاتی دباؤ سے بچانے رکھنا ضروری تھا۔ میں نے اسے ذہنی تیش کے دورے اور نرمیوں پر ایک ڈاؤن سے محفوظ رکھنے کے لیے بہت جھوٹ بولے تھے۔ ایک

جھوٹ کا راز فاش نہ ہو اس کے لیے دس جھوٹ اور بولے تھے۔

مگر اب جھوٹ ایک سچ بنتا جا رہا تھا۔ میں خود اپنے پھیلائے ہوئے جال میں گرفتار ہوتا جا رہا تھا۔ جنیم سے محبت کا ڈراما میری زندگی کی ایک حقیقت کا انداز اختیار کر رہا تھا اور میرا دفاع پہلے ہی اتنا کمزور تھا کہ ہر گزرنے والے دن کی رفاقت کے ساتھ جنیم کی جیت ہو رہی تھی۔

اگر چندا نے میرا اسی طرح ساتھ دیا ہوتا۔ میں نے ایک آہ بھجی کہ سوچا۔ تو میں اتنا کمزور نہ پڑتا۔ کاش اس کی بدگمانی کی کوئی انتہا ہوتی۔ میں نے اپنی خطائیں۔ اپنے گناہ کا اعتراف کیا۔ اپنا جرم قبول کیا۔ اس سے ہر طرف معافی مانگ لی مگر اس نے تو حد کر دی کہ خانہ کی سفارش کو بھی میرا ایک ڈراما قرار دیا۔ بلاشبہ ان کا ذرا سی دیر کے لیے ہوش میں آئے مجھے معاف کرنا ایک غیر معمولی اور ناقابل یقین واقعہ تھا مگر چندا نے میری قسم کو بھی میری بیانی کی دلیل نہیں مانا۔ وہ مجھے بھونکا سمجھتی رہی اور مجھ سے پہلے سے زیادہ بدگمان ہو گئی کہ میں اس کا جذباتی استحصال کرنے کے لیے اس کے بہتر مرگ پر بے ہوش پڑے ہوئے باپ کا نام استعمال کر رہا ہوں۔

میرے رشتی کے ساتھ شاہ عالم کے گھر میں رہنے اور جنیم کے شاہ عالم کے مراسم کی خبروں نے اسے واقعی مجھ سے متنفر کر دیا تھا۔ اس کی اور جنیم کی چاہت میں بھی فرق سب سے بڑا تھا۔ چندا کتنی تھی کہ تم میرے ہو تو کسی اور کا نام بھی تمہارے نام کے ساتھ کیوں آئے۔ تم ناصر عظیم ہو تو شاہ عالم کیسے ہو سکتے ہو۔ اس کے برعکس جنیم کو اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ اس کا محبوب شاہ عالم شادی شدہ ہے۔ اس کی رشتہ منجمدی اور عیاش فطرت سے منسوب داستانوں کو جنیم نے بھی اہمیت نہیں دی اور اپنی محبت میں رنگ یا حسد کی مٹی کس ہی نہیں رکھی۔ وہ بے تحاشہ طور پر شاہ عالم کو چاہتی تھی تو اس چاہت میں بدگمانی کے جذبات اس کے لیے بے معنی ہو گئے تھے۔ وہ آج بھی شاہ عالم کے لیے پوری نیک نیتی کے ساتھ اور جسم و جان کی ساری محبوی کے ساتھ واقف تھی۔ اسے نہ شاہ عالم کے نام سے سروکار تھا نہ اس کے ماضی سے اور نہ مستقبل کے کسی اندیشے سے۔ وہ حال کے ہر لمحے میں اس کے ساتھ تھی اور اس کے لیے تھی۔ چنانچہ میں رشتی کا شوہر بننے سے توجہ کیا تھا مگر جنیم کی محبت سے بے دور رہ سکتا تھا جو کمزوری کے جالے کی طرح ہر وقت میرے گرد لپکتی جاری تھی۔

میں وہ کھرا اسکے تھا جسے چندا نے کھوٹا جان کے پھینک دیا تھا اور جنہم نے کھوٹا سمجھتے ہوئے بھی قبول کر لیا تھا۔ میں نے جنہم سے غلط نہیں کہا تھا کہ محبت ایک دو عمل ہے۔ خیالات اور جذبات کا سلسلہ دل سے نہیں، دماغ سے ملتا ہے۔ احساس ایک شعوری عمل ہے۔ محبت میں بے اعتنائی، بے رخی اور بے عزتی والا نفرت کا رویہ کب تک وفا کی آزمائش سمجھا جاسکتا ہے؟ نخل آرزو کی آبیاری نہ ہو، الٹا اسے زہر اکو پیانی ملے تو وہ کیسے زندہ رہ سکتا ہے۔

چند اے مجھے بے اعتدائی میں بار اور اس بار کو اپنی جیت سمجھ لیا جبکہ میں اس کا اعتماد بحال کرنے کی ہر کوشش میں اپنے آپ سے ہارا۔ جنہم کبھی باری نہ تھی۔ وہ بار کے مضموم سے نا آشنا تھی چنانچہ بیش جیت اسی کی ہوتی۔ آن میں اس کی جیت کو تسلیم کرنے پر مجبور تھا۔

شادو مجھے دنیا میں تھا چھوڑ گئی تھی۔ چندا نے مجھے جذبات کی دنیا میں اکیلا کر دیا۔ میں اکیلا نہیں جی سکتا تھا اور مر بھی نہیں سکتا تھا۔ کوئی مجھ پر بے وفا کی کی فرد جرم کیسے عائد کر سکتا ہے۔

رکھیں خانے تک پہنچتے ہوئے میرے خیالات کی رو محبت اور نفرت کے دو جہز کا شکار رہی۔ ماضی اور حال کے درمیان بہتے ہوئے وقت کا دریا انہی دو کناروں میں متقیہ تھا جس میں میرا وجود ایک جھکے کی طرح تھا۔ مجھے اپنی تقدیر پر اختیار کیسے حاصل ہو سکتا تھا۔

رکھیں جاگ رہا تھا۔ حسب توقع اس نے میرا استقبال ایک ایسے پاس سے کیا جس میں میرے لیے سنسکری زد میں آنے والے القاب و آداب زیادہ تھے اسے میں نے خندہ پیشانی یعنی ڈھٹائی کے ساتھ مسکراتے ہوئے سنا۔

”وہ عورت برباد کروے گی تجھے“ اس نے ہالّا خرکھا۔ میں نے کہا ”ہر عورت ہر مرد کو ہالّا خر برباد کر دیتی ہے مگر اس کا پتا چلتا ہے برباد ہونے کے بعد۔ عرف عام میں اسے خانہ آبادی کہتے ہیں۔“

وہ تھک گئے جینہ گیا۔ ”یار“ میں شام سے ان چار دیواریں میں پاگل کئے کی طرح پکر لگا رہا ہوں۔ اگر میری ٹانگوں کے درمیان عیسکی کا میز ہو تا تو پتا چلتا کہ میں نے لاہور سے تیخو پورے تک سفر کیا ہے۔

میں نے کہا ”اگر تو سو جانا تو خواب میں پورے پاکستان کا پیدل سفر کر سکتا تھا۔ جسکے بغیر گمراہ بھی نہ لگتا۔“

”اے“ سارا دن سوئے اور روئے ہی میں تو گزارا ہے میں نے قسم اللہ کی، آج ان سب کی بڑی یاد آئی مجھے ہائے

کیا کیا چیزیں تھیں جو اپنی لائف میں وائف نے آئیں اور دل میں ناف گھونپ گئے چلی گئیں۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

”دس بارہ تو میں نے بھی دیکھی تھیں اور یاد میں مجھے کیا جانداری چیزیں تھیں۔ دو سو پاؤں سے کم کی کوئی بھی نہ تھی۔ جلیبی، امرنی، برنی اور بالو شاہی۔ کیا ٹھیکے شیرا پکاتے نام تھے آخری وہ تھی۔ دس ملائی۔“

”اے نہیں۔ وہ ریزی تھی۔ آج سارا دن اس کی یاد کے مروڑا گئے رہے پیٹ میں۔ سالی نے اپنے باپ سے پڑایا تھا مجھے۔“

”یار“ محبت میں تو ایسا ہوتا ہے۔ دیکھ بھول کتنا خوار ہوا۔ فریاد کا کیا حشر ہوا۔ اس کے ملاوٹ۔ ہر عبرت ناک عشق کا انجام تیرے حق میں خوش قسمتی بن گیا، پوچھ وہ کیسے؟“

اس نے مجھ پر کہا ”یار“ کیسے؟“

”وہ ایسے کہ جلیبی مل جاتی تھی تو امرنی کیسے ملتی۔ برنی کھانا رہتا ساری عمر تو بالو شاہی کے مزے سے محروم رہتا۔ دس ملائی پر رک جاتا تو ریزی نصیب نہ ہوتی۔ طوائی کی پوری دکان کھائی تو نے۔“

”اے فضول بکواس مت کر۔ یہ بھی سالی کوئی زندگی ہے اپنی۔ بس اب سوچ لیا ہے میں نے۔ ایک دل اپنا کتنی بار ٹوٹا ہے۔“

”چودہ بار۔ آخری اطلاعات کے مطابق ریزی سے پہلے تیرہ تیرے اربابوں کو بلڈوز کر کے اور تیرے عشق پر روڈ ورک چلا کے چاچکی تھیں۔ ایک سے ایک ہوئی ویٹ۔“

”دیکھ یار۔ اپنی پسند ایسی ہی ہے۔ یہ خشک چھوڑے جیسی آج کل کی لڑکیاں تو بس بڈوں کی مالا ہوتی ہیں۔ نری چڑی۔ اپن کو عادت ہے قوم ربر کے اسرنگ والے گدے پر سونے کی۔ ان سب کے جسم بھی بڑے گشن والے تھے مگر یہ ریزی تو قسم اللہ کی، ڈبل قوم تھی۔“

”ہاں باقی بیٹنیں تھیں تو یہ جتنی تھی۔ ہاتھی جتنا کھاتی تھی اور ویسے ہی پٹھانڈی بھی مگر تجھے پسند ہے تو نہیں کیا۔ ہم تو سمجھ لیں گے کہ تو نے ایک ساتھ چار کر لیں۔ شرع کی گنجائش کے مطابق۔“

”یار“ مذاق مت اڑا میرے جذبات کا۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ سر سے کفن باندھ کے جاؤں گا اس کے باپ سے ملنے۔“

”لو کے پٹھے پھر پٹ کے آئے گا۔ یاد ہے نا، کیسے

خون کا پھلوان بھائی تھے اس کے“ میں نے کہا۔

”بس پیارے“ اب تو جان کی بازی لگادی۔ اس بار اسنے ساتھ بھرا ہوا ریوالور لے کر جاؤں گا۔ اس کے باپ سے تم کوں گا کہ بلائی دینی دختر ایک اختر کو۔“

میں نے کہا ”دختر ایک اختر، جاہل کی اولاد۔“

”اے ہاں وہی۔ جب وہ آئے میرے سامنے بیٹھ جائے گی تو میں اس کے باپ کو کوچ میں بٹھا کے کوں گا۔“

”چل شروع کر نکاح۔ نکاح کیا ہوتا ہے؟ بس ایک بار پوچھ لیا کہ قبول ہے۔“

رکھیں نے افسردگی سے سرولایا ”نہیں پیارے۔ اپن زور زبردستی کے قائل نہیں۔ میں ریوالور دے دوں گا اس کے باپ کے ہاتھوں میں کہ یا مجھے کوئی مار دے ورنہ میں ریزی کو مار دوں گا اور خود چڑھ جاؤں گا چچائی۔“

”یار“ ایک چواکس اور بھی ہے۔ اگر ریزی اسنے باپ کو کوئی مار دے یا یہ کام تو کرے۔ پھر کون ہو گا راستے کی دیوار بننے والا۔ تم دونوں ہاتھوں میں بائیں اور آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہٹے گاتے نکل جانا۔ دیا دی اس گھر سے جتنے بندہ نہ بندے دی ذات ہو۔ علاقہ غیر کی طرف۔“

”چھوڑ یار۔ تو میریں نہیں ہے۔ یہ ہا، اکیلا کیوں آیا ہے واپس؟ گئے تھے جن، مجھے بڑی فکر ہو رہی تھی۔“

میں نے کہا ”کبھی بات ہے یار۔ صبح بتاؤں گا۔ ابھی تو سوتا ہے مجھے۔ دیکھ تین دن رہے ہیں گھڑی میں۔“

”ٹھکن سے میرا حال تھا۔ میں کرتے ہی جو سو یا تو آٹھ مچ دس بجے بھی یوں کھلی کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں کسی گھنے جنگل سے گزر رہا ہوں اور موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ اوپر سیاہ بادل ہیں اور بارش کی خوشبو سے جو درختوں سے پھوٹ رہی ہے، پھر جیسے برق سی لہرائی اور فضا میں جلتی رنگ بنتے لگی۔ خواب اچانک ٹوٹ گیا اور میں نے آنکھیں کھول کے دیکھا کہ جنہم مجھ پر جھپکیں رہی ہے۔ اس کے سنہری جھلک دینے والے براؤن ہلکے بال پھسل کے چہرے پر ایک طرف آگئے ہیں اور بادل کی طرح مجھ پر سایہ فگن ہیں۔ یہ شیشو کی اور ہینر اسپرے کی اور جنہم کے بدن کی خوشبو بھی جس نے مجھے سمور کر دیا تھا اور خواب میں لہرائے والی بجلی کی چمک اس کی نگاہ میں تھی اور جلتی رنگ اس کی ہنسی تھی۔ اس کے ہاتھ میں پانی کا ٹوٹا تھا۔“

میں گھبرا کے اٹھ بیٹھا ”تم کب آئیں اور یہ کیا کر رہی ہو؟ سارے کپڑے بھگ گئے ہیں میرے۔“

وہ ہنسی ”حد کرتے ہو تم بھی۔ آگے گھٹنے سے تم پر

”ہاں۔ ابھی دو گھنٹے ہیں بس کے روانہ ہونے میں۔ تم چاہو تو بات کر لو ان سے۔ فریڈ تو خیر پولیس والا ہے مزاج اور

”ہاں۔ ابھی دو گھنٹے ہیں بس کے روانہ ہونے میں۔ تم چاہو تو بات کر لو ان سے۔ فریڈ تو خیر پولیس والا ہے مزاج اور

باقاعدہ چھڑکاؤ ہو رہا ہے۔“

”اچھا“ اب تو جاگ گیا ہوں میں۔“

اس نے لونا مجھ پر اندھیل دیا۔ ”چلو غسل بھی بیس کرلو۔ کم سے کم منہ دھل گیا ہے۔ اب تم میرے ساتھ ناشتا کر سکتے ہو۔ چلو اٹھو فوراً۔“

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا ”اگر تم چاہتی ہو کہ میں اسی چیلے میں ناشتے کی میز پر نظر آؤں تو ٹھیک ہے۔“

رکھیں نے صبری حالت پر بڑی مسرت کا اظہار کیا ”اٹھ گیا مرادہ کلر زہ کے۔“

میں نے کہا ”ہاں۔ یہ قیامت جو آگئی تھی۔“

”ہم نے تو مت کہہ کہ آخری گھوڑا بھی بیچ کے سوا تھا۔ اب اسے اللہ ہی اٹھائے گا۔“ رکھیں بولا ”مگر جنہم نے کہا کہ لاؤں کے بھوت باتوں سے نہیں جانتے۔“

”میں نے تو اٹھنا انتظار کیا۔ رکھیں کو تصویریں دکھائی رہی۔ تم بھی دیکھو“ اس نے بیگ میں ہاتھ ڈالا۔

میں نے کہا ”میں اصل چیزیں دیکھ چکا ہوں۔ تصویر بعد میں دیکھوں گا۔ تم نے اتاری ہیں تو اچھی ہی آئی ہوں گی۔“

رکھیں نے کہا ”یار“ اس بے چارے سے فیکے کا بڑا افسوس ہوا۔“

میں نے کہا ”افسوس کیا؟ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ شرافت اور انسانیت سے کسی نے کبھی واسطہ نہیں رکھا۔ خود فیکا کل تک ملک رب نواز کے لیے یہ سب کرنا تھا۔ جو آج اس کے ساتھ ہوا۔“

”اس کی بیوی تو بے قصور تھی۔“

”جیسے بیوی بچوں کا خیال ہو وہ ایسے دھندے میں نہیں پڑتا۔ وہ ایک غرض سے ہمارے پاس آیا تھا اور غرض ہوگی تو پھر آئے گا۔ ہم اسے اپنا بندہ دیا دوست سمجھنے کی غلطی نہیں کر سکتے۔ وہ گھر کا بھیدی ہے۔ ہم اسے رب نواز کے خلاف ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

جنہم نے کہا ”معلوم ہے میں نے کیا سوچا ہے؟“

میں نے کہا ”معلوم ہے۔ وہی میں نے بھی سوچا ہے مگر چلو تم بتا دو۔“

”وہ مسکرائی ”صبح میں نے فریڈ کو فون کیا۔ رخصتی سے بھی بات ہوئی۔ وہ کوئے جانے کے لیے تیار ہیں۔“

میں نے حیرانی سے کہا ”وہ کوئے جارہے ہیں؟ اسی بس سے؟“

”ہاں۔ ابھی دو گھنٹے ہیں بس کے روانہ ہونے میں۔ تم چاہو تو بات کر لو ان سے۔ فریڈ تو خیر پولیس والا ہے مزاج اور

فطرت کے اعتبار سے۔ ساری بات سن کے فوراً راضی ہو گیا۔ رخصتی کو خود اس نے منایا کہ کوئٹہ میں باڑا مارکیٹ ہے جہاں غیر ملکی مال کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ چلو، شاہنگ کر کے آتے ہیں۔ تقریب بھی ہو جائے گی کام کے ساتھ۔

”تم نے فون پر اسے ساری بات بتائی؟“

”ہاں۔ سب اچھی طرح سمجھا دیا۔ عنایت سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں اور اس مال کے بارے میں بھی بتا دیا جو ہم نے بقلم خود دیکھا۔“

”ہم نے نہیں۔ میں نے دیکھا۔ تمہاری مخالفت کے باوجود۔ فرید نے اور تم نے تو اسے میرا وہم قرار دیا تھا۔“

”جھگڑنے کا“ وہ وہم تو تھا۔ آدمی کوئی نہیں بیٹھا ہوا تھا سیٹ پر۔“

”تمہاری طرح میں بھی وہم مان کے نظر انداز کر دیتا تو اتنی اہم بات معلوم نہ ہوتی“ میں نے کہا۔ ”یہ بتاؤ۔ تم نے آزاد صاحب سے بات کی؟“

”ہاں اور حسب توقع انہوں نے مجھے پھر یاد دلایا کہ میں ایک لڑکی ہوں اور اس قانونیت کی جانب مہمزن معاشرے میں صحافت بھی کوئی محفوظ پیشہ نہیں تھا کہ میں نے شر لاک ہو مزی جانشینی اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے گویا۔ ملک رب نواز جیسے لوگوں کے خلاف اعلان جہاد فرمانے سے پہلے مجھے اور میرے ساتھ بیٹھ کے تمہیں ٹھنڈے دماغ اور گرم دل کے ساتھ۔“

”گرم دل کے ساتھ؟“

”جیہم نہیں“ ہاں۔ ان کی مراد تھی گرمی جذبات ساتھ۔ یہ سوچنا چاہیے کہ کہیں کتنے کی دم کو سیدھا کرنے کی کوشش میں ہم خود تیز نہ ہو جائیں۔ آخر کیا ضرورت ہے کہ کتنے کی دم کو سیدھا کرنے کی جب کہ خود کو اس تیز مہم۔ مطلب یہ تھا کہ رب نواز کا ہم کچھ نہیں لگا سکتے۔“

”کمال ہے۔ آزاد صاحب جیسا آدمی بھی اگر یہ سمجھانے لگے کہ خرابی ہے تو اسے ٹھیک کرنے کی کوشش سے کوئی فائدہ نہیں۔ کہاں گیا ان کا جذبہ جہاد اور ان کی اصول پرستی کا فلسفہ۔“ میں نے کہا۔

”جھگڑنے کا“ صحبت آدمی کو بزدل بنادیتی ہے۔ اس کی سوچ کو بدل دیتی ہے۔ وہ میرے معاملے میں جذبات سے سوچتے ہیں۔“

”چھوٹی کے آنے سے یہ فرق ضرور پڑا تھا کہ کھانے کا معیار پہلے کے مقابلے میں بہت بڑھ گیا تھا۔ جب تیس مارخان پارٹ ٹائم باورچی، شو فر، چوکیدار اور ہاؤس کیپر کے

فرائض اکیلے سرانجام دیتے تھے تو اپنی پوری توجہ کے ساتھ کچھ نہیں کر پاتے تھے۔ چھوٹی نے اسے طور پر جن اور گھر کے اندر کی ذمہ داریاں خود ہی سنبھال لی تھیں اور اپنی ضرورت کے حق میں ایک جواز فراہم کر دیا تھا۔ آج ناشتہ کی میز اس کی صارت اور خوش انتظامی کا ثبوت واضح طور پر نظر آیا تھا۔ اب وہ پوریاں سن رہی تھی اور تیس مارخان کھانے کی میز سے کہیں تک دوڑ لگانے میں مصروف تھا۔ ابھی وہ میز تک پہنچا ہی تھا کہ چھوٹی کچن سے نکل مارتی تھی۔ ”ارے کہاں جا کے گر گیا مراد۔“ اور وہ ادھر جہاں تھا ہم آواز لگاتے تھے ”یار۔ تیس مارخان پوریاں ختم ہوئیں۔“ وہ ایک وقت میں دو پوریاں لانا تھا جو تیس کھانے والے دو فلوں میں ختم کر دیتے تھے۔ دوڑتے دوڑتے اس کا سانس پھول گیا تھا لیکن وہ فرض اور محبت کے تقاضے پر ہی حوصلہ مندی سے پورے کر رہا تھا۔ ایسے ہی شگنی سروں کے دوران میں اس نے ایک فون کال بھی ریسیو کی اور فون کا ریسیور ایک طرف رکھ کے چلا یا ”صاحب۔ فرید عباسی صاحب کا فون تشریف لائی۔ آپ فوراً گفت و شنید فرمائی۔“

”کچن سے چھوٹی نے چلا کے کہا۔“ ارے کیوں جی رہا ہے کم بخت۔ کیا کسی دیوار سے ٹکرا گیا اندھ۔ جھٹ گرجی تھی پر۔“

”میں نے دوسرے کمرے میں جا کے ریسیور اٹھالیا۔“ ہاں کیا ہوا۔ گھر سے نکل رہے ہو تم؟“

”اس نے کہا۔“ اپنے کمرے سے بات نہیں کر رہا ہوں میں۔“

”اچھا۔ بس اسٹینڈ پر ہو۔ بڑی جلدی پیچ لگے۔“

”یار۔ میں پڑوسی کے گھر میں ہوں۔ ہم سب کو ٹھکانا پڑا وہاں سے۔“

”میں نے کہا۔“ ٹھکانا پڑا۔ کیوں؟ خیریت تو تھی؟“

”یار۔ خیریت ہوتی تو ہم ایسے فرات نہ ہوتے۔ رخصتی تو خیر آسانی سے دیوار پر چڑھ کے دوسری طرف اترتی لیکن اماں کے لیے مشکل تھا۔ میں نے انہیں چڑھایا اور۔ دوسری طرف رخصتی تھی۔ سنبھالنے کے لیے مکر وہ آٹھ فٹ کی دیوار پر سے گر گئیں۔ رخصتی کے اور۔ خدا کا شکر ہے زیادہ چوٹ نہیں آئی انہیں مگر رخصتی کے ایک بازو میں غالباً فریج پھیر ہو گیا ہے۔ بہت تکلیف میں ہے وہ۔“

”میں نے کہا۔“ یار۔ یہ سب کیا ہے؟“

”اب فکر کی کوئی بات نہیں“ فرید بولا۔ ”یہ اتفاق تھا کہ آج میں انہیں نہیں گیا۔ ہم کوئی جگہ کی تیری کر رہے تھے۔ میرا تو بس ایک بیگ تھا۔ رخصتی نے سوٹ کیس بھر لیا

تھا۔ عورتوں کی عادت کے مطابق۔ یہ بھی چاہیے۔ وہ بھی ضروری ہے۔ حالانکہ صرف دو دن کی بات تھی۔ میں نے سوچا کہ اماں کو ان کی ایک دوست کے گھر پہنچا دوں۔ وہ قریب ہی رہتی ہیں۔ اماں کے ایک بہت عزیز دوست کی بیوہ ہیں۔ دیکھا تو باہر ایک شخص ٹیلی فون کے کھبے پر چڑھ کے مار کٹ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پلاز تھی۔ وہ بندر کی طرح کھبے سے چمکا ہوا تھا۔ خیر فون ٹھیک کرنے والے لائن میں سب اسی طرح کام کرتے ہیں مگر اس نے کھٹ سے مار کٹ دیا اور پیچھے اتر آیا۔ یہ میں نے اندر سے دروازہ کھولے بغیری دیکھ لیا تھا۔ کھڑکی کے شیشے سے ٹیلی فون پول نظر آتا ہے۔ بس میں کھٹک گیا۔ میں نے دوسری طرف سے جا کے دیکھا تو دروازے کے سامنے ایک جیب میں چار آدمی بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک کال ٹیل بجا رہا تھا۔ میں نے رخصتی کو اور امی کو کہا کہ وہ پچھلی طرف چلی جائیں اور خود دیوار کے کمرے دروازے تک گیا۔ اتنی دیر میں جیب نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ کال ٹیل بجانے والے نے اپنا تعارف کرایا کہ وہ فلاں روزنامے کا چیف رپورٹر ہے اور سابق مسز شاہ عالم نے اسے انٹرویو کے لیے بلایا تھا۔ اس کے اعتماد اور مذہب مجھے نے مجھے کنفیوز کر دیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ یہاں کیسے پہنچا اور اسے کس نے بتایا کہ شاہ عالم کی بیوی یہاں رہتی ہیں۔ وہ کہنے لگا کہ مجھے تو اخبار کے ایڈیٹر نے بھیجا ہے یہاں۔ ان کی بات ہو چکی ہے مسز شاہ عالم سے۔ ان کا نام رخشہ ہے۔ آپ ان سے تصدیق کر لیں، اگر چاہیں۔ میں بن بلایا مسمان نہیں ہوں۔ میں نے پوچھا کہ تم کس کے ساتھ آئے ہو؟ وہ کہنے لگا کہ کسی کے ساتھ بھی نہیں۔ ویسے عام طور پر انٹرویو کے لیے جاتا ہوں تو ایک فوٹو گرافر بھی ساتھ ہوتا ہے مگر یہاں میرے ساتھ کسی کی ASSIGNMENT نہیں تھی۔ میں نے کہا کہ کیا تم اس جیب میں نہیں آئے تھے جو یہاں کھڑی تھی؟ وہ حیران ہو کے بولا کہ کون سی جیب۔ آج تو میری موٹر سائیکل بھی خراب پڑی تھی۔ میں بس سے آیا ہوں۔ میں نے کہا کہ اچھا تم پر آمدمے میں بیٹھو۔ میں مسز شاہ عالم کو بتاتا ہوں۔ وہ جیسے ہی تیار ہوں گی تمہیں اندر بلا لیا جائے گا۔ اسے پر آمدمے میں بٹھا کے میں پیچھے گیا جہاں میری اماں اور رخصتی کچھ پریشان کھڑی تھیں۔ دراصل مجھے کئی باتوں نے شک میں مبتلا کیا۔ ایک تو جیب کے سوال پر اس کی حیرانی۔ جیب اس کے پیچھے کھڑی تھی اور وہ انجان بن رہا تھا پھر اس نے بس سے آنے کی بات کی۔ اخبار والے اگر کسی رپورٹر کو بھیجتے ہیں تو یہ نہیں کہتے کہ بس سے جاؤ اسے کم

سے کم رکشا، ٹیکسی کا کرایہ ضرور دیا جاتا ہے۔ یہاں قریب کوئی بس اسٹاپ بھی نہیں ہے۔ میں نے رخصتی سے پوچھا کہ کیا اس نے کسی اخبار والے کو انٹرویو کے لیے بلایا تھا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ میں سمجھ گیا کہ بڑے منظم طریقے پر وہ گھر کے اندر داخل ہوئے ہیں اور ان کے اس طرح آنے کا مقصد صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ وہ رخصتی کو اٹھا کر لے جانے کے لیے آئے تھے۔ میں نے سب سے پہلے رخصتی کو اور اماں کو کہا کہ وہ دیوار کے اوپر سے پیچھے والے گھر کے احاطے میں اتر جائیں۔ میں خود ان سے غمناک چاہتا تھا مگر ایک تو مجھے رخصتی نے اور اماں نے ہاتھ جوڑ کے اور آنسوؤں سے روک کے جانے نہیں دیا۔ مجبوراً مجھے بھی ان کے ساتھ ہی دوسری طرف کودنا پڑا پھر اماں کے کرنے سے رخصتی کو چوٹ آئی تو اسے سنبھالنا بھی ضروری تھا۔ بسائے الگ پریشان ہوئے کہ یہ معاملہ کیا ہے؟ ایک کریمین فیملی رہتی ہے یہاں۔ میں نے انہیں بتایا کہ ہمارے گھر میں ڈاکو آگئے ہیں۔“

”اور جو رخصتی کا انٹرویو لینے آئے تھے کیا وہ تمہارے گھر میں بیٹھے ہیں؟“

”نہیں۔ وہ خاموشی سے بھاگ گئے ہیں۔ میں نے پہلے پولیس کو فون کیا اور خود دیوار کے کمرے سے گیا تو دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ رپورٹر کی اولاد وہاں نہیں تھا جہاں میں نے اسے بٹھایا تھا۔ اسے پتا چل گیا ہو گا کہ ان کی پلاننگ ناکام چوہٹ ہو گئی ہے۔ گھر والے زیادہ چالاک ثابت ہوئے اور خطرے کی بوس گھم کے بھاگ گئے۔ ظاہر ہے اس کے بعد وہ گھر سے تو پکڑے جاتے۔“

”کیا وہ گھر میں داخل ہوئے تھے؟“

”ہاں۔ انہوں نے سب کمروں میں گھوم پھر کے دیکھا۔ اندر انہوں نے غصے اور ناکامی کی جھنجھاہٹ میں بہت توڑ پھوڑ کی۔ لی وی توڑوا گرا کہ انماری کے اور شوکیس کے شیشے توڑ دیے۔ وہ جلدی میں نہ ہوتے تو شاید گھر میں پھیرول چھڑک کر آگ لگا جاتے۔“

”تو کتنی دیر بعد واپس گیا تھا؟“

”آٹھ منٹ لگ گئے تھے مجھے۔ آٹھ منٹ بہت ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ جیب میں تین چار افراد ہوں گے۔ جیب انہیں اماں کے کسین چلی گئی۔ وہ دیوار کے ساتھ چھپ گئے یا شاید اندر باغ میں آگئے۔ جب فرار ہونے کا وقت آیا تو غالباً پیدل ہی گئے یا مگن ہے انہوں نے جیب کو پھر بلایا ہو۔ ان کا آپس میں انٹر کام پر رابطہ ہو۔“

”میں نے کہا۔“ یہ تو خاصی تشویش کی بات ہے۔“

صاحب بھی فراہم کر سکتے ہیں۔
 "تصویر وہ کیس سے بھی حاصل کر لے گا" خبیم بولی۔
 "اسے بتاؤ کہ کسی غیر معروف سی ماڈل کے ساتھ شاہ عالم کو جوڑو۔ اگر لباس عروسی میں ہو سیم تو کیا کہنا۔ اگر شاہ عالم سوٹ میں ہو تو یہ تصویر شادی کے موقع کی ہو سکتی ہے۔ ماڈل کا نام بدلا جاسکتا ہے تاکہ کوئی اس کا سراغ نہ لگا سکے۔"

"یہ سب بعد میں سوچیں گے پہلے لی وی کو تصویر بنالینے دو۔ ہمارے واپس آنے تک لی وی یہ کام کر لے گا" خبیم نے کہا اور فون کی طرف چلی گئی۔
 ریکس بدستور تشویش میں مبتلا رہا۔ "یار آخر تم لوگ اس بس کے ذریعے سفر کیوں کرنا چاہتے ہو؟ کیا مقصد ہے؟" میں نے کہا "مقصد بست وفتح ہے ہم دیکھیں گے کہ وہ مال کون لے جا رہا ہے۔ راستے میں مال کیس اتارا گیا تو معلوم ہو جائے گا۔ یہ ضروری تو نہیں کہ مال کو کنڈ شہر کے بازار میں اتارا جائے مال خفشار میں کسی اور کے حوالے کیا جاسکتا ہے یا کوئٹہ سے پہلے کیس بھی کوئی اسے وصول کرنے آسکتا ہے ہم خاموشی سے سب دیکھتے رہیں گے۔" "خاموشی سے" ریکس طنزیہ لہجے میں بولا "تم خاموش بیٹھ سکتے ہو ایک ساتھ۔ ایک سیر تو دو سوا سیر۔ اسے صحافت کی خارش ہے اور وہ کچھ شپ کرنے یا کیرے سے شوٹ کرنے کے چکر میں پڑی رہے گی۔ تجھے ہاتھوں میں کھلی ہوگی کہ کسی سے دو دو ہاتھ ہو جائیں۔"

میں نے کہا "نہیں یار۔ ہم ابھی دخل در معنولات کا رسک نہیں لے سکتے۔ صرف دیکھنا چاہتے ہیں کہ یہ پرنس کس روٹ پر چل رہا ہے اور چلانے والے کون ہیں۔ کوئٹہ میں مال کس کے پاس جاتا ہے پھر آگے۔" "یار تم یہ سب دیکھ سکتے ہو؟ کوئی دیکھنے دے گا تمہیں؟ اور جب تم دیکھو گے تو کیا تمہیں کوئی نہیں دیکھے گا؟ شک کی نظر سے دیکھنے والا بھی ٹھنک جاتا ہے انہیں جو یہ کام کرتے ہیں انہیں پران کی نظر ہوتی ہے کہ کیس سرکاری مجربہ ہو۔ دشمن کا آدمی نہ ہو۔"

میں نے کہا "تو ٹھیک کہتا ہے مگر پھر وہ مارا کہ ہم۔" اس نے فنی میں سر ہلایا "تم ایسے نہیں جاسکتے۔" "پھر کیسے جائیں؟ جانا تو ہے ہمیں" میں نے کہا۔ "یار تمہیں بھی چلوں گا تمہارے ساتھ۔" "تیری طبیعت ابھی اس قابل نہیں۔" ریکس نے کہا "بالکل ٹھیک ہوں میں۔"

میں نے کہا "یار رکھیں۔ تیرا ایک یا دو تھاجر ایملڈ۔ تیری پرانی پنٹال چونکڑی میں وہی ایک کام کا تو می تھا۔ انیسکڑ نہ بیک بن کے خوب ڈرائے کرتا تھا۔" "اس کی یاد کیسے آگئی اچانک؟" میں نے کہا "اس کے ڈرائے جاری ہیں یا تو یہ کمرل اس نے؟"

"انیسکڑ پولیس بن کے حرامی بن کرنا چھوڑا ہے اس نے۔ سالا پکڑا گیا تھا ایک بار۔ کب تک نہ پکڑا جاتا۔ تو خود سمجھ لے کہ تھانے میں اس کا کیا حال ہوا ہوگا لیکن پھر بھی جیل جانے سے بچ گیا۔ اپنی ان دونوں مرحوم مندرال کے ساتھ تھے۔ سیاسی سفارش چلی گئی۔"

میں نے کہا "پھر بھی اس نے کوئی شرافت کی زندگی نہیں شروع کر دی ہوگی۔"

"اے کیا ہوتی ہے یہ شرافت کی زندگی؟ کون گزار رہا ہے شرافت کی زندگی۔ شرافت علی خاں کے سوا۔ ہم تم سب اپنی اپنی فیلڈ میں چھوڑا افسانہ یا چھپا ہوا حرامی بن ضرور کر رہے ہیں۔ یہ بتا کام کیا ہے؟"

میں نے کہا "اگر دو ایک بار ہماری خاطر پھر وردی پس کر تیرے ساتھ آجائے۔" "کہاں آجائے؟"

"چھاپا مارنے" میں نے کہا "فرید عباسی کے پاس تو ابھی تک وردی اور شناختی کارڈ سب محفوظ ہیں۔"

"وہ کرے گا یہ جعلی کام؟"

میں نے کہا "جعلی کام ایک اصلی مقصد کے لیے ہے جو قانونی طریقے سے نہیں پورا ہوتا۔ اگرچہ چھاپا مار کے مال برآمد کرنا ہو تو اس کے لیے پولیس کارروائی اور مجسٹریٹ کا ساتھ ہونا وارنٹ اور مسیح نفری سب چاہیے اور میاں ابھی کانڈی کارروائی شروع ہوئی تو ان کو خبر مل جائے گی۔"

"اگر فرید مان گیا تو جبرے کو میں لے آؤں گا مگر بس تو جانے والی ہے ایک گھنٹے میں۔ تمہاری سیٹ کا کیا ہوگا؟"

"ہم اس کی جگہ سفر کریں گے۔ رشتی اور فرید عباسی کی سیٹ ریزرو تھی۔" میں نے کہا "ہم پندرہ منٹ پہلے پہنچ جائیں گے ابھی تاہم ہے۔"

"تو بات کر لے فرید سے۔"

"کہاں بات کروں؟ وہ تو پرنس سے بول رہا تھا۔ اس کی اپنی فون لائن کاٹ دی گئی تھی۔" میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ تو خود چلا جا۔"

"یار میں قائل نہیں کر سکتا اے۔"

میں نے کہا "قائل کیا کرتا۔ میرا اور خبیم کا پیغام پہنچا رہا۔ کہہ دینا وہ جاتے ہوئے کہ گئے تھے تم تینوں بس کے پیچھے لگ جاؤ۔ بس کے مقابلے میں کاربست تیز رفتار ہوئی ہے۔ تم اگر دو گھنٹے بعد بھی چلو گے تو آگے نکل جاؤ گے۔ جہاں موقع ملے بس رکوا لیتا۔ بہت لمبا راستہ ہے پوری رات کا سفر ہے۔"

"مگر انہوں نے بس نہ روکی۔ پھر خطرہ دیکھتے ہی وہ بھاگنے کی کرتے ہیں اور تین افراد کی پولیس پائی ہو تو تازنگ سے بھی نہیں چوسکتے ان کے پاس خطرناک اسلحہ ہوتا ہے۔"

"یار بڑول مت بن۔ جنگ اسلحہ سے نہیں عقل سے جیتی جاتی ہے اور گولی چلانے کی نوبت ہی کیوں آئے۔ یہ تو بس ہے مگر نے والے علی بین پستول سے ہوائی جہاز کو اغوا کر چکے ہیں۔" میں نے کہا۔

"تم بس کو پانی جیک کر دے؟"

میں نے کہا "وہ بھی ناممکن نہیں ہے مگر جو کام آسمان طریقے سے کیا جاسکتا ہو اسے مشکل طریقے سے کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اب تو میرا پلان سن۔ یہ خیال ابھی ابھی میرے ذہن میں آیا ہے۔ تم تینوں کے پاس موبائل فون ہوگا۔ ہمارے پاس بھی ہوگا۔ ہم آپس میں رابطہ رکھ سکتے ہیں۔ میاں سے تم جب بھی چلو ہمیں بتا دو۔ ہم خبیم بس کی پوزیشن سمجھاؤں گے۔ تم اسی کے مطابق فاصلہ رکھ کے چلتے رہو۔ پانچ کلومیٹر کا فاصلہ رہنا چاہیے ہمارے درمیان کم سے کم بیچ چار سے پانچ کے درمیان ہم دیکھیں گے کہ مناسب جگہ کون سی ہے۔"

"یہ مناسب جگہ کیا ہوتی ہے؟"

"جہاں دونوں طرف سے آنے والی ٹریفک کم ہو۔ مداخلت کا کوئی امکان نہ ہو۔ گشت کرنے والی پائی وے پولیس یا اسمگلرز کو چیک کرنے والی کوئی گاڑی نہ گزرے۔ ویسے تو وہ بھی اسمگلرز کے اپنے ہی بندے ہوتے ہیں۔ پرنس یا پرنسز جاسکتے ہیں مگر وہ چھاپے کی کسی غیر متوقع کارروائی میں دخل اندازی کر کے ہمارا پلانا بھیل بگاڑ سکتے ہیں۔ صبح کے پہلے پرنس سب مسافر تینہ سے بے حال ہوتے ہیں۔ بیشتر بے سدھ پڑے ہوتے ہیں یا اونگھ رہے ہوتے ہیں۔ ڈرائیور جاگتا ہے لیکن وہ بھی بہت ایزی اور RELAXED ہوتا ہے۔ مناسب جگہ اور مناسب وقت پر میں بس کو رکوا لوں گا۔"

"اے کیسے رکوالے گا؟ مگن پوائنٹ پر؟"

"نہیں۔ تم مجھے ایک فون کر دے۔ میں فون کی گھنٹی سن کے ہی شور مچا دوں گا۔ چلانے لگوں گا کہ بس میں ہم ہے۔ جو پھٹنے والا ہے۔"

ریکس اچھل پڑا "اے یار کیا دھماکے والا آئیڈیلا ہے۔"

میں نے کہا "بس لازمی رک جائے گی۔ مسافر بد خواص ہو کر چیختے چلاتے سامان چھوڑ کے بھاگیں گے۔ یوٹی بچوں کو گھسیٹ کر دور لے جائیں گے۔ ڈرائیور کنڈیکٹر کی کوئی نہیں سنے گا۔ خواہ اس اطلاع کو شرارت قرار دیں۔"

خبیم نے "جو فون کر کے فاصلہ ہو گئی تھی" فنی میں سر ہلایا "ایک بہت بڑی خالی ہے اس پلان میں۔"

میں نے کہا "کیا خالی ہے؟"

"اول تو ڈرائیور اور کنڈیکٹر ہی ساتھ ہی بھاگ جائیں گے مسافروں کے فرض کہ تم نے کہا کہ فون کرنے والے نے آدھے گھنٹے کا ٹائم رہا ہے تو سب ایک گھنٹہ اور چھپ کے بیٹھے رہیں گے۔ درختوں کی اوٹ میں اور زمین پر اوندھے پڑے دھماکے کا انتظار کرتے رہیں گے۔"

میں نے کہا "میں دس منٹ کا وقت دوں گا۔"

"اوکے وہ آدھا گھنٹہ انتظار میں گزار دوں گے پھر انہیں یقین آنے لگے گا کہ اطلاع غلط تھی۔ کسی نے شرارت کی ہوگی مگر پھر بھی کچھ لوگ ڈریں گے کہ ٹائر غلط نہ ہو۔ دس منٹ میں پھٹنے والا ہم آدھے گھنٹے بعد بھی پھٹ سکتا ہے۔ کچھ بھادر اور خدا پر بھروسہ رکھنے والے لوگ پہلے انہیں گے ان میں ڈرائیور، کنڈیکٹر بھی ہوں گے جن کو بس کے سفر میں ہونے والے اس غیر معمولی گزیر پر سب سے زیادہ تشویش ہوگی اور وہ چاہیں گے کہ جلد از جلد لوگ واپس آکے بیٹھ جائیں تو بس آگے روانہ ہو۔"

"بالکل ٹھیک مگر خالی جس کا تم ذکر کر رہی تھیں۔"

خبیم نے کہا "پہلے بات سنو میری۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ڈرائیور اور کنڈیکٹر سب سے پہلے اٹھ کر آئیں اور تلاشی لیں اسباب کی پھر لوگوں کو یقین دلائیں کہ سب ٹھیک ہے۔ ہم کہیں بھی نہیں ہے۔"

"رائٹ اسی وقت یہ لوگ آجائیں گے۔ ڈرائیور اور کنڈیکٹر کو پنڈ زاپ کرائیں گے اور اسکل کیا جائے والا سب سامان اپنے قبضے میں کر لیں گے۔ سارا سامان باہر نکال کے کھولا جائے گا اور اصل چیزیں یہ لوگ اپنی گاڑی میں رکھ لیں گے۔"

خبیم نے کہا "فرض کرو سب ایسے ہی ہوتا گیا۔"

تسماری توقعات کے مطابق ڈرائیور کلینر نے مزاحمت نہیں کی۔ مسافر دور کھڑے قماش دیکھتے رہے پولیس پائلٹی یعنی رئیس، جیڑا اور فرید نے۔ اس سنگت کا سامان اپنے قبضے میں لے لیا۔ اس کے بعد کیا ہو گا؟

”کچھ نہیں۔ وہ چلے جائیں گے۔“
”یعنی پولیس ملازموں کو پکڑے گی نہیں؟ اسٹنٹر گرفتار نہیں کئے جائیں گے؟ اور ڈرائیور کلینر ان کے جانے کے بعد کچھ نہیں کریں گے۔ بے وقوفوں کی طرح کھڑے دیکھتے رہیں گے۔“ جنم ہنسنے لگی۔

”اسیں اندازہ ہو جائے گا کہ چھاپا جعلی تھا۔ محاورے کے مطابق چوروں کو پڑ گئے مور۔“

جنم بولی ”اگر انہوں نے پیچھے سے فائرنگ کی۔۔۔ پھر؟“
”ان کے پاس اسلحہ چھوڑنے کی غلطی کی تو ایسا ضرور ہو گا۔ ان کا سارا اسلحہ ہلے رکھا یا جائے گا۔ تلاشی اس کے بعد ہوگی۔ رئیس فرید اور جیڑے کو کافی وقت مل جائے گا۔ وہ بس میں کار کا تعاقب نہیں کر سکتے۔ لوگوں کے بیٹھتے بیٹھتے آواٹھنا ویسے ہی گزر جائے گا۔“

جنم نے کہا ”چلو یہ بھی ٹھیک مگر جب بس چلے گی تو ہمارا کیا بنے گا۔ ہم کی اطلاع ہمارے موبائل فون پر دی جائے گی تو یہ سوال سب سے پہلے اٹھے گا کہ ہمارا فون کس جہاں مار پولیس پائلٹی کو کیسے معلوم ہوا؟ ممکن ہے بس میں موبائل فون کسی اور کے پاس بھی ہو مگر کتنی ہمارے فون کی بجائے۔ اطلاع ہم دیں گے تو کیا سمجھا جائے گا؟ یہی کہ ہم نے بس کو روکا ان کے لیے یہ ڈراما کیا تھا اور ہم درحقیقت اس جعلی چھاپا مار پائلٹی کے ساتھ ہیں۔ ڈرائیور اور کلینر نہیں، سارے مسافر ایسا سمجھیں گے۔ ہم کی جھوٹی اطلاع سے خوف و ہراس پھیلانے کے جرم میں ہم پکڑے جائیں گے اور بعد میں ملک رب نواز ہم سے پوچھے گا کہ ہم کس کے ایجنٹ ہیں؟ کس کے کہنے پر ہم نے اس کے مال پر ڈاکا ڈالنے والوں کا ساتھ دیا؟“

میں نے کہا ”تمہاری بات میری سمجھ میں آئی۔“
رئیس سرٹانے لگا ”اے یہ تو بڑی غلطی ہوگی۔“
میں نے کہا ”یار، میرے ذہن میں واقعی یہ بات نہیں تھی مگر اس سے پلان نہیں بدلتا۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ہم بھی انہی کے ساتھ نکل جائیں۔“

”ہماری شناخت بعد میں ہو جائے گی۔ معلوم کرنے والے معلوم کر لیں گے کہ رشتی اور فرید کی جگہ کس نے سزا کیا تھا؟“

میں نے کہا ”اس لیے دوسری ترکیب یہ ہے کہ ہم موبائل بند رکھیں گے اور سچ چار پانچ بجے کے درمیان جب لوگ سو رہے ہوں گے، اسے میں بیگ سے نکال کے آگے رکھ آؤں گا۔ کسی اور مسافر کی سیٹ کے پاس یا پھر دروازے کے قریب ڈال دوں گا۔ دروازہ مضبوطی سے بند ہوتا ہے اور وہیں کلینر بیٹھا ہوتا ہے۔ وہاں ایک وانز کو لرا اور گاڑاں بھی رکھے جاتے ہیں۔ میں پانی پینے کے برائے جانے کے لیے کام کر سکتا ہوں۔ ظاہر ہے اس کے بعد فون کی کھنٹی بجے گی تو جتنی چلی جائے گی۔ بلاخر کوئی فون اٹھائے گا۔ جب فون کا مالک ہونے کا اقرار کوئی نہیں کرے گا تو ممکن ہے کلینر ہی فون اٹھالے پھر اطلاع وہ دے گا سب کو۔ اس وقت عقل سے کام لیتے ہوئے کلینر یا کوئی اور خاموش نہیں رہ سکتا۔ وہ ایک فطری رد عمل کے طور پر چلائے گا۔ بس میں ہم ہے۔ دس منٹ میں پچھنے والا ہے۔“

جنم نے ایک اور اعتراض کیا ”بعد میں پتا چل جائے گا کہ فون رئیس کے نام پر ہے۔“

”رئیس نے یہ فون بازار سے خریدا تھا۔۔۔ سکشن رئیس کے نام پر نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

رئیس نے اعتراف کیا۔ ”ہاں۔ ہم جیسے لوگ اپنے اصل نام اور پتے کو چھپانے کے لیے فون فرضی نام سے لیتے ہیں۔“

”لیکن اس کے لیے شناختی کارڈ بنا پڑتا ہے۔“

”میرے پاس چار شناختی کارڈ رہتے ہیں ہر وقت۔“

رئیس بولا ”دو یا پورٹ بھی ہوتے ہیں۔“

میں نے کہا ”چلو اب نکلو ورنہ بس کی سیٹ کینسل ہو جائے گی۔“

”میں تمہارے پلان سے پوری طرح مطمئن نہیں ہوں۔“ وہ بولی۔

میں نے کہا ”یہ کوئی فاسٹ پلان نہیں ہے۔ ابھی ہم صرف ایک جائزہ مشن پر جا رہے ہیں۔ اگر اس پر عمل درآمد میں فطرہ محسوس ہوا تو ہم کچھ نہیں کریں گے۔ اس کے علاوہ ہمارے پاس مزید سوچنے کے لیے وقت ہے، سولہ سترہ گھنٹے۔“

جنم نے صرف ایک چادر لیٹی جس میں اس کا وجود پوری طرح کیو فلاج ہو گیا۔ وہ ایک قدامت پرست اور وضعدار قسم کی پردہ دار عورت نظر آنے لگی۔ چادر نے اس کے سر اور چہرے کو پوری طرح چھپایا اور کالے شیشوں والے چشمے کے پیچھے اس کی آنکھیں بھی غائب ہو گئیں۔ میں نے دل ہی دل میں اعتراف کیا کہ اس طرح خود کو چھپانے

پائیس چوہیں گھنے گزرا تا یقیناً مشکل کام تھا۔ خود میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ ٹوپی اور لباس مجھے رئیس نے پہلے ہی فراہم کر رکھا تھا۔ شلواری قبضے کے ساتھ مجھے بغل سے گزار کے کندھے پر ڈالنے کے لیے سندھی اجرک بھی مل گئی اور ٹوپی لگا کے میں کوئی سندھی دھڑا نظر آنے لگا۔ یہ کڑھائی اور شیشے کے کام والی ٹوپی اجرک سے بچھ کر تھی اور اس کا سامنے والا حصہ پیشانی پر تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔

میں نے ایک بریف کیس میں کپڑوں کا ایک جوڑا اضافی رکھا تاکہ نیچے میں نقد رقم کو چھپا سکوں اور ایک خطرناک قسم کے رویو لاکر جو مجھے رئیس نے دیا تھا۔ جنم کے بیگ میں اس کے روزمرہ استعمال کا سامان تھا۔ پاکٹ سائز نیپ ریکارڈر، کیمرا اور ایک زنانہ ہتھول۔ میک اپ کا تھوڑا بہت سامان اور کچھ نقد رقم۔ وہ اپنے لیے کپڑوں کے دو جوڑے لینے کے لیے جاری تھی مگر میں نے روک دیا تھا۔ ہمارا اتنا جانا تین چار دن کی بات تھی اور استعمال کے لیے ریڈی میڈ گہڑے کو کون سے بھی خریدے جاسکتے تھے۔

رئیس ہمیں گاڑی میں چھوڑنے بس اسٹینڈ تک گیا ”یار، تو نے بڑی جلدی میں پروگرام بنالیا۔ خیر اللہ مالک ہے۔ بار بار اپنی تیرے ساتھ ہیں مگر دیکھ، یہ بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ ذرا بھی گزربھوئی تو مارے گئے سب بیٹا۔ جو قدم اٹھانا سوچ سمجھ کے اٹھانا۔ بلاوجہ مصیبت کو گلے مت لگانا۔“

میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا ”بس کر میرے باپ۔ میں کوئی گاؤں کا سادہ لوح نوجوان نہیں ہوں جو تعلیم کے لیے سات سمندر پار ولایت جا رہا ہوں۔“

جنم ہنسنے لگی ”پرانے وقتوں کے بزرگ دل لگا کے پڑھنے کی نصیحت سے زیادہ کہیں دل نہ لگائے کی نصیحت کرتے تھے۔“

”اور امام ضامن باندھنے کے باوجود شکر رہتے تھے کہ لونڈا واپس آئے گا یا وہیں کسی میم کی زلفوں کے جال میں پھنس کے رہ جائے گا۔“

رئیس بولا ”مغربی میم کی فکر نہیں ہے مجھے۔ وہ تیرے ساتھ ہی جاری ہے مگر تیری طرف سے پھر بھی اطمینان نہیں ہے۔“

”آخر کیوں نہیں ہے اطمینان۔“

”اس لیے کہ تو بننا ہے عقل میں افلاطون۔ اپنی تو خیر اوقات ہی کچھ نہیں تھی تیرے سامنے مگر تو جنم کی بھی نہیں سنے گا۔“

میں نے کہا ”یار، میں خدا کو حاضر نظر جان کے وعدہ

کر سکتا ہوں کہ عقل کی بات اگر جنم کے دماغ میں بھی آئی تو اس کی ضرورتوں کا حالانکہ ایسا آج تک مجھے بھی ہوا نہیں۔ عقل مند کی ہر بات میں ہی کرتا رہا۔“

”آپ کی عقلندی تو اسی خوش نصیبی سے عیاں ہے۔“ جنم جمل کے بولی۔

میں نے کہا ”رئیس خان صاحب، بس یہاں سے ہمارے اور آپ کے راستے جدا ہوتے ہیں پھر ملیں گے اگر خدا والا ورنہ میدان حشر میں دیکھ لیتا۔“

رئیس نے گاڑی روک لی ”جنم میں جانے والوں کی لائن میں؟“

”تمہارا آگے جانا ٹھیک نہیں۔ کسی نے ہمارے ساتھ دیکھ لیا تو بعد میں نہ پہچان جائے کہیں۔“ جنم بولی۔

”یہاں سے بس کے اڑے تک ہم پیدل جاسکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”یہاں سے میں جاتا ہوں۔ سیدھا فرید عباسی کے پاس۔ اس کے بعد اپنے بار جیڑے کی طرف۔ تم فکر مت کرو۔ فرید عباسی نے خیرے کے تب بھی ہم ضرور آئیں گے۔“

ایک دو بندے اور ہیں بھروسے کے قاتل۔ سب پوری طرح مسلح ہوں گے۔ جیڑے بجا دیں گے اگر کسی نے مقابلہ کیا۔“

جنم نے کہا ”اس کی نوبت نہیں آتی چاہیے۔“

”نہیں آئے گی انشاء اللہ۔ اس الو کے نیچے کا خیال رکھنا اور اپنا بھی۔“ رئیس نے بڑے بزرگانہ انداز میں جنم کے سر پر ہاتھ رکھا۔

جنم مسکرائی ”تم تو ایسے دواغ کر رہے ہو مجھے جیسے میں بیا کے دیس سدھاری ہوں۔“

”وہ دراصل۔ اپنی نہ کوئی بہن تھی نہ بھائی تھا۔ ساری زندگی ہم ایک دوسرے کے ساتھ ایسے رہے جیسے جڑواں بھائی ہوتے ہیں۔ جو پیدا کس سے ایک ساتھ ہوں۔ جب سے تم نے بھائی کہا ہے تو یہ سالا اپنا دل بھی بدل گیا ہے۔ ناصرم سے زیادہ خوش قسمت تھا۔ اسے بت پہلے قرع جیسی بہن مل گئی تھی۔ پوچھو اس سے یہ کتنا فکر مند رہتا ہے اس کے لیے۔“

میں نے کہا ”یار، تو نے مجھے ہی فکر میں مبتلا کر دیا۔“

”اے کیا کہہ دیا ایسا میں نے؟“

میں نے کہا ”دیکھو۔ تو نے مجھے جڑواں بھائی قرار دیا۔ میں نے اعتراض نہیں کیا۔ لیکن اب جنم کو بس بنالیا تو نے تو بڑی گھڑ بھجائے گی۔ میرے اور اس کے رشتے میں۔“

جوابی کارروائی کے طور پر میں بڑی کو بس بتاؤں گا۔“

”یہ تم جا کے بنگلہ کلرک سے پوچھ لو۔ میں نے تو یہی سنا کہ ملک صاحب فرنٹ سیٹ خالی ہے جناب!“ جنم بولی۔
”میں نے دیکھ لیا ہے کہ وہ سامان کہاں رکھا گیا ہے۔“
”ڈرائیور کو خشک تو نہیں ہوا؟“ جنم بولی۔
”بالکل نہیں۔ اس نے کپیل اٹھا کے نیچے دیکھا تک نہیں کہ سامان ہے یا نہیں۔ کلینر نے ڈبے لاکر میں رکھ دیے۔ روز ایسا ہی ہوتا ہوگا۔“

سامان رکھے جانے کے بعد بھی بس کا گیت بند رہا تو لوگوں نے ہنگامہ شروع کیا کہ سوا بارہ بج گئے ہیں۔ بس کب روانہ ہوگی۔ ڈرائیور نے انہیں تسلی دے گئے ٹال دیا کہ ابھی چلتے ہیں۔ انتظار کرنے والوں کے لیے اب ایک ایک

محی الدین نواب کے قلم سے طویل ناول

اندھیرنگری

چار جلدوں میں مکمل

قیمت فی جلد 150 روپے | حصول ڈاک 40 روپے

- ایکشن اور سسپنس کا نہ رکنے والا سلسلہ
- آپ کی رگوں میں لہو گرما دے گا
- پوری دنیا پر حکمرانی کرنے والے
- ”خفیہ ہاتھ“ کی سازشوں کا حال
- بھارتی خفیہ ایجنسی ”را“ کی پاکستان
- میں تخریبی کارروائیوں کی داستان
- پاکستان کو گدھوں کی طرح نوچنے
- والے سیاستدانوں کی شرمناک داستان

”آئی ایم سوری۔ یہ مطلب نہیں تھا میرا۔“
میں نے کہا ”میرا خیال تھا کہ تم پوچھو گی شریک سفر کے بارے میں؟“
”وہ تو مجھے نظر آ رہی ہے“ جنم نے کہا ”گھور رہے ہو۔“
میں نے کہا ”کتنی پریشان ہے بے چاری۔ اسے سیٹ نہیں ملی غالباً۔“
”اس کے باپ کو دکھا ہے۔ کیسا خونخوار ہے۔“ جنم بولی۔

”ڈرائیور صاحب ابھی تک تشریف نہیں لائے ہیں“
میں نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی ”بارہ تو بج گئے۔“
ڈرائیور اسی وقت نمودار ہوا۔ وہ اوسط قد کا اور گھٹے ہوئے بدن والا چالیس سالہ شخص تھا جس کی مونچھیں بڑی نفاست سے ترش ہوئی تھیں۔ بال بڑے سلیٹے سے بے ہوئے تھے اور اس کا لباس بھی صاف ستھرا تھا۔ اگر کلینر سلام کرتے ہوئے اس کا استقبال استادی کہہ کے نہ کرتا تو مجھے بھی اندازہ نہ ہوتا کہ وہی بس ڈرائیور ہوگا۔“

استادی نے ڈرائیورنگ سائڈ کا دروازہ کھول کے کلینر کو حکم دیا کہ وہ سامان لاکر میں رکھے۔ کلینر نے ایک ایک ڈبا اتار کر اس کی باڈی میں نیچے کی طرف اگلے اور پچھلے پیروں کے درمیان بنے ہوئے خانے کا لاک کھولا اور ڈبے اس میں پیچھے کی طرف رکھ دیے۔ ڈرائیور نے انہیں اور پھر اسے ہی چلا دیا۔ مسافروں کے چھوٹے سوٹ کیس ’ٹیک اور کچھ گتے کے ڈبے سامان کے خانوں میں ایسے رکھنے شروع کئے کہ پہلے رکھے جانے والے باکس ان کے پیچھے چھپ گئے۔
جنم نے کہا ”اس موبائل فون کی بیٹری کتنی دیر چلتی ہے؟“

میں نے کہا ”چار بجے ہوئے کے بعد کم سے کم تیس گھنٹے اسے میں ستر رات کو چارج کر لیا تھا۔“
”میرا خیال ہے کہ ابھی ملک رب نواز کا فون آیا تھا۔“
”میں چونک پڑا“ ملک نے تھیں فون کیا تھا؟“
”نہیں بھئی۔ اسے کیا پتا اس فون نمبر کا۔ فون آفس میں آیا تھا۔“

میں نے کہا ”تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“
”بنگلہ کلرک بڑی عاجزی سے جی ملک صاحب جی ملک صاحب کر رہا تھا۔ اس نے شاید فرنٹ سیٹ خالی رکھنے کے لیے کہا تھا۔“
”کس کے لیے؟“

”دل تو کرتا ہوگا چاچا“ کلینر سامان پر تریاں پھیلانے لگا ”جانتا۔“
”اوئے ذاق کرتا ہے ہم سے۔ میں شکایت کروں گا تیری“ چاچا نے اترتے ہوئے برہی سے کہا۔
جب کلینر نیچے آ رہا تھا تو کسی نے چلا کے کہا ”آخروادانہ کیوں نہیں کھولتے تم سب دھوپ میں کھڑے ہیں۔“
”دروازہ استاد کھولتا ہے۔ ڈرائیور!“ کلینر نے بے اعتنائی سے کہا۔

”ڈرائیور کہاں ہے؟“ دوسرے نے پوچھا۔
”ابھی آیا نہیں۔“
”بارہ تو بجتے والے ہیں۔“
”کس کے بارہ بجتے والے ہیں؟“ کلینر بولا ”دھرو کوئی سمجھ بھی ہے کیا؟“

دوسرے نے اس کا راستہ روک لیا ”مجھے نہیں لگتا کہ بس ٹائم پر روانہ ہوگی۔“
کلینر ایسی باتیں روز سننے کا عادی تھا ”مجھے بھی نہیں لگتا۔“

”مسافر تو سارے آگئے ہیں پھر دیر کس بات کی ہے؟“
کلینر نے سہلایا ”مسافر تو روز آجاتے ہیں مگر جب تک ڈرائیور نہ آئے بس کیسے جا سکتی ہے؟“

اس کی بات سے مشتعل ہو کے کچھ لوگ آفس کی طرف چلے گئے جنم کے پاس جا بیٹھا ”یہاں وقت کی پابندی کے زیادہ قائل نہیں ہیں لوگ۔“
”اس کا مطلب ہے کہ زین کی طرح بس بھی لٹ پیچتی ہوگی؟“

”BETTER LATE THAN NEVER“ میں نے کہا۔

”بس میں چو میں سمجھنے گزارنا دے۔ جی کم عذاب نہیں۔ آخر میں تو دو گھنٹے بھی دو دن کی طرح لگتے ہیں۔“
”اب یہ سوچ سوچ کے پریشان ہونے سے کیا ہوگا۔ سفر کے بارے میں ایک خیال یہ ہے کہ سفر سلیڈ ٹھہر۔“

”دوسرا خیال یہ ہے کہ سفر مل آدی صرف SUFFER کرتا ہے۔“

”لگتا ہے تم سارا راستہ ایسی قنوطیت کی باتوں سے بھرا کر دے گی۔ بابا انجوائے کرو“ ایڈو پنر کو۔ کسی عظیم نے تو نہیں لکھا تھا کہ میں کہ سفر ضرور کرو۔ اپنی مرضی سے آئی ہو تم۔ پریشانی کا خیال ہے تو ابھی وقت ہے واپس چلی جاؤ۔ میں کسی اور کو شریک سفر بناناں گا۔“

جنم نے کہا ”آج کے بعد میں ریکس کو نام لے کر نہیں بلاؤں۔ بھائی کون کی۔ جیسے قمر کتی ہے نہیں۔ مجھے بڑا اچھا لگتا ہے اس کا بھائی کہنے کا انداز۔“

میں نے ریکس کو منہ پھیر کے گاڑی کو واپس لے جاتے دیکھا ”دیکھا تم نے۔ وہ کتنا جذباتی ہو گیا تھا اور کرشمی تم ایسی باتیں تو رو پڑتا۔ بڑا عجیب ہے یہ آدمی بھی۔ جیسے لگتا ہے اس کے سینے میں دل ہی نہیں مگر محبت کی ذرا سی دھوپ ملے تو یہ پتھر گھل کے موم ہو جاتا ہے۔“

بس اسٹینڈ پر رواں گئی لی افرا تقری تھی۔ کچھ مسافر بس کے اندر اپنی سیٹ پر بیٹھنے کے لیے بے قراری سے گیٹ کے سامنے جمع تھے اور مطالبہ کر رہے تھے کہ گیٹ کھولا جائے مگر ان کی سننے والا کوئی نہیں تھا۔ ابھی تک بس کا اسے سی بھی نہیں چلا یا گیا تھا۔

میں جنم کے ساتھ وینک روڈ میں جا بیٹھا جہاں کچھ اور لوگ بھی اپنی اپنی فیملی کے ساتھ موجود تھے۔ دیوار پر لگی گھڑی میں ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ میں نے بنگلہ آفس میں جا کے اپنی سیٹ کنفرم کی۔ بس والے فون پر ریڈیویشن کر رہے تھے مگر ٹکٹ رواں گئی سے پہلے جاری کرتے تھے۔ کوئی ریڈیویشن کے بعد ٹکٹ لینے نہ آئے تو مقررہ وقت سے پندرہ منٹ پہلے ٹکٹ کسی اور کو دے دیا جاتا تھا۔

میں اخبار اور رسالے لینے کے بہانے باہر گیا اور بس کے سامنے والے حصے کا جائزہ لیا۔ میرا خیال تھا کہ اب تک سامان سیٹ پر سے اٹھالیا گیا ہوگا مگر وہ کپیل سے ڈھکا ہوا ڈھیر اپنی جگہ پر موجود تھا۔ بس کی چھت پر ایک کلینر قسم کا شخص مسافروں کا بھاری سامان سیٹ کرنے میں مصروف تھا۔ چھت پر لگا ہوا تقریباً دو فٹ اونچا فولادی کنٹریوری طرح بھڑکا تھا۔ اسباب سفر میں صرف بستر اور بکس ہی نہیں تھے مجھے اس میں ایک سائیکل، ایک واشنگ مشین، ایک اسٹیل کی الماری اور فریج میں ایک بیڈ روم سیٹ بھی نظر آیا۔ ایک دبلا پٹلا بانس جیسا لمبا شخص پیچھے والی سیڑھی پر چڑھ کے اوپر جھانک رہا تھا اور کلینر کو بار بار دہارت کر رہا تھا ”ڈرائیور خیال سے پتہ شادی کا سامان ہے۔“

کلینر نے جانتے بوجھے شرارت سے کہا ”مبارک ہو بزرگو۔ ہماری تو ابھی ایک بھی نہیں ہوئی۔ آپ کی تیسری ہے یا چوتھی؟“

اس نے جڑبڑہو کے کہا ”اوئے شادی میری بھانجی کی ہے۔ ہمیں تو ایک نے ہی دھت ڈال رکھا ہے۔ تو بات کرنا ہے تیسری چوتھی کی۔“

لحہ بھاری ہو رہا تھا۔ وہ بس کی ایک کنڈیشنڈ فضا میں آرام سے بیٹھنا چاہتے تھے۔ باہر گرمی تھی اور وینٹنگ روم سب مسافروں کے لیے ٹاکائی تھا۔ بیشتر مسافر کھڑے ہوئے تھے اور صرف ایک پنکھا اندر کی گرمی اور ٹھنک کو ختم کرنے کے لیے قطعی ٹاکائی تھا۔ وینٹنگ روم کی ہوا کو باہر پھینکنے والا پنکھا بھی غالباً کسی خرابی کی وجہ سے بند تھا۔

ہنگامہ زیادہ بڑھا تو ڈرائیور نے اسے سی بند کر کے اعلان کر دیا "ابھی ٹائم لگے گا۔ اسے سی خراب ہے۔"

"اسے سی ابھی تو چل رہا تھا" ایک مسافر مشتعل ہو گیا۔ "تم نے خود ہی بند کیا ہے اسے" دوسرا بولا۔

"بند نہ کروں تو کیا کروں؟ چلنے والے دوں تاکہ جل جائے" ڈرائیور کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔ "میں تو معمولی خرابی توڑے گئے تھے میں دور ہو جائے گی۔ راستے میں جل گیا تو چوبیس گھنٹے سب گزار لو گے بغیر اسے سی کے؟"

اس سوال کا جواب کون دے سکتا تھا۔ احتجاج کرنے والے خاموش ہو گئے۔ زیادہ معقولیت پسند لوگوں نے ڈرائیور کی حمایت کی "بالکل ٹھیک ہے جی۔ راستے میں تو عذاب ہو جائے گا۔"

میں نے کہا "جہنم۔ کس کسی کا انتظار تو نہیں ہو رہا ہے؟"

"ہو بھی سکتا ہے۔ یہاں تو دی آئی پی کے لیے ٹرین روک لی جاتی ہے خواہ اسٹاپ نہ ہو۔ ایس ڈی ایم ٹاپ کے معمولی افسر اور ریلوے کے کسی بھی افسر کی وجہ سے گاڑی اگر لیٹ ہوتی ہے تو ہو جائے مسافر بھی اب عادی ہو گئے ہیں۔ نہ شکایت کرتے ہیں اور نہ کہتے ہیں۔"

"بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ یہ ملک عوام کا ہے حکومت عوام کی ہے مگر صرف تقریروں کی حد تک ورنہ ملک صرف خواص کا ہے۔ اگر آپ وی آئی پی یا اس کے بھائی بھتیجے تک نہیں ہیں تو یہ خرابی ہے آپ گئے نوٹیفکری۔"

"اخباروں میں ایسی خبریں بھی آئی ہیں کہ فلائٹ لیٹ کر دی گئی۔ یہ تو ایک ذاتی بس ہے ملک رب نوازی۔"

میں نے کہا "سوچو اگر وہ سواری جس کا انتظار ہو رہا ہے خود ملک رب نوازی ہو۔"

"بد شگونی تو مت کو سفر سے پہلے ہی۔"

میں نے کہا "پنے اس محبوب اور میرے رقیب روسیاء کو فون کر دیا تھا؟"

"ہاں۔ بی وی سے بات ہو گئی تھی میری" جہنم بس کے

بولی۔

میں نے کہا "ابھی آدھا گھنٹا ہے۔ میں ڈرائیور خان جی کی خیریت معلوم کر آؤں فون پر۔"

اس نے ہاتھ بیک کی طرف بڑھایا "فون ہے نا۔"

"بے وقوف۔ اسے استعمال نہیں کرنا ہے بالکل۔ میں باہر لگے ہوئے بی بی سی کے فون سے بات کر سکتا ہوں۔"

کمال اسپتال کی آریئر نے پوچھا "کس سلسلے میں بات کرنا چاہتے ہیں آپ ڈاکٹر کمال سے؟"

میں نے کہا "سلسلہ تو بہت دن سے چل رہا تھا۔ اب بات کی کرنی ہے۔"

"آپ کون صاحب بول رہے ہیں؟"

میں نے کہا "میں ماموں کا بچن سے اس کاموں امام دین گجراتی۔ تو کون ہے جی؟ اس کے گھر میں کیا کر رہی ہے؟"

گھر والی کی طرح سوال پر سوال کرتی جا رہی ہے؟ کس اس نے بیاہ تو نہیں کر لیا شرمیں؟"

کمال کی آواز سنائی دی "یہ کیا کہو اس لگا رکھی ہے؟"

میں نے کہا "تیری یہ ٹیلی فون آپ بڑی بے شرم ہے۔ مجھ سے ایسی باتیں کر رہی تھی، خیر چھوٹ۔"

"تو کہاں ہے اس وقت؟"

میں نے کہا "ہاں کے اڈے پر۔ کوئٹہ جا رہا ہوں۔ دو چار دن کے لیے۔"

"جہنم بھی ساتھ ہے؟" وہ طنز سے بولا۔

"ہاں ہے۔ طعنہ کیوں دے رہا ہے؟ کام سے جا رہا ہوں میں۔"

کمال نے کہا "مگر جی مون پر بھی جا رہا ہے تو مجھے کیا۔"

"وقت ہو تو میں بقلم خود تیرے پاس آکے تجھے جوتے مارتا۔ تیرا دماغ کچھ زیادہ خراب ہو رہا ہے۔"

"ہم سب کا دماغ خراب ہو رہا ہے۔ میرا، قمر کا، چندا کا۔ بس ایک آپ ہیں صبح الدماغ۔ میں لکھتا ہوں آخر یہ فون کرنے کا کھف بھی کیوں کرتے ہیں آپ؟ ہم تو ہیں فارغ لوگ۔ آپ اتنے مصروف آدمی ہیں۔"

میں نے کہا "دیکھ یار کمال! مجھے پتا ہے کہ تم سب ناراض ہو مجھ سے مگر کوئی فائدہ نہیں اس کا۔ ہماری مصروفیات کے دائرے انگ ہو گئے ہیں جذبات تو وہی ہیں۔"

"نہیں۔ جذبات بھی بدل گئے ہیں۔"

میں نے کہا "شکایت تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ میرا خیال ہے؟ کوئی مجھ سے رابطہ کرتا ہے۔ یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ میں کہاں ہوں زندہ ہوں کہ مر گیا؟ خیر

چھوڑ پھر کر گئیں گے یہ باتیں۔"

"ہاں اب ایسی ہی باتیں رہ گئیں کرنے کو۔"

میں نے کہا "خان جی کا حال کیا ہے؟"

"کیسا ہو سکتا ہے ان کا حال۔ وہ اب جا رہے ہیں۔"

میں نے گھبرا کے کہا "جا رہے ہیں؟ کیا مطلب ہے؟"

"مطلب وہی ہے جو تو نے سمجھا۔ وہ دنیا سے جا رہے ہیں۔ واپسی کا سفر تو شروع ہو چکا ہے بہت پہلے ہی۔ ابھی چندا انہیں لے جا رہی ہے۔"

"کہاں لے جا رہی ہے؟"

"لندن۔ علاج کے لیے۔ حالانکہ سارے شہر کے ڈاکٹر جو لندن سے ساری دگر باریاں لے کر آئے ہیں، ہم خیال ہیں کہ اس وقت انہیں بے گھر اور بے وطن کرنا زیادتی ہے ان کے ساتھ۔ ان کے علاج سے شفا کی امید رکھنا کسی مغیرے کی امید کے مترادف ہے۔"

"مغیرے روٹنا ہو جاتے ہیں آج بھی۔"

کمال نے کہا "ہاں اسی لیے میں نے چندا کو نہیں روکا۔"

"مگر وہاں جانے کا خیال کیسے آیا اسے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، پہلے ایک بار لندن کے کرا سول اسپتال کو ان کا پورا کیس بھیجا گیا تھا۔ تیری بات بھی ہوئی تھی ڈاکٹروں سے اور انہوں نے صاف جواب دے دیا تھا۔"

کمال بولا "اب چندا کو کوئی کزن اسے بلاتا ہے۔"

"چندا کا کزن! اس کا تو دنیا میں کوئی کزن نہیں تھا" میں نے کہا۔

کمال نے کہا "غالباً میری اور تیری معلومات ناقص تھیں۔ اس کا ایک کزن ہے اور وہ ہائی کشنر کے آفس میں سیکنڈ سیکریٹری ہے۔ اس کا بہت اثر سوخ ہے اسی نے سارے انتظامات کئے ہیں اپنی ذاتی داری پر اور چندا کو یقین دلادیا ہے کہ وہ خان جی کو لندن لے آئے تو علاج کوئی مسئلہ نہیں۔"

یار تو نے نہیں پوچھا چندا سے۔ یہ اچانک کزن کہاں سے پیدا ہو گیا؟ اور کزن کا کیا مطلب ہے آخر۔ وہ ماموں زاد ہے یا چچا زاد؟"

"چچا زاد۔ خان جی کے کوئی کزن تھے۔ وہ ان کا بیٹا ہے۔ چندا کو خان جی کی ڈائری میں اس کا پتا ملا۔ اس نے فون کیا تو چندا کے اس کزن نے بڑی اپنایت اور گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔ اس کا فون روز آئے لگا۔ چندا نے اسے خان جی کے متعلق بتایا تو اس نے کہا کہ مجھے کیس بسزنی بھیجو۔ چندا نے

DHL سے سارے ڈاکو منٹس روانہ کر دیے۔ تین دن بعد اس نے فون پر کہا کہ میری بات ہوئی ہے ڈاکٹروں سے اور وہ بہت پر امید ہیں۔ تم انکل کو یہاں لے آؤ۔ وہ کزن تو بڑا اکیٹو ثابت ہوا۔ دو دن بعد برٹش کونسلٹ سے فون آگیا کہ آپ دیرا کے لیے اسپورٹ کے ساتھ آجائیں۔ یوں چنگی بجائے میں دیرا ملا۔ وہیں چندا کو فرسٹ کلاس کے ٹکٹ بھی ٹھہرائے گئے۔ صرف بیٹ کفرم ہونا باقی ہے۔"

"یعنی ایک دو روز میں وہ چلی جائے گی؟"

"ہاں۔ امید تو یہی ہے۔"

میں نے کہا "کمال اسے روک۔ میرے واپس آنے تک مت جانے دے۔ میں پرسوں شام تک ضرور لوٹ آؤں گا۔"

"میں کوشش کروں گا۔ وعدہ نہیں کر سکتا۔ چندا بہت بدل گئی ہے۔ کسی کی بات نہیں سنتی۔ کسی کا لحاظ نہیں کرتی۔ اتنی بے محنت اور رخ ہو گئی ہے کہ اب تو اس سے بات کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔ قمر سے اکثر لڑائی ہو جاتی ہے اس کی۔"

"کس بات پر؟"

"وہ تیری بہن ہے۔ تیری حمایت کرتی ہے۔ تیرے خلاف کچھ سننے کو تیار نہیں اور چندا تیرا نام سننے کی روادار نہیں۔ پتا نہیں کون اسے فون کر کے تیرے اور جہنم کے بارے میں بتاتا رہتا ہے۔"

میں بھونچکا رہ گیا "کیا بتاتا رہتا ہے؟"

"وہی جو ہو رہا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کیا ہو رہا ہے مگر چندا کو معلوم ہو جاتا ہے کہ تم کیا کر رہے ہو، تم کب کہاں تھے؟"

"یار! ایسا کون ہے؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"میں کیا بتاؤں مگر کوئی ہے ضرور۔ چندا پہلے کیا کہہ بد گمان تھی، اس کی غرت اتنی زیادہ ہو گئی ہے تھ سے کہ وہ اب تیری صورت بھی دیکھنے کی روادار نہیں ہوگی۔"

میں نے اور حد سے جذبات سے مغلوب دم بخود کھڑا رہا "میں آکے بات کروں گا اس سے۔"

"کوئی فائدہ نہیں۔ اپنی بے عزتی کرانے کا۔ اچھا، مجھے ایک ایمر جس کے لیے بلایا گیا ہے۔"

میں نے کہا "قمر اور تیرا چچا ٹھیک ہیں؟"

"بالکل ٹھیک ہیں" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں واپس آیا تو مسافر بس میں بیٹھ رہے تھے اور جہنم میرا انتظار

کر دی تھی۔

”بت در کوی؟“

میں نے بکڑ کے کہا ”کیا بس نکل گئی؟“

وہ جیڑائی سے بولی ”یہ تمہیں کیا ہو رہا ہے؟ چنانچہ انہی کچھ کہا ہے تو غصہ بھریوں نکال رہے ہو؟“

میں نے خود کو سنبھالا ”آئی ایم سوری۔ میرا دماغ خراب ہو گیا ہے ایک بات سن کے۔“

”کیا بات ہے؟“

میں نے کہا ”ہٹاؤں گا چلو بس میں چلیں۔“

ہماری سیٹ خاصی پیچھے کی طرف تھی۔ اس کا ایک فائدہ یہ تھا کہ جینم چہرے کو دکھانے کی سہولت دیتا تھا۔ پیچھے کی چند سیٹوں کی ساری نقل و حرکت پر نظر رکھ سکتا تھا۔ پیچھے کی چند سیٹوں پر ایک سیٹ پر لوگ تھے۔ تین عورتیں دس بارہ بجے جو سترہ سال سے سترہ مہینے کے درمیان کی عمر کے تھے اور ایک مٹھی سا شخص جو بے حد مظلوم نظر آتا تھا مگر وہ بعد میں میری طرح دھاڑنے لگا تو بت سے دلچسپ انکشافات ہوئے۔ تین عورتوں میں سے جسے ہم اس کی ماں سمجھ رہے تھے وہ اس کی بیوی نہیں تھی۔ باقی دو انتہائی صحت مند اور وسیع و عریض خواتین اس کی زوجہ نہیں اور تین ثابت ہوئیں۔ ساری اولاد تیسری کی تھی جو اب تدریجی طور پر اس کی منظور نظر اور سب سے اہم بیوی تھی۔ دو دران سراسر نے بڑے رنج سے اعتراف کیا کہ اس سے دو بار غلطی ہو گئی۔ بندے کو کیا پتا چلا ہے کہ وہ بجز زمین کا سودا کر رہا ہے۔

بس لاہور شہر سے نکلی اور ایک گھنٹے بعد کھانے کے لیے رک گئی۔ میں نے بیٹے پر بڑا ہوا اردہ ہٹا کے دیکھا۔ جینم نے پھر منہ سر کو چادر میں لپیٹ کر اٹھنے کی تیاری کر لی تھی۔

میں نے کہا ”بچہ جاؤ۔ ہم باہر نہیں جاسکتے۔“

”کیوں۔ کھانا نہیں ملے گا آگے۔“

میں نے کہا ”نیک بخت۔ باہر دیکھ یہ شاہ جی کا ہوٹل ہے۔“

جینم پھر بیٹھ گئی ”مارے گئے پھر تو۔ ابھی تک اس کا پیچہ نہیں چھپا۔ وہ پہچان جائے گا فوراً۔“

”کھانا بیس منگوا لیتے ہیں۔“

جینم نے ایک دم میرا ہاتھ پکڑ لیا ”نا صبر۔ ادھر دیکھو۔“ میں نے اس کی نظر کا تعاقب کیا۔ ایک شخص بس ڈرائیور سے باتیں کر رہا تھا۔ میری طرف اس کی پشت تھی لیکن میں اسے پہچان سکتا تھا۔ اچانک وہ مڑ کے بس کی طرف چلنے لگا۔ وہ بت غصے میں تھا۔

یہ تو بس کے روانہ ہونے سے پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ ملک رب نواز نے بس کی سب سے آگے والی سیٹ خالی رکھنے کی ہدایت کی تھی۔ جینم نے جنگ کلرک کی ایک طرف گفتگو سن کے اندازہ کیا تھا کہ شاید ملک صاحب کی سواری بھکم خداس پر تشریف رکھنے کے لیے آ رہی ہے۔

بس والے عام طور پر اس ایک سیٹ کو جو استاد یعنی ڈرائیور کے ساتھ ہی بائیں جانب ہوتی ہے وہی آئی بی سیٹ قرار دیتے ہیں اور خاص بندہ کوئی نہ ہو تو کسی بھی ضرورت مند سے سوچا س زیادہ وصول کر کے اسے سفر کے دوران میں وہی آئی بی محسوس کرنے کا موقع فراہم کرتے ہیں خواہ اسے انگریزی کے ان تین حرف کا مطلب بھی معلوم نہ ہو۔

”یہ بلا کماں سے نازل ہو گئی؟“ جینم نے اپنا پردہ سنبھالا۔

میں نے کہا ”بلا مونٹ ہوتی ہے اور دیسے بھی ملک صاحب نے سن لیا تو ہمیں اتار دیں گے اسی جگہ۔ وہ مالک ہیں بس کے۔“

”کیسے اسے گزشت رات کی ہماری کارروائی کی خبر تو نہیں مل گئی؟“ جینم نے کہا۔

”سب کچھ ہو سکتا ہے اس دنیا میں خاتون جہاں اب اخلاقی تدبیر کی حیثیت پرانے سکوں اور متروک نوٹوں جیسی بھی نہیں رہی۔“

”عنایت سے کچھ بعید نہیں کہ ہم سے پیسے لینے کے بعد اپنے آقا کو بتا بھی دیا ہو کہ خفیہ پولیس والے آئے تھے۔ بس سے اسمگل کیے جانے والے مال کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔“

”زندہ کے دند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی“ میں نے کہا۔ ملک نے اندر آ کے بس کے مسافروں کو غور سے دیکھا۔

وہ پوری طرح اندر بھی نہیں آیا تھا۔ دروازے میں رک کر ہی اس نے سب کے چہرے دیکھ لیے تھے۔ ہمارے علاوہ بھی بس میں دس بارہ مسافر ایسے تھے جو اتر کے باہر نہیں گئے تھے۔ ان میں بیشتر خواتین تھیں۔ اس کی نظر مجھ پر بھی رکی اور ایسے گزرتی جیسے سرج لائٹ کی کھوشی ہر تاریک گوشے کا بعید لپٹی ہوئی چلتی جاتی ہے۔

پھر اس نے پلٹ کر اپنے پیچھے باادب بلا حظہ ہوشیار کھڑے ہوئے بس ڈرائیور اور کلینر یعنی مستان دیوانہ سے سوال کیا ”اوپر“ تم نے اچھی طرح دیکھ لیا تھا چلنے سے پہلے؟“

”جی جناب!“ ان دونوں نے یک زبان ہو کے کہا۔

”ملک نے استاد سے کہا“ ابھی تو ساری سواریاں نہیں ہیں۔“

”آپ باہر ملاحظہ فرما سکتے ہو جناب عالی!“ مستان نے کہا۔

”تو نے خود سب کی شکل پر غور کیا تھا؟ ایسا نہ ہو وہ۔“

چروہیل کے بیٹا ہوسب کے پیچ میں؟“ مستان نے پورے یقین کے ساتھ نفی میں سر ہلایا ”ایسا نہیں ہو سکتا جناب! مستان کی آنکھ بندے کا ایکس رے کر لیتی ہے اندر تک۔ کسی کے دل میں کیا ہے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے۔“

کلینر دیوانہ نے سر ہلایا ”استاد کی کیا بات ہے۔ اپنے پرانے کو ایسے پہچان لیتا ہے جیسے کتا اپنے مالک اور اجنبی غریب۔“

کلینر نے جو مثال دی تھی وہ معنوی اعتبار سے بہت اچھی تھی مگر استاد کا موازنہ جس جانور سے کیا تھا وہ استاد کی بے عزتی تھی۔

استاد نے کتے کی طرح غرا کے کہا ”اوپر تو بھونکتا بندہ کر۔“

ملک نے جیسے خود سے سوال کیا ”آخر ہم کو غلط اطلاع کس نے دی؟“

دیوانہ بولا ”سری۔ محول کیا ہو گا کسی نے۔“ ملک نے اسے غصے سے دیکھا ”اتنی جرات کس کی ہے کہ ہم سے مذاق کرے۔“

”وہ جناب عالی! اکل اپریل کی پہلی تاریخ تھی“ دیوانہ نے پردے ادب سے یاد دلایا۔

ڈرائیور مستان نے اسے ملک کے خطاب سے بچانے کے لیے دو گالیوں سے نوازا ”زبان بند نہیں رکھ سکتا تو۔ اب بولا تو مکار کے دانت حلق سے اتار دوں گا۔“

ملک نیچے اتر کے واپس اور چل پڑا جہاں اس کی کار کو ایک ڈرائیور بلا ضرورت کپڑا مار کے چمکانے کی کوشش میں مصروف تھا۔

دیوانہ نے فریادی لہجے میں بس کے باقی ماندہ مسافروں سے خطاب کیا ”لوٹی“ ایسی کون سی غلط بات کی تھی میں نے۔ مجھے بھی آج صبح اڑے پر فون کیا کسی نے کہ تیری ساس فوت ہو گئی ہے۔ جنازہ دو بیٹے۔ لوٹی بڑا غمگین شخص تھا ہوا پہلے تو میں۔ خیال آیا میرے کو بڑی دیر بعد کہ ابھی تو میری شادی ہی نہیں ہوئی۔ خود استاد نے بتایا کہ اپریل کی پہلی تاریخ کو ساری دنیا بے وقوف بناتی ہے ایک دوسرے کو اور

سب بے وقوف بنتے ہیں۔“

کدو جیسے صاف سر اور مونے شیشوں کی عینک والے ایک فلسفی ٹائپ شخص نے کہا ”یہ غلط ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں ایک اقلیت نے واضح اکثریت کو بے وقوف بنایا ہے۔ ان کا سیاسی اور معاشی استعمال کرنے کے لیے۔ کبھی مذہب کے نام پر کبھی جمہوریت کے نام پر تو کبھی عزت و غیرت کے نام پر۔“

ایک مولانا نے اپنی پالشت بھر لپی داڑھی پر ہاتھ پھیر کے اپنی برقع میں مخوف زوجہ سے کہا ”یہ شخص کیونٹ ہے۔ ایسے بے دین لوگوں کو بھون کے رکھ دوں میں۔ اگر کلا شگوف ہو میرے ہاتھ میں۔ تڑ تڑ۔“

زوجہ نے نیچے کے اندر سے چلا کے کہا ”جی کچھ خیال کر۔“ نے کو دودھ پلا رہی ہوں میں۔ ہر جگہ گولیاں چلانے لگتے ہو۔“

وٹر ٹائپ ایک شخص نے دروازے تک آ کے بے آواز بلند ہو کر کامیون پر مٹا شروع کیا۔ لوٹی بس شام تک نہیں رکے گی۔

میں نے جینم کی طرف دیکھا تو اس نے سر ہلا کے اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ اچھا برا جیسا بھی تھا کھانا ایک ضرورت تھی۔ وال روٹی کے آرڈر نے وٹر کو مایوس کیا اور

جائے جاتے اس نے ہم پر ایک شرمندہ کرنے والی نظری مگر مجھے ایسے سر راہ قسم کے ہوٹلوں کا خاصا تجربہ تھا۔ اول تو مجھے ہمیشہ شک رہتا تھا کہ گوشت عمر کی آخری حد کو پہنچنے کے طبعی موت مرنے والے جانور کا نہ ہو۔ میں نے جب ترتیب سے متاثر ہو کے۔ فوراً منگوا لیا تو یہی ہوا کہ ہاتھوں اور داغوں کے درمیان پلاسٹک جیسی چمک دار بوٹی کو کھینچ کھینچ کے بالا خرابی بارمان لی۔ قاعدت سے شور بے پر اٹھا کیا اور بوٹی کو بعد میں آنے والوں کے لیے چھوڑ دیا۔ کچھ ہوٹل والے بچ کا سارا گوشت اسی طرح واپس جمع کر کے رات تک نئے نام سے پکاتے ہیں۔ دن میں جو بھنا ہو وہ رات کو فوراً ہو جاتا ہے۔

جینم نے چادر ہٹا دی ”فٹ۔ عادت نہیں رہی پردے کی تو چادر میں بھی دم کھتا ہے۔“

”ضرورت اس کی ہے کہ تم جیسی سب بے مہار خواتین کو افغانستان بھیج دیا جائے وہاں تمہارے اخلاق و کردار کو عین اسلامی سانچے میں ڈھال دیا جائے۔ صرف دو بچے کا شارٹ کورس۔“

”آخر یہ ہمارے لیے ہی کیوں ضروری ہے؟“ جینم

”دیکھو تمہارے اعتراض سے کچھ نہیں ہوگا۔ یہ دنیا مردوں کا معاشرہ ہے یہاں ہم جو چاہیں گے کریں گے۔ چاہیں گے تو عورت کو اشتہار کے لیے نمائندگی بنادیں گے۔ چاہیں گے تو اپنے گھر کو ”سب جیل“ قرار دے کر اسے ساری عمر کے لیے نظربند کر دیں گے۔“

جنیم باہر دیکھنے لگی ”اپنے ملک صاحب تو واپس جا رہے ہیں۔“

ملک واقعی ایک جلوس کی صورت میں اپنی گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس جلوس میں اس کے ساتھ شاہجی کے علاوہ مستان اور دیوانہ بھی تھے۔ ملک نے شاہجی کی محضر تاول فرمانے کی دعوت مسترد کر دی تھی۔

”آخر اسے کیا غلط اطلاع دی تھی کسی نے؟“ میں نے کہا۔

جنیم نے کہا ”ابھی وقت ہے۔ دوڑ کے جاؤ اور پوچھ لو۔ میں تو اپنے خیال کا اظہار کر چکی ہوں۔“

”مجبوراً میں تم سے اتفاق کرتا ہوں۔ تمہارے اندیشے درست نکلتے ہیں مجھے بھی مگر اس نے بس میں آکے کیا رکھا آخر؟ اگر رعایت نے اسے بتایا تھا کہ خفیہ پولیس والے آئے تھے تو ملک نے سامانِ ادھر ادھر نہیں کیا۔“

”اسے اپنے انتظامات پر زیادہ بھروسہ ہوگا جو اس نے لائن کیئر رکھنے کے لیے پہلے سے کر رکھے ہیں یا پھر اس نے معلوم کیا ہوگا تو اسے پتا چلا ہوگا کہ ظاہر یا خفیہ کسی قسم کی پولیس نے گزشتہ شب ایسی کوئی کارروائی نہیں کی۔“

”اسی لیے وہ سمجھ رہا ہے کہ اس کے ساتھ خفیہ پولیس کسی نے اور اتفاق یہ کہ آج فرسٹ ایئرل ہے“ میں نے کہا۔

آؤٹ ڈور سروس فراہم کرنے والے ویٹرنے ہمیں دال روٹی فراہم کرتے ہوئے بڑے غور سے دیکھا اور سہلانا ہوا چلا گیا۔

جنیم نے سر ہاتھ مارا ”مارے گئے۔“

میں نے کہا ”کیا ہوا؟“ اصولاً تم کو ایک چیچ مار کے کتنا چاہیے تھا کہ ہائے میں مر گئی۔“

”ضرور اس ویٹرنے مجھے پہچان لیا ہے۔ میں نے شاہجی کے ہوٹل میں ویٹروں کی تصویریں بھی تو بنائی تھیں۔“

میں نے کہا ”رائٹ۔ بس اب سمجھو کہ ہمارے لیے لچ مفت یعنی COMPLIMENTRY۔“

”مگر میں شاہجی کو کیا جواب دوں گی؟ ابھی تک فچر کہیں

نہیں شائع ہوا۔ نہ کسی کی تصویر چھپی۔ میں تو بالکل بھول گئی تھی۔“

میں نے اسے تسلی دی ”ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ شاہجی کے آنے سے پہلے کوئی جھوٹ گھڑ لو۔ TECHNICAL قسم کا۔“

”یہی کرنا پڑے گا“ جنیم نے کہا ”مگر خدا کا شکر ہے کہ ملک چلا گیا ہے۔ اس کے سامنے شاہجی پہچان لیتا تو بڑی مشکل ہو جاتی۔“

”کیا تم بھول گئی ہو کہ ملک کے سامنے تم نے روپوشی اختیار کر رکھی تھی۔ چلو اب کھانا کھاؤ۔ زیادہ زور مت ڈالو اپنے نازک دماغ پر۔ نازک چیز کو احتیاط سے استعمال نہ کیا جائے تو خراب ہو جاتی ہے۔“

جنیم نے میری طرف دیکھے بغیر کہا ”آگے ایک عورت بیٹھی ہے برقع میں۔ شکل کاک چائپ برقع ہے۔ ڈرائیور کے بالکل پیچھے۔“

”کون ہے وہ؟ تمہاری بھونکی کی منڈ کی دیورانی؟“

”مجھے اس کا چہرہ دیکھا ہوا لگتا ہے۔ ابھی اس نے نقاب اٹھا کے ہماری طرف دیکھا تھا۔“

”کیا بہت حسین ہے؟“

”بہت زیادہ۔ تم مت دیکھنا ورنہ غش کھا جاؤ گے۔ غلط نہیں ہے میرے پاس“ جنیم نے کہا ”کچھ یاد نہیں آتا کہ“ میں نے کہا ”دفعہ کو؟“ تم آرام سے کھانا کھاؤ۔ کچھ دیر کے لیے بھول جاؤ اسے۔ خود یاد آجائے گا۔“

شاہجی دس منٹ بعد اچانک نمودار ہوئے۔ انہوں نے اندر آنے کے بعد یہ آواز بلند کرنا ”اوجھی سلاواں میکیم حضرات و خواتین۔“

میں نے گرم جوش کا مظاہرہ کیا ”آؤجی شاہ صاحب۔ خیر ہو۔“

وہ صرف ہاتھ ملاتا چاہتا تھا مگر میں نے اسے فرط محبت سے گلے لگا کے عید والا مصافحہ کیا۔ اسے شاہجی نے خلوص اور اپنائیت کا مظاہرہ سمجھا۔

”مجھے تو ابھی بتایا اس لڑکے نے جو کھانا لایا تھا۔ میں نے کہا کہ لوبی حد ہو گئی غیرت کی۔ ادھر سے گزرے ہو آپ لوگ اور ہم سے ملے بغیر۔“

میں نے کہا ”وہ دراصل۔ ان کی طبیعت کچھ ہنسناز تھی۔“

وہ کسی مسافر کی خالی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ”میں نے لڑکے سے کہا کہ حرامی، مسز مسلمانوں کو ادھر لانا تھا۔ اپنے ملک

رب نواز صاحب بھی آئے ہوئے تھے۔“ جنیم نے کہا ”ہاں میں نے دیکھا تھا“ وہ ایم پی اے تھے۔“

”تھے کیا جناب؟“ میں نے کہا ”شاہجی نے ہیں پر زور دیا۔ میں نے کہا ”مافی الحال تو اسبلی کوئی نہیں۔“

”اوسر بی! اسمبلیاں آتی جاتی رہتی ہیں لیکن خاندانی لوگوں کی سیٹ تو کہیں ختم نہیں جاتی۔ اپنے پرانے مہمان ہیں۔ آجاتے ہیں کبھی کبھی باحضر تاول فرمانے کے لیے“ شاہجی نے اس موقع کو حقیقت جانے بغیر ذاتی و پبلش کے لیے استعمال کرنے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔

جنیم نے ان کو شکایت کا موقع ہی نہیں دیا ”آپ کے اور ہوٹل کے بارے میں فیچر تیار ہو رہا ہے۔ میگزین بھی کمپوزنگ میں تھا۔ TRANSPARENTIES بھی بن رہی ہیں۔ بس اس کے بعد PASTING کا مسئلہ ہوگا۔“

شاہجی پکڑا ”اچھا جی۔ چلو اپنے معاملات کو آپ خود سمجھتی ہو تو ہم کیا شکایت کریں۔ ویسے کب تک امید ہے؟“

”اسی جتنے میں انشاء اللہ“ جنیم نے کہا۔

اس کے بعد وہی ہوا جس کی توقع تھی۔ شاہجی نے میرے بل ادا کرنے کی کوشش کا ایسے برا مانا جیسے میں نے انہیں گالی دے دی ہو۔ وہ واجبی حد تک تعلیم یافتہ آدمی تھا مگر پینول پب“ اس کی اراضی اور ہوٹل وغیرہ کو دیکھ کے اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ وہ کروڑوں کا مالک ہے اگر اس نے یہ سب کچھ کسی کی سیاسی پشت پناہی اور سفارش سے نہیں حاصل کیا تھا تو شاہجی یقیناً کاروباری ذہن رکھنے والا ہو شمار آدمی تھا۔ وہ سب کے ساتھ اتنا ہی مخلص اور فیاض ہوتا تو شاید اتنا کبھی جمع نہ کیا تا لیکن وہ آدمی کو اس کی حیثیت کے مطابق اہمیت دیتا تھا اور اس کی بی آرا بھی تھی۔

اب بس کے مسافر واپس آکے اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھے ہوئے لمبی لمبی دکاریں لے رہے تھے اور خلال کر رہے تھے۔ شکایت کر رہے تھے کہ چینی اور گریس میں کچے ہوئے کھانے سے ان کا گھبراہٹ ہو گیا ہے اور بل ادا کر کے ان کا بیٹا بیٹھ گیا ہے ایسے کھانے کے ایسے ریشہ۔ انہیں پتا ہوتا تو وہ قوم کا غم کھائے مزارا کر لیتے۔ جو سب بڑے لوگ کھاتے ہیں، ماشاء اللہ کتنی اچھی محنت ہے۔

جنیم نے میرے کان سے دو انچ کے فاصلے پر منہ لاکے کہا ”اس برقع والی عورت کو دیکھا تم نے؟“

میں نے کہا ”میرے کان مت کھاؤ۔ قلمی کمرے کی

انوار ملک کی قلم سے ایک بہشت ناک ناول

ہزار داستان

گزروں حضرات اکیلے میں اس ناول کو ہرگز نہ پڑھیں

● سانیوں کے آسیب میں پھنسی ہوئی معصوم بچی بڑباکی داستان حیرت۔

● سانیوں کا شہزادہ رنارہ ایک آدم زادی پر عاشق ہو گیا تھا۔

● عمر کا پندرہواں سال اس کے لئے نحوست کے دروازے کھولنے والا تھا۔

● سید بابا کا خادم ایک بارہ فٹ لمبا سانپ تھا جس نے رنارہ کا ظلم توڑ دیا۔

● سید بابا کی نظر کرم ان سب کے لئے باعث نجات بنی۔

قیمت 250 روپے

موصول ڈاک 30 روپے

بہترین کتابت، خوبصورت گروپیشن اور عمدہ طباعت کے ساتھ

ہزار داستان

فلیکس نیلسن پبلشنگس

۲۰ عزیزانیت اردو بازار لاہور 7247414

نہایت روڈ

ولی پکسٹال چوک میوہ پستان، لاہور

آنکھ سے دیکھو تو ہمیں یہ سین قابل اعتراض لگے گا۔ ذرا دور سے بات کرو۔“

اس نے ناراضی سے کہا ”میں نے کچھ کہا تھا۔“
”وہ بھی بڑی شرمناک بات تھی۔ میں کیوں دیکھوں گا پرانی عورت کی طرف آخر۔ دیے تم کو تو نقاب اٹھا کے اندر جھانک سکتا ہوں۔ اس کے بعد جو ہوسو ہو۔“

”میرا شک یقین میں بدل جا رہا ہے۔“
”جب بالکل بدل جائے تو بتانا“ میں نے کہا۔

بس ڈرائیور مستانہ اسی وقت اپنی سیٹ پر آکے بیٹھا تھا۔ اس نے ایک طائرانہ نگاہ پیچھے بیٹھے ہوئے مسافروں پر ڈالی اور اپنے معاون خصوصی دیوانہ سے پوچھا ”اوسنے دیوانے“ سواریاں پوری ہیں۔“

دیوانہ کو غیر ضروری بکواس فراہم کے استاد کی تھانہ کھانے کا شوق تھا ”آدمی سواری کوئی نہیں بٹھائی تھی ہم نے استاد۔ سب پورے ہی لگتے ہیں۔“

استاد نے غرا کے کہا ”اوسنے کس کے دیکھ۔ پوچھ لے۔“
دیوانے نے اعلان کیا ”سواریاں پوری سے زیادہ ہیں استاد جی! دو بندے فالتو شائق لگ رہے ہیں۔ میں اور آپ اتر جائیں تو پھر پورے۔“

استاد نے گاڑی آگے بڑھادی۔ ”چل پیسے لے ان سے۔ بٹھادے بیچ میں اسٹول ڈال کے۔“

اچانک اس برقع والی عورت نے پھر نقاب اٹھا کے میری طرف دیکھا۔ وہ مین ڈرائیور کے پیچھے والی سیٹ پر تھی اور ہم چوتھی قطار میں۔ اس پر نظر پڑنے ہی مجھے خجتم کی تشویش جائز لگی۔ وہ چوہ میرے لیے بھی انجینی نہیں تھا۔ میں نے چند سیکنڈ سوچا اور پھر اپنی سیٹ پر اچھلتے اچھلتے وہ گیا۔

میں نے خجتم کا ہاتھ کھینچ لیا ”استادو مانک ہوئے بغیر بھی بات کی جاسکتی ہے۔“

”خجتم۔ وہ۔ وہ عورت نہیں۔“

”اچھا۔ پھر کون ہے۔ وہی تالی بجانے والی عورت؟“
”برقع میں فیکا ہے۔ میں قسم کھا سکتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

باری اب خجتم کے اچھلنے کی تھی ”رائٹ۔ بالکل ٹھیک پچھانا تم نے۔ وہ فیکا ہی ہوگا۔ اسی لیے چوہ مجھے مانا پچھانا لگ رہا تھا لیکن اس طرف تو میرا ذہن بھی جانی نہیں سکتا تھا۔“
میں نے کہا ”سوال یہ ہے کہ فیکا برقع میں یہاں کیا کر رہا ہے؟“

خجتم نے کہا ”یہ دو الگ الگ سوال ہیں۔ ایک یہ کہ فیکا برقع میں کیوں ہے؟“

”فیکا ایک آزاد ملک کا آزاد شہری ہے۔ کسی قانون کے تحت مردوں کے برقع اوڑھنے پر پابندی نہیں۔“

خجتم نے کہا ”صحیح جواب یہ ہے کہ وہ میری طرح روپوشی اختیار کئے ہوئے ہے۔ دو سراسوال زیادہ اہم ہے کہ یہاں وہ کیا عزائم لے کر آیا ہے؟“

”کیا خیال ہے اس سے پوچھ نہ لیا جائے؟ جا کے بے تکلفی سے اس کے کندھے پر ہاتھ مار کے کہوں کہ بارس فیکا آخر یہ کیا پکڑ ہے۔ اب ہم سے کیا روہ۔“

خجتم ہنسی ”وہ فوراً نقاب اٹھا کے تم سے گلے لے گا اور وہ شعر پڑھے گا۔ پر وہ نہیں جب کوئی خدا سے بندوں سے پردہ کرنا لگا۔ جاؤ پوچھو۔“

”ملک رب نوازی تشریف آوری کی ایک وجہ فیکا ہو سکتا ہے۔ بلکہ میں یہ سمجھنے پر مجبور ہوں کہ دو سری وجہ کوئی نہیں۔ اگر عتایت چوکیدار نے ہمارے بارے میں کچھ بتایا ہو تو ملک بس کے اڈے پر ہی چوکیدار کے ساتھ آتا اور ہم وہیں دھر لے جاتے۔“

”کس جرم میں دھر لے جاتے آخر۔ ایسا ہوتا تو ہم صاف انکار کر دیتے کہ عتایت بکواس کرتا ہے۔“

میں نے طنز سے کہا ”اور ملک یہ بات مان کے کتا“
سوری! پھر اپنا سامنے لے کر لوٹ جاتا۔“

خجتم نے میرے کندھے پر ہتھکنی دی ”دو نہیں۔ خجتم کے ہوتے تسماری طرف کوئی آنکھ اٹھا کے نہیں دیکھ سکتا۔ خجتم نام ہے میرا ایک معمولی چوکیدار کے جی کی کیا اہمیت ہے میرے جھوٹ کے سامنے ملک کا تو باپ بھی مانتا کہ چوکیدار کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ چاہے دل سے وہ نہ مانتا مگر ہمیں کسی کے دل سے کیا۔ ویسے تسماری یہ بات کچھ ذہن ضرور رکھتی ہے کہ ملک اس کے پکڑ میں یہاں آیا ہوگا۔“

میں نے کہا ”فیکا بالکل ہو رہا ہے اور اس کا بالکل ہونا جائز ہے۔“

”اس کی جگہ تم ہوتے تو کیا کرتے؟“ خجتم بولی۔
میں نے کہا ”ایسا کیوں فرض کروں میں آخر تم کیا کرتیں؟“

”ایک بہت عزیز بیوی کے لیے کسی محبت کرنے والے شوہر کے کیا جذبات ہو سکتے ہیں یہ میں کیسے فرض کروں؟“ وہ بولی۔

”میں دنیا کے ہر ملک کی اینٹ سے اینٹ بجاؤں۔ قتل

میں نے کہا ”مجھے تو کوئی وظیفہ کرنا ہی نہیں آتا۔ تم کچھ دھو۔ جس سے فیکا کا خیال بدل جائے۔ مصیبت کو ٹالنے کے لیے آیت کریمہ کا ورد بھی کیا جاتا ہے۔“

”یہ مصیبت نہیں“ غصہ ہے۔ اسے ٹالنے کے لیے فیکا سے بات کرنا ضروری ہے۔ خجتم اب پریشان ہو رہی تھی۔ ”اس نے ہمیں دیکھا ہے کئی بار۔ کیا تا وہ خود بھی بات کرنا چاہتا ہو ورنہ وہ ہمیں بھی اپنا چہرہ نہ دکھاتا۔ ہمارا تو سارا کھیل خراب ہو جائے گا۔“

”خراب کیا ختم ہو جائے گا۔“ میں نے کہا ”مگر بات کرنا بھی تو مشکل ہے۔ کم سے کم میرے لیے اس کے ساتھ سیٹ پر دو سری عورت بیٹھی ہے۔“

”کیا وہ عورت ہے؟“
”اس کی تصدیق تو برقع میں تمہیں کر ہی کی جاسکتی ہے لیکن مرنے کے زیادہ آسان اور باعزت طریقے بھی ہیں۔“

میں نے کہا۔

خجتم بولی ”میرا مطلب تھا کہ کہیں وہ دونوں ساتھ نہ ہوں۔“

”WAIT AND SEE۔ فی الحال یہی پالیسی رکھو۔“

کسا سا معاف کرا لیتے ہیں۔ کہیں گھوڑا پلٹے پھوٹک نہ ماروے۔“

”یہ گھوڑا کہاں سے آیا؟“

”بھئی وہ کسی نے ایک غلط فہمی کو مشورہ دیا تھا کہ گھوڑے کی دو انگلی میں ڈالو“ پھر نگلی گھوڑے کے منہ میں ڈال کے دو سری طرف سے پھوٹک مارو“ دو گھوڑے کے حلق سے اتر جائے گی مگر گھوڑے نے پہلے پھوٹک مار دی۔“

خجتم ہنسنے لگی ”گھوڑے کی پھوٹک پہلے نکال دی جاتی تو کچھ نہ ہوتا۔“

میں نے کہا ”یہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے بات کرنے یا سمجھانے سے پہلے ہی فیکا کچھ کر گزرے۔ ہمیں موقع بھی نہ ملے یا لے تو صرف گلہ بڑھنے کا۔“

رات تک بس ایک میز اڑ کر رہنے والی یکسانیت اور شور کے ساتھ چلتی رہی۔ دوسرے کے بعد بیشتر مسافروں کی طرح مجھے بھی غنودگی سی محسوس ہونے لگی تھی مگر میں فیکا پر نظر رکھنا چاہتا تھا۔ خجتم دن میں سونے کی عادی نہیں تھی مگر بس کے جھٹکنے کسی جھوٹے کی حرکت جیسے تھے۔ باتیں کرتے کرتے وہ اوتھمنے لگی اور چند منٹ میں اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

میں اسے دیکھتا رہا۔ اب اس نے چادر ہٹا دی تھی۔ یہ لاہور میں شہادت سے بچنے کے لیے تھی جہاں خجتم کے

کردتھا ملک کو۔“
خجتم نے کہا ”فیکا بھی انتقام لینا چاہتا ہے۔ ممکن ہے اسی لیے ملک کو فون پر گالیاں اور دھمکیاں دی ہوں۔ سامنے جا کے تو وہ کچھ کہہ نہیں سکتا۔“

”بالکل ٹھیک ہے تسماری سوچ۔ براہ راست انتقام تو کوئی ملک جیسا ہی دوسرا لے سکتا تھا۔ لوہے کو لوہا کاٹنا ہے۔“

فیکا کی اتنی طاقت کہاں کہ وہ جوانی کا ردوائی کرتے ہوئے ملک کی بیوی کو اٹھوالے اور پھر اس کا وہی حشر کرے جو اس کی اپنی بیوی کا ہوا۔ اس نے دھمکی ضرور دی ہوگی کہ ملک میں مجھے چھوڑوں گا نہیں۔ تیرے بیوی بچوں کو اور پھر تجھے قتل کیے بغیر چین سے نہیں بیٹھوں گا۔ تیرے گھر کو تباہ کر دوں گا۔ ہم سے اڑا دوں گا۔ تیری بسوں کو آگ لگا دوں گا۔“

خجتم نے مجھے ترجمانی نظر سے دیکھا ”کیا تم نے اسے دھمکی کا مضمون بنا کے دیا تھا؟“

میں نے ہنس کے کہا ”ہاں۔ لکھ کے دیا تھا۔ ایک نقل ملک کو بھی ارسال کی تھی۔“

”تسمارا خیال یہ ہے کہ فیکا بس کو آگ لگانے کا ارادہ رکھتا ہے؟“

میں نے کہا ”ملک بھی لگا سکتا ہے۔ بس میں ہم بھی رکھ سکتا ہے۔“

”یعنی ہم جھوٹ بول کے خوف و ہراس پھیلاتا چاہتے تھے۔ فیکا جیج ایسا کرے گا۔ پھر ہمارے پروگرام کا کیا ہوگا؟“
ہمارا کیا ہوگا؟“

”کیا ہوگا۔ فیکا ہم سے بھی خفا ہوگا۔ ہم محض باتیں کرتے رہے۔ صرف وعدے کرتے رہے اور واپس دے دیتے رہے۔ وہ ہمارے آسمان پر بیٹھا رہا“ دل پر مہر کا بھاری پتھر رکھے مگر ہم نے کیا کچھ بھی نہیں اور اس کی بیوی کی جان گئی۔ وہ شاید ہمیں بھی معاف نہ کرے۔“

”ہم نیک نہیں کے ساتھ اس کی مدد کرنا چاہتے تھے مگر یہ اتنا آسان بھی نہیں تھا۔“ خجتم بولی۔

میں نے کہا ”فیکا سمجھتا ہوگا کہ ہم نے دیر کی۔ غفلت برتی۔ معاملہ میری اپنی بیوی کا ہوتا تو کیا میں صرف سوچ بچار کرتا رہتا اور موقع کے انتظار میں وقت ضائع کرتا۔ میں انجام کی پروا کئے بغیر ملک پر چڑھا ہی کرتا۔ میں مرجانا یا مار دینا لیکن کسی اور کی بیوی کے لیے نہیں۔“

”اب ہمیں اس غلطی کو دہرانا نہیں چاہیے۔ اس سے پہلے کہ فیکا ہمیں بھی بس کے ساتھ ہی ہم سے اڑا دے، ہمیں کچھ کرنا چاہیے۔“

ساتھی صفائی بہت تھے اور وہ بھی جو اس کے قلم کی کات سے
مجموع ہوتے تھے۔ اس کے روانہ ہونے کے بعد یہ خطرہ نہیں
رہا کسی مسافر نے اسے غور سے دیکھا بھی تھا تو شخص اس
کے حسن بے مثال کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے
کیا وہ جگہ حسین ہے یا صرف مجھے اتنی حسین لگتی ہے؟
اور جب میں نے اپنے آپ سے ایک فلسفیانہ سوال کیا کہ
آخر حسن کیا ہے تو میرے ذہن میں جواب بھی صدیوں پرانا
آیا کہ حسن تو دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے۔ چنانچہ سلی کو
مجنوں کی نظر سے دیکھو ورنہ وہ تمہیں ایک معمولی ممکن ہے
بے کشش یا بد صورت عورت لگے۔ ہر ماں صرف اپنے بچے
کی نظر کیوں اتاری ہے؟ نظر لگنا اگر کوئی حقیقت رکھتا ہے تو
کوئی بیوی اپنے شوہر کی نظر کیوں نہیں اتارتی۔ کوئی بہن
اپنے بھائی کی یا بیٹی اپنے باپ کی نظر کیوں نہیں اتارتی؟ بات
وہی ہے کہ ہر ماں کی نظر میں صرف اس کا بچہ قدرت کے
حسن تخلیق کا شکار ہے۔ ایسا شکار جو پہلے وجود میں نہیں
آتا چنانچہ دوسرے سب اس سے رشک اور حسد کرتے ہیں۔
میں میری نظر کی بات نہیں۔ جنم واقعی حسین تھی۔
حسین چنانچہ بھی کم نہیں تھی اور اگر موازنہ ممکن ہو تا تو شاید
کسی مقابلہ حسن کے جج کی آنکھ اور تجربہ رکھنے والا اسے ہی
زیادہ نمبر دیتا۔ وہ حسن جو ایک عالمی معیار رکھتا ہے اور
جسمانی ابعاد و شمار کے پیمانے پر ناپ تول کے پرکھا جاسکتا
ہے۔ وہ چندا کے پاس زیادہ تھا لیکن آج کل عالمی مقابلہ حسن
صرف جسمانی خوبصورتی تک محدود نہیں رہا۔ اس میں ذہنی
برتری کو برابری اہمیت حاصل ہے۔ دیکھنے والے صرف ظاہر
کا حسن نہیں دیکھتے۔ باطن کو بھی دیکھتے ہیں۔ خیالات، رویہ،
انداز گفتگو، قوت اظہار، علم اور شعور سب جانچتے ہیں اور
اس اعتبار سے رفتہ رفتہ مجھ پر یہ احساس غالب آنے لگا تھا کہ
جنم سب سے الگ ہے۔

اب الگ ہونا ایک الگ مسئلہ ہے۔ برف پوش پہاڑوں
کی چوٹی پر طلوع آفتاب کا حسن بھی الفاظ میں بیان نہیں
ہو سکتا اور ساحل سمندر پر غروب آفتاب کا منظر بھی۔ دونوں
حسن قدرت کے دائمی شکار ہیں گردو نون الگ ہیں اور ایک
کا موازنہ دوسرے سے کر کے کسی کو زیادہ اچھا سمجھنے قرار دیا
جاسکتا ہے۔ حسین تو نیک بھی تھی اور ایک عالم اہل کار و دانہ
شیدائی تھا۔ شادو اس کے مقابلے میں ذرا بھی حسین نہیں
تھی۔ پوچھنے والے مجھ سے پوچھتے تھے کہ آخر کیا ہے اس میں
س نے مجھے دیوانہ بنا رکھا ہے؟ تو بات ساری یہی ہے کہ
سن وی جو دیوانہ کر دے۔ ہم ہوتے تم ہوتے کہ میرے ہوتے

سب اسی حسن کے اسیر ہوئے۔
چندا کی یاد آئی تو میرے دل میں ایک کک جاگ اٹھی۔
میں نے نیم غودگی میں اسے اپنے قریب محسوس کیا اور اس
کے وجود کی ملک نے مجھے چونکا دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ ابھی
یہاں تھی۔ میرے بہت نزدیک تھی۔ میں اس کا وہ اداس، غم
زدہ کرنے والا، مایوس اور بیمار چہرہ دیکھ سکتا تھا جو زندگی کے
سفر کی آخری منزل تک میرے ساتھ رہا۔ اس نے کیا کیا نہ
کیا میرے لیے اور میں نے کیا کیا نہ کیا اس کے لیے۔
سوئے میں جنم کے وہ شریر بال جن کو وہ اپنے نازک
پاتھوں کی ایک دلنشین حرکت سے مسلسل پیچھے دھکیلتی رہتی
تھی، اب پھل کے اس کے چرسے پر سایہ قلم ہو گئے تھے
اور اس کے رخساروں کو چوم رہے تھے۔ بڑی بڑی روشن
آنکھوں کے در پیچہ بند تھے اور مسکراہٹ سے روشن ہونٹ
تھوڑے سے کھل گئے تھے۔ معلوم نہیں وہ کیا خواب دیکھ
رہی تھی۔

اچانک اس نے آنکھیں کھول دیں اور مجھے یوں لگا جیسے
بس کے نیم تاریک خواب کا ماحول میں شفق کا اجالا اتر آیا
ہے۔ اس کی آنکھوں میں ستارے سے جھلملانے لگے اور
نازک ہونٹوں کی مسکراہٹ دھوپ کی طرح روشن ہونے
لگی۔

اس نے آہستہ سے ایک جمائی لی، "کیا دیکھ رہے ہو
اپنے؟"

میں نے کہا "تمہیں 'مرف' تمہیں۔"

"ابھی دیکھنا پاتی ہے؟" وہ مسکرائی۔

"حسن کے کچھ منظر ایسے ہوتے ہیں جن میں ہر لمحہ ہر
نظر کے ساتھ خیال کا ناپا پی سامنے آتا جاتا ہے۔ جیسے ایک
بار میں مری کے کسی ہوٹل میں تھا۔ وہ ہوٹل مال روڈ سے ذرا
بہت کے کچھ خیب کی جانب تھا۔ ہوٹل سے نکل کے چند
یڑمیاں چڑھتے ہی مال روڈ آجاتی تھی مگر اس کے پچھلے حصے
کی گلی سے وادی کی گمرانی تک اور دور دور تک پچھلے
درختوں سے ڈھکے پہاڑوں تک ایک پورا منظر سامنے آتا تھا۔
تھا۔ کسی بہت بڑی سیٹھا اسکوپ اسکرین کے پردے جیسی
تصویر کی طرح اور یہ ناممکن تھا کہ کوئی اس منظر کے سارے
حسن کو ایک نظر میں جذب کر سکے اور یاد کے نقش پر ایسے
اتار سکے کہ پھر جب چاہے تصور میں دیکھ سکے۔"

"یہ ناممکن کیوں تھا؟"

"ناممکن اس لیے تھا کہ ہر منظر میں ہزار منظر تھے۔ ہزار
مجھے احساس ہوتا تھا کہ ادھر تو میں نے دیکھا ہی نہیں تھا ابھی

تک۔ اس پر تو میری نظری نہیں گئی تھی۔ وادی میں بڑے
پتھروں سے چٹانوں تک۔ کائنات سے اٹکے ہوئے کسی پھول
سے درختوں کی بلندی سے اٹکے ہوئے بادل تک۔ لاکھوں
پہلو تھے اس ایک منظر کے ایسے ہی تم ہو۔"

اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا "مت کرو ایسی
باتیں کیونکہ بعد میں یہ باتیں یاد آئیں گی تو۔"

"تو کیا ہو گا؟"

"دکھ ہو گا۔ کہ وہ وقت گزر گیا۔ وقت تو گزری جاتا
ہے۔"

میں نے کہا "اس خیال سے ہم آج کے وقت کو بھی
دکھ کر لیں؟ یہ کہاں کی غلطی ہے۔ آج کے احساس کا ہر
لمحہ توجہ مانگتا ہے۔ اہمیت مانگتا ہے اور چاہے جانے کے قابل
ہے۔"

اس نے میرے شانے پر اپنا سر رکھ دیا اور آنکھیں بند
کر لیں۔ میں نے گوشہ چشم سے ایک آنسو کے سوتی کو اس
کے رخساروں پر پھسلا دیکھا۔

"یہ کیا تم رورہی ہو؟" میں نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں۔ مجھے یہ سب خواب آرزو کی طرح لگتا ہے۔ ایسا
نہ میں نے کبھی سوچا تھا ورنہ ممکن سمجھا تھا۔ پتا نہیں یہ سب
کیسے ہوا؟"

"کیا کیسے ہوا؟"

وہ بولی "تم ایسے تو نہ تھے پھر ایسے کس طرح بن گئے
اپنی چاہت کے سفر میں بالکل تنہا تھی میں۔ تمہارے پیچھے
بھاگنے والے۔ ایسا کیسے ممکن ہوا کہ تم میرے ساتھ چلتے
لگے۔"

میں نے کہا "بالکل۔ یہ تو خوشی کی بات ہے۔ رونے کی
نہیں۔"

"مگر مجھے ڈر لگتا ہے۔ تم بدل سکتے ہو۔ تم خود کو پوری
طرح بدلے پر قادر ہو۔ تم اپنی شخصیت کو ظاہر میں ہی نہیں
مزاج، عادت اور کردار کے اعتبار سے بھی بدل سکتے ہو۔
تمہارا یہ لمحہ 'یہ زبان' یہ انداز سب جو کل تھا وہ آج نہیں
ہے۔ آنے والے کل میں تم نے نئے نام سے، نئی شخصیت
بنا لی اور مجھے پہچاننے سے بھی انکار کر دیا۔ پھر کیا ہو گا؟"

"کیوں سوچتی ہو تم ایسی باتیں آخر؟" میں نے کہا۔

"شاید اس لیے کہ ابھی تک میں نارمل نہیں ہوئی" وہ
بولی "خوف میرے اندر ابھی موجود ہے۔ تمہیں کھودینے کا
خوف۔"

میں نے اس کے ہاتھ کو جھٹکا "ختم ہو جائے گا یہ خوف

بھی۔ میں ختم کروں گا۔ تمہیں یقین آجائے گا کہ اب کچھ
بدلتے والا نہیں ہے۔ سب ایسے ہی رہے گا۔"

اس نے سر اٹھا کے مجھے دیکھا "ایک بات بتاؤ گے؟"

"صرف ایک ہی کیوں؟ ہزاروں باتیں ہیں جو تم پوچھ
سکتی ہو۔"

وہ بولی "میں برا نہیں مانوں گی جج کا۔"

"مجھے اب تم سے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں رہی۔
میں جج کو تم سے کیسے چھٹا سکتا ہوں؟" میں نے کہا۔

وہ بولی "جو باتیں تم آج مجھ سے کر رہے ہو، یہ تم نے
چندا سے بھی کی ہوں گی؟"

سوال بہت خلاف توقع تھا مگر میں نے کوئی رد عمل ظاہر
نہیں کیا "صرف چندا سے ہی نہیں۔ شادو سے بھی کی تھیں
اور پھر خوشی سے بھی۔"

"شادی سے پہلے؟"

"ہاں۔ شادی کے بعد بھی کچھ عرصہ اور اس کے بعد نہ
جانے کس کس سے۔"

"تم بے وقوف بناتے تھے سب کو؟"

میں مشکل میں پڑ گیا تھا۔ "یہی سمجھ لو مگر چندا ان میں
شامل نہیں ہے کیونکہ چندا سے محبت کرنا تھا تا میرا شاہ عالم
نہیں، شاہ عالم نے شاید کسی سے بھی محبت نہیں کی تھی۔ وہ
محبت کرنے والا دل ہی نہیں رکھتا تھا۔"

"ایسی باتیں تم نے مجھ سے کیوں نہیں کی تھیں؟ مجھے
بے وقوف بنانے کے لیے؟" جنم نے کہا۔

"تم بنی بنائی بے وقوف تھیں۔ شاہ عالم کو کچھ کرنے کی
کیا ضرورت تھی؟" میں نے ہنس کے کہا۔

"تمہارا شاہ عالم کا دل پر قبضت تھا۔ کوئی نہیں مان
سکتا کہ وہ سب تمہاری اداکاری تھی۔ ناصر عظیم تھا جو شاہ
عالم کے گیت آپ میں دنیا کے سامنے رہا۔ اس کا یہ دل
اصل شخصیت سے بالکل مختلف تھا۔ ہر لحاظ سے، تمہاری
اصل شخصیت یہ ہے۔ ایسا ہی سمجھنا چاہیے مجھے۔"

"ہاں۔ کیونکہ ایسا ہی ہے۔"

"نہیں۔ یہ تو اداکاری نہیں؟" اس نے آہستہ سے
کہا۔

اب اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ میں ناراضی کا اظہار
کر کے اس موضوع کو بدل دوں بلکہ پیشہ کے لیے ختم
کروں۔

میں نے برہمی سے کہا "دیکھو جنم! میں تمہیں شک کا
فائدہ دے رہا ہوں۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ تم ابھی تک اپنے

میشل شک کے اثر میں ہو۔ یہ بے یقینی اور تذبذب کی کیفیت کے دورے ہیں جو ہمیں پڑتے رہتے ہیں۔ اب ان دوروں کی شدت بھی کم ہو گئی ہے اور درمیانی وقفہ بھی بڑھ گیا ہے لیکن تمہارا یہ رویہ مجھے بھی پریشان کرتا ہے۔ اگر تم اس شک اور وہم کے خوف زدہ کرنے والے ہمارے خود نہیں تو زندگی تو ساری زندگی بے اطمینانی کا شکار رہو گی۔ اس نے فخت سے کہا "آئی ایم سوری!"

"اگر تمہیں سو فیصد اعتماد نہیں ہے اسے آپ پر۔ تم یہ فیصلہ کرنے سے قاصر ہو کہ شاہ عالم اور ناصر عظیم میں اصل کون ہے اور نقل کون۔ تم اس شخصیت کی تبدیلی سے مفاہمت نہیں کر سکتیں۔ تمہیں لگتا ہے کہ میں اتنا پیار جتنا کے تمہیں ہے وہ توقف بنا رہا ہوں "یکنگ کر رہا ہوں۔"

"دیکھو! ناراض کیوں ہوتے ہو میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

"مطلب کچھ بھی ہو۔ یہ چکر اب ختم ہو جانا چاہیے اور اگر کوئی دشواری ہے تو پھر ہمیں ایک دوسرے سے الگ ہو کے سوچنا چاہیے۔ تم اخبار میں اپنے معمول کے مطابق کام کرو اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ دور رہو کے دیکھو سوچو اور پھر جو سمجھ آئے وہ کرو۔ میرے ساتھ وہ کے تم جذبات سے سوچتی ہو، حالانکہ میں نے سب بتا دیا ہے تمہیں۔ سب سمجھا دیا ہے کہ وہ ناصر عظیم تھا جو شاہ عالم بنا ہوا تھا۔ میں نے ناصر عظیم کی زندگی کی کتاب کا ہر ورق کھول کے تمہارے سامنے رکھ دیا ہے۔ ان سب سے ملو اور تمہیں جو میرے ناصر عظیم ہونے کے گواہ ہیں۔ رخصتی جاتی ہے اور باقی ہے مگر تمہارا تو عجیب ہی معاملہ ہے۔" یہ سب میں نے بہت غصے میں کہا۔

جنم کی حالت غیر ہو گئی۔ آٹسو ایک دم اس کی آنکھوں میں اٹھ آئے اور وہ اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کے رونے لگی۔

میں نے دل کڑا کر کے اسے روکنے دیا۔ "ساری زندگی روکنے سے کیا فائدہ۔ میرے لیے اور بھی تم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ شاد ہو گئی تو کیا میں زندہ نہیں رہا۔ چنانچہ مجھے چھوڑ دیا تو میں پاگل نہیں ہوا۔ زندگی ایسے ہی حادثات سے عبارت ہے۔ تمہارا اعتبار رکھو کے کیا ہو گا؟ کچھ نہیں۔" "خدا کے لیے ایسی باتیں مت کرو۔ مجھے غلام مت سمجھو۔" دوتے دوتے چلا کے وہ بولی "چھوڑ جائے کی دھمکی کوئی کسی کے لیے نہیں مرتا۔ زندگی جلی جیوں کا ڈراما

نہیں ہوتی۔ کسی شرط اور غرض کے بغیر شک اور خوف کے بغیر چلتی ہے محبت کی گاڑی۔"

میرے ساتھ اٹنے ہاتھ کی طرف والی سیٹ پر بھی ایک مرد عورت بیٹھے تھے۔ مرد کی عمر چالیس سے کچھ اور ہو گی۔ عورت اس سے دس سال کم لگتی تھی۔ وہ سب کچھ دیکھ رہے تھے اور شاید سننے کی کوشش بھی کر رہے تھے۔ یہ تو صاف ظاہر تھا کہ ہمارے درمیان کسی اختلافی مسئلے پر بحث ہو رہی ہے پھر جنم نے روٹا شروع کیا اور میں نے غصے کا اظہار کیا تو بات اور واضح ہو گئی۔ آگے پیچھے کی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے لوگ ہماری آواز سن سکتے ہوں گے مگر وہ کچھ دیکھنے سے قاصر تھے۔ نہ جانے کب ہماری آواز بھی اونچی ہو گئی تھی۔

مرو نے اچانک میری طرف ہاتھ دھاکے میرے کھنکھنے کو چھو "یک میں! یہ تم کیا کر رہے ہو؟ یہ کون سی جگہ ہے جھگڑے کی؟"

میں نے اس کی طرف دیکھ کے کہا "ہم جھگڑ نہیں رہے ہیں۔"

"لیکن تمہاری بیوی بد رہی ہے۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔" اس نے میرے قریب ہو کر سرگوشی کی "اگر وہ HYSTERIC ہو گئی تو تمہاں جا کے سب کے سامنے تمہیں آجائے۔ میری بیوی تمہاری جگہ بیٹھ کے اسے خاموش کرانے لگی۔"

میں نے شرمندگی سے کہا "اس کی ضرورت نہیں میں ٹھیک کروں گا۔"

"ہم بھی بہت لڑتے تھے پہلے۔ اب بھی لڑتے ہیں حالانکہ ہمارے بچے بڑے ہو گئے ہیں۔ وہ فوراً آجاتے ہیں ریفری بن کے ہم نے انہیں اختیار دے رکھا ہے کہ ایسی صورت حال میں وہ فوراً مداخلت کریں اور فیصلہ دیں کہ غلطی کس کی تھی۔ تمہارے بچے ہیں؟"

میں نے کہا "جی نہیں۔"

"ابھی نئی شادی ہے پھر کوئی بات نہیں یہ جھگڑے بھی ضروری ہوتے ہیں ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے۔ قہقہے منوں پر جا رہے ہو؟"

اس کی بیوی نے کمسن ماری "یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟"

"دراحدہ دیکھو ان کا۔ ایسے ہوتے ہیں نئے دولہا دلہن۔ اسی لیے پوچھا تھا میں نے" مرو نے ٹھکی سے کہا "اسنے زور سے کئی بار منے کی کیا ضرورت تھی۔ ساری زندگی کنیاں مار مار کے پسلیاں ٹیڑھی کر دی ہیں میری۔"

"تم خود کون سے سیدھے تھے۔ کتنے کی دُم کی طرح ہو آج بھی۔ دوسروں کو نصیحت۔"

مرو نے بڑکے کہا "مجھے کتنے کی دُم کا تم نے تمہارے اشارے پر کتنے کی طرح دُم نہیں ہلا سکتا میں اس لیے؟ تمہاری ماں نے تمہارے باپ کو بندر کی طرح پھینکا ساری عمر۔"

عورت نے چلا کے کہا "میرے باپ کو بندر کا تم نے؟"

روٹنے والی جنم میرے ساتھ بیٹھے لگی۔ ہماری صلح کرانے والے اب خود جنگ میں الجھ گئے تھے۔ اس وقت ان کے بچے موجود نہیں تھے کہ ریفری کی طرح سٹی بجاکے مقابلہ رکاوٹیں اور فیصلہ کرتے کہ فائل کس کا تھا۔ اب ان کی زبانیں بے نیام ہونے والی گواروں کی طرح چل رہی تھیں اور وہ ایک دوسرے کے خاندان کی سات پشتوں کے کڑے ٹوڑے اکھاڑنے میں مصروف تھے۔

میں نے کہا "پلیز، پلیز جناب! یہ آپ کو کیا ہو گیا؟"

مرو نے کہا "ابھی کیا ہوا ہے، آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔"

میں نے کہا "دیکھئے آپ تو ہمیں سمجھا رہے تھے۔ اب خود تماشا بن رہے ہیں سب کے سامنے۔"

مرو نے عورت کی طرف دیکھا اور پھر ہنسنے لگا "کیسا رہا تماشا۔ ہاتھ ملاؤ پھر اسی بات پر۔"

میں نے بے وقوفوں کی طرح ہاتھ ملایا "یہ سب ڈراما تھا؟"

عورت بھی ہنسنے لگی "ٹوڑنے کی بہت پریکٹس ہے ہمیں۔"

مرو نے کہا "بہت دن ہو گئے لڑے ہوئے اب ایسے ہی جھوٹ موت جھگڑے گزار کر لیتے ہیں۔"

"تم بھی ایسا ہی کر کے دیکھو جب جھگڑے کی بات ہو تو چپ رہو اور جب کچھ نہ ہو تو لڑنے کا کھیل شروع کر دو۔"

"غیر کر پوری ہو جاتی ہے بندے کی" مرو بولا "جیسے کرکٹ کا کھلاڑی ٹیسٹ کرکٹ سے ریٹائر ہو جائے تو ٹیسٹ پریکٹس ریٹائر کرنا ہے۔"

آگے پیچھے کے ایک دو لوگ جوان کی لڑائی میں دلچسپی لینے لگے تھے اب مسکرا رہے تھے۔

میں نے جنم کی طرف دیکھا "کیوں اہلیہ محترمہ بات تو دل کو لگتی ہے ان بزرگوں کی۔"

اس نے منہ پھیر کے کہا "مجھے بات ہی نہیں کرنی ہے تم سے۔"

اس کے بعد آدھے گھنٹے تک آداب محبت اور دستور عاشقی کے مطابق وہ مجھ سے روشنی رہی اور میں اسے منانا رہا اور جیسا کہ شاعر نے فرمایا ہے برا مزہ اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر۔

بالآخر اس نے کہا "ایسی دھمکی پھر مت دینا۔"

میں نے کہا "کیسی دھمکی؟"

"تعلق نہ رکھنے کی ساتھ چھوڑنے کی۔"

میں نے کہا "وہ تو کیا اس فرمائی تھی میں نے یہ خود میرے لیے ممکن کہاں تھا مگر تم بھی ایسی بات پھر مت کہنا۔"

"کیسی بات؟"

"یہی کہ تمہیں شک ہوئے لگتا ہے مجھ پر کہ میں شاہ عالم ہی ہوں یا کوئی اور۔"

اس نے فخت سے کہا "نہیں کون گی۔ ایک خوف کے نظریے آنے والے کانٹے کی غلش ہے۔ جو کبھی کبھی انتشار پیدا کرتی ہے۔"

"جب تم جانتی ہو تو پھر اس خوف سے نجات پانا کیا مشکل ہے اور مجھ سے کس بات کا خوف۔"

"تم سے نہیں" اس نے پُر زور لہجے میں تردید کی "خوف اس بات کا ہے کہ کہیں میں پھر تھانہ ہو جاؤں۔ میں نے تمہیں پایا اور پھر کھو دیا پھر کتنے عذاب جھیلے میں نے اور تم لوٹ کر آگئے وہاں سے جہاں سے کہتے ہیں کہ کوئی واپس نہیں آتا۔ ساری دنیا کے یقین کو میرے یقین نے شکست دے دی۔ میں نے تمہیں موت سے چھین لیا۔"

"تم واقعی یہ سمجھتی ہو؟"

"کیا غلط کہا میں نے۔ ساری دنیا کے لیے تم مر چکے ہو۔ زندہ ہو صرف میرے لیے۔ تم نے سب کو چھوڑ دیا۔ مجھے نہیں چھوڑا۔"

میں نے کہا "اچھا اب اگر میں تمہیں چھوڑ دوں؟"

"تم ایسا نہیں کر سکتے۔"

"کیوں نہیں کر سکتا۔ دل کا کیا ہے، ہمک جائے کسی اور پر آجائے کوئی اور اچھا لگنے لگے مجھے۔"

"دیکھو! میں چندا نہیں ہوں۔ اور رخصتی بھی نہیں ہوں۔ میں قفل کر دوں گی تمہیں بھی اور اسے بھی۔ جو تمہیں مجھ سے چھیننے کی کوشش کرے گی۔"

"اور اس کے بعد ساری عمر آٹسو بیاتی رہو گی میرے مزار پر۔ ہر جمعرات کو چراغ جلاؤ گی اور پھول چڑھاؤ گی قبر پر۔"

وہ ہنسنے لگی "تم مذاق سمجھ رہے ہو اسے۔ مجھے آزمانے

کی غلطی بھی مت کرنا کبھی۔ تمہیں مار کے میں پھانسی چڑھنے کا انتظار نہیں کروں گی۔ میں خود کو بھی گولی مار لوں گی۔
 ”پلے تو تمہارے دل میں رقابت کے ایسے خطرناک جذبات نہیں تھے تم پروا بھی نہیں کرتی تھیں کہ میں کس کے ساتھ ہوں اور کہاں ہوں۔“
 ”پلے کی بات اور تھی۔ اس وقت تم کسی کے بھی نہیں تھے اب صرف میرے ہو۔ تم پر صرف میرا حق باقی رہ گیا ہے اور اپنے حق کی حفاظت کرنا آتا ہے مجھے کوئی میرا حق مجھ سے نہیں چھین سکتا۔ اپنا یہ حق حاصل کرنے کے لیے میں نے کتنا انتظار کیا تھا۔ کتنا عذاب بھگایا تھا۔ سارے زمانے سے لڑتا پڑتا مجھے لیکن بالآخر میں نے تمہیں سب سے چھین لیا۔“

”تم واقعی پاگل ہو۔“
 جینم نے کہا ”ہاں میں پاگل ہوں لیکن صرف تمہارے لیے اگر کبھی تمہارے دل میں ایسا کوئی خیال آئے۔“
 ”کیسا خیال؟“

”وہی جو تم ابھی کہہ رہے تھے کہ تمہارا دل کسی اور پر آجائے تو مجھے آزمائش کے عذاب میں موت ڈالنا۔ میں تاریخ ڈالے بغیر اپنی تحریر دے دوں گی تمہیں کہ میں اپنی مرضی سے خودکشی کر رہی ہوں اور اس کا ذمہ دار کسی کو نہ سمجھا جائے اسے اپنے پاس رکھنا۔ کبھی مجھ سے بے وفائی کا خیال دل میں آئے تو پلے مجھے زہر دے کر سلاؤ۔ میں زہر بھی فراہم کر دوں گی تمہیں۔ تمہارا کام بھی آسان ہو جائے گا اور میرا بھی۔“

نہیں دم بخود اسے دیکھتا رہا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ جو کچھ وہ کہہ رہی ہے پورے ہوش و حواس میں یقین کے ساتھ کہہ رہی ہے اور اس میں کوئی شک کی بات نہیں کہ وہ ایسا کر سکتی ہے۔

”جینم خدا کے لیے بس کرو۔ کوئی اور بات کرو“ میں نے کہا۔

”جھا!“ وہ سوچ کے بولی ”آج ہول سیل میں انڈوں کی پٹی کا کیا بھانڈا تھا؟“

میں نے ہنس کے کہا ”کس کے انڈے؟ مرغی کے یا شتر مرغ کے؟“

”انڈے تو شتر مرغی دیتی ہوگی“ جینم بھی ہنسنے لگی۔

باہر اب رات ہو گئی تھی۔ مسافروں کی صورت پر تھکن اور بیخاری کے آثار عیاں تھے میرے پڑوسی ہمارے طرف سے مٹھکن ہو کے اب اپنی باتوں میں مصروف تھے۔

اس تمام عرصے میں میری نظر نیچے پر بھی رہی تھی محمود پر فتح میں چوہ چھپائے خاموش بیٹھا تھا اور نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ معلوم نہیں اس کے دماغ میں کیا تھا اور میں اس سے پوچھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی دوسری عورت ایک خطرناک قسم کے غیر متدبھان کی بیوی تھی جو بڑے کا اتنی شدت سے قائل تھا کہ اس کی بیوی نے کھانا کھاتے ہوئے بھی نقاب نہیں اٹھایا تھا۔ اس کا کھانا نیچے کے اندر پہنچ گیا تھا اور اس نے اندر ہی کھالیا تھا۔ اسے یقیناً اس کی پریکٹس اور عادت تھی۔

بس رات کے کھانے اور عشا کی نماز کے لیے پھر ایک پینول پب کے روڈ سائڈ ہوٹل کے سامنے رک گئی۔ یہ شاہ جی کے پب اور ہوٹل کے مقابلے میں غیر آباد جگہ تھی۔ ڈرائیور مستانہ نے اعلان کیا کہ آگے بس صبح فجر کی نماز سے پلے کہیں نہیں روکی جائے گی۔ کھانا پینا اور جو کچھ کرنا ہے یہاں کر لیں۔ چنانچہ ”جو کچھ“ کرنے کے لیے حضرات کھلے آسمان کی چھت کے نیچے باندھ چرے میں گم ہو رہے تھے۔ خواتین ایک جیل کی کوٹھری جیسے تختہ حال اور گندے کمرے کے دروازے پر کھڑی تھیں جس کی اہمیت اور ضرورت کو مزید واضح کرنے کے لیے کسی عالم فاضل نے اس پر بلفلم خود چوڑے لٹے لٹکے کا تھا ”ہیت الخالہ“ یعنی خالہ کا گھر۔ غالباً بیت الخلاء سے اس کا ذہن خلا“ خلائی پرواز اور خلائی ستاروں کی طرف جاتا ہو گا۔

میں اور جینم ٹانگیں سیدھی کرنے کے لیے بہت دیر چلتے رہے پھر وہ خالہ کے گھر کی طرف چلی گئی جہاں اب ضرورت مندوں کی قطار نہیں تھی اور میں نے اوپن ایئر ٹاکٹ کا رخ کیا۔ واپس آ کے ہم نے بھی کھانے کی رسم پوری کی پھر میں نے چائے کے نام پر براؤن رنگ کا دودھ والا شیرہ نوش فرمایا اور جینم نے کولڈ ڈرنک کو ترجیح دی۔

”اس کا ذائقہ ہاضمے کے منہ پر جیسا ہے جس میں پانی کی جگہ گنے کا رس استعمال کیا گیا ہو“ اس نے آدھی بول پلی کے کہا ”بہ نقلی ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔ میں بھی نقلی ہوں۔ تم بھی وہ نہیں جو نظر آ رہی ہو۔ دنیا میں دھوکا دینا دھوکا ہے۔“ میں نے کہا۔

”میں نیچے سے پوچھنا چاہیے کہ بتا تیری رضا کیا ہے؟“

”اگر میں نے اس سیٹ کی طرف رخ بھی کیا تو وہ پٹھان پلے مجھے گولی مارے گا جس کی منکوحہ نیچے کے ساتھ بیٹھی ہے۔ بعد میں پوچھے گا کہ یہ کیا حرکت تھی؟ تم میں بہت ہے تو

جا کے اس سے بات کرو۔“
 جینم نے کہا ”ٹھیک ہے مگر کوئی بہانہ ہونا چاہیے۔“
 ”بہانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم اس کے پاس جا کے کان میں کو کہو کہ نیچے شرافت سے مجھے بتا دو کہ تم کیا کرنا چاہتے ہو ورنہ میں تمہارا بھانڈا اچھوڑ دوں گی۔ ممکن ہے وہ ڈر جائے۔“

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ نیچا کچھ بھی نہ کرنا چاہتا ہو۔ اس نے ملک کے خوف سے جان چاکے فرار ہونے کے لیے روپوشی اختیار کی ہو۔“

”مستادان حسین۔ کیا جان بھانے کے لیے نیچے کا کوئی جانا ضروری تھا؟ اور اگر ضروری تھا فرض کر لیا جائے کہ کوئی میں اس کا کوئی ناما رہتا ہے تو وہ ملک رب نوازی کی بس سروس کا انتخاب کیوں کرتا؟ اور بھی ہمیں جانی ہیں کوئی سب سے محفوظ تھا نہیں۔“

جینم کچھ خفیف ہوئی ”یہ تو ٹھیک کہا تم نے۔“
 ”میرا خیال ہے کہ آدھی رات کے بعد ہی کچھ کرے گا نیچا۔ اگر ہم نے اسے نہ روکا تو ہمارا سارا پلان دھرا رہ جائے گا۔“ میں نے کہا۔

جینم نے سر ہلایا ”آخر کیا کرنا چاہتا ہے؟ بس کو ہم سے اڑانا چاہتا ہے یا بالی جیک کرنا چاہتا ہے؟“

”بہتر ہے یہ سوال تم نیچے سے کرو۔“
 جینم سوچتی رہی ”وہ مسلح بھی ہوگا۔ دستی بم تو خیر چھوٹی سی چیز ہے۔ پر فتح میں کھا شگوف بھی چھپائی جاسکتی ہے۔“
 ”کیا ایسا ہی وہ ہمارے بارے میں نہیں سوچ رہا ہوگا اور پریشان نہیں ہوگا کہ آخر ہم ایسے پراسرار طریقے پر کوئی کیوں جا رہے ہیں ملک رب نوازی کی بس سے۔“

”یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ میں اسے سمجھا سکتی ہوں کہ تمہارے اور ہمارے مقاصد ایک ہیں۔ ہمیں مل کے کام کرنا چاہیے۔ کوئی ایسی حرکت مت کرنا کہ اپنے ساتھ ہمارا بھی بیڑا غرق کرادو مگر اصل مسئلہ ہے اس کے پاس جینم کے بات کرنے کا۔ ایک آزمایا اور ہے۔“ جینم نے چٹکی بجا لی۔

”فرماؤ“ میں ہمت تن کوٹھ رہی۔
 ”کیا کسی طرح ہم اس کے پیچھے والی سیٹ پر جا کے بیٹھ سکتے ہیں؟“

میں نے کہا ”چلو وہاں بیٹھتے ہیں۔ ان سے درخواست کی جاسکتی ہے مگر پھر وہی بات کہ بہانہ کیا ہو؟ اگر ہماری سیٹ پیچھے ہوئی تو میں کتنا کہ جھگڑے زیادہ گئے سے میری بیوی کی طبیعت بگڑ رہی ہے۔ یہ بھی کہا جاسکتا تھا کہ ایسا ہوتا ہے اگر

ایسا ہو جیسا کہ تم بھی جانتی ہو۔“
 ”یہ کیا ایسا جیسا کی گردان چل رہی ہے۔“
 ”بہتر میرا مطلب تھا۔ کہ چوتھے سینے میں۔“
 جینم کا چہرہ لال پڑ گیا ”فضول اور بے ہودہ باتیں مت کرو۔“

میں نے ہنس کے کہا ”جو تمہا مینہ تو ہے۔ اپریل۔ مگر خیر! وہ معقول لوگ ہوئے تو کسی دلیل کے بغیر بھی مان جائیں گے۔ روایت پیچھے آنے سے انہیں فرق نہیں پڑتا چاہیے۔“
 ”مگر کوئی وجہ بھی ہو۔“

میں نے اُدھر اُدھر نظریں دوڑائیں ”ایک منصف میں ان سے بات کر کے آتا ہوں۔ وہ دونوں ادھر بیٹھے ہیں۔ میں ان سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ کے سامنے والی سیٹ پر جو خاتون اکیلی بیٹھی ہیں۔ وہ ہمارے ساتھ ہیں۔ ہم ان کے نزدیک ہونا چاہتے ہیں۔ مجبوری میں الگ الگ بیٹھنا پڑا۔“
 میں گیا اور جھک مار کے لوٹ آیا۔ وہ دونوں ذرا بھی معقول نہیں تھے ان میں سے ایک نے کہا ”سارا دن تم اکیلا بیٹھا رہا۔ ابھی رات کو ادھر نزدیک بیٹھ کے کیا کرے گا؟“

دوسرے نے تاکید میں سر ہلایا ”سفر میں سب مجبوری ہوتا ہے۔“

بس ایک بار پھر روانہ ہوئی تو میں پلے کے مقابلے میں زیادہ چوکس تھا۔ نیچے نے پھر ایک بار بھی پلٹ کے نہیں دیکھا اور میں نے اسے اپنی جگہ سے اٹھتے بھی نہیں دیکھا تھا۔ معلوم نہیں اس نے کھانا کیسے کھایا؟ اور اسے نودس گھنٹے میں کسی حاجت نے بھی اٹھنے پر مجبور نہیں کیا۔ شاید وہ ڈرتا تھا کہ پر فتح کے باوجود اس کی موانگی کا راز افشا ہو جائے گا۔ اس کی چال چلتی کھالے کی یا وہ کوئی غیر زنانہ حرکت کر بیٹھا تو لوگ پلے تو مارا کہ اس کی جس بدل ڈالیں گے اور رہی سہی کسر پولیس پوری کر دے گی۔

جینم پھر اچھوٹنے لگی گئی یا سر پیچھے کیے سوچ رہی تھی۔ میں بھی اگلے چند لمحوں کی خیالی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ مجھے امید ضرور تھی مگر پورا یقین نہیں تھا کہ ریش خاں ایک جعلی انسپکٹر نہیں عرف جیسے بیڈے کے ساتھ ایک سابق انسپکٹر پولیس کو لائے اور چھاپے کا ڈراما منبج کرنے میں کامیاب ہوگا۔

ریش کی کوشش کو ناکامی سے دوچار کرنے والے اسباب بہت تھے۔ یہ ہو سکتا تھا کہ کوئی اس خطرناک مشن میں اس کا ساتھ نہ دے۔ ان کے اور ہمارے درمیان رابطے میں گڑبڑ ہو جائے چھاپا مار کا ردائی کے دوران میں کوئی اصل پولیس

پارٹی نمودار ہو جائے۔ یا یہ کہ مجھے کاکولی تینہ نہ نکلے۔
اچانک جنم نے آنکھیں کھول کے کہا "سنوئی۔ سنوئی۔
نیکے نے یہ حرکت کیوں کی تھی؟"

میں نے کہا "کوئی غلط حرکت کی ہے اس نے تمہارے
ساتھ تو میں قتل کروں گا۔"

"اس نے اپنی شکل کیوں دکھائی تھی ہمیں۔ بیٹا رہتا
جیسے اب بیٹھا ہوا ہے۔"

"شاید اسے امید نہیں ہوئی کہ ہم اس کی ایک جھٹک
دیکھ کے اسے پہچان لیں گے۔"

"مگر اس نے دوبار جھٹک دکھائی۔ ایک بار مجھے ایک بار
تمہیں۔ اس کا مقصد یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ دیکھو مجھے پہچان
لو۔ میں فیکا ہوں۔ میری موجودگی بے سبب نہیں اور تم بھی
تفریح کے لیے اس بس سے کوئی نہیں جا رہے ہو۔ ہم دونوں
ملک رب نواز کے ایک جیسے دشمن ہیں۔ ہمارے درمیان
تعاون اور اشتراک ہونا چاہیے۔ ہمیں ایک دوسرے کا پردہ
رکھنا چاہیے۔"

میں نے کہا "میرا آر رائٹ۔ ہم نے اس کی خاموش
پیشکش کے جواب میں خاموشی اختیار کر لی تو گویا بات ختم
ہو گئی۔"

جنم بولی "مگر ہم اس سے بات کرتے تو ضرور فائدہ
ہوتا۔"

میں نے کہا "اب کرو۔ اٹ اٹ۔"

اپنی جگہ آرام سے بیٹھو۔ کسی نے ہوشیاری دکھائی تو بہت
سے بندے مارے جائیں گے سانسے دیکھو۔"

سب کے ساتھ ایک خود کار لڑکی طرح میرا سر بھی گھوم
گیا تھا اور جو کچھ میں نے دیکھا اس پر میری عقل بھی دنگ
اور آنکھیں پھٹی رہ گئی تھیں۔ یہ ایک انگش اور ماروھاڑ
سے بھرپور ظلم کا منظر لگتا تھا۔ سب سے پیچھے کونے کی سیٹ پر
ایک لڑکی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کلا شکوف
تھی جس کا رخ بس کے اندر ہر مسافر کو اپنی طرف محسوس ہوا
ہوگا۔

اس بس میں پٹھان کافی تھے۔ پٹھان صرف سرحد کے
رہنے والے ہی نہیں کہلاتے۔ عام طور پر بلوچستان کے لوگ
بھی پٹھان ہی سمجھے جاتے ہیں اور افغان بھی۔ شاید ان کے
ظاہری طبعی تہذیب و ثقافت اور ایک جیسی اخلاقی قدروں
کے علاوہ ایک جیسی محسوس ہونے والی زون کے باعث۔ اس
علاقے کے رہنے والوں کے مواصلے کو اپنا زور سمجھتے ہیں
اور ہر شخص باہر ہر وقت مسلح رہنا اتنا ہی ضروری سمجھتا ہے
جتنے کہڑے پٹھان۔

نیکے نے اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا تھا۔ اس
بات کے امکانات بہت زیادہ تھے کہ جب وہ آگے بیٹھے ہوئے
ڈرائیور کی گردن پر دیو اللور کی ٹال رکھے تو پیچھے سے کوئی بھی
پٹھان اس کی کھوپڑی میں گولی اتار دے لیکن ایسی نوٹ آنے
سے پہلے ہی بالکل پیچھے کھڑی ہوئی لڑکی نے نیکے کو پورا تحفظ
فراہم کر دیا تھا۔

بس کے سارے مسافر اپنی اپنی جگہ منجمد ہو گئے تھے۔ یہ
بات آسانی سے سب کی سمجھ میں آگئی تھی کہ اب کسی کی
بمداری صرف اس کے حق میں نہیں دوسروں کے لیے بھی
خود کشی کے مترادف ہوگی۔ کلا شکوف کا ایک برست نہ
جانے کتنے جسموں کو جھلی کر دے گا۔ اس کی ہر گولی ہر موت
کا نام تھا وہاں کوئی اپنی موت کو خود آواز دینے والا نہیں تھا۔
اس قسم کی صورت حال میں ابتدائی چند منٹ فیصلہ کن
اور خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ سمجھ دار لوگ اپنے اعصاب
پر قابو پا لیتے ہیں اور جان بچانے کے لیے ہائی جیکروں اور
دہشت گردوں کی ہر بات بلا چون درچال مانتے جاتے ہیں مگر جن
کے اعصاب کمزور ہوں یا بلند پریش سے جن کے دماغ کا فیوزاڑ
جاتا ہو وہ فوری طور پر سوچے سمجھے بغیر کچھ کر جاتے ہیں اور
اس کو شش میں اکثر خود مارے جاتے ہیں لیکن کبھی اتھریا اور
بو تو جان کی بازی لگا کے کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔
یہ چند منٹ گزر چکے تھے اور سب نے صورت حال کی

عجیبی کو قبول کر لیا تھا۔ مردوں نے عورتوں کو ڈانٹ کر چپ
کرا دیا تھا اور عورتوں نے بچوں کو پیٹنے سے لگایا تھا۔ کچھ
عورتیں رو رہی تھیں اور کچھ نروس لہجے میں تلاوت کرنے
لگی تھیں۔

بس کی رفتار کم ہو گئی۔ ڈرائیور متانہ یقیناً مضبوط
اعصاب کا مالک اور آسانی سے خوف زدہ نہ ہونے والا آدمی
تھا "کون ہو تم؟"

"میں تیرے باپ ملک کا باپ۔"

"تو۔ فیکا ہے۔ آواز سے لگتا ہے۔ ڈرائیور نے پلٹ
کر دیکھے بغیر کہا۔

"ہاں۔ فیکا ہوں میں۔"

"یہ کیا کر رہا ہے تو۔ کیا چاہیے تجھے؟" ڈرائیور نے
سکون سے کہا۔

"سیدھا چلتا جا۔ آگے سڑک دو حصوں میں تقسیم
ہوگی۔ اگلے ہاتھ پر جانا ہے۔"

"اگلے ہاتھ پر۔ مگر وہ سڑک۔"

"مجھے پتا ہے۔ وہ پرانی سڑک بند ہے آگے سے" فیکا
بولی۔

"ٹھیک ہے۔ جیسا تو چاہے گا ویسے ہی ہوگا۔ اپنے آپ
کو قابو میں رکھ۔ ایسا نہ ہو گولی چل جائے خواہ خواہ۔ میرے
ہاتھ میں بس ہے۔ بہت لوگ مارے جائیں گے۔"

"مارے جائیں۔" مجھے پروا نہیں۔ میری بیوی کو مارنے
والوں میں تو بھی شامل تھا۔ فیکا جیج کے بولا۔

پیچھے سے لڑکی نے چلا کے کہا "اوائے متانے سڑک کے
بچے۔ سیدھا کھڑا رہ اپنی جگہ پر۔ بلاوجہ سر کو مت گھما۔"

میں اسے لڑکی ہی کہوں گا۔ اس نے اپنا چہرہ پر فتح کے
نقاب میں ایسے چھپا رکھا تھا کہ میں صرف اس کی پیشانی کا کچھ
روشن حصہ اور اس کی سرچ لائٹ کی طرح متحرک آنکھوں کو
ہی دیکھ سکتا تھا۔ صرف ایک بار میں نے بھی سب کے ساتھ
پلٹ کے دیکھا تھا۔ اب کسی میں اتنی بہت نہیں تھی کہ پیچھے
مڑ کے دیکھے۔ تاہم اس کی جسمانی ساخت ایسی ہی تھی۔ وہ
دلچسپی اور درمیانے قد کی لڑکی لگتی تھی۔ اپنی آواز سے بھی
اس کی عمر کا کچھ اندازہ ہوتا تھا۔ وہ میں اور میں کے
درمیان ہو سکتی تھی مگر وہ بے حد مستعد اور بہت بمداری لڑکی
تھی۔ عام لڑکی کلا شکوف دیکھ کے ہی دہشت سے بے ہوش
ہو سکتی ہے مگر اس نے یہ خطرناک ہتھیار کسی پیش رو سپاہی کی
طرح اٹھا رکھا تھا۔ اس کی آواز میں رعب تھا، کچھ نہیں
تھی۔ ایک سپاٹ اور جذبات سے عاری لہجے میں بات کرنے

والی وہ لڑکی اگر کسی دہشت گرد تنظیم کی رکن نہیں تھی تو پھر
یہ اعتقاد قابل تعریف تھا۔

"میں نے نہیں مارا تیری بیوی کو فیکے۔"

"سب سے پہلی کہتے ہیں" فیکا چلا کے بولا "وہ ملک
بھی یہی کہتا ہے پھر کیا اسے فرشتوں نے مارا؟ خود میں نے
مارا؟ وہ بیٹھے بیٹھے کر گئی۔ مجھے سب پتا ہے کہ ملک کے کتے بو
تھ تم سب شریک تھے اس جرم میں۔ میں کسی کو نہیں
چھوڑوں گا۔ کسی کی بیوی نہیں بنے گی۔ سب کا یہی حشر
کروں گا میں۔" فیکے نے اپنی دیو اللور آئینہ دھکی میں لم سے
کم نصف درجن گالیاں استعمال کی ہوں گی جو عام حالات میں
وہ خود بھی عورتوں کے سامنے نہ بلتا مگر وہ اپنے ہوش میں نہیں
تھا۔

جنم نے آہستہ سے سرگوشی میں کہا "کیا تم ایسے ہی
خاموش ہمشائی بن کے دیکھتے رہو گے؟"

میں نے کہا "ہاں۔ تم بھی دیکھو۔ کیا پنشن اور ایکشن
والا ڈراما ہے۔"

"یہ لڑکی کون ہے؟ فیکے کے ساتھ کیسے آگئی؟"

میں نے کہا "نہ کے کوچہ لو مگر کلک بڑھ کے اٹھنا۔"

"یہ بالکل سچ نہیں کہتی اس چند کے ساتھ۔ کتنی دلیر
اور الٹ لڑکی ہے۔ کیا یہ سچ کلا شکوف کا برست کھول
سکتی ہے؟"

"یہ بھی اچھا سوال ہے۔ تم اپنا دیو اللور نکال کے کھڑی
ہو جاؤ۔ پتا چل جائے گا کہ صرف دھکی دے رہی ہے یا۔"

لڑکی نے پھر اونچی آواز میں کہا "ہم کسی مسافر کو نقصان
پہنچانا نہیں چاہتے۔ ہماری کسی سے دشمنی نہیں۔"

"پھر یہ کیا کر رہے ہو تم لوگ؟" کسی نے سوال کر دیا مگر
میں پلٹ کر سوال کرنے والے کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔

"ہم اپنا انتقام لے رہے ہیں۔ یہ ہمارا ذاتی مسئلہ ہے۔"

لڑکی نے کچھ پرسکون لہجے میں کہا "اس بس سیکینی کے مالک نے
میری بس کو اغوا کیا۔ اس کی آواز لونی ملک رب نواز کے
پالو کتوں نے اور پھر اسے مار دیا۔ قانون اس کا کچھ نہیں
کھاؤ سکتا لیکن ہم سزا دیں گے اسے اور ان بے رحم بے ضمیر
مالکوں کو۔"

نیکے نے کہا "اُدھر سے موڑ لے بس۔ سیدھا چلتا جا۔
کوئی حراسی پن نہیں۔"

ڈرائیور نے بس کو موڑ لیا۔ بہت سی عورتیں اونچی آواز
میں رونے لگیں۔ ماؤں کو رونا دیکھ کے بچے بھی رونے لگے۔
"خوب۔ تو یہ سالی ہے فیکے کی؟" جنم نے کہا۔

”سالی۔ تو مگر والی۔ یہ تو بڑی پانڈ ہے بھی“ میں نے کہا ”اس کے مقابلے میں فیکا تو اگر حق ہے۔ دھواں دینے والی۔“

”کیا اس کی بہن بھی ایسی ہی تھی؟“ فیکے کی بیوی ”ضروری تو نہیں مگر وہ بہت خوب صورت تھی“ کیا یہ بھی ہوگی؟

”ضروری تو نہیں“ جنم نے مجھے میرے الفاظ لوٹائے۔ فیکے کے حکم پر بس ایک جگہ رک گئی۔ یہ پرانی سڑک نہ جانے کب سے زیر استعمال نہیں تھی۔ ٹوٹی ہوئی سڑک پر جمائیاں آگ آئی تھیں اور پتھر پتھر ہوئے تھے شاید نئی سڑک کسی شہر کو بائی پاس کرنے کے لیے بنائی گئی تھی یا کسی نئے پل سے گزرائی گئی تھی۔ چند سینکڑوں کے لیے جیسے کائنات کا حکم تھی۔ بس کا شور جھگڑے اور دوسری سب آوازیں اچانک خاموش ہو گئیں۔ شدید خوف کے تاؤ اور بے چینی کے کشیدہ ماحول میں چالیس بیالیس مسافر بے حس و حرکت بیٹھے رہے۔

”چالی نکال کے نیچے ڈال دے“ فیکے نے حکم دیا۔ مستانہ آگے جھکا پھر وہ چپے کی طرح پلٹ کے جھپٹا لیکن وہ فیکے سے زیادہ پھر پلٹا ثابت نہیں ہوا۔ فیکا جو دیکھنے میں واقعی چند اور کال لگتا تھا ”رہو اور ہاتھ میں آجانے سے اور اپنے انتہائی جذبات کے دباؤ سے باہل ہو رہا تھا۔ میں نے گولی چلنے کی آواز سنی پھر ذرا نیچے چلایا۔ عورتوں نے کورس میں ایک بڑی لڑکی چبھ لہند کی۔ پیچھے سے لڑکی نے ڈانٹ کے سب کو خاموش رہنے کا حکم دیا۔ فیکے نے مستانہ کو واقعی گولی مار دی تھی۔ گولی بس کے شیشے میں سوراخ کرتی باہر رات کی تاریکی میں نکل گئی تھی۔ شیشے پر گزری کا جالا سا پھیل گیا تھا۔

گولی ذرا نیچے کے کندھے پر لگی تھی۔ وہ ایک ہاتھ سے کندھا دبا کے پیچھے گرا اور پھر اٹھا ”فیکے۔ مجھے مت مار۔ ہم خدا کی میں نے نہیں مارا تیری بیوی کو۔ میری تیری کیا دشمنی۔ تو بھی اپنی طرح ذرا نیچے رہا۔ ہم سب ملک رب نواز کے حکم کے غلام ہیں۔“

”اس کی لاش تو ہی اٹھا کے لایا تھا“ فیکے نے اسے گالی دی۔

”ہاں۔ مجھے ملک نے کہا تھا“ میں کیسے انکار کرتا؟“ ”چل اتر پیچے“ فیکے نے اسے حکم دیا اور اس کے پیچھے خود بھی ساڑھ کے دوڑنے سے باہر کود گیا۔

لڑکی نے پیچھے سے اعلان کیا ”سارے ایک ایک کر کے

نیچے اتریں گے۔ دیوانے گیت کھول اور اتر کے نیچے کھڑا ہو جا۔“

دیوانے نے زبردستی کہا ”اپنی تو پتلون شلٹون بھی میلی شلی ہو گئی ہے۔“

لڑکی نے اپنی زانو دھاڑ کے ساتھ کہا۔ ”سنا نہیں کیا کہا میں نے۔ مرد پہلے اتر جائیں۔ ہاتھ اوپر۔ سب ایک لائن میں کھڑے ہو جائیں۔ اس کے بعد عورتیں آئیں گی۔ آخر میں بچے۔“

کچھ مردانہ اور کچھ زنانہ احتجاج کی ٹلی جلی آوازوں کا شور بلند ہوا۔ ایک عورت چلانے لگی ”ہائے“ میں نے کو کیسے چھوڑا جس ان ظالموں کے پاس۔“

میں نے کہا ”اسے ڈانٹا“ جب کہ انہیں ظالم کہہ رہی ہے بے وقوف۔ ابھی ٹھانیں سے کوئی مار دیں گے۔“ ایک لرزتے شخص نے کانپتی آواز میں اپنی شریک حیات کو ایسے اللہ دعا کہا جیسے وہ محاذ جنگ پر اگلے مورچے میں کام آنے جا رہا ہے۔ ”اللہ نہ چاہا تو ہم پھر ملیں گے تم دعا کرنا“ بچے تمہارے حوالے کر کے جا رہا ہوں۔ ان کا خیال رکھنا۔“

ایک بزرگ نے وصیت کے انداز میں اپنے پسماندگان کو سمجھاتا شروع کیا ”بھئی تمہارے کی کوئی بات نہیں۔ اب انہوں نے کہا ہے کہ ہمیں کچھ نہیں ہو گا تو انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

ایک عورت نے اس حکم کے خلاف آواز اٹھائی ”یہ کیا بات ہے“ میں نے اپنے بچوں کو کیسے چھوڑ دیں پیچھے۔“ اس سے دوسری عورت کی ہمت بڑھی ”بچے ہمارے ساتھ جائیں گے۔“

کھانکھن والی لڑکی نے یہ مطالبہ تسلیم کر لیا ”ٹھیک ہے۔ چھوٹے بچے عورتوں کے ساتھ جائیں گے۔ بڑے مردوں کے ساتھ پہلے اتر جائیں۔“

وصیت کرنے والے بزرگ نے کہا ”عزیزو۔ ایک گزارش ہماری بھی قابل غور ہے۔ خواتین کو پہلے موقع دیا جائے۔“

ایک بو جھوں والے نوجوان نے کہا ”ہاں۔ ٹائی فیک ڈوبنے لگا تھا تو پہلے عورتوں کو نکالا گیا تھا۔“

”کی اور نے کہا“ ٹائیڈ فرسٹ کا اصول ہے۔“

”تو اس بند کو اصول کے نیچے اتر دینے“ لڑکی نے چلا کے کہا ”عام ضائع مت کرو ہمارا۔“

میں نے کہا ”جہاں خطرے کا سامنا ہو وہاں مردوں کو

پہل کرنا چاہیے“ اور اسے ہاتھ اٹھا کے گیت سے اتر گیا۔ گیت کے دوسری طرف ذرا نیچے مستانہ اور فیکا کے دلائل جاری تھے۔ مستانہ درد سے کراہ رہا تھا اور فیکا کی منت سماجت کر رہا تھا۔ اسے سمجھا رہا تھا کہ ان کے گناہ لوگوں سے ملک رب نواز کے جرم کا بدلہ لینا کوئی اچھی بات نہیں۔ اچھی بات یہ ہے کہ بندہ دشمن کو بھی معاف کر دے۔ مجھے اس کی باتوں پر حیرانی نہیں ہوئی۔ بڑے بڑے فرعون صفت انسانوں کو فرشتہ اجل کی دید پر خدا یاد آجاتا ہے۔ تمام عمر شیطان کے مشن کو آگے بڑھانے والے موت کو سامنے دیکھ کر نیکی اور ثواب کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔

میں اپنا مت مخالف سمت میں کر کے کھڑا ہو گیا تھا۔ میری تقلید کرتے ہوئے میرے پڑوسی بھی اتر آئے تھے پھر ایک ایک کر کے دوسرے سب مرد بھی لائن میں شامل ہو گئے۔ پیچھے بس میں اب زیادہ چیخ و پکار رہی ہوئی تھی۔ دوسری طرف سے ذرا نیچے مستانہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا آیا۔

کھیتنے بڑے دردناک لمحے میں اس کا استقبال کیا ”استادجی“ آپ کے تو خون شون نکل رہا ہے۔“

مستانہ نے غرا کے کہا ”اور کیا تیل نکلے گا پگل دے پتر۔ یہ سب تیری وجہ سے ہوا۔ تو نے نہیں دیکھا کہ برقع پہنے ایک مرد بیٹھا ہے۔“

دیوانے نے فریاد کی ”استادجی میں کیسے جھانک سکتا تھا نقاب شتاب کے اندر۔ زنانی سوار یوں کے ساتھ والا بندہ مجھے کڑچ کر دیتا۔“

کھانکھن والی لڑکی پہلے سے طے شدہ پروگرام پر عمل کر رہی تھی۔ پلان یقیناً فیکے نے بنایا ہو گا مگر اس پر وہ اکیلا عمل نہیں کر سکتا تھا۔ اصل کمال اس لڑکی نے کیا تھا جو اپنی بہن کے قاتل سے بدلہ لینے کے لیے فیکے کا ساتھ دینے پر راضی ہو گئی تھی حالانکہ یہ کام اس نے پہلے کبھی نہیں کیا ہو گا۔ وہ غیر معمولی ہمت رکھنے والی لڑکی تھی اور یقیناً اسے اپنی بہن کی بے آہوئی والی موت کا اتنا دکھ تھا کہ فیکا کچھ نہ کرنا تب بھی شاید وہ خود ملک رب نواز کو قتل کر دیتی۔

مردوں کے بعد عورتوں کی باری تھی جو اب اپنی گود کے نیچے۔ جڈ بیک اور دوپٹے سنبھال رہی تھیں۔ انہیں موقع ملا تو باہر سب کے سامنے آنے سے پہلے وہ لب اسٹک بھی درست کرتیں مگر لڑکی نے ان کو جلدی کرنے کا حکم دیا اور پھر خود ان سے پہلے اتر کے گیت پر کھڑی ہو گئی۔ اس نے عورتوں کو اترنے میں مدد بھی دی اور ان کے چھوٹے بچوں کو سنبھال کر اتارا۔ یہ سب میں نے دیکھا نہیں مگر اپنے کانوں تک

چنچنے والی آوازوں سے میں اندازہ کر سکتا تھا کہ پیچھے کیا ہو رہا ہے۔ عورتوں کو مردوں سے کچھ فاصلے پر کھڑا کر دیا گیا۔

جس سڑک پر بس کوئٹہ کی طرف جا رہی تھی وہ اس ویران جگہ سے ایک کلومیٹر دور ہوئی یا شاید زیادہ۔ خود بحفاظت اتر جانے کے بعد اب مسافر اپنے سامان کی طرف سے پریشان تھے۔ عورتیں چیخ رہی تھیں۔ ہائے میرے تو سارے کپڑے ہیں سوٹ کیس میں۔ میں نے سارے کپڑے بڑے بکس میں ڈال دیے تھے سامان کا کیا ہو گا۔

لڑکی نے ایک دم کھانکھن کا برست کھول دیا۔ ایک طرف کے ٹائڈ دھماکے سے پھٹ گئے۔ عورتوں نے بڑائی چچیں ماریں اور بچے ان بچوں سے دل کے زور زور سے رونے لگے۔

”یقینی سامان اٹھا سکتے ہو تو اٹھا لو اور جتنی دور جا سکتے ہو چلے جاؤ“ لڑکی نے حکم جاری کیا ”ہم اس بس کو آگ لگانے والے ہیں“ وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔ صرف دس منٹ دیں گے ہم۔“

ایک بار پھر لڑکی چلی۔ عورتوں نے چلا چلا کے اپنے مردوں کو آوازیں دینا شروع کیا۔ فلاں بکس اٹھاؤ۔ فلاں سوٹ کیس نکال لاؤ۔ سارا سامان لے آؤ جلدی جلدی۔ کچھ سربراہا لیتا۔ کچھ ہاتھ میں پکڑ لیں۔ سڑک کو نہی دور ہے۔“ ظاہر ہے اس حکم کی ہدایات پر مردوں کا تو عمل خوشگوار نہیں تھا۔ وہ خفا ہوئے تھے کہ ایک سوٹ کیس اٹھا کے سڑک تک جانا کیا آسان کام ہے؟ اتنا وزن ایک قلی بھی اٹھا کے ایک کلومیٹر نہیں جا سکتا۔ لڑکی کے اعلان نے کچھ افراد اتنی پھیلا دی تھی۔ اس نے دوسرا حکم جاری کیا ”چلو ایک ایک کر کے جو اٹھانا ہے اٹھاؤ۔ جلدی“ جن کو کچھ نہیں لینا ہے وہ جائیں۔ سڑک اس طرف ہے۔ صبح بس مل جائے گی دوسری۔“

مجھے کچھ اٹھانا نہیں تھا مگر میں ڈرائے کا آخری سین دیکھنے کے لیے رکا رہا۔ ہر مرد نے پانچ منٹ میں کوئی چیز اٹھالی۔ ایک سوٹ کیس یا صندوق کے ساتھ وہ اپنی فیملی سے جاملے پھر انہوں نے ایک قافلے کی صورت میں چلنا شروع کیا۔ یہ ایک عجیب منظر تھا۔ تیس چالیس مرد عورتیں اور بچے روتے پینتے چنچتے چلاتے سامان چھپتے ویران جنگل کی تاریکی میں موت سے دور بھاگ رہے تھے۔ لڑکی نے ایک برست انہیں دہشت زدہ کرنے اور اس بات کا یقین دلانے کے لیے مارا تھا کہ وہ غلط امیدوں کا سہارا نہ لیں اور کسی خوش فہمی کا شکار نہ ہوں۔ اگر کسی کے دل میں یہ خیال ہے

کہ اسے اپنے رپو الوور کو استعمال کرنے کا موقع مل جائے گا تو وہ اسے دل سے نکال دے۔

پتا خروہاں صرف پانچ لوگ رہ گئے۔ جنم میرے ساتھ بالکل چر سکون کھڑی تھی۔ فیکا رپو الوور کا رخ ڈرائیور مستانہ کی طرف کئے کھڑا تھا اور کبھی کبھی میری طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔ ابھی تک اس کے دل کا سوال ہونوں تک نہیں آیا تھا اور میں نے بھی اجنبیت کے تاثر کو برقرار رکھا تھا۔

میں یہ طے کرنے سے قاصر تھا کہ مجھے داخل در معقولات کرنا چاہیے یا نہیں۔ اگر میں چاہتا تو فیکے کو باتوں میں لگا کے اس پر غریبی کا رونا دہائی سے روکنے کی کوشش ضرور کر سکتا تھا۔ اس کے انتقام کی سزا بے گناہوں کو مل رہی تھی۔ ملک رب نواز کے لیے یہ نقصان اتنا بڑا نہیں تھا کہ وہ تباہ ہو جائے۔ اس کی صرف کوسو کے روٹ پر نہ جانے کتنی بیس چل رہی تھیں۔ ایک بس جل کے راکھ ہو جانے سے اسے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کا ہر جانہ وہ انشورنس کمپنی سے وصول کر کے دوسری بس خرید سکتا تھا لیکن جن مسافروں کا اسباب بس کے ساتھ غدر آتش ہونے والا تھا۔ ان کے لیے یہ نقصان ناقابل تلافی تھا۔ جو پریشانی وہ آدمی رات کے وقت بیوی بچوں کے ساتھ اٹھا رہے تھے وہ الگ تھی۔

اس کے برعکس فیکے کو مطالبہ کرنے اور اسے دلائل سے قائل کرنا خود میرے اور جنم کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ اگر وہ قائل نہ ہوتا تو میرا اور جنم کا انجام بھی وہی ہوتا جو دیوانہ مستانہ گروپ کا ہونے والا تھا۔ شاید اس کی سالی کا شکوف والی کے لیے شاسالی کا یہ رشتہ خطرے کی علامت بن جاتا اور وہ اپنے جیجائی سے کہتی کہ ان دونوں کو چھوڑنا بہت بڑی غلطی ہوئی۔ ایسی غلطی جو ہمیں سیدھا جاسکی کے تختے پر پہنچا دے گی۔ کسی چشم دید گواہ کو چھوڑنے کا ریسک کیسے لیا جاسکتا ہے۔ وہ پاگل پن کی حد تک جو شیلی اور جوتنی لڑکی ایک برست میں سب کو چھلنی کو دیتی۔ نہ دہی نہ شادست حساب پاک ہوا۔

شاید جنم نے میرے ذہن میں جاری خیالات کی نقش کش کا اندازہ کر لیا۔ اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ ہم فیکے کو نہیں جانتے کیونکہ فیکا ہمیں نہیں جانتا۔ یہی ہمارے حق میں ہنر ہے۔

میں نے کہا ”تھک“۔
”کوئی اگر مگر نہیں۔ وہ جو کر رہا ہے کرنے دو۔“
اس وقت لڑکی نے چلا کے کہا ”تم دونوں کیوں کھڑے ہو۔ جو اٹھنا ہے اٹھا کے جاؤ۔“

جنم نے ہٹلانے کی اداکاری کی ”جی۔ جی جاتے ہیں۔“

میں نے فیکے کی طرف دیکھا لیکن وہ انجان بنا کھڑا تھا اور دیوانے کو مستانے کے زخم کی ڈرنک کرتے دیکھ رہا تھا۔ خون زیادہ بہہ جانے سے مستانے کے لیے کھڑا رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ شاید اسے پھر آ رہے تھے یا کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ڈشبن پر لیٹ گیا تھا اور گھیزو دیوانہ اس کے زخم پر اپنی قبض بھاڑ کے باندھ چکا تھا۔ وہ خود اب صرف بنیان پٹنے ہوئے تھا جس میں کئی سوراخ تھے۔

میں جنم کے ساتھ چلے لگا۔ بس کے باقی مسافر کافی آگے جا کے رک گئے تھے اور آپس میں صلاح مشورہ کر رہے تھے کہ انہیں کیا کرنا چاہیے۔ کسی کا خیال تھا کہ سب کو صبح تک اسی جگہ انتظار کرنا چاہیے۔ کچھ کہتے تھے کہ جیسے بھی ہو سڑک تک پہنچ جانا چاہیے۔ ایک تجویز یہ تھی کہ نوجوان جاسیں اور کوئی بس میاں لانے کی سہیل کریں۔ سڑک پر سے گزرتے والی کوئی کار پولیس جیپ یا بس رکوا میں اور کیس سے مدد لائیں۔

جنم نے اور میں نے سڑک تک جانے کا فیصلہ کیا۔ ہم خالی ہاتھ تھے۔ ہمارے پاس ایک بیگ تھا جسے میں نے کندھے سے لٹکایا تھا۔ ہم ایک گلو میٹر کا فاصلہ آسانی سے پیدل طے کر سکتے تھے۔ بس میں ہمارے جو پڑوسی تھے وہ بھی آہستہ آہستہ باتیں کرتے جا رہے تھے۔

میں نے کہا ”آسمان سے ایسے مصیبت نازل ہوتی ہے۔ جب ان مسافروں نے سفر شروع کیا تھا تو یہ کس نے سوچا ہو گا کہ آگے کیا ہو گا؟ سب کے ذہن میں ایک ہی خیال ہو گا کہ بس خیر عافیت کے ساتھ انہیں کوئی پہنچا دے گی۔“

”ہاں۔ حادثے کا خیال بھی نہیں آتا کسی کو اور اس صورت حال کا تو کوئی تصور ہی نہیں کر سکتا۔“
”ہم چاہتے تو فیکے کو روک سکتے تھے۔“

”خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے ہمیں چھوڑ دیا۔ وہ بے وقوف ثابت ہوا ورنہ اسے معلوم تھا کہ ہم کون ہیں اور بعد میں کیا کر سکتے ہیں۔“

”اس کی سالی کا شکوف والی ہرگز نہ چھوڑتی ہمیں مگر یہ کوئی طریقہ نہیں بدلے لینے کا۔ سزا ملک کو نہیں ان مسافروں کو ملی۔ ہم انہیں سمجھاتے کہ دیکھو ملک کو ایسے تباہ نہیں کیا جاسکتا۔ ہم جانتیں گے کہ ہمیں ایسے طریقے جن سے اس کی ایسی تپسی ہو جائے گی۔ اس کا گھر اس کا کاروبار اور اس کی عزت۔ اس کی سادھ اور شان۔ یہ بس اس کی شخصیت کے

قلعے کی فصیلیں انہیں گرانے سے کھلت ہوگی ملک رب نواز کو۔ ایک بس کو تباہ کرنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ ہم انہیں اپنے ساتھ لاسکتے تھے۔“

جنم نے نفی میں سر ہلایا ”اگر وہ نہ مانتے تو لینے کے دینے پڑ جاتے۔ ابھی تو فیکے کو خیال نہیں آیا یا اس کی بہت نہیں ہوئی ایک ساتھ اتنے قتل کرنے کی۔ یا اس نے احسان کیا اور ہمیں چھوڑ دیا کہ بعد میں ہم کسی کو اس واردات کے بارے میں نہیں بتائیں گے لیکن فرض کرو کہ فیکا مان جاتا اور اپنی سالی کا شکوف والی کو بھی ماریا تو کیا ہوتا؟“

”نکم سے کم حسرت دیدار تو نہ رہتی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ جو لڑکی اتنی بڑا رشتہ دار اور حوصلہ مند ہے اس کی صورت کیسی ہے اور اگر وہ ہمارے ساتھ آجانی تو ہماری طاقت میں اتنا ہی اضافہ ہو جاتا۔ جتنا پاکستان کو ایک ایٹمی دھماکے سے حاصل ہو سکتا ہے۔“

جنم نے کہا ”اس کا بھی نقصان ہوتا۔ مستانہ ایڈز دیوانہ جب ملک رب نواز کی خدمت میں فریادی بن کے پہنچتے تو اسے بتاتے کہ فیکا اکیلا نہیں تھا۔ ایک سالی کے علاوہ اس کے ساتھ ایک داڑھی والا گورا چٹا جوان مولوی تھا اور ایک لڑکی تھی۔ اس طے اور نام کی۔ ہم پھر انہیں دیکھیں گے تو پہچان لیں گے اور بھی نہ کبھی ہم پہچانے جاتے۔“
میں نے کہا ”چلو جو ہوا سو ہوا۔ اب کیا ہو گا؟ ہمارا تو سارا روبرو گمراہ چھٹ ہو گیا۔“

”جنم سڑک کے کنارے ایک پلیا کے کھنڈر پر بیٹھ گئی۔“
”ٹھنڈی کٹنی ہو گے؟“ اس نے بیگ میں سے تھراپاس نکال کر نکالی پھر کافی کا پیکٹ اور دو گولہ میں سارا پانی انڈیل دیا۔ پیکٹ میں چٹنی اور دو دودھ شامل تھے مگر پانی نیم گرم بھی نہیں رہا تھا۔ اس کے باوجود کافی نے انوکھا الحظ دیا۔

”اس ٹرائٹ پیکٹ کا تو ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔“
میں نے اُدھر اُدھر دیکھ کے کہا ”یہ وقت بعد میں یاد آئے گا۔“
”ہر روز یہاں دو میں بھکتی ہوں گی۔ جہاں ہم آگئے۔“
تقدیر بھی کیسے کیسے دلچسپ اور حیران کن ڈرامے کرتی ہے۔

اجانک اس سمت میں روشنی کا بولہ سا اٹھاجہر ہم بس کو چھوڑ کر آئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ شعلہ ایک لاؤ کی طرح بھڑکنے لگا اور پھر کسی آتش فشاں کا آگ اگلنے والا دیانہ بن گیا۔ رات کا اندھیرا ایک چر آسب اجالے سے روشن ہو گیا جس میں مصیبت کے مارے روئے پینتے مسافروں کے سامنے ایسے نظر آتے تھے جیسے مگرکھ میں بد روحوں کا اجتماع

جاری ہو۔

پھر خاموشی کو چیرنے والی ایک چیخ بلند ہوئی۔ جنم نے بے اختیار میرا بازو تھام لیا ”یہ۔ یہ۔ یہ۔“

میں نے اس کے ہاتھ پر چھکی دی ”ہاں“ میرا بھی یہی خیال ہے کہ یہ فیکے کی چیخ تھی۔

”کیا جنگ کا پانسلا پلٹ گیا؟ فیکا مارا گیا؟“
”مہولی تو ایک بھی نہیں چلی۔“ میں نے سوچ کے کہا اور سیاہی میں رقص کرتے تاریخی شعلوں کا منظر دیکھتا رہا۔

مسافر غور میں اب اونچی آواز میں رو رہی تھیں اور ان نامعلوم دہشت گردوں کو بددعا میں دے رہی تھیں جنہوں نے ان کا سب کچھ جلا کے راکھ کر دیا تھا۔ میں نے لاہور سے روانگی کے وقت بس کے اوپر کسی لڑکی کا بیجز کا سامان بھی دیکھا تھا۔ اب اس لڑکی کا کیا ہے گا؟

پہلی گولی کی آواز پر میں بھی اچھل پڑا۔ معلوم نہیں اسے کس نے فائر کیا تھا۔ رپو الوور کس کے ہاتھ میں تھا۔ قاتل کون تھا۔ مقتول کون۔ فائر کے چند سیکنڈ بعد کلا شکوف کا خونئی نذر گویا۔ مسلسل فائر کا بھیاںک شور جس سے لاشوں کے گرنے کا تصور ذہن میں آتا ہے۔

جنم دہشت زدہ ہو کے کھڑی ہو گئی ”چلو۔ ہمیں یہاں رکتا ہی نہیں چاہیے تھا۔ انھوں مرمت کرو۔“
میں نے اسے تسلی دی ”اٹ اٹا رات۔ ہم محفوظ ہیں۔“

”نہیں۔ وہ پاگل لڑکی سب کو مار ڈالے گی۔ اس پر خون سوار ہے۔“ جنم کا لہجہ سبڑا والا ہونے لگا تھا۔

میں نے پانی کافی کو حلق میں اندھیل کے پیچہ تک کو جنگل کی طرف اچھال دیا۔ باقی مسافر بھی اب صلاح مشورے بھول کے بھاگنے لگے تھے لیکن ہم ان سے بہت آگے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ ہم نے نصف سے زیادہ فاصلہ طے کر لیا تھا۔ سڑک تک پہنچ کے جنم پھر چر سکون ہو گئی ”ہم کدھر جائیں گے؟“

میں نے آسمان کی طرف دیکھا اور قطبی ستارہ تلاش کر لیا ”ادھر جا رہے تھے ہم کوئٹہ اس طرف ہے۔“ میں نے کہا۔

جنم نے مجھے کھینچا۔ ”ہم واپس جائیں گے۔ اس طرف۔“

ہم سڑک پر لاہور کی طرف چلے گئے لاہور یہاں سے سیکڑوں میل دور تھا۔ آدراک سڑک رات کے اندھیرے میں نظر بھی نہیں آتی تھی۔ ایک لومڑی چھلانگ مار کے سڑک

کر اس کرگئی۔ جنم مجھ سے چٹ گئی۔ خوف سے اس کا بدن کانپ رہا تھا۔

میں نے شانے پر ہاتھ رکھ کے اسے اپنے قریب کر لیا۔ ”دوست! یہ کوئی آدم خور شیر نہیں تھا! لومڑی تھی بے چاری۔“

”میاں اور بھی جنگلی جانور ہوں گے۔“

”ہاں۔ بھیڑیے ہیں اور سنا ہے گلزمگ۔ وہ بھیڑیے اور چیتے سے زیادہ کینڈ اور خطرناک ہوتا ہے۔ اچانک خاموشی سے پکڑ لیتا ہے مگر ہمارے پاس ریلو اور دیسے بھی یہ جو آدم خور جانور ہیں، یہ دیسے خطرناک نہیں ہوتے مگر بھوکے ہوں تو گیدڑ کی شیر ہو جاتے ہیں۔ اپنی گلی میں تو کتنا بھی شیر ہوتا ہے یہ محاورہ سنا ہو گا تم نے۔“

”کتنی سناں سڑک ہے۔“

میں نے کہا ”ہاں۔ لاہور! اسلام آباد یا ملتان روڈ پر ساری رات سڑک چلتا ہے اور ڈاکو زیادہ پھرتے ہیں۔ اگا ڈاکا گاڑی کو روک کر لوٹ لیتے ہیں۔ بس کے مسافروں کو بھی لوٹ چکے ہیں کئی بار۔“

”تم مجھے ڈرا رہے ہو۔“

میں نے کہا ”تم کیوں ڈر رہی ہو۔ دیکھو! کیسا رونا ننگ سفر ہے۔ ہم تم اور یہ تھالی۔ سرگوشی کرتی رات۔ ہمیں دیکھ کر سڑک اترے ستارے۔“

کتے جیسا ایک جانور صحن سڑک کے بیچ میں اکھڑا ہوا اور ہمیں گھورنے لگا۔ جنم نے بیچ مار کے مجھے روک لیا۔

میں نے کہا ”گیدڑ تھا۔ بڑول کہیں کا۔ اگر بھوکا ہو تا تب بھی مجھے کھاتا۔ تمہارے پاس تو کچھ ہے ہی نہیں بڑیوں کے سوا۔ چلو۔“

جنم کی رہی ”کیوں نہ ہم صبح تک کہیں چھپ کے بیٹھ جائیں۔“

میں نے کہا ”تاکہ ریکس اپنی پولیس فورس کے ساتھ بس کی تلاش میں ادھر سے گزرے تو ٹھکل جائے سیدھا کونڈ کی طرف۔“

جنم نے بابل ناخواستہ آگے قدم بڑھائے ”تمہارے ہی دماغ میں چھوڑا نکلا تھا جاسوسی کا اور ایڈو سر کا۔“

میں نے بکڑ کے کہا ”میں روشنی اور فریڈ کو سمجھ رہا تھا۔ یہ تجویز تو تمہاری تھی۔“

”یہ غلط ہے۔ وہ اڑ گئی۔“

”کیا؟ تم نے نہیں کہا تھا کہ ہم چلتے ہیں؟ کچھ خدا کا

خوف کرو۔“

جنم نے کہا ”اچھا کتنا تو تم نے کیوں مانا؟“

مجھے ہنسی آگئی ”ٹھیک ہے۔ آئندہ تمہاری کوئی بات نہیں مانوں گا۔“

وہ تنک کے پولی ”ان مطلب مت نکالو میری بات کا۔“

”تم اس وقت لڑنے کے موڈ میں ہو۔ اچھا لڑو میں صرف سنوں گا۔ پولوں گا نہیں“ میں نے کہا اور پھر چلا کے کہا ”سانپ!“

”سانپ کماں؟“

”دو منہ والا۔ ایک سینک سر کے بیچ میں۔ اڑنے والا تم نے دیکھا؟“

”نہیں۔“

”میں نے بھی نہیں دیکھا“ میں نے کہا۔ جنم ہنسنے لگی پھر مجھے مارنے لگی۔

ہم ٹھٹھٹے ہوئے چلتے گئے۔ اس امید میں کہ کسی وقت کہیں بھی مخالف سمت سے ایک جپ آئے گی جس کو ریکس چلا رہا ہو گا اور اس میں آگے پولیس کی وردی پن کے نذر بیگ یعنی جیرا بلینڈ ہو گا یا سابق انسپٹر فرید عباسی تشریف فرما ہوں گے ممکن ہے اور بھی کچھ لوگ ہوں اور جب بیٹھ لائیں گی روشنی میں وہ ہم دونوں کو آوارہ روحوں کی طرح سڑک پر بھٹکا دیکھیں گے تو کتنے حیران ہوں گے۔

ڈھانکی سے ساڑھے چار بج گئے۔ ہم سڑک سے ذرا ہٹ کے ایک پتھر بیٹھے تھے۔ دو گھنٹے میں کسی طرف سے بھی کوئی گاڑی نہیں آئی تھی ورنہ شاید ہمیں لفٹ مل جاتی۔ جنم پر ہی نہیں مجھ پر بھی ممکن غالب آچکی تھی۔ اچانک موبائل فون کی گھنٹی چلانے لگی۔

جنم نے اپنے بیگ سے فون نکال کے کہا ”ہیلو! اور پھر فون مجھے تھماوا۔“

”نہیں ہے۔“

میں نے کہا ”رہیں خبیث کماں ہے تو؟“

اس نے کہا ”ابے کیا بس میں اور کوئی نہیں ہے یہ باتیں سننے والا؟“

میں نے کہا ”ہم بے بس ہیں یا۔ مجبور ہیں اور لاچار ہیں۔ سڑک کے کنارے بڑے ہیں تو کماں ہے؟“

”ہم بس آ رہے ہیں سنائی بس تو ابھی تک نظر آئی نہیں پیارے!“

میں نے کہا ”نظر آئے گی بھی نہیں۔ ذرا آہستہ آنا اور ہر طرف دیکھتے ہوئے آنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم نظری نہ

آئیں۔“

”ابے بات کیا ہے؟ قسم اللہ کی دل دھڑک رہا ہے اپنا۔“

میں نے کہا ”دل تو ابھی تک ہمارا بھی دھڑک رہا ہے لیکن وہ کیا کما ہے شاعر نے۔“

”دم وائیس برسرِ راہ۔ عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے۔“

”یار! سچ بتا کیا ہوا ہے؟“

میں نے کہا ”ابھی تک تو کچھ نہیں ہوا۔ نہ بیٹا نہ بیٹی۔ نہ نکاح نہ رخصتی۔ نہ انتقال پر ملال مگر کیا بھروسا ہے زندگی کا۔ کسی وقت کچھ بھی ہو جائے اس لیے میری وصیت سن لے۔ میرے بعد جنم کی۔“

”رہیں نے مجھے دو شاندار گالیاں دے کے فون بند کر دیا۔ میں نے فون جنم کو واپس کر دیا ”کیا کہہ رہا تھا؟“ جنم نے پوچھا۔

”میں بتا نہیں سکتا۔ اس کے خیالات پست ہیں۔ الفاظ اس سے بھی زیادہ پست۔ معلوم ہے تمہارے بارے میں کیا کہہ رہا تھا؟“

”رہنے دو۔ مجھے معلوم ہے میں نہیں پدا کرتی کسی کی رائے کی۔ میں اچھی یا بری سمجھی بھی ہوں، بس ہوں۔“

”کیا خیال ہے صبح کی سیر کرنے چلیں۔ صحت کے لیے بہت مفید ہوتی ہے“ میں نے کہا ”میرا مطلب ہے جسمانی صحت۔ دماغی صحت تو تمہاری جیسی ہے“ انوس کہ وکی ہی رہے گی۔“

”کوئی نہیں پوچھتا دماغ کو۔ صورت اچھی ہونی چاہیے۔ زمانہ دیوانہ ہوتا ہے بڑے بڑے افلاطون اشارہ ابد کے غلام ہوتے ہیں“ دو کپڑے جھاڑ کے کھڑی ہو گئی۔

”تم میری مثال دے سکتی ہو“ میں نے انکساری سے کہا۔

پندرہ منٹ میں ہم نے مشکل سے دو سو گز طے کئے ہوں گے کہ اوپر ایک روشنی سی لہرائی پھر غائب ہو گئی اور چند سیکنڈ کے بعد تاریکی میں درخت اوپر تک روشن ہو گئے۔ پھر سوڑ سے جب نمودار ہوئی اور میں نے سڑک کے درمیان میں جنم کو بھی اپنے ساتھ بٹھالیا۔

مجھے سخت خفت اور پریشانی ہوئی جب ہمارے پاس آگے رکے والی جپ سے عسشی پولیس کے اٹھارے اترے۔ ایسا نظارہ شاید انہوں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا ہو گا اور ممکن ہے پہلے انہیں اپنی آنکھوں پر دھوکے کا کمان ہوا ہو۔ انہیں سمجھ

پریت پر یقین رکھنے والے ماتحت نے کہا ہو کہ یہ عورت کوئی چڑیل ہے اور مرد کوئی بھوت۔ دیکھا ابھی غائب ہو جائیں گے۔

ان کا انچارج ایک عمر رسیدہ اور سنجیدہ قسم کا اے ایس آئی تھا۔ وہ ریلو اور ہاتھ لے پہلے اتر۔ جپ کی تیز روشنی میں اس نے ہم دونوں کا غور سے جائزہ لیا۔ ”کون ہو تم دونوں؟“

میں نے کہا ”ہم۔ ہم کونڈ جا رہے تھے۔“

اس نے سخت لہجے میں کہا ”پیدل؟ اور کونڈ تو دوسری طرف ہے۔“

میں نے کہا ”ہم بس سے جا رہے تھے۔ بس بھی ادھر ہی جاری تھی۔“

وہ بولا ”پھر تم نے سوچا کہ راستے میں اتر کے ہوا خوری کر لیں۔ سچ بتاؤ یہ معاملہ کیا ہے۔ سڑک کے بیچ میں کیا ہو رہا تھا۔“

ایک ماتحت نے پیچھے سے کہا ”سری۔ گڈی میں بٹھائیں ان کو پوچھ لے چلیں۔“

اسی وقت وہ جپ نمودار ہوئی جس کا ہمیں انتظار تھا۔ وہ پہلی پولیس جپ کے ساتھ آئی۔ اس میں سے فرید عباسی پہلے اتر۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملا کے اے ایس آئی کی طرف دیکھا۔

انسپٹر نذیر بیگ بڑی تھانے دارانہ شان کے ساتھ چھری ہلاتا اتر کے آیا۔ برسوں سے تھانے داری کا ڈراما کرتے کرتے اس کی اداکاری میں حقیقت کا رنگ آ گیا تھا۔ وہ اصلی تھانے دار سے زیادہ تھانے دار لگتا تھا۔ اس کی شخصیت بھی ایسی ہی تھی۔ پولیس کی وردی میں وہ بارعجب بھی نظر آتا تھا۔

میں نے کہا ”واہ جی واہ! اپنے بیگ صاحب بھی آئے ہیں۔ لوہی ٹیک نہ شدہ دوشد۔ بلایا ہم نے آپ کو تھا۔ آپ سے پہلے سے یہ آگئے۔“

اے ایس آئی کچھ پریشان ہوا ”یہ کیا معاملہ ہے سری!“

جیرے بیٹھنے کے اس کے احترام آمیز لہجے کو اپنا حق سمجھ کے تسلیم کیا ”کچھ نہیں تم جاؤ۔ یہ دوست ہیں میرے۔“

اب جنم نے بھی اپنا ریس کار ڈال دیا ”میں پولیس رپورٹر ہوں۔ کونڈ جانے والی بس کو کچھ دہشت گردوں یا ڈاکوؤں نے ہائی جیک کر لیا تھا۔ غالباً بس کو انہوں نے آگ لگا دی ہے۔“

اے ایس آئی کی پریشانی بڑھ گئی ”کماں۔ کب ہوئی

واردات؟
"کوئی دو گھنٹے پہلے" جنم نے کہا "آپ آگے جائیں گے تو اگلے ہاتھ کی طرف پرانی سڑک ہے اس پر اب کوئی نہیں جاتا۔ وہ بس کوادھری لے گئے تھے۔"
"اور مسافر؟"

"مسافروں کو انہوں نے پھونڈیا" میں نے کہا "ہم پیدل والیں لاہور جا رہے تھے مگر خاتون تھک گئیں تو ہم نے موبائل فون پر اپنے دوستوں کو بلوالیا۔"

فرید عباسی اور جیرا بلینے نے کسی جرنالی کا اظہار نہیں کیا مگر ان کی سمجھ میں نہیں آیا ہو گا کہ ہم کس حد تک سیریس ہیں۔ بس کے اغوا اور ہلائے جانے کی کہانی ابھی تک انہیں بھی معلوم نہیں تھی۔

عشقی پولیس کے اے ایس آئی نے کہا "آپ مریانی کر کے ہمارے ساتھ چلو۔ جائے واردات تک۔ آپ کی گواہی پر رپورٹ لکھی جائے گی۔"

میں نے کہا "ہم رپورٹ میں مدعی نہیں بنیں گے ہاں تمہاری راہنمائی کر سکتے ہیں۔"

"یہ تو بڑی سنگین واردات ہے جی۔ آپ کو مدد کرنا چاہیے قانون کی۔ ہمیں تو آپ نے ہی اطلاع دی ہے سب سے پہلے۔" اے ایس آئی نے اپنے ماتحتوں کو جیب میں سوار ہونے کا اشارہ کیا۔

میں اور جنم پیچھے والی جیب میں سوار ہو گئے تو رئیس مجھے گالیاں دیتے لگا کیونکہ میرا اور جنم کا ہنس سے بڑا حال تھا۔ بٹے بٹے میں نے انہیں بتایا کہ پولیس نے ہمیں کس حال میں دیکھا تھا۔ "ہم تو کبھی تھے کہ تمہارے سوا کسی کی گاڑی ہو سکتی ہے دو گھنٹے میں ایک گاڑی نہیں گزری تھی۔ یہ بتائیں کہاں سے نازل ہو گئے پتا نہیں کیا گئے ہوں گے کہ ہم شراب کے نشے میں ہیں۔ مگر سے بھاگے ہوئے بھی لگتے تھے ایک کانٹیل کا تو خوف سے بڑا حال تھا۔ وہ کچھ پڑھ رہا تھا زرباب اور ایسے دیکھ رہا تھا جیسے ابھی ہم دھواں بن کے غائب ہو جائیں گے اس وقت یہاں سے گاڑی میں کوئی نہیں گزرتا۔ سیدل کون نظر آسکتا ہے۔"

جنم نے کہا "گاڑی ادھر موزوں میں نے خواہ خواہ اپنی شناخت ظاہر کر رکھی تو وہ جان نہ چھوڑے آسانی سے۔" "عوئی" اپنے ہوتے ہوئے ایک کیا تھا نے دار کیا کر سکتا تھا "جیرے بلینے نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا "خیر سے بڑے دن بعد ملاقات ہوئی اور کسی جگہ ہوئی۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا "معاف کرنا یا ر۔ سناؤ کیا

حال ہے؟ کیسے گزر رہی ہے زندگی کیا ہو رہا ہے؟"
"جو بھی ہو رہا ہے جی چنگا ہی ہو رہا ہے اور اپنی مرضی سے کچھ نہیں ہو رہا ہے۔ سب اس نیلی پھتری والے کی مرضی سے ہو رہا ہے۔" اس نے اور انگلی اٹھائی "آج رئیس نے کہا کہ خیر سے ناصر صاحب نے یاد کیا ہے تو ہم نے کہا کہ وہ تو بہت بڑے آدمی ہو گئے ہیں مگر اپنی یادوں کے بار ہیں۔ دردی پھر یمن لی اور حاضر ہو گئے۔"

راستے میں ہمیں وہ مسافر لے جو اقساں و عیساں سروں پر سوٹ کیس اٹھائے اپنی تھریں سے زیادہ بیویوں کو کوسے میں روڈ کی جانب دوں تھے۔ ان کے پیچھے ہائے کرتی پریاں یوں چل رہی تھیں جیسے تھکے ہارے تیل کے پیچھے بندھی ہوئی چرخ چوں کرتی گاڑی کو چلنا ہی پڑتا ہے۔ ان پر بچے سوار تھے اور حالات کی پروا کئے بغیر آدمی رات کے بعد ہینڈ میں مداخلت کے خلاف احتجاج کر رہے تھے۔ مشکل میں ذرا بڑے بچے تھے جو اٹھتے "لو کھڑاتے ماں باپ کا ساتھ دینے پر مجبور تھے اور سوالات کے جواب میں مسلسل جھڑکھا رہے تھے۔ ہم نے انہیں تسلی دی کہ اب پولیس آگئی ہے بہت جلد کوئی بس آجائے گی جو انہیں کوئٹے لے جائے گی۔ مشکل یہ تھی کہ بچے جاننے کے بعد کھانے کو لنگ رہے تھے اور یہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ اگلے دو چار گھنٹے تک کچھ ملنے کی امید بھی نہیں تھی۔

بس کے کچھ حصے اب بھی جل رہے تھے مگر اس کا زیادہ حصہ جل کے کوئٹا ہو گیا تھا۔ ایک خوبصورت رنگ والی ازکرنڈیشن بس کی جگہ صرف اس کا ڈھانچا بچا رہ گیا تھا۔ پلے ہوئے ٹائٹوں سے اٹھنے والے دھوئیں کی بوبر طرف پھیل گئی تھی۔

سب سے پہلے لپک کر آگے آنے والا دیوانہ تھا۔ اس نے پولیس کو دیکھتے ہی وہابی دہی شروع کی۔ "ہم بڑا شریاد ہو گئے جناب عالی! غلاموں نے سب کچھ جلا دیا" وہ دباڑیں مار مار کے روٹے لگا۔

اصلی تھانے دار نے اسے ڈانٹ لگائی "اوتے چوب کر۔ جیرے باپ کا کیا گیا ہے۔ بس جلی ہے مالکوں کی۔ تو چنگا بھلا کھڑا ہے اپنے بیروں پر۔"

میں نے کہا "مالک بھی انشورنس کمپنی سے پورا معاوضہ وصول کر لیں گے۔ ارے گئے بے چارے مسافر۔"

"ڈرائیور کہاں ہے؟" انسپکٹر جیرے بلینے نے کہا۔
"استاد۔ استاد ادھر آرام شادام فرما رہے ہیں۔ ذمہ کر دیا تھا اس نے گولی شلی مار کے بڑا خون شون بر

کیا۔"
استاد مستانہ ایک صاف اور ہموار جگہ پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے لیے تھابت کے باعث اٹھ کر بیٹھنا مشکل تھا۔ جنم نے اس سے پوچھا "وہ دونوں کہاں ہیں بھاگ گئے؟"

مستانہ نے نفی میں سر ہلایا "وہ حرام زادی بھاگ گئی۔ فیکا ادھر رہا ہے۔"

میں نے اس طرف دیکھا جہاں مستانہ نے اشارہ کیا تھا۔ بس سے کچھ فاصلے پر فیکا زمین پر مڑا پڑا تھا۔ میں اس کے قریب گیا۔ رئیس نے اپنی جیب کا رخ بدل کر بیڈلائش اس پر ڈالی تو مجھے ایک عیساکر کرانیت پیدا کرنے والا منظر دکھائی دیا۔

فیکے کا سر اور چوہوں سے کھلا ہوا تھا۔ وہ ناقابل شناخت ہو گیا تھا۔ اس کے سر اور چہرے کی جگہ کچلے ہوئے خون میں تھڑے گوشت کا ایک ڈھیر ہو گیا تھا۔ وہاں ایک بڑا پتھر تھا جو شاید دس کلو سے زیادہ وزن کا ہو گا۔ یہ پتھر خون میں رنگا ہوا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ بار بار اس کے سر کو چورا کرنے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ اس پاس کی زمین بھی خون سے لال تھی اور مٹی میں مل جانے والے گوشت، خون اور منفر کو چانے کے لیے جنگل کے کیزے کوڑے پہنچ گئے تھے۔

مستانہ نے بتایا کہ اسے فیکے کو ایک پتھر مارنے کا موقع مل گیا تھا۔ وہ پتھر نہیں جو لاش کے پاس پڑا ہوا تھا، وہ چھوٹا پتھر تھا جو اس نے کچھ دور سے نشانے لے کر پھینچ مارا تھا اور چونکہ بچپن میں پتھر پھینچنے سے اس کا نشانہ اچھا تھا، اب بھی وہ کرکٹ کرکٹ کھیلتا ہے تو بال سیدھی وکٹ تکٹ پر جا کے لگتی ہے اور دوڑنے والا رن آؤٹ ہو جاتا ہے۔ تو وہ پتھر بھی سیدھا فیکے کے سر پر لگا اور وہ پتھر اشرا کے گراتو بس پھر استاد نے اسے جہنم رسید کر دیا۔ بازو شازو زخمی ہونے کے باوجود استاد نے چٹان اٹھا کے ماری سر پر اور وہ ادھر ہی پھڑک کے فوت ہو گیا۔ اس کی سالی کا شکوفہ والی کو موقع ہی نہیں ملا کچھ کرنے کا۔ اس نے ایک برست شرٹ مارا اور جان بچاکے فرار ہو گئی۔ ادھر پھل شکل کی طرف بھاگ گئی۔ اصل تھانے دار نے کہا "خیر بھاگ کے کہاں جائے گی۔ ہم صبح ہونے سے پہلے اسے قابو کر لیں گے۔"

مجھے اس دعوے کی صداقت میں شک تھا مگر میں نے پولیس کی عموئی نااہلی پر اظہار خیال فرمانے کے لیے یہ موقع مناسب نہیں سمجھا۔ میں اب یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی مسافر نے موبائل فون پر پولیس

کو اطلاع دی تھی لیکن وہ ہنگامی امدادی پارٹی بنوڑ راہ میں کہیں بھی یا ممکن ہے ابھی ایمرولینس، آگ بجھانے والی گاڑی اور مجسٹریٹ وغیرہ کے ساتھ روانگی کے لیے مضابطہ کی کارروائی میں مصروف ہوں۔

دیوانہ نے تقلم خود ملک رب نواز صاحب کو فون پر مطلع کیا تھا اور ملک صاحب نے فرمایا تھا کہ وہ تقلم خود تشریف لائیں گے۔ انہوں نے فیکے کا شکار کرنے پر دیوانہ کو انعام کے طور پر ڈرائیور بنانے کا وعدہ بھی فرمایا تھا اور بہت جلد وہ استاد کی گھرے پر فائز ہونے والا تھا۔

آدھے گھنٹے میں ساری صورت حال ہمارے سامنے آچکی تھی۔ اس کے بعد میں نے جیرے بلینے سے کہا "بس اب کھٹک لٹھک لٹھکے دار صاحب! آخریت اسی میں ہے۔"

جیرے نے بڑی متانت سے سر ہلایا "خیر سے اپنا بھی کچھ ایسا ہی خیال تھا۔"

اصل تھانے دار نے اس خیال پر اعتراض کیا "ابھی تو بیان کی نہیں ہوا کسی کا۔"

جنم نے کہا "میں نے بتا دیا تھا کہ ہم اس چکر میں نہیں پڑیں گے۔"

جیرے نے کہا "اتنے لوگ کم ہیں بیان دینے والے اور اصل بیان تو ان دونوں کا ہے۔"

"مستانہ اینڈ دیوانہ کا" میں نے کہا۔
"لیکن ہمارے پاس نفری کم ہے اور اسے تلاش کرنے میں آپ ہماری مدد کر سکتے ہو۔ مفروضہ ملزمہ کو" اس نے دوسرا نکتہ اٹھایا۔

جیرے نے مونچھوں پر عارٹا ہاتھ پھیرا "دیکھو سب انسپکٹر، ہم یہاں کسی قانونی کارروائی میں دخل اندازی نہیں کر سکتے۔ یہ ہمارا علاقہ نہیں ہے۔ ہم آئے تھے اپنے دوستوں کو ساتھ لے جانے کے لیے یہاں کیا ہوا ہے یہ سب ہمیں نہیں معلوم تھا اور معلوم ہوجانے کے بعد بھی ہماری قانونی ذمہ داری کوئی نہیں۔ تم کو کرنا ہے جو کرنا ہے یا اس پولیس پارٹی کو جو آئے دالی ہے کچھ دیر میں۔ سمجھ میں آگئی بات؟"

"جی سرنی" اے ایس آئی مایوسی سے بولا۔
ہم سب ایک جیب میں بھر کے واپس ہوئے۔ کچھ مسافر ابھی تک ایک کیمپوٹ کے فاصلے پر ریک رہے تھے۔ ان کی حالت یقیناً قابل رحم تھی۔ ان میں ایک شخص بیمار تھا۔ اسے بیوی اور دو بچے سارا دے کر چند قدم چلاتے تھے مجرورہ دم لینے کے لیے رگ جاتا تھا۔ وہ بوڑھے بھی مشکل سے چل رہے تھے۔ تین عورتیں بہت موتی تھیں اور انہیں شاید گھر

انسانی ہونا تھا۔

”نیرے۔ جیپ روک“ میں نے چلا کے کہا اور جبرے نے گھبرا کے سارا زور بریک پیدل پر ڈال دیا۔ جیپ کے پتے جیسے جام ہو گئے۔ میں چھلانگ مار کے اترا اور کسی کو کچھ بتائے بغیر سڑک پار کر کے جنگل میں اس طرف دوڑا جب کہ میں نے وہ سایہ دیکھا تھا۔

اپنے اندازے کی بنیاد پر میں کچھ پیچھے گیا۔ بالی سب نے بھی سمجھ لیا تھا کہ میرا پس جنگل کی طرف بھاگ جانا کسی ہانکوں کے دورے کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ یقیناً میں نے کچھ دیکھا تھا۔ ریس اور فرید میرے پیچھے لپکے اور جبرے نے بڑی عقلمندی سے کام لیتے ہوئے جیپ کو ایسے کھڑا کر دیا کہ ساری پینڈ لائٹس کی روشنی ایک سمت میں جنگل کو روشن کرنے لگی۔

وہ ایک جھاڑی کی اوٹ میں دیکھی ہوئی تھی۔ روشنی میں اس کا میری نظر سے اوچھل رہا تھا۔ میری نظر سے نظر ہٹتی ہی وہ اٹھ کے بھاگی۔ اس کے کپڑے کانٹوں میں الجھ کر پھٹ چکے تھے۔ وہ خوف اور ٹھکن کے اعصابی دباؤ کا شکار تھی اور مجھ سے بھاگ کے کہاں جا سکتی تھی۔ چند قدم میں ہی میں نے اسے جالیا۔ جب تک ریس خاں اور فرید عباسی نے دو طرف سے اس کے لیے فرار کے راستے مسدود کر دیے تھے۔

وہ اپنا برقع بھی اتار کے پیٹک چلی تھی اور کھانکوف سے بھی نجات حاصل کر چکی تھی۔ جب میں نے اسے روکا تو اس نے زبردست مزاحمت کی۔ اس نے مجھے کہناں ماریں اور لائٹس چلائیں اور اپنے لیے لپکے ناخنوں سے میرے چہرے اور گردن پر خراشیں ڈال دیں۔ اس ٹھٹھس میں پہنے ہوئے کپڑے اور زیادہ پھٹ گئے۔

میں نے اسے جکڑ لیا ”ہوش میں آؤ لڑکی!“ وہ دیوانہ وار چلانے لگی ”چھوڑو۔ چھوڑو مجھے“ کہتے۔ بھیر پڑے۔

میں نے اس کے ایک زبردست چھانچہ رسید کیا جس سے وہ پیچھے جا گری۔ اتنی دیر میں جھنم بھی آگئی۔ اس نے مجھے سے کہا ”یہ کیا کر رہے ہو تم“ پھر وہ لڑکی کے پاس بیٹھ گئی جو بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس کے اعصاب بالآخر جواب دے گئے تھے۔ ہم نے اسے جیپ میں شفٹ کر دیا۔ پھر سمجھا۔ فرید عباسی نے آسانی سے اس کو اپنے ہاتھوں میں اٹھالیا۔ وہ دروازہ کھول کر لڑکی کو لپیٹ لیا اور اس حالت میں بھی جب اس پر وحشت سوار تھی اس کے چہرے پر دیوانگی تھی اور آنکھوں

میں بھی چارپائی توڑنے کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ ان کے گتے گودے بالکل جام ہو چکے تھے اور گوشت کے پہاڑ کا بوجھ ڈھونے کے قابل نہیں رہے تھے۔

اب رات ختم ہونے کو تھی۔ آفت پر صبح کلاب کا اجالا سا نظر آنے لگا تھا۔ مجھے جنگل میں ابھی رات براجاں تھی۔ ہم سڑک کے قریب تھے اور اپنے اپنے طور پر اس واقعے سے اپنے اپنے انداز پر اظہار خیال کرنے میں مصروف تھے۔ ڈرائیو تک اس وقت بھی ریس ہی کر رہا تھا۔ جھنم اس کے ساتھ والی سیٹ پر آگے بیٹھی ہوئی تھی۔ پیچھے ایک سیٹ پر جبرا بلیڈ تھا۔ دوسرے پر ریس اور فرید۔ ٹیکے کے انتظام کی کمائی اس کی زندگی کے ساتھ ہی ختم ہو گئی تھی۔ اس کے ایسے مارے جانے کا کسی کو طال نہیں تھا کیونکہ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ اس نے اپنے اعمال کی سزا پائی۔

میں اس کی سالی کھانکوف والی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کے جوش اور جذبے نے مجھے متاثر کیا تھا حالانکہ اس میں ایک متنی پلو رکھنے والی تخریبی قوت کار فرما تھی لیکن اس کے ذمے دار حالات تھے۔ اس کے لیے بہن کی موت ایک ناقابل برداشت حد تک پُر عذاب تجربہ تھا۔ ٹیکے نے اس کے جذبات کو بھاری اور اسے انتقام کی راہ پر ڈال دیا۔ اس میں ہمت تھی طاقت تھی اور زبردست خود اعتمادی تھی۔ اس کی صلاحیت کو شہت رخ دے کر تقریری مقاصد کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا تھا مگر اب شاید بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس نے جرم کی راہ پر قدم رکھ دیا تھا اور قانون اس کے تعاقب میں تھا۔

وہ خود نہ جانے کہاں تھی۔ اسی جنگل میں آہوے میاد دیدہ کی طرح بھاگ رہی تھی۔ وہ اکیلی لڑکی تھی۔ اس کا ساتھ دینے والا جو اس کا محافظ بھی تھا اور مددگار بھی غیر متوقع طور پر مارا گیا تھا اور وہ گھر سے سیکڑوں میل دور بالکل بے سارا و تنہا رہ گئی تھی۔ اب اسے خیر خواہیت کے ساتھ قانون کے چنگل سے بچ کے واپس گھر پہنچنے کی فکر ہو گئی۔ اس نے کھانکوف پیٹک دی ہوئی اور ٹھکن ہے وہ برقع بھی کہیں ڈال دیا ہو۔ اب وہ کیا کرے گی؟ سڑک تک پہنچ کے کسی سے لفت لے گی؟ یہاں کون ہے لفت دینے والا؟ جب تک صبح نہیں ہوئی اور کوئی بس نہیں گزرتی۔

میرے خیالات کی رو ایک جھٹکے سے ٹوٹ گئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں نے اپنے سامنے سڑک سے کچھ فاصلے پر جھاڑیوں کے پیچھے ایک سائے کو متحرک دیکھا تھا۔ وہ کوئی چنگل جانور نہیں تھا۔ وہ تاریکی میں ایک جھلک دکھا کے غائب ہونے والا

میں خوف کا کرب، وہ صورت کے نقوش اور اپنے رنگوں روپ سے حسین کبھی جا سکتی تھی۔ اس کا لباس تاریار ہو جانے کے باوجود جدید وضع کا اور خوبصورت تھا۔

اب میں جبرے کے ساتھ آگے بیٹھ گیا۔ پیچھے جھنم نے لڑکی کو ایک سیٹ پر لٹانے کی کوشش کی مگر اس کے پیر باہر نکل گئے۔ جیپ میں کھانے پینے کا سب سامان تھا مگر خالو کپڑے نہیں تھے جو اسے پہنائے جا سکتے۔ جھنم نے اس پر اپنا دھینا ڈال کے اس کے جسم کے غیر مستور حصوں کو ڈھانپنے کی کوشش کی مگر ریس نے اسے روک دیا۔ ریس اور فرید عباسی نے اپنی اپنی شرش اتار کے اس پر ڈال دیں اور خود صرف بنیان بننے بیٹھے رہے۔ جھنم اسے ہوش میں لانے کے لیے اس پر پانی کے پھینٹے مارنے لگی۔

میں نے جبرے سے کہا ”یہ ڈرائیو صاحب تم کیوں رکے ہوئے ہو۔ بس اب نکل چلو یہاں سے۔“ جھنم نے بھی کہا ”اس سے پہلے کہ دونوں طرف سے پولیس آجائے۔“

”پولیس آپ کو کیسے پکڑ سکتی ہے جناب!“ جبرا بولا ”اور آپ کی وجہ سے ہم بھی بچ جائیں گے اگر یہ وردی کام نہ آئی۔“

ریس نے کہا ”اے پائل خانے۔ پولیس اس لڑکی کو لے جائے گی اپنے ساتھ پھر ہم اسے نہیں بچا سکیں گے۔“ ”اچھا تو اب خبر سے اس کو بھی بچانا ضروری ہو گیا ہے۔“ جبرا گاڑی کو دوڑانے لگا ”میں تو کہتا ہوں کہ جان چھڑاؤ اس مصیبت سے۔“

فرید نے اس کی تائید کی۔ اور کہا ”اس نے باقاعدہ دہشت گردی کی ہے۔ کھانکوف رکھا اور اسے خربہ کاری کے لیے استعمال کرنا۔ آتش زنی اور ہائی جینٹک یہ پتا نہیں کتنے سنگین جرائم کا ارتکاب کر چکی ہے۔“

میں نے کہا ”میں مانتا ہوں مگر اس سے بھی بوجھ لیں۔“ ”ہم کیوں بوجھیں پولیس خود بوجھ لے گی۔“

جھنم نے میری حمایت کی ”پولیس کے حوالے کسی دقت بھی کیا جا سکتا ہے اسے لیکن کسی لڑکی کے ساتھ پولیس کی تفتیش کا انداز کیا ہوتا ہے یہ ہم سب جانتے ہیں۔ ٹھکن ہے اس نے مجبوری میں خفکے کا ساتھ دیا ہو۔ اس کو ہلک میل کیا ہو خفکے نے یا اس کا استعمال کیا گیا ہو۔ اس کے انتقامی جذبات کو بھی ہم جنون اور پاگل بن کا دورہ سمجھ سکتے ہیں جس میں یہ ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی۔“ فرید بولا ”کچھ دیر میں صبح ہو جائے گی، ہم اسے کیسے

چھپا کے رکھیں گے؟“ ”دیکھو آگے کسی قصبے یا گاؤں سے اگر اس کے لیے کپڑے مل گئے کوئی چادر بھی مل گئی تو کام چل جائے گا۔“ ”دابئی کا سفر بھی چودہ پندرہ گھنٹے کا ہے۔ ہمارا تو حال خراب ہو رہا ہے پہلے ہی۔ جیپ نے سارے انجن بجز ڈھیلے کھینچے ہیں“ فرید بولا۔

میں نے کہا ”یہ ریس نے کہا تھا جیپ لانے کا کار میں کیوں نہیں آئے؟“

”یہ اسی سالے جبرے کا آئیڈیا تھا۔ کہنے لگا کہ پولیس جیپ میں ہی ٹھیک لگتی ہے“ ریس نکلی سے بولا۔

لڑکی ہوش میں آگے سسکیاں لینے لگی۔ ”مجھے چھوڑو۔ مجھے جانے دو“ میں نے کچھ نہیں کیا ”مجھے گرفتار مت کرو۔“

جھنم نے اسے تلی دی ”فکرت کرو۔ تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ ہم تمہاری مدد کرنا چاہتے ہیں۔ ہم دشمن نہیں ہیں تمہارے۔“

باری باری اس نے ہم سب کی صورتوں کو دیکھ لیا۔ ”تم پولیس والے ہو؟“

جھنم نے کہا ”ہم کو غلط مت سمجھو۔ پولیس میں سب بڑے لوگ نہیں ہوتے۔ اگر تم نے کچھ نہیں کیا ہے تو ہم تمہاری مدد کریں گے۔“

”میں نے کچھ نہیں کیا ہے“ اس نے پھر کہا اور رونے لگی۔

”دیکھو خود کو سنبھالو۔ ہم لاہور جا رہے ہیں۔ وہاں پہنچ کے دیکھیں گے کہ اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہیں ہم مگر تمہارے ساتھ کوئی نا انصافی نہیں ہوگی۔ خفکے کی بیوی تمہاری بہن تھی۔ ہم نے اسے بھی بچانے کی کوشش ضرور کی تھی۔ فیکہا خود ہم سے مدد مانگتے آیا تھا۔“

”فیکہا۔ آپ اس کو جانتے تھے؟“

”ہاں۔ افسوس کہ ہم اس کی مدد نہ کر سکے۔ ہم سے کچھ دیر ہو گئی اور ملک رب نواز نے بڑی جلدی کی۔“

وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی ”فیکہا بھی مر گیا۔ میری بہن بڑی بد نصیب تھی کہ خفکے سے شادی ہو گئی اس کی۔ خود اس کا تو یہ انجام ہونا تھا ایک نہ ایک دن۔“

جھنم نے کہا ”تم یہ سب جانتی تھیں پھر تم نے اس کا ساتھ دینا کیسے منظور کیا؟ تم بڑی تمہیں اور سمجھ دار نظر آتی ہو۔“

”میں مجبور ہو گئی تھی۔ اپنے جذبات سے۔ اور

”اے شیطان فیکے کی وجہ سے“ بے وقوفی میری تھی۔ میں اس کے چنگل میں پھنس گئی۔“
 جینم نے میری طرف دیکھا، یوں جیسے کتنا چاہتی ہو کہ اس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ جو اس لڑکی کو پولیس کے حوالے کرنے پر مصرتھے وہ غلط تھے۔
 میں نے کہا ”اب تم یہ بیان‘ تفتیش اور جرح چھوڑو۔ اسے کچھ سہلت دو کہ یہ مستعمل جائے ابھی بہت لمبا سفر درپیش ہے۔“

”اپنا تو حشر نشر ہو گیا ہے پارے۔ تو نے بھی جھک ماری اور ہم نے بھی۔ حاصل کچھ نہیں ہوا“ رکیس خفا ہونے لگا۔ ”میرا تو دم نکلنے والا ہے صحن سے اور بھوک سے۔“
 جیرا ہنسنے لگا ”اویار‘ تیرا دم نہیں نکلے دیں گے ہم خیر سے۔ دم کا راستہ روک دیں گے اوپر نیچے سے پھرا بر کیسے نکلے گا؟“

فرید نے کہا ”ہم کسی ہوٹل ریستورنٹ میں رک جاتے تھے۔“
 جینم نے اس لڑکی کی طرف دیکھا ”اگر ایک چادر ہی مل جاتی۔“

اب دن نکل آیا تھا اور ہر طرف دھوپ پھیل گئی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف کھیت شروع ہو گئے تھے گندم کی فصل کٹائی کے لیے تیار کھڑی تھی۔ بس کہیں کسان موادور عورتیں کٹائی کی تیاری میں مصروف نظر آ رہے تھے۔ چھوٹے موٹے بہت سے دیہات سے گزرنے کے بعد جیرے نے سڑک سے کچھ فاصلے پر ایک نسبتاً بڑا گاؤں دیکھا اور جیپ روک لی۔

اس نے گاؤں کی طرف سے کچے راستے پر سائیکل پر آنے والے ایک شخص کو اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ وہ شخص پولیس کی وردی دیکھ کے اتنا ڈرا کہ اترتے ہوئے گر گیا۔ اس کے گرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس نے دھوٹی باندھ رکھی تھی۔

”تم یہاں رہتے ہو؟“ جیرے نے مونچھوں پر ہاتھ پھیر کے کہا ”کیا نام ہے تمہارا؟“

”عزیز عبد العزیز جناب عالی! ترکمان ہوں میں۔“

”کیا نام ہے اس گاؤں کا؟“

”باگانوالہ مشرقی۔ باگانوالہ آگے ہے۔“

جیرے نے سہلایا اور جیپ کو کچے راستے پر اتار لیا۔ دیہاتی کچھ دیر چکا کھڑا شاید یہ سوچتا رہا کہ گاؤں میں پولیس کس کیس کی تفتیش کے لیے آئی ہے پھر وہ سائیکل اور دھوٹی

سنبھال کے روانہ ہو گیا۔
 فرید نے کہا ”یہ کدھر چل پڑے تم؟“
 رکیس بولا ”باگانوالہ مشرقی میں تیرا ماما رہتا ہے۔“
 جیرے نے کہا ”مائے کا سالا اور سائے کا سالا رہتا ہے۔ اور کچھ دیر آرام کر کے اور کھاپی کے چلتے ہیں۔ اب تم اپنی وردی پن کو تھوڑی دیر کے لیے۔“
 میں نے کہا ”اور یہ لڑکی۔ اس کا نام تو ابھی تک پوچھا ہی نہیں کسی نے بھی؟“

اب وہ یکدم سکون تھی اور سٹ کر سیٹ پر آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا ”نام تو فینہ ہے‘ سوئی نکتے ہیں سب۔“

جیرے نے سہلایا ”ٹھیک کہتے ہیں سب۔ سوہنی تم کو کچھ بولنے کی ضرورت نہیں۔“

اس نے کہا ”سوہنی نہیں جی‘ سوئی۔“

”ایک ہی بات ہے۔ ہم یہاں تمہاری رپورٹ پر ایک کیس کی تفتیش کے لیے کچھ دیر ٹھہریں گے تم پڑنے وغیرہ بدل لینا‘ ہاتھ منہ دھو لینا۔“

”کس کیس کی بات کر رہے ہیں آپ؟“ وہ پریشان ہو گئی۔

جینم نے پھر اسے تسلی دی ”اطمینان رکھو۔ تم بالکل محفوظ ہو۔ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ اس وقت تم ہمارے ساتھ ہو۔ ہم نہ ملے تو اب تک پولیس کہیں تلاش کر چکی ہوتی۔“

سوئی کچھ نہیں بولی۔ اس نے یہ نہیں پوچھا کہ پولیس والے تو تم بھی ہو‘ تم میرے ساتھ اس مہمانی کے ساتھ کیوں پیش آ رہے ہو۔ میری مدد اور حفاظت کس لیے کر رہے ہو۔ اگر جینم ساتھ نہ ہوتی تو وہ ہماری کسی بات کا یقین نہ کرتی اور یہی سمجھتی کہ تقدیر نے اس کے ساتھ ایک سنگین مذاقی کیا ہے۔ جو اسے خوں آشام کتوں کی درندگی سے بچانے کی بات کر رہے ہیں‘ وہ خود بھوکے بھیڑے ہیں۔

گاؤں میں داخل ہونے والے راستے پر پسا گھرا ایک زمیندار چوہدری عظمت کا تھا۔ یہ پرانی جوبلی اور جدید وضع کے بنگلے کی درمیانی اور ملی جلی صورت تھی۔ پولیس کی جیپ اس کے احاطے میں داخل ہوئی تو وہ باہر کھڑا کسی نوکر کو ہدایات دے رہا تھا۔ وہ خواہ اس باخند آگے آیا۔

”خیر تو ہے جناب!“ اس نے سلام کرنے کے بعد ہم سب کو دیکھا۔

”ہاں خیر ہے۔ ہم ایک کیس کی تفتیش کر رہے ہیں۔“

جیرے نے کہا۔

”کیس؟ میرے خلاف؟“

”نہیں۔ تمہارے خلاف نہیں۔ پہلے تم جھگڑا کھولو اور اس لڑکی کو اندر لے جا کے عورتوں کے حوالے کرو۔ اس کے کپڑے بدلنا اور دیکھو۔ عورتوں کو سمجھانا کوئی فالتو بات نہ کریں۔“

ہم وہاں ایک گھنٹا گھومے۔ جیرے نے زمیندار کو ایک فصول سی کمانی سانی کہ سوتی اور اس کا شوہر موٹر سائیکل پر جا رہے تھے کہ انہیں چند افراد نے روکا۔ وہ انہیں لوٹنا چاہتے تھے مگر سوتی کے شوہر نے مقابلہ کیا۔ ان میں سے ایک نے لاشی سے اس کا سر ہٹا دیا۔ سوتی نے دوسرے کو پکڑ لیا تھا مگر وہ بھی خود کو چھڑا کر بھاگ گیا۔ وہ اسی طرف آئے تھے۔ سوتی کے شوہر کو اسپتال بھیج دیا گیا ہے اور پولیس سوتی کو باکالوالہ اس لیے لائی ہے کہ وہ حملہ آوروں کو شناخت کر سکتی ہے۔

جیرا بولا ”سوتی نے ان میں سے ایک کو چوہدری عقلت کا نام لیتے سنا تھا۔“

چوہدری عقلت اُچھل پڑا ”میرا نام۔ یہ آپ کیا فرما رہے ہو۔“

”اس نے کہا تھا کہ چوہدری عقلت کی جوبلی میں آجانا۔ وہ پہلے بھاگا تھا۔ دوسرے کو سوتی سے جان چھڑانے میں دیر لگی تھی۔ اسی شخص میں سوتی کے کپڑے پھٹ گئے۔“ جیرے نے کہا۔

چوہدری عقلت قسمیں کھانے لگا کہ اس طے کے کسی آدمی کا اس کی جوبلی میں رہنے والوں یا یہاں آنے جانے والوں سے کوئی تعلق نہیں۔ جیرے نے ایک پرانے پانی تھانے دار کی طرح اسے خوب ہراساں کیا۔ خانہ خلاشی سے اس کے سارے خاندان کی حوالات میں شناختی پڑے تک ہر دھمکی دی اور بہت کامیاب رہا۔ زمیندار نے ہماری خاطر مدارات میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ سوتی کو صرف بدلے کے لیے ہی کپڑے نہیں دیے گئے۔ زمیندار کی ماں نے اسے بیٹی کی طرح سر پر ہاتھ رکھ کے دعا دی اور اسے اضافی جوڑے بھی دیے۔ خود ہم نے نہادھو کے زبردست قسم کا ناشیا کیا اور اس کے بعد روانگی کا ارادہ کیا تو زمیندار نے دوسرے کھانے تک رکھنے کی درخواست کی۔ ظاہر ہے ہم وہاں زیادہ دیر گھومنے کے اپنا وقت ہی ضائع کرتے چنانچہ روغنی نان اور کھنکھن دیکھی میں بیٹھے مرغ اور مٹی کے سمندر میں ڈوبا ہوا حلوا سب ہمارے نوش فرمانے کے لیے گاڑی میں رکھوا دیے۔

گھٹے

زمیندار نے یقیناً خدا کا شکر ادا کیا ہو گا کہ بلا غلی۔ تھانے دار کی خاطر تواضع کر کے اور تجھے تھا کف دے کر اس نے اپنی اور لواحقین کی عزت بچال۔ اس وقت تک ہمارا بھی یہی خیال تھا کہ بات اس سے آگے نہیں بڑھی مگر دوبارہ لاہور جانے والی شاہراہ پر آگے جیرے نے سوچوں کو تادڑ کر انکشاف کیا کہ زمیندار بہت سمجھ دار یعنی بڑول ثابت ہوا۔ ”میں نے پانچ ماٹھے اور پانچ اس نے فوراً نکال کے سامنے رکھ دیے۔“ جیرے نے ہمیں پانچ ٹوٹ لکھائے۔

فرید بھونچکا رہ گیا ”پانچ ہزار نقد بھی وصول کر لیے تم نے؟“

”ایسا نہ کرنا تو اسے شک ہو جائے کہ یہ کیا تھانے دار ہے مجھے دس ماٹھے کا خیال آیا تھا پھر رعایت کر دی میں نے بندہ شریف تھا۔“ جیرا بولا۔

”بڑی حرا می چیز ہے یہ جس کا نام جیرا بلینڈ ہے۔“ رئیس نے فرید کو مخاطب کر کے کہا ”آخر یہ ہے اپنا۔“

جیرا بلینڈ کئی برس سے جلی تھانے دارین کے وارداتوں میں مصروف تھا اور صرف ایک بار پکڑا گیا تھا۔ چور چوری سے جانے میرا چھری سے نہ جانے۔ مروج ملتے ہی اس نے مال کھایا۔ اس کے کارنامے میرے لیے نئے نہیں تھے۔ وہ بہت مختار انداز میں واردات کرتا تھا اور ایک دن تھانے دار کی کمانی میں لگے کے ہفتہ دس دن آرام سے گزارتا تھا۔ اس کی کامیابی کا راز اس کی بہترین اداکاری میں تھا۔ وہ باتوں سے دھوکے سے اور انداز و اطوار سے تھانے داروں کی ایسی نقل کرتا تھا کہ خود تھانے دار دھوکا کھا جاتے تھے۔ وہ تھانوں میں پہنچ کے اپنا کام نکال لیتا تھا اور سڑک پر ماتحت نچلے درجے کے لوگوں پر رعب بھارتا تھا۔ رئیس کا خیال تھا کہ اب جیرا یہ کام چھوڑ چکا ہے مگر حقیقت شاید اس کے برعکس تھی۔

سوتی کی سمجھ میں پہلے کچھ نہیں آیا تھا مگر آہستہ آہستہ اس کو شک ہونے لگا کہ ہم پولیس والے نہیں ہیں۔ اس نے ہمارا کہنا مانا تھا کیونکہ ہم نے اس کی جان بچائی تھی اور اس کی مدد کی تھی۔ وہ اب بہترین کپڑے پہنے اس سوتی سے بالکل مختلف لگ رہی تھی جسے میں نے بھارتیوں میں سے کسی خوف کے مارے ہوئے خرگوش کی طرح برآمد کیا تھا۔ اس کا رنگ روپ آہستہ آہستہ ظاہر ہونے لگا تھا۔ اس کے چہرے پر کچھ رونق اور طہانیت آگئی تھی۔ ممکن ہے اس کے دل میں ایک نیا اندیشہ جاگ اٹھا ہو کہ اگر ہم سب پولیس والے نہیں ہیں

تو پھر کون ہیں اور اس طرح ہمیں بدل کے ہم وہاں کیا کرنے گئے تھے مگر اس کے حق میں خاموش رہنا ہی بہتر تھا کیونکہ ہمارے مقابلے میں خود اس کی پوزیشن انتہائی غیر محفوظ تھی۔ سڑک پانی جھڑ گزشتہ رات کے سفر سے کہیں زیادہ مہر آزا اور سخت مرطبت ثابت ہوا۔ رات کو ہم اتنے گھٹے ہوئے اور بے آرام نہیں تھے ہم ایک انٹرکنٹیننٹل بس میں تھے جس کے مقابلے میں جب بہت تکلیف دہ سواری تھی۔ ایک سمت میں مسلسل بندہ کھٹنے کا سڑک کرنے کے بعد بغیر آرام کے بندہ کھٹنے واپسی کے سفر میں گزار کے ہم سب کی حالت پتلی ہو گئی۔

لاہور تک ہم نے چار پانچ جگہ رک کے کھانا کھایا اور چائے پی۔ جیرے کی بدولت ہر جگہ خاطر مدارات ہر بوتل کی طرف سے ایک نذرانہ رہی۔ ہم لوگ اس کے عادی تھے مگر فرید کو یہ سب سخت ناگوار گزر رہا تھا۔ رات دس بجے ہم واپس لاہور پہنچ گئے۔ فرید عباسی نے رخصت ہوتے وقت ہمیں بڑی سفید اور موٹر گاڑیوں سے نوازا۔ وہ رخصتی اور اپنی ماں کو ایک دوست کے گھر میں چھوڑ گیا تھا اور وہ اس کے کچھ بتائے بغیر ایک ضروری کام پر جانے سے پریشان بیٹھی تھیں۔ انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ اس کی خیریت کس سے معلوم کریں۔ صرف رخصتی کو شبہ تھا کہ وہ ہمارے ساتھ کوئٹہ جاسکتا ہے۔

ر میں خانے پہنچ کے ہم نے تیس مارخان کو سوتی کے حوالے سے ضروری ہدایات دیں۔ اسے خیم کے ساتھ الگ بیدروم میں سلاوا اور اس بیدروم کو لاک کر کے خیمے میں چابی اپنے کپچے کے نیچے رکھ لی۔ جیرا بلینڈ سب سے پہلے بے سندھ ہو گئے کرتے ہی سو گیا۔ اس نے بید کے بجائے قالین کے فرش کو ترجیح دی تھی۔ چھوٹ چوڑے بید کو میں نے رئیس کے ساتھ شیئر کیا لیکن مجھے دن کے دو نہ بے چین رکھا پھر میں نے اسپرین کھائی اور کچھ دیر بعد راحت کے احساس کے ساتھ ہی مجھ پر نیند غالب آگئی۔

صبح خلاف امید میری آنکھ جلدی کھل گئی۔ میں نے گھڑی دیکھی تو صبح کے ساڑھے چھ بجے تھے۔ میں گزشتہ رات اتنا تھک گیا تھا کہ میرا خیال تھا میں دوپہر تک سو رہوں گا۔ رئیس اور جیرا بلینڈ گہری نیند میں تھے۔ عادت کے مطابق رئیس خزانے سے رہا تھا۔ اس کے خزانے وقفہ وقفہ سے شروع ہو کے تیز ہوتے جاتے تھے یہاں تک کہ وہ خود سڑب ہو کے کوٹ بدل لیتا تھا اور کچھ دیر کے لیے خزانے بھی بند ہو جاتے تھے۔

میرا جسم اب بھی تھکن سے ٹوٹ رہا تھا۔ دوبارہ سوتے کی کوشش میں ناکام ہو کے میں نے گرم پانی سے غسل کا فیصلہ کیا اور آدھا گھنٹا گرم پانی کے ٹب میں لیٹا رہا۔ اس سے مجھے کافی فرق پڑا۔ ٹھنڈے پانی سے شاور لینے کے بعد میں باہر نکلا تو بہت تازہ دم تھا۔ کچن کی طرف سے تیس مارخان اور چھوٹی کے باتیں کرنے کی آواز آرہی تھی۔

میں قریب پہنچ کے رک گیا۔ تیس مارخان دیوار سے چپکا ہوا تھا اور چھوٹی اس کے سر پر پاز کائے والی چھری رکھ کے دیوار پر نشان لگا رہی تھی۔

”اب ایڑی مت اٹھا اوپر اور گردن سیدھی رکھ۔“ وہ بولی۔

تیس مارخان نے چھوٹی سے کہا ”تم چھری کو سر پر ایسے کیوں دہاتی جیسے توں پر کھن لگاتی۔“

”وہاں کس رہی ہوں میں۔ سرنے کی طرح گردن مت اٹھا۔ چل اب ہٹ جا۔ نشان لگوا ہے میں نے۔“

تیس مارخان نے ایک قدم پیچھے ہو کے جب میں سے پانچ فٹ لمبا بانی کٹی فٹ نکلا۔ ”اب ام خود ملاحظہ کرتی۔“

”تیرا دماغ خراب ہے۔ سب روز جانے کہاں سے الہا بلا اٹھا کے لے آتا ہے۔ مجھے ہی لگتے ہیں سب بے وقوف بنانے والے۔“ چھوٹی بڑبڑانے لگی۔

”ایسا گفت و شنید فرما کے تم باا صاحب کی شان شریف میں گستاخی فرماتی۔“ تیس مارخان نے فرش سے دیوار کے نشان کی بلندی کی بڑی احتیاط کے ساتھ تلاش شروع کی۔ ”سارے زمانے کے جھوٹے دھوکے باز باا۔“ نقلی سفید داڑھیوں لٹکاے الو بناتے ہیں تیرے جیسے گدھوں کو۔“

”تم ناحق بکواس کرتی۔ گدھا ایک چوپایہ ہوتی جیمیں کا مالک۔ الو ایک پرندہ ہوتی۔ گدھے کو الو کون بتاتی۔“ تیس مارخان اپنے کام میں لگا رہا۔

”مت کھایا کریہ انی سیدھی گولیاں۔ کسی دن کچھ ہو جائے گا۔ میرے ایک ماموں تھے وہ بھی ایسی ہی طاقت کی دوا میں لاتے رہتے تھے۔ نازن نے کا بڑا شوق تھا ان کو۔ سارے بال جھڑ گئے ایک بار کوئی ایسی چیز کھالی۔ صبح سو کے اٹھے تو سارے بال نیچے پر دھڑے تھے۔ مونچھیں تک غائب ہو گئی تھیں۔ پلکیں اور مونچھیں سب غائب بالکل چیلے ہوئے آلو لگتے تھے۔ مونچھیں ان کی بھی بڑی شاندار تھیں۔ تیرے جیسی۔“

تیس مارخان کا ہاتھ رک گیا ”مونچھ غائب ہوتی، کیسے

غائب ہوتی؟

”ہوئی دوا میں کوئی ایسی بات۔ دوبارہ ایک بال نہیں اگا۔ ساری عمر ہر محل آزما کے دیکھ لیا۔“
”موتیوں کی ایسی جھرتاک اور شرمناک تہائی کے ذکر سے تمہیں مارخان پر لرزہ طاری ہو گیا۔“ تم ام کو جھوٹ بول کے ڈراتی۔“

”اے لعنت سوار جھوٹ بولنے والے پر اور ہزار بار مجھے جھوٹا کہنے والے پر۔ میں طواوون کی تجھے مانوں سے۔ کیا نہیں ملا انہوں نے سر اور مونچھیں اگانے کے لیے۔ کتے مدینے کی مٹی کا گارا“ ایک گدھے کی لہجہ جس کے بارے میں کہتے تھے کہ اس گدھے کی نسل سے ہے جو حضرت عیسیٰ کی سواری کے کام آتا تھا۔ جڑی بوٹیوں اور وہ کیا ہوتے ہیں۔ بیڑناک اور ماموں کا ایک سالہ۔ تو بہ شادی سے پہلے کسی عظیم کے چکر میں پڑ گیا تھا۔ اس نے تپا نہیں کیا دے دیا وہ تو مرد سے عورت بن گیا۔“ وہ مدہ دیا کے کھی کھی کرنے لگی ”شادی کیا خاک ہوتی“ انا کہنے لگا کہ میرے لیے لڑکا تلاش کرو۔“

”ام یقین نہیں فرماتی“ تمہیں مارخان نے پورے دھوکے کے ساتھ اس بات کو مسترد کر دیا اور پھر اپنے قد کی پینٹس کرنے لگا۔

میں نے آگے بڑھ کے کہا ”بھئی تمہیں مارخان کیا بات ہے“ آج کچھ دراز قد لگ رہے ہو“ تمہارا قد کچھ بڑھ گیا ہے۔“

اس کا چہرہ مسرت سے چمکنے لگا ”آپ سچ فرماتی صاب! یہ بد بخت اور بد خواہ عورت ذات ام یقین نہیں فرماتی۔“
میں نے کہا ”یقین نہ کرنے کی کون سی بات ہے۔ صاف نظر آ رہا ہے کہ تمہارا قد کم سے کم ایک ملی میٹر بڑھا ہے۔“
”کہاں صاحب جی۔ دیوار پر نشان تو وہیں آیا ہے“ چھوٹی نے کہا۔

”تم غلط نشان لگاتی۔ بابا صاب کو بدنام کرتی“ تمہیں مارخان بولا۔

”اے جا۔ میری جوتی کو بھی غرض نہیں۔ مجھے مل جائے کہیں وہ بد معاش بابا تو ایک سو چالیس جوتے گن کے لگاؤں“ چھوٹی نے چپک کے کہا۔

میں نے کہا ”بھئی یہ ایک سو چالیس کا کیا چکر ہے؟“
”صاحب جی۔ وہ اپنی عمر ایک سو چالیس سال بتاتا ہے۔ جھوٹ بکتا ہے حرای کہ چالیس سال قبر میں دفن ہو کے چلے کاٹا رہا۔ چالیس سال اس پہاڑ کی چوٹی پر لٹکا بیٹھا رہا۔ جنہاں

برف ہی برف ہوتی ہے۔ کون سا پہاڑ ہے وہ سب سے اونچا۔“

میں نے کہا ”ہالیوڈ ماؤنٹ اور سٹ۔“
”ہاں جی وہی پھرکتا ہے چالیس سال ہوا میں اٹلا لٹکا رہا۔ قطبی ستارے کے ساتھ۔ اچھا تھا اسی وقت آسمان سے گرنا۔“

”مجھور میں اکتا“ میں نے کہا۔

”غریب ہونا مسند میں۔ اس جھوٹے لپاڑیے نے گولیاں دی ہیں کہ اس میں حالیہ کے شیر کی آنکھ کا موتی ہے اور برقانی ریچھ کے جگر کی چربی اور پتا نہیں کیا الالہ۔ مجھے تو سرور کی گولیاں لگتی ہیں۔ قد اس سے خاک بڑھے گا۔ چار فٹ دوا سچ سے سوا دوا کچ نہیں ہوا سچی۔“

تمہیں مارخان کے لیے اتنی بے عزتی ناقابل برداشت تھی ”ابھی تم کو اس بند نہیں فرماتی تو ام ایک جھانپا عرض کر کے تمہارا دندان مبارک شید فرماتی۔ تمہاری سب ہڈی شکستہ کرتی ایک مکار سید فرما کے تم کو فنا کرتی لات مار کے۔“

اس سے پہلے کہ چھوٹی اس الٹی میٹم کے جواب میں اپنی زبان کی کلا شکوف کا برست مارتی، میں نے انہیں روک دیا۔
”بس۔ بہت ہو گئی یہ خانہ جنگی۔ اب لڑنا چھوڑ کے مجھے ایک کپ کافی کا بنا دو۔“

ساڑھے سات بجے تک خیم کے بند روم کا دروازہ لاک تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ اس کے ساتھ سوتی بھی سوتی پڑی ہے۔ میں نے اس وقت سے قاعدہ اٹھاتے ہوئے خان جی کو دیکھنے کے لیے کمال کلینک جانے کا فیصلہ کیا۔ حالات نے اچانک غیر متوقع رخ اختیار کر لیا تو میں ایک دن کی غیر حاضری کے بعد واپس آ گیا وہ گویہ پہنچ جانے کے بعد شاید میری فوری واپسی ممکن نہ ہوتی۔ کمال نے مجھے بتایا تھا کہ چند ایک دو دن میں خان جی کے ساتھ لندن جا سکتی ہے۔ اس کے سفر کی تمام تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں اور خان جی کو بے ہوشی کی حالت میں شفٹ کرنے کے انتظامات ہونے کے بعد چندا کا پہلی فلائٹ سے روانہ ہو جانا چاہی تھا۔

میں نے لباس تبدیل کرتے ہوئے آئینے میں اپنے سراپا کو دیکھا اور آج کے ناصر عظیم کا موازنہ شاہ عالم بننے سے پہلے والے ناصر عظیم سے کیا تو میں دم بخود رہ گیا۔ میرے سامنے ایک مشق کی شری حد کے مطابق داڑھی رکھنے والا کوئی اجنبی چہرہ تھا جس میں پرانے ناصر عظیم کی صورت کے خدوخال کم ہو چکے تھے سیاہ بالوں والی یہ داڑھی میرے

چہرے کی شناخت کو بدلنے میں سب سے اہم کردار ادا کرتی تھی۔ اس سے میرا چہرہ بھاری بھر کم اور بارعب نظر آتا تھا مگر داڑھی بے ترتیب ہو رہی تھی۔ اسے تراش خراش کے ساتھ زیادہ متاثر کن بنایا جاسکتا تھا۔ نیلے بال کافی بڑھ گئے تھے اور میں اس طے میں کوئی پاپ عکس لگاتا تھا۔ ناصر عظیم یا شاہ عالم کی مجھ میں کوئی مشابہت باقی نہ رہی تھی۔ جب میں ان کا تصور کرتا تھا تو آئینے میں مجھے دو قطعی اجنبی اور مختلف عکس نظر آتے تھے۔ میں نے اپنی ایک زندگی سے تین زندگیاں ایسے بنائی تھیں جیسے مٹی سے برتن بنانے والا ایک سی مٹی سے مرا می بنائے پھر اسی کو گھوڑے کی شکل دے کر دیکھے اور مطمئن نہ ہو تو اس مٹی کو گزیا کا روپ دے دے۔

میرے کپڑے بہت خراب ہو رہے تھے۔ اپنے پرانے کپڑوں میں سے میں نے اپنے پسندیدہ رنگ کی نئی شرت اور ایک بہت اعلیٰ قسم کی کالی پینٹ کا انتخاب کیا۔ ایک زمانہ تھا کہ میں اپنے لباس کے معاملے میں نفاست، فیشن اور مناجت کا بہت زیادہ خیال رکھتا تھا۔ کون سا لباس کب اور کہاں پہننا ہے۔ وقت، موقع اور تقریب کے لحاظ سے کیا لباس مناسب ہو گا۔ کس رنگ کی شرت کے ساتھ کیسی پینٹ اور کس سوٹ پر کون سی ٹائی چیخ کرے گی۔ یہ سب میری خوش لباسی اور حسین فطرت کی شرت کا سبب تھا۔ میں کپڑے خریدتا رہتا تھا اور مسترد کرتا رہتا تھا لیکن اب ایک مدت سے میں یہ سب کچھ بھولا ہوا تھا۔ شناخت بدلنے کے کھیل نے مجھے لباس کے حسن سے بے نیاز کر دیا تھا۔ میں لباس کو ایک ایکٹر کے کاسٹیم کی طرح استعمال کر رہا تھا۔ جو حسین کے تقاضوں کے مطابق بھی خلعت فاخرہ پہنے، کبھی قبائے شاہی تو کبھی خرقہ و دھنکی۔

بالش کئے ہوئے جوتے پہن کے میں باہر آیا تو چھوٹی لاؤنج کی صفائی میں مصروف تھی۔ گاڑی کی چابی ٹیبل پر پڑی تھی۔

چھوٹی نے مجھے دیکھا تو دم بخود رہ گئی ”صاحب جی۔ آپ تو بڑے اچھے لگ رہے ہو آج۔“

میں نے اسے ڈانٹ کے کہا ”کیا مطلب ہے اس فضول بات کا آخر۔ کل تک میں برا لگتا تھا تمہیں۔“

وہ یو کلا مٹی ”نہیں صاحب جی۔ میرا مطلب تھا۔“

میں نے کہا ”دیکھو میں کمال کلینک جا رہا ہوں۔“

تمہیں مارخان نے ایک دروازے سے نمودار ہو کے سخت تشویش کا اظہار کیا ”آپ کا حالات زار سے نفاست اور علامات ظاہر ہوتی۔ آپ کو ام بقلم خود اسپتال لے جاتی

انگریز کا اسپتال۔“

میں نے کہا ”یہ کو اس سننے کا غم نہیں ہے میرے پاس۔ جو میں کہہ رہا ہوں وہ سنو۔“

”ناصر عظیم تن گوش ہو جاتی“ اس نے ستانت سے کہا۔
”جب بالی لوگ سو کے اٹھیں تو انہیں تار بنا۔ مجھے امید ہے کہ دو گھنٹے میں واپس آ جاؤں گا۔“

”امید پر دنیا قائم ہوتی۔“ وہ آسمان کی طرف دیکھ کے بولا۔

قرعے میں صبح کچھ کے حیران رہ گئی۔ حسب عادت اس نے میری چیخ ماری ”بھائی۔ آپ!“ اور پھر مجھ سے گلے ملنے دوڑی۔ اس کے ایک ہاتھ میں جھانپا تھی جس سے وہ دیواروں کے اوپر اور کونوں میں لگے عکزی کے جانے اتار رہی تھی۔ گرد اور جانے اس کے سر کے بالوں میں بھی چپکے ہوئے تھے۔

میں نے کہا ”بھئی۔ یہ کیا طیلہ بنا رکھا ہے۔ جل چھوڑیہ سارے کام میں نے ناشائیں کیا ہے۔“

اس نے جھانپا پھینک دی ”میں ابھی لاتی ہوں دو منٹ میں۔ کیا کھاؤ گے؟“

”تیرا سر۔ وہ الو کا چھانکل گیا؟“

وہ ہنسی ”ابھی ابھی تو گئے ہیں وہ۔ آٹھ بجے سے ایک منٹ اور بیچے ہوئے میں تو شور مچاتے ہیں کہ سارا شیدول خراب کر دیا۔ ناشتے کے بعد انہیں اخبار دیکھنا ہوتا ہے۔ آدھا ٹھنڈا اس کے لیے چاہیے۔ ناشتا چھوڑ دیتے ہیں اگر دیر ہو جائے ایک ساتھ دونوں کام ہو سکتے ہیں مگر نہیں۔“

”شوہر بن کے آدمی ایسے ہی خُرخے کرتا ہے اور اسے بگاڑتی ہیں بیویاں۔ اس کے استے ناز اٹھاتی ہیں، اتنی اہمیت دیتی ہیں اسے۔ عادتیں خراب کر دیتی ہیں پہلے پھر شکوہ کرتی ہیں۔“ میں بچن میں کرسی ڈال کے بیٹھ گیا۔

وہ چوٹا جلا کے ایک دم چلی ”بھائی۔ اتنی دیر سے باتیں کئے جا رہے ہو فضول۔“

میں نے سر کھچا کے کہا ”میں چاہتا تھا کہ باتوں میں تو بھول جائے۔ اتنی اہم سوری! چاکلیٹ اس وقت مل نہیں سکتی تھی۔“

”مہمانے اچھے کرنے لگے ہو اب تم پہلے ایسا نہیں ہوتا تھا۔ پتا نہیں شادی کر لو گے تو کیا ہو گا۔ یہ بھی یاد نہیں رہے گا کہ خرکون تھی اور کیا پند تھا اسے۔ میں تو بھول گئی ہوں چاکلیٹ کا ذائقہ بھی۔ انہیں تو نہ ہوش ہے نہ پرواہ جب دیکھو وہی ایک بات کہ چاکلیٹ سے دانت خراب ہوتے

ہیں۔ مولیٰ ہو جاو گی۔
 میں نے کہا "مولیٰ تو خیر بہت ہو گئی ہے تو۔"
 وہ شرمائی "کمال بھائی۔ دیکھی ہی ہوں۔ اب یہ تو ہوتا ہے۔"
 میں نے کہا "ایک سڑک کے نیچے کاموں بٹنا لکھا تھا میرے نصیب میں۔ خیر تو اپنے خاں اعظم کی بات کر۔" اس نے کہا "آپ ان سے لئے نہیں؟ سیدھے ادھر آگئے؟"
 "ہاں۔ کچھ باتیں کرنا چاہتا تھا مجھ سے۔ چند اکب جاری ہے لندن؟"
 "قرآن اس ہو گئی۔ کل رات دو بجے ہے اس کی فلائٹ کراچی سے۔ لاہور سے کل صبح نو بجے۔ بس بھائی، اب کچھ نہیں رہا۔ کتنا اچھا وقت تھا جو کڑ گیا۔ جب ہم سب ساتھ تھے۔ نظر لگ گئی اس وقت کو کسی کی۔"
 میں نے کہا "یہی مایوسی کی باتیں کیوں کر رہی ہے۔ وقت تو خیر بدل جاتا ہے مگر اور کیا بدلے ہے؟"
 "نہیں۔ پہلے جیسا کچھ بھی نہیں ہے۔ تم چلے گئے۔ خان جی کا بھی چل چلاؤ ہے۔ چند ابھی کئی واپس آنے والا کوئی نہیں۔"
 "چند صرف علاج کرا نے جاری ہے۔"
 "نہیں بھائی۔ مجھے ایسا لگتا ہے کمال بھی سمجھتے ہیں کہ علاج کے لیے جانے کا صرف ہمانہ ہے۔ وہ یہاں سے جانا چاہتی ہے۔ کوئی مجھڑ ہوتا ہے تو یہاں بھی خان جی ٹھیک ہو سکتے ہیں لیکن کسی ڈاکٹر کے علاج سے یہ ناممکن ہے۔ ہر علاج، ہر دوا یہاں بھی ہے۔ لندن کے ڈاکٹروں سے اچھے ڈاکٹر ہیں یہاں اور خود لندن کے ڈاکٹر صاف جواب دے چکے ہیں پھر اس کزن کی بات پر اعتبار کرنے کا کیا مطلب ہے؟ کمال نے کیا نہیں کیا؟ سارا ریکارڈ لندن بھیجا۔ خود ڈاکٹروں سے بات کی۔ ہر ٹیسٹ کی رپورٹ پر ان ڈاکٹروں سے ڈسکس کیا جو لندن میں برسوں پریکٹس کرتے رہے پڑھاتے رہے۔"
 "تجرا مطلب ہے۔ خان جی کے علاج کا صرف ہمانہ ہے۔ وہ ہمیشہ کے لیے جانا چاہتی ہے؟"
 میں نے اس کی باتوں سے یہی اندازہ کیا۔ وہ لوٹ کے نہیں آئے گی۔ خان جی نہیں ہوں گے اس کے بعد بھی۔"
 "مگر وہ کیا کرے گی لندن میں؟ کہاں رہے گی؟"
 "وہ کزن جو پیدا ہو گیا ہے۔" قمر نے سنی سے کہا اور اہل ہوا پانی کیسی میں ڈالنے لگی "اب جو کچھ ہے وہی کزن ہے، ہم

کچھ نہیں۔"
 "میں سمجھاؤں گا۔"
 قمر ایک دم چلی "تم پر تم کیا سمجھاؤ گے بھائی۔ تمہاری کیا ہوا ہے یہ سب۔"
 میں نے کھڑو لیے میں مدافعت کی "تو بھی ایسا سمجھتی ہے؟"
 "کیوں نہ سمجھوں آخر؟ اور اس کے سوا کیا سمجھوں۔ تم نے اسے چھوڑا اور خواہ کسی وجہ سے بھی چھوڑا۔ یہ مجبوری تھی حالات کی یا بد قسمتی تھی مگر تمہارے کسی عذر کو قبول کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ اس کے سوا کچھ نہیں سمجھ سکتی تھی کہ ناصر عظیم اب شاہ عالم ہے۔ رخصتی کا شوہر، خیم کا محبوب۔"
 "قمر! کو اس کرنے کی ضرورت نہیں۔"
 "تم میرے منہ پر تھپڑ بھی مار سکتے ہو بھائی مگر اس سے حقیقت نہیں بدلے گی۔ چندا نے کبھی تم پر اعتبار نہیں کیا۔ تمہاری وضاحتوں کو قبول نہیں کیا۔ تمہاری قسموں کو نہیں مانا اور مانتی بھی کیسے۔ محبت میں آدمی اتنا شکلی اور حاسد ہو جاتا ہے۔ تمہارے بارے میں کوئی افواہ بھی ہوتی تو اس کو تشویش سے بخار ہو جاتا۔ یہ تو معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ تم شاہ عالم ہاؤس میں رہتے تھے۔ رخصتی دنیا کے سامنے تمہاری بیوی تھی۔ سب کو معلوم تھا کہ اس کا اور تمہارا بیڑہ دم ایک ہے۔ اندر کی سچائی کی تردید تم کیسے کر سکتے تھے پھر خیم کے ساتھ تمہارے مراسم کے افسانے جو شاہ عالم سے منسوب تھے مگر تمہارا نام شاہ عالم ہوا تو خیر چھوڑو بہت کرچکے ہیں ہم یہ باتیں۔ چندا صرف ناصر عظیم کو چاہتی تھی۔ تم دوبارہ ناصر عظیم بن کر آئے تو وہ سمجھتی ہے کہ وہ پہلے والے ناصر عظیم نہیں ہو پہلے تم صرف اس کے تھے اب وہ بات نہیں رہی۔ تم نے رخصتی کو طلاق دی بالآخر مگر خیم کے ساتھ تم اسی طرح ہو۔"
 "تم چندا کو بالکل الزام نہیں دو گی۔ اس نے کیا رویہ اختیار کیا تھا میرے ساتھ۔ میں نے کم ذات اٹھائی اس کی محبت کو پھرانے کے لیے کبھی طرح مجھے بے آبرو کیا اس نے۔ میرے اعتبار کو ٹھوکر مار کے۔"
 قمر نے آہستہ سے کہا "بھائی۔ ناشتا کرو۔"
 "ناشتا کر رہا ہوں میں مگر مجھے بتا دیا یہ سچ نہیں ہے؟ میں لوٹ کے آیا تھا اور میری قسم کھا کے کہہ سکتا ہوں کہ چندا مجھ پر یقین کرتی تو میں لوٹ کے کہیں نہ جاتا مگر اس نے تو اعتبار کے سارے دواؤں پریشانی کے لیے بند کر دیے۔"

قمر نے کہا "نہیں بھائی۔ یہ سچ نہیں ہے۔"
 "پھر کیا ہے سچ؟"
 "سچ سچ ہے بھائی کہ وہ تم پر اعتبار کرنا چاہتی تھی۔ تمہارے واپس آجانے کی سچی دعائیں کی ہوں گی اس نے۔ دن رات سوئے جاتے اور اس کی دعا قبول ہو گئی تو کیا اس نے خدا کا شکر ادا نہیں کیا ہو گا۔ دنیا میں اور کون تھا اس کا۔ بالآخر وہ تمہیں ہی قبول کرتی۔ تمہاری ہر خطا کو معاف کر دیتی۔ بھول جاتی وہ سب کچھ۔ جو تم نے کیا اور اس نے کہا۔"
 "پھر؟ پھر ایسا کیوں نہیں ہوا؟"
 "اس کا جواب تم دو بھائی۔ تم ٹھہرے کیوں نہیں؟ تم نے انتظار کیوں نہیں کیا۔ غلطی کی تھی تو سزا کیوں نہیں کائی پوری۔ تم واپس کیوں چلے گئے؟"
 میں نے کہا "یہ غلط ہے۔ میں نے سب کچھ کر کے دیکھا۔"
 "پلو میں مان لیتی ہوں کہ تم نے سب کیا مگر جو تمہارے کئے کرائے پر پانی پھیرنا رہا۔"
 میں نے چونک کے کہا "تو اس کی بات کر رہی ہے قمر؟"
 "اس کی۔" وہ رک کر بولی "اب میں کیا گالی دوں اسے تمہارے سامنے۔ وہ تمہاری ساری باتیں، تمہاری شب و روز کی مصروفیات۔ تمہارے ایک ایک دن کے ایک ایک منٹ کا حال فون پر سناتی رہی۔"
 "سناتی رہی۔ کوئی عورت؟" میں بھونچکا رہ گیا۔
 "ہاں، کوئی عورت۔"
 "مگر کون عورت؟" میں نے کہا۔
 "یہ تم سوچو، تم بتاؤ۔ اس نے چندا کو فون پر رپورٹ دی کہ تم خیم کے ساتھ کہاں تھے پھر رخصتی سے ملنے تک مجھے تھے۔ طلاق دینے کے بعد بھی تم نے اسے ایک گھر لے کر دے رکھا ہے اور تم باقاعدگی سے جاتے ہو وہاں۔"
 میرا سارا خون مچھ کے سر میں اگیا "تو نے مجھے پہلے کبھی نہیں بتایا۔"
 "خود مجھے کہاں معلوم تھا؟" وہ بولی "وہ تو ایک دن میری زبردست جنگ ہوئی چندا سے۔ میں تمہاری حمایت کرتی تھی۔ لڑتی تھی اس سے۔ وہ سچ ہو جاتی تھی۔ بہت کچھ اٹا سیدھا کبھی تھی تمہارے بارے میں۔ نوبت اس انتہا کو پہنچ گئی تھی کہ کمال نے مجھے بات کرنے سے روک دیا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اپنے بھائی کی بلا وجہ حمایت کر کے تم بھی شریک جرم ہو رہی ہو۔ تمہیں کیا معلوم وہ کیا کرنا پھر رہا

ہے۔"
 "یہ کمال نے کہا؟"
 "ہاں۔ کمال نے ہی مجھے بتایا کہ چندا کو ایک عورت فون کر کے سب بتاتی ہے۔ تم کہاں رہتے ہو کیا کرتے ہو۔ کہاں جاتے ہو۔ کس وقت جاتے ہو اور کس سے ملتے ہو۔ یہاں تک کہ کیا باتیں کرتے ہو۔"
 "یہ ناممکن ہے۔" میں نے میز پر مکا مار کے کہا۔
 "مگر یہ سچ ہے۔ میں نے خود سنا ہے بھائی؟" قمر نے سکون سے کہا۔
 "تو نے سنا ہے؟ کیسے؟"
 "جب میں نے چندا سے پوچھا کہ کیا یہ سچ ہے تو اس نے کہا کہ خود اپنے کانوں سے سنو گی، اب فون آئے تو تم خود بات کرنا۔"
 "کس وقت فون کرتی تھی وہ عورت؟"
 "کوئی وقت مقرر نہیں تھا اس کے لیے مجھے انتظار کرنا پڑا سارا دن۔ شام کو مجھے چندا نے بلوایا۔ اس نے عورت کی بات شروع ہوتے ہی اسے ہولڈ کر دیا تھا کہ میں بلاتی ہوں مگر چاندنی کو۔ جب میں گئی تو اس نے پہلو کر کے ریسیور مجھے تھما دیا اور میں نے اس عورت کی آواز سنی۔"
 "کس کی آواز تھی وہ؟"
 "قمر نے مجھے غور سے دیکھا "آواز خیم کی نہیں تھی۔"
 "خیم کی نہیں تھی؟" میں نے کہا "پھر کس کی تھی؟"
 "اس نے مجھے بتایا کہ تم خیم کو کہاں لے گئے تھے۔ کون سی جگہ ہے وہ۔ رئیس خان۔ یہ نام اسے کیسے میں نے چلا کے کہا "رئیس خان۔ یہ نام اسے کیسے معلوم ہوا؟"
 "میں کیا بتاؤں، رئیس خانے میں وہ تمہارے ساتھ ہی رہی۔ رات بھر اس کو کسی نے اغوا کر لیا تھا۔ تم اس کی تلاش میں آدمی رات کو شاید رہ گئے تھے۔ وہ آزاد صاحب کے گھر میں رہتی تھی۔ وہ اخبار کے ایڈیٹر ہیں مگر ان کی بیٹی نہیں ہے وہ آزاد صاحب نے شادی نہیں کی۔ خیم کو بال پوس کے بڑا کیا تھا۔ وہ انہی کے اخبار میں کام کرتی ہے لیکن اب وہ اخبار میں ڈپٹی پری بھی باقاعدگی سے نہیں جاتی۔ تمہارے ساتھ ہی رہتی ہے ہر وقت۔"
 میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ یہ سب سچ تھا مگر اس انکشاف نے میرا دماغ مایوس کر دیا۔ میں صرف دو عورتوں پر شک کر سکتا تھا۔ یہ ساری باتیں خیم کے علاوہ صرف رخصتی جانتی تھی۔ کیا وہ چندا کو فون کرتی رہی؟ چندا کی

دگمائی کے اسباب اب مجھ پر واضح ہونے لگے تھے۔
میں نے کہا ”قرب کب سے جاری تھا یہ گناہ میں فونوں
کا سلسلہ؟“

”کئی ماہ سے۔“

”یہ بھی چندا نے بتایا ہے؟“

”قرنے سرھلایا۔“ اور کون بتاتا۔“

میں نے کہا ”وہ ایک عورت کی ٹیلی فون پر کسی ہوئی باتوں
پر یقین کرتی رہی۔ ایک بار بھی اس نے مجھ سے نہیں
پوچھا۔“

”اس نے شروع میں یقین نہیں کیا تھا مگر بعد میں اسے
کرنا پڑا جب کچھ باتیں صحیح ثابت ہوئیں۔“

میں نے کہا ”کیسے؟ کیا اس نے میری جاسوسی کی تھی؟
کیا ذریعہ تھا اس کے پاس تھدق کا۔“

”بھائی۔ کچھ عقل سے کام لو۔ وہ بھی شر میں رہتی ہے۔
اس کی جگہ میں ہوتی تو کیا اس کے ہر بات کو کوچ مان لیتی؟ میں
اس عورت سے ثبوت مانگتی۔ اس نے اپنے بارے میں نہیں
بتایا مگر اور سب کچھ بتا دیا۔“

”مثلاً؟“

”مثلاً یہ کہ رخصتی اب کہاں رہتی ہے اس کا فون نمبر
کیا ہے۔ اس سے پوچھا جاسکتا ہے کہ ناصر عظیم تم سے ملنے
کب آیا تھا؟“

میں نے کہا ”وامانی گاؤں۔ رخصتی کا فون نمبر بھی دے دیا
اس نے؟ یہ تو مت بڑی سازش ہے۔“

”اور چندا نے خود آزاد صاحب سے پوچھا۔ انہوں نے
بست کچھ بتایا جو وہ عورت بھی بتا چکی تھی۔“

میں بہت دیر تک سوچتا رہا کہ آخر وہ عورت کون ہو سکتی
ہے مگر میرے ذہن میں صرف ایک ہی نام آتا تھا اور وہ نام
رخصتی کا تھا۔ یہ تفصیلات جن کا تعلق میرے معمولات سے
تھا، کسی اور کے علم میں نہیں تھیں۔ میں روپوشی کی زندگی
م گزار رہا تھا لیکن سوال یہ تھا کہ رخصتی کو یہ سب چندا کو
بتانے کی کیا ضرورت تھی؟ اسے چندا کے جذبات کو میرے
خلاف بھڑکانے اور نفرت کی خلیج کو وسیع تر کر کے کیا حاصل
ہو سکتا تھا؟ ظاہر ہے کچھ نہیں۔

ہاں جنم پر الزام آسکتا تھا کہ اس نے راقبت کے حسد
میں چندا کو مجھ سے بدظن کرنے کی کوشش کی بلکہ یہ کہا جائے
کہ اس کے دل میں جو شک تھا، اسے یقین میں بدلنے کے
لئے حالات سے پورا فائدہ اٹھایا۔ جنم نے میری چندا کی
طرف واپسی کے مبہم سے امکانات کو بھی بالکل ختم کر دیا۔

لیکن قمر کا کہنا تھا کہ وہ آواز جنم کی نہیں تھی اور پھر
جنم کے دل میں راقبت کے جذبات کا کوئی گزر نہیں۔ وہ شاہ
عالم کے لیے چاہت کے جو جذبات رکھتی تھی، اس میں حسد کا
کبھی دخل نہیں تھا۔ اس نے شاہ عالم کو صرف اپنا بنانے کی
کسی خواہش کو دل میں جگہ نہیں دی۔ وہ ملکیت کے احساس
سے بالاتر ہو کے اپنی محبت کو غیر مشروط رکھتی تھی۔ ایسا ہی
آج بھی ہے۔ رخصتی جب شاہ عالم کی بیوی تھی تو جنم کو اس
سے غرض نہ تھی۔ شاہ عالم دنیا بھر میں اپنی عیاش فطرت اور
رنگین مزاجی کے افسانوں سے بدنام تھا۔ خود جنم کا نام اس
کے ساتھ کم بدنام نہیں تھا مگر جنم نے کس کی پروا کی؟ جب
میں نے اسے چندا کے ساتھ اپنی جذباتی وابستگی کے بارے
میں بتایا تو اس نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس نے
کبھی چندا کا ذکر ایسے نہیں کیا کہ مجھے بڑا گھٹا اس کے لیے
چندا کا وجود کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔

پھر بھی اس امکان کو کبھی مسترد نہیں کیا جاسکتا تھا کہ
اب پہلی بار اس کو اپنے محبوب کے دل پر پورا اختیار حاصل
ہونے کا یقین آیا تو اس نے اپنے قبضے کو مضبوط اور اندیشوں
سے بے نیاز کرنے کے لیے ماضی کے سب جذباتی رشتوں کو
ختم کر دینے کا سوچا۔ چندا کی محبت کا نقش بھی باقی نہ رہے کہ
مستقبل میں بھی خطرہ بنے۔ اس کے لیے جنم نے دگمائی کے
سارے اسباب فراہم کر دیے۔ میری بے وفائی کے سارے
ثبوت دے دیے۔ چندا کو یقین دلایا کہ اب امید رکھنا بھی
لا حاصل ہوگا۔ اگر آواز اس کی نہیں تھی تو کیا ہوا۔ اس کی
مدد کوئی دوسری عورت بھی کر سکتی تھی۔ کوئی سیسل یا ہیراز
جنم ذہن لڑکی ہے۔

قرنے نے کہا ”اب سوچنے سے کچھ نہیں ہوگا بھائی!“

”میں یہ سوچ رہا تھا قمر۔ کہ ایسا کس نے کیا اور کیوں؟
میں نہ رخصتی پر شک کر سکتا ہوں اور نہ قمر مگر ان کے علاوہ
تیسری عورت کا وجود ہی نہیں۔ جنم کسی اور سے فون کر سکتی
ہے مگر وہ ایسی لڑکی نہیں ہے۔“

قمر طرے مسکرائی ”چھا؟ اور کیسی لڑکی ہے وہ؟ اس
کے بارے میں جو زبان خلق کہتی ہے۔ وہ بھی غلط ہے۔“

میں نے بے بسی سے کہا ”تو کبھی یقین نہیں کرے گی مجھ
پر۔“

”میرے یقین کی بات کیوں کرتے ہو۔ میرا تم سے جو
رشتہ ہے وہ ایسی باتوں سے متاثر نہیں ہوتا لیکن تمہارے دکھ
سے مجھے دکھ ضرور ہوتا ہے۔ تمہارے حالات سے میں
لا تعلق کیسے رکھوں خود کو۔ مجھے تو میرے خوابوں کی تعبیر مل

گئی بھائی مگر تم نے سب کچھ گنوا کے بھی کیا پایا؟“

میں نے ایک آہ بھری ”زندگی میں ہر شخص کے تجربات
الگ ہوتے ہیں۔ انہی کو ہم تقدیر کا نام دیتے ہیں۔ ہوش
سنیالنے سے پہلے میں نے بہت کچھ گنوا دیا تھا۔ ماں کی محبت
باپ کی شفقت۔ بچپن کی معصومیت۔ گھر کی چھت کا احساس
تحفظ۔ اپنے رشتے۔ یہ سب کہاں ملا مجھے۔“

”ایسی ہی زندگی کمال نے بھی گزاری اور خود میں نے۔
باپ اسٹور تھا وہ مارا گیا۔ ماں اس کے قاتلوں سے انتقام لینے
میں تو لوٹ کے نہیں آئی۔ اس نے دوسری شادی کر لی اور
اب کچھ پتا نہیں، وہ کہاں ہے۔ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ کیسی
ماں تھی وہ جو مجھے تمہارے خوالے کر گئی اور پھر کبھی خبر بھی
نہیں لی میری۔ تمہیں تو پتا ہی نہیں کہ ماں کون تھی مگر مجھے
معلوم ہے کہ اس نے مجھے کیسے چھوڑا تھا۔ فونوں کی ایک
پوری کے ساتھ۔ وہ نوٹ کام نہیں آئے۔ میں زندہ رہی اس
رشتے کے سارے جس کو تم نے ایک مقدس فرض کی طرح
سمجھا۔ وہ دوئے لگے۔“

میں نے کہا ”تو مت پاگل۔ آج سب کچھ ہے تیرے
پاس۔“

”وہ سب تو تمہارے پاس بھی ہے پھر بھی تمہیں خلا
کیوں محسوس ہوتا ہے اپنی زندگی میں۔ ادھر اکیوں مجھے تو
تم اپنے آپ کو؟“

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ”ایک نہ ایک دن میں اپنے ماضی کا
سراغ ضرور لگاؤں گا۔ اچھا کیا تو نے یاد دلایا۔ کاروبار حیات
کی تک دو میں یہ بات میں کب سے بھولا ہوا تھا۔ میری
زندگی کی کتاب کا پہلا باب کس نے لکھا تھا اور کہاں؟ مجھے
ان کا پتہ چلا یا کیسے بھول گیا۔“

”تم مرد ہو بھائی۔ دنیا کی خاک چھان سکتے ہو۔ تمہارے
پاس صرف خواہش یا ارادہ ہی نہیں، طاقت اور وسائل بھی
ہیں لیکن میں تو بس انتظار کر سکتی ہوں۔ ایک امید کی چنگاری
کو ہواوے کے روشن رکھ سکتی ہوں۔ کہ ایک دن میری ماں
پھر آئے گی۔ اس بچی سے ملنے بہتے وہ فونوں کی ایک پوری پر
بٹھا کے لاوارث چھوڑ گئی تھی اور اس دن میں اسے پہچاننے
سے بھی انکار کر دوں گی۔“

”کیا پتا قمر وہ سامنے آئے بغیر تیرے بارے میں سب
معلوم کر رہی ہو۔“

”کوئی فائدہ نہیں اس خیال سے دل کو بھلانے کا۔ اب
مجھے اس کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ میں نفرت کرتی
ہوں اس سے۔ ایک خواہش ضرور ہے کہ کبھی وہ میری

ضرورت محسوس کرے اور میرے سامنے آئے تو میں ایک
طمانچہ اس کی ماتا کے منہ پر مار کے اس سے بدلے
سکوں۔ وہ بھی تو بدلہ لینے ہی نکلی تھی۔ اس نے ایک لمبی گہری
سانس لی۔“

میں نے اس کے ماتھے پر ہوسہ دیا ”اپنے دل سے یہ زہر
نکال دے قمر میرے دل میں احساس محرومی کا درد ضرور ہے
مگر نفرت کا کوئی کاٹنا نہیں ہے۔ میں بہت پیار کرتا ہوں تجھ
سے۔ یہی ایک نہ نوٹنے والا رشتہ ہے جس پر مجھے بھروسہ ہے
اور خوش نصیب ہے تو کہ تجھے کمال جیسا شوہر مل گیا۔ کسی
نے تجھے چاہا اور اپنا لیا۔ میں بہت بد قسمت رہا اس معاملے
میں۔“

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا ”ایسا کیوں ہے بھائی۔ کیوں ہوا
یہ سب آخر؟ ایسا تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ میرے تصور
میں مستقبل کا یہ نقشہ نہیں تھا جو آج نظر آتا ہے۔ تم نے
چندا کو بھی گنوا دیا ہے۔“

”شاید۔“

”شاید کی بات نہیں۔ اس سے مل لو مگر کوئی بات مت
کرنا اس سے اور دکھ ہوگا تمہیں۔“

میں نے سرھلایا ”آج اس کا شمار کر کے نکل گیا۔ میں
جتنا مایوس تھا اس سے زیادہ احساس جرم کا شکار تھا۔ یہ خیال
میرے لیے روح کا آزار بن گیا تھا کہ میں نے صرف اپنی ہی
نہیں، چندا کی زندگی بھی برباد کی۔ آج جو کچھ ہو رہا تھا وہ سب
میری ایک غلطی کا شاخسانہ تھا۔ فون کرنے والی گناہ عورت
کو یہ موقع میں نے ہی فراہم کیا تھا کہ وہ جذبات کے رشتوں
کی کمزور پر جانے والی زنجیر کو بالکل منقطع کر دے۔ چندا کے
دل میں بدگمانی کا بیج بونے والا میں خود تھا۔ اپنے گھر کو بے
آسرا میں نے چھوڑا تھا۔ آج اس پر آسیب کا قبضہ تھا تو یہ
غلطی کس کی تھی۔ خالی گھر میں بیٹھوں کا ذرا ہونا ہے۔ کیا یہ
بات مجھے معلوم نہیں تھی۔ لوگ خالی گھر کی کھڑکیاں
دروازے۔۔۔ کیا دیواروں کی آخری اینٹ تک نکال لیتے
ہیں مگر میں نے کب یہ سوچا؟

کمال کسی انتظامی مسئلے میں کون کے ساتھ میٹنگ میں
مضروف تھا۔ چندا کو میں نے خان جی کے کمرے میں کچھ دیر
بعد دیکھا۔ جب میں کمرل خان دی گریٹ کے بے حس و
حرکت اور زندہ لاش جیسے وجود کے سامنے شرمسار کھڑا
انہیں آخری بار دیکھ رہا تھا۔ وہ عظیم روایات کی حامل
شخصیت کی سرانجام عمارت تھی جو گرتے گرتے ایک کھنڈر
میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اس کھنڈر کی دیواریں بھی لرز رہی

مداری ☆ 96 ☆ ساتواں حصہ

مداری ☆ 97 ☆ ساتواں حصہ

☆ ساتواں حصہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھیں اور آنے والے کسی بھی لمحے کا خفیہ سا جھکا انہیں
زمن بوس کر سکتا تھا۔ وہ ایک محل تھا جو مقبوضہ بن گیا تھا۔
چندا مجھے دیکھ کر سرد مری سے مسکرائی ”کیا حال ہے
ناصر؟“

”میں نے کہا“ چھا ہوں، تم لندن جاری ہو؟“
اس نے سپاٹ لہجے میں کہا ”ہاں۔ ٹھیک سنا ہے تم
نے“

”بے کسی کزن کے پاس؟“
”پس مگر اس کے بارے میں تمہارے کسی سوال کا
جواب نہیں دوں گی میں“ چندا نے میری آنکھوں میں
آنکھیں ڈال کے کہا۔

”تم ہمیشہ کے لیے جاری ہو؟“ میں نے کہا۔
”ہمیشہ کے لیے خان جی جا رہے ہیں اور میں انہیں نہیں
روک سکتی۔“

”جیسے میں تمہیں نہیں روک سکتا؟“
”ہاں۔ اختیار نہ تمہارے پاس ہے اور نہ میرے پاس“
اس نے سختی سے کہا۔

”پھر تم لندن کیوں جاری ہو؟“ میں نے کہا۔
”ناک میں زیادہ سے زیادہ مہلت حاصل کر سکوں خان
جی کے لیے۔“

میں نے کہا ”یہ جانتے ہوئے بھی کہ موت کا ایک
دن معین ہے۔“

”امید کا جھوٹا سارا بھی ٹھکرایا نہیں جاسکتا۔ خواہ
سارا دینے والا کوئی ایجنسی ہی کیوں نہ ہو“ وہ بولی۔
”قرعے بتایا ہے کہ تم واپس نہیں آؤ گی؟“

اس نے عجیب سے لہجے میں کہا ”قرعہ چاہے کے جو
چاہے سمجھے۔“

”اپنے آپ سے بھاگ کے کوئی کہاں جاسکتا ہے؟ کبھی
یہ بھی سوچا ہے تم نے؟“ میں نے برہمی سے کہا۔

”تم صرف اپنے لیے سوچو۔ یہ مت سوچو کہ دوسرے
کیا سوچتے ہیں اور میرے بارے میں تو سوچنے کی زحمت بھی
نہ کرنا کیونکہ میں نے بھی تمہارے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا
ہے۔ مجھے تیاری کرنی ہے سفر کے لیے۔ تم چاہو تو یہاں روک
کے کسی مجرے کا انتظار کر سکتے ہو۔ شاید پھر خان جی تمہارے
لے ہو ش میں آ کے کوئی سفارش کریں“ وہ جلی اور باہر نکل
گئی۔

اس کے تلخ زہر میں مجھے ہوئے الفاظ کا شتر میرے دل
میں پیوست ہو گیا۔ قرعے ٹھیک کہا تھا۔ اب چندا سے کچھ

بھی کمنا لا حاصل تھا۔ لندن یا نیویارک صرف مسافروں کے
نام ہیں جو آج کی دنیا میں اتنی سست گئی ہیں کہ زمین ایک
گلوبل ویج ہو گئی ہے لیکن جو دل سے دور ہو جائے وہ واقعی
دور ہو جاتا ہے اور جب دلوں میں دوری ہو تو ایک گھر کی
چھت کے نیچے رہنے والے بھی کبھی نہیں ملے۔

میں کچھ دیر خان جی کے قدموں کی جانب خاموش کھڑا
رہا۔ ایسا ہی ایک موقع تھا جب خان جی نے اچانک آنکھیں
کھول کے مجھ سے کہا تھا کہ انہوں نے مجھے معاف کیا مگر چندا
نے میری بات پر آج تک یقین نہیں کیا تھا اور ہمیشہ ہی کہا تھا
کہ میں نے جھوٹ بول کے اس کے دادا کا نام لیا اور اس کا
جذباتی استحصال کرنا چاہا۔ آج وہ مجھے اسی بات کا طعنہ دے
گئی تھی۔

ان چند لمحوں میں جو میں نے اپنی تنہائی کے ساتھ خان
جی کے ساتھ گزارے میری زندگی کا پورا ایک دور ناست
فائدہ دیکھنے والی فلم کی طرح تصور کے پردے پر عکس بناتا
گزر گیا۔ اسی دور کی یادوں کا کوئی حساب نہیں تھا مگر ایک
قرض ضرور تھا جس کا بار مجھے آج پہلے سے کہیں زیادہ محسوس
ہو رہا تھا۔ میں اس بار کے نیچے دبا ہوا تھا مگر یہ بار میرے لیے
باعث آزار نہیں وجہ افتخار تھا۔

دل ہی دل میں خان جی سے اپنی نادانیوں کو تابیوں
اور گستاخیوں پر معافی مانگ لی اور اگرچہ خان جی نے پلٹ بھی
نہیں جھپکائی اور شاید کچھ سنا بھی نہیں۔ محسوس بھی نہیں کیا
مگر مجھے ایک طمانیت ملی کیونکہ یہ صرف میں جانتا تھا کہ
دانستہ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا اور ناصر عظیم آج بھی خان
اعظم کی مہربانیوں کے ٹھیل ہی ناصر عظیم تھا۔

مجھے تو ہنرمند ہاتھوں کے کمال فن نے حسن و خوبصورتی
عطا کر دی زندگی میں وہی ملی ہوں جس کا میں بنا ہوا ہوں۔

میں نے آخری بار خان جی کو خدا حافظ اور الوداع کہا
اور ان پر آخری غمخورد گزری خواستگار نگاہ ڈالی۔ مجھے معلوم
تھا کہ پھر یہ صورت میں صرف خوابوں میں دیکھوں گا۔ ان
کے اور میرے راستے اس دنیا میں کہاں مل کے ایک ہوئے
تھے اور کہاں پھر الگ ہو رہے تھے۔ ایک نیک سیرت، نیک
نیت اور نیک نظر انسان کو الوداع۔ ایک شفیق باپ، ایک فراخ دل
حق پرست مجاہد کو الوداع۔ ایک مخلص دوست کو الوداع۔ خدا تم پر اپنی
رحمتوں کے سارے دروازے کھولے۔

نہ روئے کی پوری کوشش کے باوجود واپسی میں میرے
آنسو مجھے بتائے بغیر خاموشی سے اور مسلسل آنکھوں میں
آتے رہے اور مجھے یوں لگا جیسے میں دبا پر غیر میں ایک اجنبی
ہوں اور اکیلا ہوں۔ قرعے ٹھیک کہا تھا۔ اس وقت کے
ساتھ سب کچھ بدل گیا ہے۔ کچھ بھی نہیں رہا ہے کہ جو تھا۔
وہ بچے میں واپس پہنچا تو ریس اداس، لمبوتر چرو
لٹکائے ساری دنیا سے بیزار بیٹھا تھا۔ جیرا چلا گیا تھا اور جنم
بند کر کے میں سوئی کا انتہو پور کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کے ریس
اپنی پریشانی اور ناراضی بھول گیا اور اس کا چرو ایک سوالیہ
نشان بن گیا۔

”ابے کیا ہوا ہے؟ تو رو رہا ہے پارے کیا بہت ہے
عزت کیا اس نے تجھے چل چھوڑا یا عزت تو سالی ہاتھ کا
میل ہے۔ آئی جانی چیز ہے۔ وہ کیا فرمایا ہے اپنے علامہ
صاحب نے کہ ایک کھونٹا کھو گیا ہے تو کیا، روئے پیٹنے کی
جگہ اور بھی ہے۔“ وہ مجھے نکل دینے لگا۔

اداس اور غم زدہ ہونے کے باوجود مجھے ریس کی بات
نے مسکرائے پر مجبور کر دیا۔ اگر کھو گیا اک نہیں تو کیا غم
مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں۔ اس شعر کا مطلب اس نے
ضرور سنا دیا تھا مگر شعر کی مٹی پلید کر دی تھی۔

میں نے کہا ”یار ریس! آج میں سب کچھ چھوڑ آیا
ہیش کے لیے۔“

”ایسے پسلیاں مت بھا۔“
میں نے کہا ”سب ختم ہو گیا۔ خان جی کو چندا اکل صبح
علاج کے لیے لندن لے جا رہی ہے مگر علاج صرف بہانہ ہے۔
اصل میں تو وہ یہاں سے جانا چاہتی تھی۔ ہمیشہ کے لیے خان
جی کی مٹی بھی پرانی ہو جائے گی۔ حالانکہ اس جیلے سپاہی پر
اس زمین کا حق پہلے تھا مگر چندا کو کون سمجھائے اس نے
کبھی واپس نہ آنے کا طے کر لیا ہے۔“

”یہ تو بڑا غلط فیصلہ کیا اس نے پارا۔“
”ہاں مگر وہ اس کا قانونی حق رہتی ہے۔“ میں نے سختی
سے کہا ”اسے کون روک سکتا ہے؟“

فون کی گھنٹی پر ریس نے ریسور اٹھایا اور مجھے تھمادیا
”کمال ہے۔“

میں نے کہا ”کمال۔ سوری یا تو میٹنگ میں تھا۔“
کمال نے کہا ”یہاں بہت بڑی خبر ہے۔ تمہارے لیے۔“
”صرف میرے لیے؟“ میں نے متنبہل کے کہا۔

”نہیں۔ ابھی کسی کے لیے بھی نہیں ہے، خان جی
گزر چکے۔“

”اللہ وانا لہ راجعون“ میں نے بے اختیار کہا۔
”اوتکتی دیر ٹھہرا تھا ان کے پاس؟“
”شاید دس منٹ۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں۔ دراصل ان
سے جدا ہوتے وقت میں بہت جذباتی ہو گیا تھا۔ پرانی باتیں
یا دہرائی تھیں۔“

کمال نے کہا ”چندا اسے تحریر بات ہوئی تھی؟“
”ہاں۔ مشکل سے دو منٹ پھر وہ سفر کی تیاری کے بہانے
چلی گئی تھی۔“

کمال بولا ”تو وہیں تھا اس وقت؟“
”ہاں۔ آخر تو کیا کتنا چاہتا ہے؟ یہ جرح چہ معنی دار ہے؟“

اس نے قدرے توقف سے کہا ”دراصل۔ جب چندا
۔ واپس آئی۔ تقریباً دس منٹ بعد۔ تو خان جی نہیں رہے
تھے ان کی سانس اور دل کی دھڑکن رک چکی تھی۔ مصنوعی
طریقے سے دل کی حرکت اور تنفس بحال کرنے کی کوشش
ضرور کی، ہم نے مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔“

میں نے کہا ”بس یا۔ کبھی نہ کبھی یہ ہونا تھا۔ تو جانتا
ہے، ان کی ہر سانس آخری سانس ہو سکتی تھی۔“
وہ پھر کا ”چندا کہتی ہے کہ جب وہ مٹی تو خان جی زندہ
تھے۔“

میرا دل ڈوبنے لگا ”ہاں۔ ہوں گے۔“
”ہوں گے نہیں۔ یقیناً تھے چندا نے تمہارے سامنے
ان کی نبض دیکھی تھی۔“

”ہاں دیکھی تھی۔ پھر؟ کیا وہ سمجھتی ہے۔“ آواز
میرے حلق میں پھنس گئی۔

”ہاں۔ آئی ایم سوری۔ وہ ایسا ہی سمجھتی ہے۔ باہل
ہو گئی ہے وہ۔“ کمال نے بڑے دکھ سے کہا۔
”وہ سمجھتی ہے میں نے مار دیا خان جی کو؟“ میں نے چیخ
کے کہا۔

”چلانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ دنیا میں کوئی نہیں جو اس
پر ایک فیصلہ بھی یقین کرے مگر۔“

”مگر کیا۔ وہ پولیس کیس کرنا چاہتی ہے مجھ پر؟ الزام
عائد کرنا چاہتی ہے کہ میں نے اس کے دادا کو قتل کر دیا۔“

”اب اسے کون سمجھائے میں نے بڑی کوشش کی۔ یہ
سراسر دباؤ تھی ہے۔ ان کا آخری وقت آیا تھا۔ چندا وہاں
ہوئی تب بھی یہی ہوتا۔ اب یہ ایک افسوس ناک اتفاق ہے
کہ وہاں تو تھا اور خود بچتا نہیں چلا۔“
”اسے کہ دو کہ بلائے پولیس کو۔ لگا دے مجھ پر خان جی
کے قتل کا الزام۔ جیل بھجوانے مجھے چھانی دلاوے

مجھے۔ اگر اس کے دل کو اسی سے سکون ملتا ہے۔ اگر ایسے ہی خان جی کی روح کو قرار مل سکتا ہے تو میں خود کو پولیس کے حوالے کرنے آتا ہوں۔ میں اعتراف جرم بھی کروں گا۔"

میں نے دباؤں مار مار کے دوتے ہوئے کہا۔

"ناصر۔ ہوش میں آ۔ بے وقوفی کی بات مت کہ۔ میرا مقصد تجھے سمجھانا تھا۔ اسے ہم سنبھال لیں گے۔ کچھ بھی نہیں کرنے دیں گے مگر تو یہاں مت آنا۔ اس کے سامنے مت جانا۔"

صدے کے ساتھ مجھے کی انتہا نے مجھے پاگل کر دیا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ اس وقت رئیس اور ختم مل کے مجھے نہ سنبھالے تو نہ جانے میں کیا کرگزرتا۔ چندا کی بات نے مجھے اتنی اذیت پہنچائی تھی جو میری برداشت سے باہر تھی۔ میں اس وقت بھی اتنا ضرور سمجھتا تھا کہ یہ حرکت اس نے جانتے ہوئے کی ہوگی لیکن مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ مجھ سے نفرت کی انتہا میں چندا اتنا کر سکتی ہے۔ باپ کی شادی ترین روتھل ایک غریبی سوچ بن کے ہی سامنے آتا ہے جب آدمی یہ طے کر لیتا ہے کہ ہم تو ذہب ہیں صم تم کو بھی لے ڈوئیں گے۔ وطن کے تعلیم سبھی نے ایک آزاد ملک کے فیور شری کے اور مودومین نے پاکستان کی سرزمین کے سوا کس بھی دفن ہونا قبول نہیں کیا تھا۔ بے شک یہ فیصلہ خود اختیاری نہیں تھا۔ شاید یہ انتظام غیب ان کی کسی خواہش اور دعا کی قبولیت کا نتیجہ تھا۔ اس شام انہیں میانی صاحب کے قبرستان کے ایک پرسکون گوشے میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

میں اس وقت وہاں موجود تھا اور ان کے جسد خاکی کو گھڑ میں اتارنے والا بھی میں تھا۔ مجھے یہ موقع کمال نے فراہم کیا تھا حالانکہ وہاں سابق اور حاضر سروس اعلیٰ فوجی افسران بھی تھے اور معززین شری بھی۔ ان کی تدفین سرکاری فوجی اعزاز کے ساتھ یقیناً نہیں کی گئی کیونکہ نہ وہ کوئی جنرل تھے اور نہ انہیں محاذ پر شہادت کی سعادت حاصل ہوئی تھی لیکن میں سمجھتا ہوں کہ انہیں پیش کیا جانے والا جذبات کا آخری خراج تحسین کسی طور کم نہیں تھا۔

رات کو قمر نے مجھے فون کیا "بھائی۔ آپ رونا مت۔" میں نے کہا "خان اعظم کہتے تھے، یہی یقین کرتے تھے کہ میرے لیے کبھی مت رونا۔"

"ہاں۔ قمر رونے لگی۔"

"THE SHOW MUST GO ON"

"زندگی کے کارواں کو آگے بڑھتے رہنا چاہیے" وہ بولی۔

میں نے کہا "چند اکا کیا حال ہے؟"

"ٹھیک ہے بھائی۔ اپنے کارنرز میں اکیلے گم صم بیٹھی تھی۔ اس نے ہمارے لیے کبھی دردناک نہیں کھولا۔ کمال دیوار کے اوپر سے صم میں کود گئے۔ میں نے بست کو شش کی کہ وہ کچھ کھالے گروہ کپڑے بدل کے اسپتال چلی گئی۔ ناشتہ شفت بھی آج اس کی۔"

میں نے کہا "چلو اچھا ہے" اس کا پلان کیا ہے اب؟

"کچھ نہیں۔ لندن سے اس کے کزن نے فون کیا تھا۔ معلوم نہیں اس نے کیا جواب دیا۔ اب کیا کرے گی وہ لندن جا کے بھائی لیکن کچھ پانس وہ چلی جائے۔ اس کے دماغ کا حال ایسا ہی ہے۔ بھائی، مجھے نیند نہیں آ رہی تھی اس لیے تمہیں فون کر دیا۔ اب تم بھی سو جاؤ۔"

"شب بخیر۔ تو بھی اب مت جاگنا۔" میں نے ریسور دکھ دیا۔

اس رات مجھے سوئے کی جدوجہد میں ناکام ہو کے سکون آور گولیوں کا سہارا لیتا ہوا۔ میرا ذہنی اشتہار اندر سے اٹھنے والے ایک ایسے شور کی طرح تھا جو ناقابل برداشت حد تک دماغ خراب کرنے والا تھا۔ صبح میں دیر تک سوتا رہا اور جب جاگا تو میری حالت بست بہتر تھی۔ ختم وہیں صوفے پر بیٹھی چائے پی رہی تھی اور اخبار دیکھ رہی تھی۔

"تم یہ کیوں؟ میں چائے لاتی ہوں تمہارے لیے۔"

اس نے اخبار مجھے تھما دیا۔

"کیا کوئی خاص خبر ہے؟"

"ہاں۔ تلاش کرلو" وہ بولی۔

خبر میں نے کسی دشواری کے بغیر تلاش کر لی کیونکہ اس کے ساتھ ایک تصویر بھی تھی۔ تصویر میں شاہ عالم کسی کارواں فرنگی حینہ کی بانسوں میں بائیں ڈالے کھڑا تھا۔ اس نے سیاہ سوٹ پہن رکھا تھا اور اس کے ساتھ کھڑی ہوئی لڑکی لباس عروسی میں تھی۔ اس کے ساتھ ہی مختصر خبر تھی کہ لیجے ایف کے سابق چیرمین شاہ عالم نے لندن کی ایک فلمی کرسٹوفر سے شادی کر لی ہے۔ وہ کچھ عرصے سے تقریبات میں ایک ساتھ دیکھے جا رہے تھے۔ خبر میں دیگر تفصیلات عدم نہیں دی گئی تھیں کہ شادی کب اور کہاں ہوئی اور کس مذہب کے رسم و رواج کے مطابق ہوئی۔ اگر اس ماڈل نے نکاح کی خاطر اسلام قبول کیا تھا تو اس کا اسلامی نام کیا رکھا گیا۔ شرکا کون تھے وغیرہ وغیرہ۔

ختم چائے لے کر آئی تو میں نے کہا "بی بی نے تو کمال کر دیا۔"

"میں تعریف کروں گی اس کی تو تم جلو گے۔ وہ ہے ہی کمال کا لڑکا۔ کل اس نے صبح مجھے تصور دکھائی تھی۔ میں نے خبرنا کے اسے دی اور اس نے ہر جگہ لگا دی۔ اب تک ملک رب نواز نے بھی دیکھی ہوگی۔"

"اب کم سے کم وہ رخصتی کو ریشان نہیں کرے گا۔ فون پر اس سے نہیں پوچھو گا کہ شاہ عالم کہاں ہے۔ فون پر مجھے یاد آیا۔"

"کیا یاد آیا۔ جب کیوں ہو گئے؟"

میں نے کہا "کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں بتاؤں یا نہ بتاؤں۔ رئیس کہاں ہے؟"

"سوئی کو عمران خان سے ملوانے لے گیا ہے اور مرغبازی کی تاریخ میں اپنی فتوحات کے کارنامے ساربا ہے۔"

"سوئی یہیں ہے ابھی تک؟"

"وہ کہاں جا سکتی ہے اسے پورا یقین ہے کہ اب تک اس کی گرفتاری کے وارنٹ نکل چکے ہوں گے۔ پولیس اس کی تلاش میں چھاپے مار رہی ہوگی۔"

"گھر کہاں ہے اس کا۔ ماں باپ اور بہن بھائی تو ہوں گے؟"

ختم نے نفی میں سر ہلایا "وہی ایک بہن تھی جس کی شادی خٹکے سے کوئی گئی تھی۔ اس کی مرضی کے خلاف۔ بچا کی دوسری بیوی ہے۔ نکاح اس کا کزن تھا۔ سات سال پہلے ماں باپ کسی شادی میں شریک ہونے گئے تھے۔ اور لوڈنگ کی وجہ سے بس بے قابو ہو کے نہر میں گر گئی تھی۔ کچھ لوگ بچے بچا لے چکے تھے مگر سوئی کے ماں باپ ان میں شامل نہیں تھے پھر ایک بد قسمتی کا دور آیا۔ بچانے ان کے مکان پر قبضہ کر لیا۔ سوئی اپنی بہن کے مقابلے میں ذرا باغی فطرت رکھتی تھی اس لیے چچا کی نہیں چلی ورنہ اس کی شادی بھی کسی سے زبردستی ہو جاتی۔"

"اس نے کھا شکوف کیسے اٹھائی؟"

"یہ سب لمبی کہانی ہے۔ تم خود اسی سے منٹا۔ پہلے مجھے بتاؤ تم کس فون کی بات کرنا چاہتے تھے؟"

میں پھر تذبذب میں پڑ گیا لیکن ختم کے اصرار پر مجھے بتانا پڑا کہ کوئی عورت کئی مہینے سے چندا کو فون پر کیا بتاتی رہی ہے۔

ختم نے کسی رد عمل کا اظہار کئے بغیر ساری بات سنی "تم کیوں شش و پنج کا شکار تھے۔ یہ سب مجھے بتاتے ہوئے کیا سوچ رہے تھے؟"

"کچھ نہیں۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ عورت کون تھی؟"

"وہ میں تھی۔" ختم نے کہا "میرے علاوہ کون ہو سکتا ہے؟"

"اگر میں جذبات کو دیکھوں یا پولیس کی نظر سے دیکھوں تو ذہن میں یہی خیال آتا ہے مگر عقل یہ بات نہیں مانتی۔ میں نے کہا۔"

"تم سمجھتے ہو میں ایسا نہیں کر سکتی؟"

"مجھے یقین ہے کہ تم بھی ایسا نہیں کرو گی۔ تمہاری فطرت اور کردار کے ساتھ ایسی حرکت کوئی مطابقت نہیں رکھتی۔"

"اتنا بھروسہ ہے تمہیں مجھ پر؟" اس کا چہرہ اندر کی خوشی سے دھنک لگا۔

"ہاں۔ چنانچہ اس کے بعد رخصتی کا خیال آتا ہے۔ تمہارے علاوہ اس کو ہر بات معلوم ہوتی تھی مگر اس کو کیا ضرورت تھی۔ کیا فائدہ حاصل ہو سکتا تھا اس سازش سے۔ اس کا تو کوئی تعلق ہی نہیں چندا کے معاملات سے۔"

"تیسری عورت کوئی نہیں؟"

"مجھے تو نظر نہیں آتی۔ سوچ سوچ کے میرا دماغ ماؤف ہونے لگا ہے کہ یہ کاربیر کس نے کیا۔ اس نے جو کما وہ جھوٹ نہیں تھا مگر اتنا بچ بولنے کا مقصد چندا کی بدگمانی کو نفرت میں بدلنے کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ اب تو وہ میری صورت بھی دیکھنے کی روادار نہیں۔"

"سارا شک مجھ پر جانا چاہیے لیکن ناصر تمہارے اور اپنے درمیان کسی دوسری عورت کے آجانے سے مجھے کبھی فرق نہیں پڑا۔ مجھے رخصتی سے کبھی بھی حسد یا جھل نہیں ہوئی۔ اگر تم رخصتی کی جگہ چندا کو دے دیتے تو میں کوئی شکایت نہیں کرتی۔ تم جانتے ہو کہ میں نے کبھی تمہیں پابند نہیں کیا۔ ہاں میں خود اپنے طور پر پابند ہوں۔"

میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا "کوئی صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے سب معلوم ہے۔ ہاں یہ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ چندا کا دل اتنا تنگ ہے۔ ایسی نوبت پہلے کبھی آئی ہی نہیں تھی۔ میں نے اور کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ میرا مطلب ہے جب تک میں ناصر عظیم تھا میں پہلے صرف شاد کا تھا پھر چندا کا ہو گیا۔ جب شاہ عالم بنا تو چندا کی محبت نقش پر آب ثابت ہوئی۔"

ختم کچھ الجھن میں پڑ گئی "لیکن چندا کو یہ کہاں معلوم تھا کہ تم دہری زندگی گزار رہے ہو۔ یہ بات رخصتی کے علم میں

بھی نہیں تھی۔“

”ہاں اور جب یہ راز کھلا تو ان دونوں نے مجھے اپنی اپنی زندگی سے خارج کر دیا۔ یہ غالباً پروین شاکر کا شعر ہے۔ وہ جہاں بھی گیا لوٹا تو مرے پاس آیا۔ بس یہی بات ہے اچھی مرے بھائی کی۔ لیکن چنداں ایسا نہیں سمجھا۔ اس نے لوٹ کر آنے والے ناصر عظیم کو پچھانے سے بھی انکار کر دیا۔ خیر! اسے کیا سمجھا جاسکتا ہے نوشتہ تقدیر کے سوا۔ رہی سہی کسر اس مہیاں نے پوری کر دی جو اسے فون پر میرے بارے میں وہ باتیں بتاتی رہی جو کسی بھی عورت کی محبت کو نفرت میں بدلنے کے لیے کافی تھیں۔ چنداں پہلے ہی میری محبت کو دل سے نکال چکی تھی۔ یہ میری زندگی کا ایک اور باب تھا جو آج بند ہوا۔“

”ختم نے دانستہ موضوع بدل دیا۔ تم نے اخبار دیکھا؟“

”ہاں۔ بس کے ہائی چیک ہونے کی خبر کل مجھے نظر نہیں آئی تھی۔“

”ختم بننے لگی۔“ مع دو ڈھائی بجے کا واقعہ کل صبح کے اخبارات میں کیسے خبریں سن سکتا تھا۔ ایک ایونگ پیپر نے رپورٹ دی تھی۔ باقی اخبارات نے اندر کے صفحات پر آج دی ہے۔ چوتھے صفحے پر۔“

میں نے تلاش کی تو تقریباً ہر اخبار میں ایک ہی تصویر کے ساتھ مجھے پوری خبر مل گئی۔ تصویر میں بس کا جلا ہوا ڈھانچا نظر آ رہا تھا۔ رپورٹر نے کچھ مسافروں کے تاثرات بیان کیے تھے۔ پولیس نے کلینر کو مبینی شاید کے طور پر پکڑ رکھا تھا اور اس پر ٹھیکے کے قتل کا الزام بھی تھا۔ ملک رب نواز نے اسے اپنے سیاسی دشمنوں کی سازش قرار دیا تھا مگر پولیس نے ذاتی دشمنی کو اس واردات کا سبب بتایا تھا۔ آگے وہی تھا کہ پولیس نے فلاں فلاں دفعہ کے تحت نامعلوم افراد کے خلاف ملک رب نواز کی مددیت میں مقدمہ درج کر لیا ہے۔ تفتیش جاری ہے اور سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے۔ وغیرہ۔

میں نے کہا ”ملک نے ٹھیکے کے انتقام کا معاملہ گول کر دیا۔“

”یہ کیا نامعلوم حملہ آور ہو گیا۔ اگر ملک صاحب اسے شناخت کرتے یا کلینر دیوانہ اس کا نام لیتا تو پھر پائی کمائی کے منظر عام پر آنے کا خدشہ تھا کہ ٹھیکے نے یہ انتقامی کارروائی کیوں کی آخر؟ اس کی سالی نے اس کا ساتھ کیوں دیا؟“

”یعنی سالی کا شکوف والی۔ اب قانونی طور پر محفوظ ہے۔“

”لیکن ملک رب نواز کے عتاب سے نہیں۔ اسے قانون نہیں ملک خود سزا دے گا۔ یہ زیادہ خطرناک بات ہے۔“

”ختم سوچ میں پڑ گئی۔ ہم اسے کب تک بچا سکتے ہیں اور کیسے؟“

”کوئی بھی کسی کو بچانے کا دعویٰ کیسے کر سکتا ہے۔ بچانے والا تو اوپر بیٹھا ہے۔ میں نے کہا ”افسوس یہ ہے کہ ہمارا مشن ناکام رہا۔“

”ایسا مت کہو۔ ناکام صرف ایک کوشش ہوئی ہے۔ بہت سوچ کے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ملک رب نواز سے ملاقات اب ناگزیر ہو گئی ہے۔ میں آج ہی ملوں گی اس سے۔“

”ختم نے کہا۔“

”میں چونک پڑا۔ تم اپنی جاؤ گی؟“

”مجھے خوشی ہو گی اگر تم بھی ساتھ چلو۔“ وہ بولی۔

”یہ اچانک فیصلہ؟“

اس نے میری بات کاٹ دی ”اچانک نہیں۔ حالات رفتہ رفتہ ایسے موڑ پر آ گئے ہیں کہ میں ایک اخبار نویس کی حیثیت سے ملک رب نواز کو شرفِ ملاقات بخش سکتی ہوں۔ بہت سی باتیں وضاحت طلب ہیں۔“

”ہو سکتا ہے وہ انکار کر دے۔“

وہ ہنسی ”بالکل ہو سکتا ہے مگر ہو گا نہیں۔ ہم اخبار دانوں کی بھی ایک چھٹی حس ہوتی ہے جو ہمیں بتاتی ہے کہ اب ہم مداری اک کھیل شروع کر سکتے ہیں اور اچھے بھلے آدمی کو بچہ جمورا بنا سکتے ہیں۔ صحافت کی سند تو ہمارے ہاتھ میں ہر وقت رہتی ہے۔ مداری کی ڈگڈگی کی طرح۔ جب کھیل شروع کرنا ہو تو ہم پبلک کو متوجہ کرتے ہیں جیسے مداری مجمع لگاتا ہے پھر بچے جمور سے معاملات شروع کرتے ہیں اور بڑے بڑے چالاک زمانے کو الو سمجھنے اور بنانے والے ان سوالوں کے جواب دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ پبلک کو برا مزہ آتا ہے جب حکومت کی ٹانگ کھینچی جائے کسی توپ قسم کے یو رو کرٹ کا کچا چٹھا سامنے آئے؟ کسی وزیر سفیر کے بارے میں سنسنی خیز انکشافات ہوں۔“

میں نے دلچسپی سے کہا ”اچھا۔ یہ بات ہے تو شروع کرو اپنا کھیل۔“

”ابھی نو۔“ ختم نے کہا ”ادھر آ جاؤ۔ یہاں دوپٹہ فری ٹیلی فون سیٹ ہے۔ تم دونوں طرف کی گفتگو سن سکو گے۔“

ختم نے ملک رب نواز کا ریموٹ نمبر ملایا ”ملک رب نواز صاحب بول رہے ہیں۔ سلام“

”ملک نے کہا ”وعلیک السلام“ آپ کی آواز سے ہم پہچان تو گئے ہیں مگر نام نہیں آ رہا ذہن میں۔“

”دماغ پر زیادہ زور نہ ڈالیں۔ پبلک پر اپنی ہے۔ میں ختم بول رہی ہوں۔“

”اچھا اچھا۔“ لوتی۔ یہ تو کمال ہو گیا۔ ہم بھی سوچ ہی رہے تھے کہ بہت دن ہو گئے اخبار والے دوستوں سے ملاقات کیسے کسی دن ہمارے ساتھ جائے گی۔“

ختم نے کہا ”کسی دن کیا ملک صاحب آج کیوں نہیں؟“

”وہ بات یہ ہے کہ سب کو پہلے سے بتانا پڑتا ہے۔“

ملک نے خوش اسلوبی سے ختم کو ٹالنے کی کوشش کی۔

”میں صرف اپنی بات کر رہی تھی۔ دراصل آج صبح کا اخبار دیکھا تو آپ کی تصویر نظر آئی اور پھر ایک افسوسناک خبر کسی نے آپ کی کوئی جانے والی بس کو اغوا کر لیا اور پھر آگ لگا دی۔“

”بس جتنا ہے یہ تو چلتا ہے اپنے ملک کی سیاست میں۔ حالانکہ ہم کسی کے ساتھ ذاتی دشمنی کے قائل نہیں مگر ہمارے بھی ہیں مہیاں کیسے کیسے۔ لاکھوں کا نقصان ہوا ہمارا۔“

”آج دس لاکھ کیا ہیں آپ کے لیے ملک صاحب! اور پھر اصل نقصان تو ہوا انشورنس کمپنی کا۔ آپ نئی بس خرید لیں گے۔ یہ کہہ کر رقم سے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر آپ دیکھو مسافروں کا کتنا نقصان ہوا۔ وہ سب ہم کو پورا کرنا پڑے گا۔ وہ بیمہ کمپنی کیوں دے گی۔ اور ابھی قانونی مسائل میں ہمارا کتنا وقت ضائع ہو گا۔“

”آخر کون ہو سکتے ہیں آپ کے یہ دشمن۔؟“

وہ مشتعل ہو گیا ”کوئی“ اس کا پتا چل جائے تو ہم ان کا جینڈہ بھاڑیں۔“

ختم نے کہا ”میرا خیال ہے کہ میں آپ کی مدد کر سکتی ہوں اس معاملے میں۔“

”آپ آپ کو معلوم ہے کچھ؟“

ختم نے کہا ”ایک بات بتانا چاہتی ہوں میں۔ جو آپ کے لیے بہت اہم اطلاع ہوگی۔ کل آئس میں ایک پارسل موصول ہوا تھا۔“

”اخبار کے دفتر میں؟“

”جی۔ پارسل میرے نام پر تھا۔ میں اپنے ساتھ لے آئی تھی۔ ابھی ذرا فراغت ہوئی تو میں نے اسے کھولا۔“

ملک نے کہا ”ایسے پارسل خطرناک بھی ہو سکتے ہیں! مداری ☆

بی! ”بالکل ہو سکتے ہیں مگر اس کے وزن سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس میں ہم نہیں ہو سکتا۔ اس میں کچھ تصویریں تھیں۔“

”تصویریں؟“ میری۔ ”ملک شاید غلط قسم کی تصاویر کے خیال سے پریشان ہو گیا۔“

ختم ہنسی ”آپ کی ہوتیں تو ہم شائع کرانے کی دھمکی دیتے۔ کچھ مال وصول کرتے آپ سے۔“

”ادنیٰ مال کیا آپ سے زیادہ ہے۔ آپ ویسے ہی حکم کر دے۔“

ختم نے کہا ”وہ تصویریں رنگین تھیں۔ کسی نے بڑی مہارت سے بنائی تھیں۔ میری سمجھ میں تو کچھ آیا نہیں ان کو دیکھ کر لیکن ابھی ابھی کسی نے مجھے فون کیا۔ مجھ سے پوچھا کہ تصویریں دکھ لیں آپ نے؟“

”اچھا کون تھا فون کرنے والا؟“

”یہ تو نہیں بتایا اس نے وہ فون کرنے والا نہیں فون کرنے والی تھی۔“

ملک نے کہا ”کوئی زمانی تھی؟“

”ہاں جی۔ کوئی عورت تھی۔ بچے سے پختہ عمری اور تعلیم یافتہ لگتی تھی۔ مجھ سے انگریزی میں بولتی رہی۔ اس کے سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ کیا یہ تصویریں تم نے بھیجی تھیں۔ اس نے کہا کہ آپ کی سمجھ میں کچھ آیا؟ میں نے کہا کہ میں انہی تصویروں پر غور کر رہی تھی۔ پتا نہیں کیا چیزیں ہیں۔ وہ بولی کہ یہ نوادرات ہیں۔“

”نوادرات۔“ ملک کا چونکا ایک فطری بات تھی۔ ”ہاں جی۔ اس نے کہا کہ یہ کچھ پرانی تاریخی چیزیں ہیں۔ ملک رب نواز کی جس بس کو کوئٹہ جاتے ہوئے اغوا کیا گیا اور آگ لگادی گئی۔ یہ چیزیں اسی بس سے اسمگل کی جا رہی تھیں۔“

”یہ۔ یہ کیا بوس کی اس نے؟“ ملک بولا۔ ”اس نے کہا کہ اور بہت سے لوگوں کی طرح ملک رب نواز بھی اسی بس سروس کو اسمگلنگ کے لیے استعمال کرتا ہے۔“

”اس الو کی بھیجی سے کتنا تھا کہ یہ بات ہم سے ہمارے منہ پر کرے۔ ایسے فون پر کتیا کی طرح کیوں بھونک رہی تھی؟“

جنیم نے کہا ”ایسا میں کیسے کہہ سکتی تھی۔ اس نے بتایا کہ کوئٹہ سے یہ مال جاتا ہے جہن کے راستے افغانستان۔ وہاں سے ایران اور وسطی ایشیائی ریاستوں کو بھیج دیا جاتا ہے اور پہنچتا ہے یورپ امریکا کی منڈی میں۔“

ملک رب نواز نے چند سیکنڈ کے توقف سے کہا ”بی بی۔ بڑا مت فالتو تو ہم بھی ایک سوال کریں تم سے؟“

”مصور کریں ملک صاحب۔ سوال تو سوال ہوتا ہے کوئی گالی نہیں۔“

”سوال یہ ہے جی۔ کہ آخر ہمارے معاملات میں آپ کا نام بار بار کیوں آتا ہے اب دیکھو پہلے کسی نے آپ کو اغوا کیا۔ ہمارا مطلب ہے کہ ہمارا نام لے کر کچھ لوگ زبردستی لے گئے آپ کو اور ہماری ایک کوٹھی میں بلاوجہ بٹھا کے رکھا۔“

”مگر آپ نے تو تردید کدی تھی کہ وہ کوٹھی آپ کی نہیں۔“

”ہاں۔ وہ دراصل مالک تو ہمارا ایک دوست تھا۔ مگر چالی ہمارے پاس ہے اور دیکھ بھال ہم کرتے ہیں تو لوگ

سمجھتے ہیں ہماری ہے۔“

”وہ بات تو جھج تھی۔“

”ہم نے کب کہا کہ آپ جھوٹ بولتی ہو۔ اس کے بعد جناب وہ ہمارا ایک تنگ حرام ملازم چوری کر کے بھاگا تو آپ کے پاس گیا شکایت لے کر اور آپ نے اس کی وکیل بن گئے ہمیں فون کیا۔ جو چیزوں لے کر بھاگا تھا۔“

”ایک سو رتی کا سر“ جنیم نے گالی کو نظر انداز کر دیا۔ ”ہاں جی دی۔ اس کا معاملہ بھی آپ طے کر رہی تھیں۔ بے شک کرایا نہیں مگر بات آپ نے کی تھی اور اب دیکھو یہ کیا معاملہ۔“

جنیم نے کہا ”ایسے معاملات میں لوگ پیشہ اخبار والوں کو ذریعہ بناتے ہیں۔ آپ وہ تصویریں دیکھنا چاہتے ہیں یا نہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ عورت پھر مجھے فون کرے۔“

ملک نے سوچ کے کہا ”ٹھیک ہے جی۔ آپ وہ تصویریں لاؤ۔ کیا خیال ہے کہ پھر کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس سو رتی کے سر کا معاملہ۔“

”وہ بھی ہو جائے گا مگر آپ کو تعاون کرنا ہوگا۔ مجھے تو آپ جانتے ہیں نا کسی کو بلک میل کرنا میری عادت نہیں لیکن اور کسی کے ہاتھ میں پڑیں یہ تصویریں تو معاملہ خراب ہو جائے گا۔“

”آپ تشریف لاؤ جی غریب خانے پر۔ ہم آپ کے لیے وہ ہیں۔“ جنیم نے کہا ”ملک نے خوش اخلاقی سے کہا۔ ”میں ابھی ایک کھتے میں آئی ہوں“ جنیم نے کہا اور فون بند کر دیا۔

جنیم نے ایک فون آزاد صاحب کو کیا اور انہیں اپنی خیریت کی اطلاع دینے کا فرض پورا کیا۔ وہ ابھی ابھی اخبار کے دفتر سے واپس گھر پہنچے تھے حسب عادت انہوں نے غنودگی میں کچھ ڈانٹ ڈپٹ کی اور کچھ سمجھایا۔ جنیم نے دوسرا فون کسی ہم پیشہ کو کیا اور یہ بتایا کہ وہ ملک رب نواز سے ایک انٹرویو کرنے اس کے گھر جا رہی ہے۔ یہ سب حفاظتی بندوبست تھا۔

میں نے آخری روز تک جنیم کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ ”میں تمہیں وہاں ڈراپ کر کے باہر انتظار کروں گا۔“

”مجھے ایک ٹھکانا مل جائے گا۔“

میں نے کہا ”ہم انتظار کریں گے تیرا قیامت تک بقول شاعر۔“

مجھے نہیں معلوم کہ وہ کار کہاں سے ہمارے پیچھے گئی تھی جس نے چرنگ کر اس سے کوئٹہ روڈ کی طرف مڑتے

ہوئے سابق نسری مسین ہال کے سامنے اچانک ہمارا راستہ روک لیا۔

”یا اللہ خیر!“ جنیم کے منہ سے بے اختیار نکلا ”یہ کون ہے؟“

میں نے بریک پر پورا زور ڈال کے گاڑی کو روک دیا۔ ”یہ تمہارا کوئی ناپید ہوا رستہ ہو سکتا ہے۔ رقبہ میرے ساتھ تمہیں دیکھ کے اس کے جذبات سخت ہیں۔ ہوئے ہوں گے۔ اب وہ مجھے مجروح کرے گا۔“

راستہ روکنے والی کار عام قسم کی سوڈی سیڈان تھی لیکن اس کی رجسٹریشن اسلام آباد کی تھی۔ گاڑی سے اتر کے ہماری طرف آئے والا وہ تھا جو کار چلا رہا تھا۔ گاڑی میں اس کے ساتھ اور کوئی نہیں تھا۔

جنیم نے میری طرف جھک کے آہستہ سے کہا ”یہ تو وہی لگتا ہے۔“

میں سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ کس کی طرف تھا۔ ”ہاں۔ رقبہ نے جو طیلہ بتایا تھا اس کے مطابق یہ پروفیسر ہاشم رضا ہے۔“

وہ اتنی دیر میں قریب آیا تھا۔ اس کے لیوں پر ایک دوستانہ اور معذرت خواہانہ مسکراہٹ تھی۔ ”آئی ایم سوری۔ میں نے تمہیں ایسے روکا۔“

میں نے کہا ”آپ نے تو پوری کوشش کی تھی کہ ایکسی ڈنٹ نہ ہو جائے۔“

اس نے سر ہلایا ”تم نے بچالیا۔ آف کورس یہ تمہاری مہارت تھی لیکن میں سوری کہہ چکا ہوں۔“

پروفیسر کے سڑیلوں اور بھوؤں کے سب بال مجھے اور بالکل سفید تھے۔ اتنی کل سفیدی اس کی جسمانی صحت سے میل نہیں کھاتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس نے بالکل اصل نظر آنے والی سفید بالوں کی وگ لگا رکھی تھی۔ اس کی آنکھیں روشن پر جتنی انداز میں متحرک اور کچھ گول تھیں۔ انہیں دیکھ کے آلوکی یا سانپ کی آنکھوں کا خیال آتا تھا مگر آلوکی یا سانپ عینک میں لگاتے اور پروفیسر کی آنکھوں پر نازک شربہ فریم کی خوبصورت اور قیمتی عینک تھی۔

جنیم نے آہستہ سے میرا ہاتھ دیا جس کا مقصد یہی ہو سکتا تھا کہ میں فوراً پروفیسر کے بچانے کی کوشش نہ کروں۔ ”تو کون ہیں آپ؟ اور اس طرح ہمارا راستہ روکنے کا مقصد کیا ہے آخر؟“

وہ بالوں پر ہاتھ بھر کے مسکرایا ”مگر میں غلطی نہیں کر رہا تو آپ وہی ہیں مشہور صحافی جنیم؟“

کچھ نہیں بولی۔ اس نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ ہوں۔ پروفیسر ہاشم رضا کیا یہ نام آپ کو سنا ہوا لگتا ہے؟“ جنیم نے نفی میں سر ہلایا ”میں گراچی کے بزرگ شاعر ہاشم رضا کو ضرور جانتی ہوں۔ جو بہت سینئر آئی سی ایس آفیسر تھے۔“

”مسکرایا“ میں لندن میں ہوں آج کل۔“

میں نے کہا ”ایک منٹ۔ آپ ایک موٹو سوری‘ تاریخ داں ہیں۔ تاریخ اور تہذیب پر بہت دلچسپی رکھتی ہیں آپ نے؟“

وہ خوش ہوا اور اس نے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک خوبصورت والٹ نکالا پھر والٹ میں سے ایک کارڈ مجھے پیش کیا ”خوشی ہوتی ہے جب اپنے وطن میں بھی کوئی نام جانتے والا ملتا ہے۔ صورت آشنا نہ سہی۔“

بے مہر یاران وطن کا شکوہ کرنے میں پروفیسر حق بجانب تھا۔ ٹیلی وژن کے آنے سے بھی صورت حال میں تبدیلی نہیں آئی۔ کسی حشر سامان ماڈل یا ایکٹریس کے مقابلے میں اہل علم اور اہل قلم کی صورت کو آج بھی کوئی نہیں پہچانتا۔ مصور اور مصنف اسکا لرا اور سائنس داں صرف اپنے نام کی شناخت رکھتے ہیں۔ وہ بھی اپنے مخصوص دلچسپی کے حلقے میں۔ جیسے شاعر کو مشاعروں میں اور مصور کو نمائشوں میں پہچانا جاتا ہے۔

مجھے تاریخ یا تہذیب پر تحقیق سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ تاریخ میں نے میٹرک میں جنمی پڑھی تھی اس سے مجھے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ ہندوستان میں کتنے خاندانوں نے حکومت کی اور یہاں کتنے وائسرائے آئے اسی طرح تہذیب سے میرا تعلق تاریخی عمارات اور عجائب خانوں تک محدود تھا۔ وادی تیل یا روغن تہذیب ہند حارہ تہذیب کے آثار اور پروفیسر ہندو مسلم تہذیب کے بارے میں معلومات بہت دلچسپی بلکہ سطحی تھیں۔ پروفیسر ہاشم رضا سے میرا تعارف کسی اور حوالے سے

حسب توقع اس نے یہ سب نہیں بتایا وہ۔ دراصل
افریس ختم ہو جانے کے بعد سب شرکاء چلے گئے ہیں۔ میں
اور پرچم دن کے لیے رک گیا ہوں تو ظاہر ہے انتظام
ضروری تھا۔ منتظمین نے ویسے بھی پیسے بچانے کے
لیا جیسے ہوٹل کا انتخاب نہیں کیا تھا ورنہ میں اپنے
ان کر لیتا۔

میں نے افسوس کا اظہار کیا "کہاں ٹھہراؤ تھا منتظمین
نے آپ کو؟"

پروفیسر نے اس سوال کا جواب نہیں دیا "بارہ بجے سے
پہلے میں چیک آؤٹ کر جاؤں گا اور ظاہر ہے کسی اچھے ہوٹل
میں جاؤں گا۔ میں فون کر کے بتا دوں گا آپ کو۔ اخبار کے دفتر
میں پیغام چھوڑ دوں گا اگر آپ نہ ملیں۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔" جنم نے کہا۔
میں نے گاڑی اشارت کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور
سمجھ گیا "پروفیسر صاحب" آپ نے پاکستان کیوں چھوڑ دیا
آخر؟

اس کا مصافحے کے لیے آگے بڑھنے والا ہاتھ رک گیا
"ہاں۔ اور کیا کہیں۔ میاں قدر نہیں تھی۔ ساری عمر
پرچھے گزر گئی۔"

"آپ نے ریٹائر ہونے کے بعد اپنا مکان بنالیا تھا
کیس؟" میں نے جیسے بہت سوچ کے کہا "ہاں" اور شاید وہ
کی طرف۔ ایم آئی راسٹ؟

وہ صاف نرمی سے نظر آنے لگا "ہاں۔ بنایا تو تھا۔ لیکن
بچا رہا۔ کوئی فائدہ نہیں تھا پاکستان میں رہ کے۔"

میں نے کہا "ایک غریب ملک کسی صحافی یا پروفیسر کو کیا
دے سکتا ہے۔ وہاں یقیناً آپ کی اچھی آمدنی ہوگی۔"

"ہاں۔ خدا کا شکر ہے۔ اچھا پھر ملاقات ہوگی۔" اس
نے اپنا ہاتھ پہلے جنم کی طرف اور پھر میری طرف بڑھایا۔

"فدائے وطن کے آپ یہ بھی بھول گئے کہ میاں
خواتین مردوں سے مصافحہ نہیں کریں۔" میں نے کہا۔

اس نے کچھ بڑا مانا "صرف سوچ کا انداز ہے یہ بھی
ورنہ ہماری خواتین کیا نہیں کر رہی ہیں۔ کس معاملے میں
مردوں کی برابری کی دعوت دے رہی ہیں اور مغرب کی تقلید میں
کیا کسی سے کم ہیں۔ مذہب اور تہذیبیافتہ ہونے کا معیار ہی
یہ ہے میاں کہ آپ اپنے لائف اسٹائل میں کس حد تک
پاکستانی نہیں ہیں۔"

اس کے سچے نے مجھے کچھ شرمندہ کیا "پھر بھی۔ ہم جس
معاشرے میں رہتے ہیں اس کا مزاج اسلامی ہے۔"

اس کے سچے نے مجھے کچھ شرمندہ کیا "پھر بھی۔ ہم جس
معاشرے میں رہتے ہیں اس کا مزاج اسلامی ہے۔"

اس کے سچے نے مجھے کچھ شرمندہ کیا "پھر بھی۔ ہم جس
معاشرے میں رہتے ہیں اس کا مزاج اسلامی ہے۔"

جس سے اس وقت تک
ہاں۔ یہاں یہ مشہور تھا کہ پروفیسر
ہاتھ رضا مل ہو گیا تھا مگر وہ میرے سامنے زندہ سلامت
کھڑا تھا۔ اس کی شخصیت پر اسرار، تحریر اور بدنامی کی
تاریک دھند میں لپٹے ہوئے ماضی کی آئینہ دار تھی۔

میں نے کارڈ کو دلچسپی سے دیکھا۔ اس پر لندن کا
ایڈریس، فون اور ٹیکس نمبر تھا۔ "میاں آج کل ایک ہسٹری
کائرفنس ہو رہی ہے۔"

اس نے طمانیت سے سہلایا۔ "ہاں۔ اسی میں شرکت
کے لیے آیا تھا میں۔"

جنم نے کہا "افسوس کہ مجھے تاریخ سے صرف کیٹڈر کی
حد تک دلچسپی ہے۔"

اس نے کہا "دیکھئے۔ میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں
گا۔" میں نے کہا "سوری پروفیسر یہ جگہ کوئی بات کرنے کے
لیے قطعی نامناسب ہے۔ ویسے بھی ہم ایک اور کام کے لیے
نکلے تھے مگر۔"

اس نے مذمت سے ہاتھ ملے "آئی ایم سوری۔ اگر
میں کسی وقت آپ سے ملنا چاہوں؟"

"کس سلسلے میں آخر؟" جنم نے کہا۔

"وہ معلومات ایسے ہیں۔" اس نے میری طرف دیکھا
"کہ میاں ڈسکس نہیں کئے جاسکتے۔ آف کورس مجھے قطعی
اعتراض نہیں ہوگا۔ اگر آپ کے شوہر بھی ساتھ ہوں۔ میں
نے کئی بار اخبار کے دفتر میں رابطے کی کوشش کی۔ پر پس
کلب سے بھی معلوم کیا لیکن آپ سے بات نہ ہو سکی۔ یہ تو
خوش قسمتی ہے میری کہ اچانک آپ پر نظر پڑی میری۔"

جنم نے کہا "پروفیسر آپ کا قیام کہاں ہے؟"

میں نے کہا "بھئی کمال کرتی ہو تم بھی۔ ہسٹری کائرفنس
کے سب مندوبین کو کسی ایک ہوٹل میں اکو موڈٹ کیا گیا
ہوگا۔"

"رائسٹ۔ آپ روم نمبر اور ہوٹل کا نام بتادیں اور یہ کہ
آپ رات کو کس وقت ملے ہیں۔" جنم نے کہا۔

اس کے سچے نے مجھے کچھ شرمندہ کیا "پھر بھی۔ ہم جس
معاشرے میں رہتے ہیں اس کا مزاج اسلامی ہے۔"

اس کے سچے نے مجھے کچھ شرمندہ کیا "پھر بھی۔ ہم جس
معاشرے میں رہتے ہیں اس کا مزاج اسلامی ہے۔"

اس کے سچے نے مجھے کچھ شرمندہ کیا "پھر بھی۔ ہم جس
معاشرے میں رہتے ہیں اس کا مزاج اسلامی ہے۔"

وہ ٹھہرے مسکرایا "بہت اچھی طرح جانتا ہوں میں۔
یہاں ابھی یہ طے ہونا باقی ہے کہ مسلمان کون ہے؟ ویسے نام
تو اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے میرے وطن کا مگر اسلام کس کا
تھا ہے اور کون دائرہ اسلام سے خارج ہے؟ یہ سب سے بڑا
جھگڑا ہے۔ آپ معاشرے کے اسلامی مزاج کی بات کرتے
ہیں۔"

یہ بحث کرنے کی نہ جگہ تھی اور نہ موقع تھا۔ میں نے
خدا بخوار پروفیسر کو شرمندہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ شاید اس
کی وجہ یہ تھی کہ میرے دل میں اس کے خلاف عقائد کا زہر
تھا۔ اگر وہ صرف ایک تاریخ داں پروفیسر ہوتا تو اس کے علم
دلفن اور اس کی عقل اور عمر کا میں دل سے احترام کرتا مگر
اس کے ذاتی کردار کے بارے میں جو کچھ مجھے معلوم ہوا تھا،
وہ قابل نفرت تھا۔ وطن میں ناقدی کا گلدوزہ تو ایک بھانڈا تھا۔
اصل وجہ ہوس زر تھی اور احساس محرومی تھا۔ اصل اہل علم
اپنے قناعت پسندانہ مزاج میں رد و پیش ہوتے ہیں۔ ان کی
ساری دولت ان کا علم ہوتی ہے اور دنیاوی دولت کی
ضرورت کا انہیں خیال بھی نہیں آتا مگر پروفیسر کو ریٹائر ہونے
کے بعد زیادہ شدت کے ساتھ اس احساس نے پشیمانی میں
جھٹکایا ہوگا کہ ساری عمر بڑھتے بڑھتے پرچھے گزرے اس نے
جھک ماری۔ عزت، شہرت یا دولت کچھ بھی اپنے پاس نہیں۔
زندگی کے سارے مزے وہ لوٹ رہے ہیں جن کے پاس پیسہ
ہے اور عزت ان کے لیے ہے جو کسی طرح بھی اس کے
مستحق نہیں۔ شاید یہ بچھٹاؤ ایک عام بات ہو گئی ہے۔
دانشور، فنکار، سائنس داں اور تخلیقی کام کرنے والے سب
ہی معاشرے کے خلاف یہی جذباتی رد عمل رکھتے ہیں مگر
پروفیسر کی طرح کوئی بے ضمیر اور بے کردار نہیں ہوتا۔ غالی
اور کمزوری پروفیسر کی فطرت میں تھی کہ جیسے ہی اسے موقع
ملا اس نے اس کا رخ سے اسٹیکر بننا قبول کر لیا۔

جب اس کی گاڑی روانہ ہو گئی تو جنم نے مجھے شو کا دیا
"اب چلے جناب!"

میں نے چونک کر چابی لگا لی "یہ شخص کتنا جھوٹا اور دوغلا
ہے۔"

"وہ عمر میں میرے باپ کے برابر ہے۔ میں ہاتھ ملا لیتی اس
سے تو کون سا گناہ ہو جاتا۔ تم نے اسے بلا وجہ شرمندہ کیا" وہ
بولی۔

میں نے کہا "بلا وجہ؟ تم اسے بلا وجہ کہتی ہو۔ میرا بس
چلتا تو میں اس کو ذلیل کرنے کے لیے جوتے مارتا ہوا چوک
تک لے جاتا اور مجمع اکٹھا کر کے کہتا کہ دیکھو اس ماری

پروفیسر کو۔ یہ خود کو تاریخ داں کہتا ہے مگر یہ چور ہے، ذاک اور
آسمگر ہے۔ یہ اس ملک کے تاریخی ورثے کو چراگے باہر لے
جا رہا ہے اور ان کو فروخت کر رہا ہے جو ہماری تاریخ اور
تہذیب کے دشمن ہیں۔"

جنم نے کہا "اس کا حلیہ کتنا محترم ہے۔ گفتگو کا انداز
کتنا شائستہ ہے۔ کتنا مرحوم کا دینے والا چہرہ ہے اس کا۔"

"اور وہ کتنے اعتماد سے جھوٹ بول رہا تھا۔ میں شرط
لگا سکتا ہوں کہ اس کے نام سے ہسٹری کائرفنس کے شریک یا
منتظمین واقف بھی نہیں ہوں گے۔"

جنم ہنسی "یہ شرط میں بھی لگا سکتی ہوں۔ اسی لیے وہ
ہوٹل کا نام یا روم نمبر نہیں بتا سکا۔"

"یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ایک شخص جو واقعی
اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا، پروفیسر تھا، وہ اپنے مقام سے کتنا گر گیا۔
ملک رب نواز جیسے بہت ہیں جن کی فطرت اور مزاج میں
دولت نے خرابی پیدا کی۔ اب یہ خرابی موروثی ہو گئی ہے مگر
اس شخص کے پاس علم تھا۔ آج یہ بھی ایک بد معاش ہے اس
لیے رئیس کو اغوا کر لیا۔ اس کے پاس حکم کے غلام ہیں جو
زر خرید ہیں اور اس کی دولت کی طاقت سے ڈرتے ہیں چنانچہ
اس کے لیے ہر غیر قانونی اور غیر اخلاقی کام کر سکتے ہیں۔"

جنم نے کہا "جب وہ بات کر رہا تھا تو مجھے کسی اور کا
خیال آ رہا تھا۔ اس نے کوئی انسان نظر آنے والا حیدر ان بھی
پال رکھا ہے کیا نام تھا اس کا؟"

"جبرائیل" میں نے کہا "ایک خفیہ ٹھکانا بھی ہے اس کا،
پر اسرار بھرانہ سرگرمیوں کے لیے۔ ممکن عجیب بات ہے، یہ
شخص اس شہر میں برسوں طلبہ کو درس دیتا رہا۔ انہیں تاریخ
سے آشنا کرتا رہا۔ یہاں سیکولر لوگ ہوں گے جو اسے استاد
کا درجہ اور تعظیم دیتے ہوں گے۔"

جنم نے کہا "یہ نکتہ قابل غور ہے۔ آخر پروفیسر اتنی
بے وقوفی سے شہر میں گاڑی لے کر کیسے پھر سکتا ہے۔ کیا اسے
کوئی ڈر نہیں کہ میاں پر گلی محلے سڑک اور بازار میں اس کو
جانے اور پہچاننے والے موجود ہیں۔ جو شخص ہمیں بیس
سال کسی کالج میں پڑھاتا رہے اس کے شاگرد ہر جگہ ہوں
گے۔ دکان دار سے لے کر اعلیٰ سرکاری عہدے دار تک اور
پھر اس کے رشتے دار بھی ہوں گے اسی شہر میں۔"

میں نے کہا "میں بادل ناخو استہ تمہاری ذہانت کا
اعتراف کرتے پر مجبور ہوں۔"

جنم نے اپنی بات جاری رکھی "آخر اس پروفیسر کو
بچانے جانے کا ڈر کیوں نہیں ہے۔ وہ خود بھی جانتا ہے کہ

پروفیسر کو۔ یہ خود کو تاریخ داں کہتا ہے مگر یہ چور ہے، ذاک اور
آسمگر ہے۔ یہ اس ملک کے تاریخی ورثے کو چراگے باہر لے
جا رہا ہے اور ان کو فروخت کر رہا ہے جو ہماری تاریخ اور
تہذیب کے دشمن ہیں۔"

سب جاننے والوں کے لیے وہ مقتول و مرحوم ہے مگر اس کے باوجود اگر ایک شخص شہر میں ہر جگہ نظر آئے جس کے بارے میں سب سمجھتے ہوں کہ وہ تو مر گیا تھا اور وہ عام آدمی بھی نہ ہو۔ تو کیا اس بات کا چرچا نہیں ہوگا؟

"بالکل ہوگا۔ بہت سے لوگ صرف جہان ہوں گے مگر کچھ یہ ضرور پوچھیں گے کہ آپ پروفیسر ہاشم رضا ہیں؟ مگر ہم نے تو آپ کے بارے میں سنا تھا کہ آپ کو چوروں، ڈاکوؤں نے گھر میں گھس کے قتل کر دیا تھا۔"

خٹم نے کہا "تمہیں کیا پتا پوچھتے ہوں تو؟"

"نہیں۔ پروفیسر جیسا جہان نہ گروا رکھنے والا شخص یہ رسک نہیں لے گا کہ اس کے زندہ ہونے کی بات کا افسانہ بن جائے اس نے ایک خاص مقصد کے تحت روپوشی اختیار کی تھی۔"

"پھر کیا بات ہے؟" خٹم بولی۔

"طالب اصل پروفیسر ہاشم رضا کا طبع یہ نہیں ہوگا۔ طبع بدلنے کا جو طریقہ میں نے آج اختیار کیا ہے وہ پروفیسر نے کئی سال پہلے آزمایا ہوگا۔ ایک نئی شخصیت اختیار کرنے کے لیے جس کا اپنے ماضی سے کوئی تعلق نہ ہو۔"

خٹم نے کہا "پھر تو اسے نام بھی بدل لیتا ہے۔"

"کارڈ پر اس کا نام ایچ آر کرمانی لکھا ہے۔ ایچ آر تو خیر ہاشم رضا ہو گیا۔ اگر وہ پہلے بھی کرمانی تھا تو شاید یہ بات عام لوگ نہیں جانتے ہوں گے۔ یہاں تو سب اسے ہاشم رضا کہتے تھے مگر ہاں سب اسے مسٹر کرمانی کہتے ہوں گے۔ یا ممکن ہے اپنے نام میں یہ اضافہ اس نے بند کیا ہو۔"

"پروفیسر کی شخصیت ایک معما ہے۔ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ JIO SAW PUZZLE کی طرح اس کے مختلف پہلو بڑے کنفیوز کرنے والے ہیں۔ فرصت میں بیٹھ کے انہیں جوڑیں گے تو اصل صورت سامنے آئے گی۔"

"پتا چل جائے گا کہ پروفیسر ہاشم رضا سے مسٹر ایچ آر کرمانی تک اس کی شخصیت نے کتنے بہو پ بدلے۔ ابھی تو سوچو، ملک رب نواز کے بارے میں۔"

میں نے کہا "میں خرا خواہ سوچوں اس کے بارے میں۔ اس سے ملاقات کا آئیڈیا تمہارا تھا؟ تم سوچو۔"

"جی ہاں اب کچھ بھی ہو، تمہیں فکر نہیں؟"

میں نے کہا "فکر کرنے سے کیا ہوتا ہے قانون۔ وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔"

وہ خفا ہونے لگی "پھر میرے ساتھ آنے کی بھی کیا ضرورت تھی؟"

"میں گاڑی چلا رہا ہوں۔"

"گاڑی میں خود چلا سکتی تھی۔ کسی ڈرائیور کی ضرورت نہیں تھی مجھے۔"

میں نے کہا "دیکھو، ایک ایجنٹ ڈرائیور کی وجہ سے تم کو کچھ بھی نہیں کرنا پڑا، تم آرام سے بیٹھ کے فصول باتیں کرتی رہیں اور تم منزل مقصود تک خوب عافیت کے ساتھ صبح سالم پہنچ جاؤ گی، بہت سے راہ چلتے لوگ زخمی ہو کے اسپتال نہیں گئے اور تمہاری گاڑی کے نیچے نہیں آئے کوئی گھبراہٹ نہیں گرا، تمہاری گاڑی کے شیشے اور ہیڈ لائٹس وغیرہ کا نقصان نہیں ہوا۔"

وہ ہنسنے لگی "سوئی کے تار کے سے گاڑی گزارا سکتی ہوں میں جناب!۔"

میں نے کہا "ہاں، اگر گاڑی ہو دھاگے جیسی یا سوئی کا تار کا ہو پولیس کی ناکہ بندی والا۔ جہاں سے باقی مگر جاتا ہے، دم نہ جاتی ہے۔ راکٹ لانچر اور کلاشنکوف کے ساتھ ڈاکو گزر جاتے ہیں۔ چاقو سے سیب کاٹ کر کھانے والا شریف آدمی پکڑا جاتا ہے کہ خطرناک اسلحے سے لیس تھا۔"

خٹم نے کہا "انگلے موڑ سے دائیں طرف جانا ہے۔"

میں نے کہا "صرف تمہیں، ممکن ہے اگلا موڑ ہماری زندگی کا آخری موڑ ثابت ہو۔ جہاں ہم بیٹھ کے بقتل شاعر۔ شاید بھی خوابوں میں ملیں۔"

"خوابوں میں شاید۔ روز نہیں۔"

"حد کرتی ہو تم بھی۔ اچھی سے اچھی فلم بھی ہر روز کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ تم خوابوں میں بھی اجارہ داری چاہتی ہو۔"

میں نے احتجاج کیا۔

"تم اور کسے دیکھتے ہو؟"

میں نے کہا "بھئی اللہ رکھی سے رکھا تک آدمی بنے چاہے دیکھے اور جیسے چاہے دیکھے، سب کا حق ہے خوابوں پر۔"

موڑ آیا تو خٹم نے کہا "میرا خیال ہے کہ تم میرے ساتھ رہو۔"

میں نے گاڑی روک لی "دیکھو۔ محبت میں ساتھ جینے کی بات ٹھیک ہے۔ ساتھ مرنے کا مجھے کوئی شوق نہیں اور نہ میں نے بھی عہد کیا ہے، میں معذرت چاہتا ہوں۔"

اس نے کہا "انور، اتنا ڈرتے کیوں ہو۔ نہیں بچانے کا تمہیں کوئی بھی۔"

"ابھی پروفیسر نے مجھے شوہر سمجھ لیا تھا تمہارا" میں نے دیکھی لیے میں گما۔

"پھر کیا ہوا؟"

میں نے کہا "آخر میری بھی کچھ عزت ہے، دوبارہ ملک کے سامنے۔"

اس نے چڑ کے کہا "اچھا بابا۔ میں کہہ دوں گی کہ یہ باڈی گارڈ ہے میرا۔"

"بابا! کیا میں بابا ہوں، معاف کرو بابا؟"

وہ مسکرائی "باڈی گارڈ تو ہو۔"

میں نے سوچ کے کہا "باڈی گارڈ یعنی جسم کا محافظ۔ یعنی یہ تو پھر وہی ہو گیا اردو میں شوہر ہی کہتے ہیں اسے۔"

وہ جھٹکے اترنے لگی "اچھا مت جاؤ، بیٹھے رہو یہاں۔"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا "ایک عرض سن لو بلکہ ایک سچ سن لو۔"

"اب کیا ہے؟" وہ دھڑکے ہوئے لیے میں بولی۔

میں نے کہا "جس خیال کا تم نے ابھی اظہار کیا تھا، وہ فیصلہ تو میں بہت پہلے ہی کر چکا تھا۔ آخری سانس تک ساتھ نبھانے کا۔ ہر جگہ ساتھ دینے کا۔ سوائے ہاتھ روم اور قبر کے۔"

وہ مسکرائی "تم مذاق کرتے ہو۔ میں سمجھتی نہیں، آہستہ آہستہ عادی ہو جاؤں گی۔"

میں نے گاڑی آگے بڑھائی اور ملک رب نواز کی کوٹھی کے گیٹ کے سامنے روک لی۔ ایک چھوٹی سی بلیگ آفس جیسی گھڑکی سے چوکیدار نے جھانک کر دیکھا اور بولا "گاڑی گیٹ کے سامنے گھڑکی ہے۔"

میں نے دانت نکال کے کہا "گھڑکی۔ ہاں ہے مگر بند ہے۔"

اس نے چٹا کے کہا "اوتے بہرے۔ گاڑی کیوں گھڑکی ہے یہاں؟"

میں نے سر ہلایا "یہ بیٹھ نہیں سکتی، لیٹ بھی نہیں سکتی۔"

اس کا بار اچھ گیا "مذاق کرنا ہے۔ ملک صاحب کی گاڑی کیسے لٹکی؟"

"ملک صاحب کی دائرہ؟ اپنے وقت پر نکلے گی، عمر کیا ہے ان کی؟"

وہ مشتعل ہو کے باہر آ گیا۔ میں نے گاڑی کو موڑ کے سڑک کے دوسرے کنارے پر گیٹ سے دور کھڑا کر دیا۔ یہاں

خاطمی انتظامات خاصے سخت نظر آ رہے تھے چنانچہ میں نے اور خٹم نے اپنا اسلحہ ساتھ نہ لے جانے کا فیصلہ کیا۔ رب الوہر چھپانے کی سب سے محفوظ جگہ سیٹ کے نیچے تھی۔ میں نے رب سیٹ ہٹانے کے رب الوہر رکھے تاکہ کوئی سیٹ کے نیچے دیکھے تو اسے کچھ بھی نہ ملے۔

خٹم کے ساتھ میں ایک بار پھر گیٹ تک پہنچا تو چوکیدار نے مجھے گھورتے ہوئے کہا "کس سے ملنا ہے؟"

خٹم نے کہا "ملک صاحب کو بتاؤ خٹم آئی ہے۔"

"کون؟" وہ ہاتھ پر ٹھکن ڈال کے بولا۔

"خٹم میں اخبار کے دفتر میں کام کرتی ہوں" خٹم نے کہا۔

"لیکن وہ تو فلموں میں کام کرتی ہے" چوکیدار بولا۔

"اب تم بتاتے ہو یا میں گھس جاؤں ایسے ہی اندر؟"

خٹم نے جھک کر کہا۔

چوکیدار نے فوراً پلیٹ کے ایک فون اٹھایا اور ملک رب نواز سے وی کہہ دیا جو خٹم نے اس سے کہا تھا پھر اس نے ٹیٹ کھول دیا۔

میں نے گزرتے گزرتے کہا "تمہاری آنکھوں کو چٹسہ کی ضرورت ہے۔"

اس نے مجھے گھورا "میری نظریاں بالکل ٹھیک ہے۔ حرامی حلالی سب کو پہچانتی ہے۔"

میں نے کہا "یہ وہی خٹم ہے فلموں والی۔ آج کل فلموں میں کام نہیں ہے اس لیے اخبار کے دفتر میں کام کرتی ہے۔"

اس نے ہاتھ جوڑ کے کہا "اد جیابار، ایویں تمہیں نہ ملے۔"

خٹم کچھ آگے نکل گئی تھی۔ میں نے ملک رب نواز کو خوش اخلاقی کی مجسم تصویر بنا دیکھا۔ وہ خٹم کا استقبال کرنے کے لیے باہر آ گیا تھا "آؤ، خیر ہے۔ ہم تو کبھی تھے کہ آپ کو یاد ہی نہیں رہا۔"

خٹم نے کہا "جتنی کمزور یادداشت تو ہمارے حاکموں اور لیڈروں کی ہوتی ہے ملک صاحب۔ انہیں کل کی بات یاد نہیں رہتی۔ نہ گزرتے ہوئے کل کی اور نہ آنے والے کل کی۔"

"ہم تو جی نہ حاکم ہیں نہ لیڈر۔ آپ اندر تشریف لاؤ جی" اس نے خٹم کے لیے دروازہ کھولا اور پھر مجھ سے خطاب ہوا۔ "مولوی صاحب، آپ ادھر ہی کریں بیٹھو۔"

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ملک رب نواز کو میرے

چہرے کے خدو خال میں کسی نامرغیہ کی مشابہت کا شبہ تک نہیں ہوا تھا "ہم باڑی گاڑیں میڈم کے جناب۔ ہر جگہ ساتھ جاتے ہیں۔"

ملک نے غصے کو ضبط کر کے کہا "اندھ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے، میرے باڑی گاڑیں۔"

میں نے سپاٹ لیجے میں کہا "میڈم کو ان سے بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔"

ملک گرم ہو گیا "یہ کیسا بد تمیز آدمی ہے مس جنرل اسے سمجھائیں کہ یہ گھر ہے ہمارا۔"

جنرل نے کہا "ملک صاحبہ کیوں نہ ہم بھی یہیں بیٹھ جائیں، براہ راست۔"

ملک کا چہرہ تاریک ہو گیا "کیا بات کرتی ہو جی آپ بھی۔"

ہم نوکروں کے ساتھ بیٹھیں گے اور ہمارے درمیان گفتگو میں نوکر بھی شریک ہوں گے۔"

جنرل جیسے شش و پنج میں پڑ گئی "مشکل یہ ہے ملک صاحب کہ اسے مجھ پر مسلط کیا ہے آزاد صاحب نے آزاد صاحب کو جانتے ہیں یا آپ؟"

"ہاں جی، ایڈیٹر صاحب! "

"باب کی طرح پرورش کی ہے انہوں نے میری۔ وہ بہت فکر کرتے ہیں میری۔ اس کو کہہ رکھا ہے کہ ہر جگہ نظر رکھتے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے جی، مگر ہم کیا بھروسے کے قابل نہیں اور نوکر تو نوکر ہی ہوتا ہے۔ ہر بات اس کے سامنے کیسے کر سکتے ہیں بہ؟"

جنرل نے کہا "ایک طریقہ ہے ملک صاحبہ۔ یہ انگریزی بالکل نہیں جانتا۔ ہم انگریزی میں بات کر سکتے ہیں۔ اسے آپ دور رکھیں، بھائی۔"

ملک نے خون کا ٹھونٹ پی کے یہ شرط منظور کی۔ میں جنرل کے ساتھ ہی اندر گیا۔ میں نے آرائش کے شاہانہ انداز کی تفصیلات پر بالکل غور نہیں کیا۔ ایک محل میں سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا محلوں کے سوا کہیں نہیں ہوتا۔ میں نے ساری توجہ اندر کے نقشے پر رکھی اور اس تصویر کو ذہن نشین کر لیا۔ کون سا دروازہ کس طرف ہے اور کہاں کھلتا ہو گا۔ کوریڈور کے آخر میں کیا ہو سکتا ہے۔ باہر کھلنے کے اور کتنے راستے ہوں گے۔ وہ زینہ کہاں ہو گا جو خانے میں اترتا ہو گا اور ممکن ہے اور کی منزل تک جاتا ہو۔"

گاؤں میں ملک رب نواز کی خاندانی حویلی میں نے بہت پہلے دیکھی تھی۔ اس وقت بھی ان کی شہر میں کوئی ہوگی۔

شاہ پر بڑے شہر میں ایک کوٹھی ہوگی لیکن یہ بالکل جدید وضع کی کوٹھی تھی پرانے کے فرق کو ظاہر کرتی تھی۔ اس کا پیرا بھائی یعنی ملک شاہ نواز اپنے آباؤ اجداد کی طرح زمیندارانہ ٹھاتہ پاٹ اور انداز نگہ رکھتا تھا۔ رب نواز نے شہری تعلیم حاصل کی تھی اور جیسا کہ میں نے سنا تھا، وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے ولایت بھی گیا تھا۔ یہ خاندانی ریسوس "نوابوں اور راجے ماراجوں کی شان تھی جو ایک روایت بن گئی تھی۔ اس میں حصول علم کی فکریں اور شوق کا دخل کم تھا۔ پرانے وقتوں میں جب انگریز حاکم تھے لوگ برطانیہ جاتے تھے اور کوئی ڈگری ملنے نہ ملنے، حاکموں کے دہس میں جوانی کے کچھ دن اور اسکول کی چند راتیں ضرور گزار آتے تھے۔ بعض اوقات سات سمندر پار کی سوغات ایک میم بھی لے آتے تھے کہ سندر رہے اور وقت ضرورت کام آئے۔"

اب آزاد ملک کے شاہین بچے تعلیم کے بھانے امریکا جاتے ہیں تو وہ بھی وہاں ہی کر سکتے ہیں جو ان کے پشرو کرتے تھے۔ وہ کسی امریکی سینہ سے کانڈی شادی کر کے امریکی شہریت حاصل کر لیتے ہیں یا برسوں غیر قانونی تارکین وطن کی حیثیت سے چھپ چھپا کر گزارتے ہیں اور بالآخر اپنے نام پر سے پاکستانی ہونے کا فیصلہ اتار کے خدا کا شکر بجالاتے ہیں کہ ان کا مستقبل اور آنے والی نسلوں کا مستقبل روپے سے نہیں ڈال رہا ہے۔"

ملک رب نواز نے زمینداری چھوڑنے کے شہری زندگی اختیار کی تو وزارت کی جگہ صنعت اور کاروبار میں دلچسپی لی۔ اسٹیبل میں ان کی آرائشی سیٹ محفوظ رہی مگر گاؤں سے ان کا تعلق صرف اس حد تک باقی رہا کہ وہ سال کے سال زمین کی آمدنی وصول کرتے تھے اور الیکشن کے وقت اپنے ووٹرز سے عہد و قالیے پہنچ جاتے تھے۔ سب جاگیردار وڈیرے عملاً شہری تھے بلکہ بین الاقوامی شہری تھے جو کاروبار یا تفریح کے لیے دنیا کے ہر بڑے شہر سے تعلق قائم کر چکے تھے۔"

ملک رب نواز کچھ محنت اور پریشانی کی وجہ سے بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ شاید اس کا پروگرام کہیں اور جانے یا کسی اور سے ملاقات کرنے کا تھا۔ جنرل نے اچانک آگے اس کے شیڈول کو ڈسٹرب کر دیا تھا۔ عام حالات میں وہ معذرت کر لیتا اور ملاقات کو فرمت ملنے تک التوا میں رکھتا مگر جنرل سے ملنا ضروری ہو گیا تھا۔

اس نے پھر گھڑی دیکھی تو جنرل نے کہا "آپ کچھ جلدی میں معلوم ہوتے ہیں ملک صاحب۔"

"جلدی کوئی خاص نہیں۔ دراصل ایک پرنس میننگ

پہلے سے ملے تھی۔ باہر سے آئے ہوئے ہیں کچھ بندے مگر خیر۔ جب بندے کو دیر سویر ہو جاتی ہے آپ کو ہم انکار نہیں کر سکتے تھے۔"

جنرل نے کہا "ایسی کوئی بات نہیں تھی، ہم پھر آجاتے۔"

"چلو جی چھوڑو اس بات کو۔ ہم نے کھلوا دیا ہے کہ ایک ضروری کام پڑ گیا ہے۔ میننگ آؤس گئے بعد ہو جائے گی۔ مولوی صاحب، آپ کو اُدھر تشریف رکھنے پر تو اعتراض نہیں ہے۔" اس نے لاؤنج کے ایک صوفے کی طرف اشارہ کیا اور خود جنرل کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

وسیع لاؤنج کے دائیں جانب ڈرائنگ روم تھا۔ دونوں کو ایک سرسراہٹے ریشم کا شفاف پردہ علامتی طور پر جدا کرتا تھا۔ انیس الگ کرنے والے شیشے کے بڑے بڑے سلائیڈنگ دروازے تھے اور سیاہ ٹھل کے بھاری پردے بھی تھے جو اس وقت کھلے ہوئے تھے۔

لاؤنج میں ایک طرف کھانے کی لمبی میز تھی جو پتیلیا آرڈر پر بخوانی گئی ہوگی۔ اس کے گرد چوبیس کرسیاں تھیں۔ گیارہ ایک طرف اور گیارہ دوسری طرف۔ دو آئینے سامنے ٹھاس ٹاپ ٹیبل کو روشن رکھنے کے لیے لمبے سے تین فانوس آویزاں تھے۔ لاؤنج کے دوسرے حصے میں سرائیڈ ساؤنڈ میزک سسٹم تھا اور ہوم سینما ٹاپ بہت بڑے اسکرین والائی ویڈیو ریکورڈ کنٹرول ڈیجیٹل سی ڈی اور وی سی ڈی ریکورڈر "ڈش ریسپونڈ"۔ پہلی فائزر اور اسپیکر سب ملا کے لاکھوں روپے کی مالیت کے تھے۔

ڈرائنگ روم کی دست اور آرائش کی شان بھی کم نہ تھی۔ اس میں مجھے اور تصاویر، آرائشی ظروف اور نوارات یوں بھر دیے گئے تھے کہ ڈرائنگ روم ایک گودام لگتا تھا۔ اس میں وسعت اور کشادگی کا احساس ختم ہو گیا تھا۔ زیبائش کے اس انداز سے دولت کے غور کی نمائش زیادہ ہوتی تھی۔ ذوق جمال کا اظہار یوں بھی ملک رب نواز کا مقصد نہ تھا۔ گاؤں سے شہر نکل ہو کے شہری پھر اپنانے والوں کو یہ بات فوراً سمجھ میں نہیں آتی کہ انگریز ڈیکوریشن بھی ایک آرٹ ہے۔ نصف صدی یا اس سے بھی پہلے مغرب کی تہذیب کا لاف انشا علی اختیار کرنے والے انہیں بدستور پہنچا دیا جیتے رہتے ہیں۔

مجھے رب نواز نے ڈرائنگ روم کے باہری لاؤنج میں بٹھا دیا تھا اور خود جنرل کے ساتھ آخری حصے میں جا بیٹھا تھا۔ میرے اور ان کے درمیان تقریباً تیس فٹ کا فاصلہ مائل تھا۔

لیکن اس پر اعتراض نہیں کیا جاسکتا تھا کیونکہ ہر ایک پردے سے میں جنرل کو دیکھ سکتا تھا۔ اگر وہ مجھے لاؤنج کے آخری حصے میں بٹھاتا تو یہ فاصلہ دیکھنا بھی ہو سکتا تھا۔ پھر میں جنرل کو صرف دیکھ سکتا، ان کی گفتگو کو واضح طور پر سناتا اور سمجھتا میرے لیے مشکل ہو جاتا۔

مجھے کچھ لمبی محسوس ہو رہی تھی کہ میرے ساتھ واقعی نوکروں جیسا سلوک کیا گیا۔ ملک رب نواز کے طبقے میں نوکروں کے ساتھ ایسا ہی برحقہ امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔ یہ بات نہ میرے ذہن میں آئی تھی اور نہ جنرل کے جنرل نے مجھے ساتھ رکھنے کے لیے خاصا قائل کرنے والا محسوس ہوا تھا۔ مگر عیار ملک نے اس کا مل بھی نکال لیا تھا۔ اگر جنرل خد کرتی تو شاید مذاکرات شروع ہونے سے پہلے ہی ناکام ہو جاتے۔ کسی نوکر کے ساتھ ایک ہی سطح پر بیٹھ کے بات کرنے میں وہ زیادہ بے عزتی محسوس کرتا۔ مالک صوفے یا تخت پر بیٹھا ہے تو نوکر فرش پر ہو۔ مالک فرش پر بیٹھا ہے تو نوکر دست پر۔ سہ گھڑا رہے نوکروں کے لیے کھانے پینے کے برتن، رہنے کی جگہ، گھر کا ساز و سامان، بیوی بچوں کے کپڑے اور ٹھکے میاں تک کہ تعلیم اور صحت۔ سب اس قدر قرب ہوئے ضروری تھے کہ حاکم و محکوم کا فرق واضح نظر آئے۔

ایسے ہی لوگ شرمندگی کے کسی احساس کے بغیر اپنی سیاسی تقریروں اور بیانوں میں اسلامی اخوت اور مساوات کا ذکر کرتے تھے تو حضرت عزرا اور ان کے غلام کا حوالہ دیتے تھے۔

فاطر قاضی کا بندوبست ملک نے پہلے ہی کر رکھا تھا۔ جنرل کے کہنے پر ایک ملازم نے مجھے بھی چائے لاکر دی مگر اس کے لیے وہ اپنے سوئٹ کو آرڈر سے چینی کا کاک لایا تھا جو اسپرینڈ نہیں تھا چنانچہ گھٹیا تھا۔ ایک دسی پلیٹ میں چند بسکٹ بھی ڈال کر میرے سامنے رکھے تھے۔ میں نے بے عزتی کے اس سلوک پر اپنے غصے کے جذبات کو قابو میں رکھا اور خود کو اس دلیل سے قائل کیا کہ عزت اور ذلت منجانب اللہ ہے۔ مجھے کسی ملک رب نواز کے جمالت آئینہ نگار نہ دویے سے بدل ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ خود میری نظریں ملک کی کون سی عزت ہے۔ نگاہ قمر میں شاہن سکندری کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

"آپ ڈرا جلدی سے دکھادیں وہ تصویریں۔" ملک نے پھر گھڑی دیکھی۔

"ہاں، ان تصویروں سے مجھے تو کچھ اندازہ نہیں ہوا؟"

جنرل نے اپنے بیگ سے وہ تصویریں نکالیں جو اس نے خود

اپنے کمرے سے اتاری تھیں۔ یہ کیا چیزیں ہیں؟“
ملک کی چند سیکنڈ کی خاموشی سے میں نے اس کے رد عمل کا اندازہ کر لیا۔ اسے یقیناً تصویریں دیکھ کے شاک لگا ہوگا۔ وہ ہم سے جھوٹ بول سکتا تھا لیکن اپنے آپ سے نہیں۔ وہ جانتا تھا کہ یہ مال کس بس سے کوئٹہ بھیجا گیا تھا اور غدار، ٹمک حرام ٹیکے نے اس بس کو اغوا کر کے آگ لگا دی تھی۔ اب اسے افسوس ہوگا کہ ڈرائیور نے ٹیکے کو وہیں جان سے مار دیا۔ خبر ڈرائیور کی جگہ وہ خود ہوتا تو یہی کرتا مگر اب بتانے والا کوئی نہیں کہ یہ تصویریں کس نے اتاریں؟ کب اتاریں اور کیسے؟ اتنا تو ملک بھی سمجھ سکتا تھا کہ تصویریں مال کے روانہ ہونے سے پہلے اتاری گئی ہوں گی۔ دوران سفر یہ ٹمکنگ تھا۔ مال مختلف ذرائع سے حاصل ہوتا ہے اور وصول سے پہلے بھی کئی ہاتھوں سے گزرتا ہے۔ اسے پتا چلنا ہی پڑے گا کہ غدار اور ٹمک حرام کہاں بیٹھے ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟ وہ دشمنوں کے ہاتھ میں کھیل رہے ہیں یا خود ملک رب نواز کو بلیک میل کرنا چاہتے ہیں؟ اسے تصویریں ارسال کرنے کا مقصد دھمکی دینے کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟
”آپ کس سوچ میں پڑ گئے ملک صاحب!“ ختم نے

ملک چوٹا ”میں سوچ رہا تھا کہ کیا یہ اتفاق ہے؟ مال تو ہمارا جانا رہتا ہے۔ ہماری اپنی بس ہے۔ خبر سے پہلے کبھی کسی نے یہ حرکت نہیں کی۔ اب ایک ساتھ دو ہاتھ ہوئیں۔ کسی نے مال کی تصویر اتاری اور آپ کو بھیج دی اور پھر آپ کو ٹیلی فون پر کما کہ یہ مال اسمگل کیا جا رہا تھا۔“
”کیا یہ قلعہ ہے؟“

”سب قلعہ ہے۔ جھوٹ ہے اور بکواس ہے۔“ ملک نے کہا۔ ”مگر آپ غور فرماؤ کہ وہی بس تباہ کر دی گئی۔ ہم نہیں مان سکتے کہ یہ کام اکیلے ٹیکے نے کیا ہوگا۔ اتنا ہوشیار نہیں تھا وہ یہ ہو سکتا ہے کہ غصے میں پاگل ہو کے اس نے بس کو اغوا کیا اور آگ لگا دی۔ اس کا ساتھ دینے والی ٹیکے کی اپنی سالی تھی۔ اسے بھی بدلے کی خواہش نے پاگل کر دیا ہوگا۔ آخر بن چھی مرے والی اس کی۔“
”کل ہونے والی۔“ ختم نے کہا۔

”لیکن اس کے قتل کا بدلہ انہوں نے ہم سے کیوں لیا؟“ ملک مشتعل ہو گیا۔

”انہیں یقین ہوگا کہ قتل کے ذمے دار آپ ہیں۔“
”ہم نے اسی لیے پاگل کہا ہے۔ دونوں کو پاگل آدمی کے یقین کی کوئی بنیاد نہیں ہوتی۔ فیکٹ نہ سہی، اس کی وہ

سالی تو زندہ ہے۔ ایک نہ ایک دن ہم خود تلاش کر لیں گے۔ اسے پولیس سمجھ نہیں کرے گی پھر معلوم ہو جائے گا کہ انہیں اس بد معاشی پر کس نے والا کوئی تھا؟“
”یعنی آپ کو شک ہے کہ انتقام ایک ذاتی فعل نہیں تھا ان کا؟“

ملک نے سر ہلایا ”دونوں باتیں ہو سکتی ہیں۔ دشمن بھی ہیں ہمارے۔ بہت۔ کیا پتا انہوں نے ٹیکے کو استعمال کیا ہو۔ یہ تصویریں اتارنے اور فون کرنے والا کام کسی سیانے بندے کا ہے۔ جو بہت سوچ سمجھ کے کام کرتا ہے۔ اور حراس نے ایک دھمکی ہمیں دی، آپ کے ذریعے پیغام بھیج دیا۔ دوسری طرف ٹیکے نے بس اغوا کر کے آگ لگا دی۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اس کی دھمکی صرف دھمکی نہیں ہے۔ وہ ہمارا بیزاغری کر سکتا ہے۔“

”کیا آپ ڈر گئے ہیں ملک صاحب!“
ملک گرم ہو گیا ”تھک کر رہی ہوئی آپ بھی۔ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں سے ڈر جائیں، ہم تو زندہ رہنا مشکل ہو جائے۔ جو ٹھنکے والے کتوں سے شیر نہیں ڈرتا۔ اس کا دشمن بھی شیر ہی ہو سکتا ہے۔ ہم یہی سوچ رہے ہیں کہ ہمارے سامنے یہ دو سرا شیر کون رہا ہے آخر؟“

ختم نے کہا ”کیا ابھی تک جنگل میں ایک ہی شیر تھا۔ صرف آپ تھے اس فیلڈ میں؟ آپ کا حریف کوئی نہیں تھا؟“

”تم کس فیلڈ کی بات کر رہی ہو بی بی؟“

”اسمگلنگ کی فیلڈ؟“ ختم نے بے خوفی سے کہا۔

”کون کتہ ہے اسے اسمگلنگ؟“ ملک بھڑک اٹھا۔

”کسی نے سامنے آئے بغیر ایک فون کر دیا اور آپ نے مان لیا۔ بہت ہوئی تو سامنے آئے ہم سے بات کرتا۔“

ختم نے ملک کی سب گالیوں کو نظر انداز کر دیا ”یہ کیا مال تھا جو آپ کی اپنی بس سروس سے کوئٹہ جا رہا تھا؟“

”یہ کچھ آرٹ کے نمونے تھے۔ ونڈی کرافٹ کا سامان تھا اور نوادرات تھے۔“ ملک نے خود کو سمجھال لیا۔

ختم نے کہا ”مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ آرٹ ڈیلر بھی ہیں۔“

”ہم ایکسپورٹرز ہیں۔ باہر جس چیز کی کھپت ہوتی ہے وہ بھیج دیتے ہیں۔ سب جنرل امپورٹرز ایکسپورٹرز ہی کرتے ہیں۔“

ملک نے کہا۔
”آپ کے پاس یقیناً لائسنس بھی ہوگا؟“
”کیوں نہیں۔ کئی سال سے ہم امپورٹ ایکسپورٹ کے برنس میں ہیں۔ ملک کو لاکھوں ڈالر کا روزِ مبادلہ کما کے دے

چکے ہیں۔ انکم ٹیکس اور ڈیوٹی کی مد میں لاکھوں دیتے ہیں۔“ ملک نے کہا۔

”برانہ نہیں تو آپ بات کون جس راستے سے یہ مال جا رہا تھا؟ وہ کوئی تجارتی راستہ نہیں ہے۔ اور ہرے صرف اسمگلنگ ہوتی ہے۔“

”قلعہ ہے آپ کا یہ خیال۔ افغان ٹرانزٹ ٹریڈ اور ہرے ہو رہی ہے۔ ہر چیز جاتی ہے افغانستان۔“

”ملک صاحب۔ آپ بھی اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ افغان ٹرانزٹ ٹریڈ درحقیقت اسمگلنگ کا قانونی نام ہے۔ جو مال باہر سے افغانستان کے لیے منگوایا جاتا ہے وہ قانونی راستے سے گزر کے واپس پاکستان آ جاتا ہے۔ اس پر ڈیوٹی نہیں دینی پڑتی۔“

وہ بولا ”مس شبنم خیر۔ آپ بھی پاکستانی ہو اور ہم بھی اور ہی رہتے ہیں۔ ہم دونوں کو ہر بات معلوم ہے۔ آپ ہم سے زیادہ جانتی ہو کہ یہاں کیا ہوتا ہے؟ قاعدے کا قانون آخر کس لیے بنائے جاتے ہیں؟ اور کس کے لیے۔؟“
”رشتہ لینے والوں کے لیے۔“

”واہ جی واہ! سولہ آنے ج بات کہہ دی آپ نے چند لفظوں میں۔“ ملک نے کہا ”ابھی کچھ دن پہلے آپ کے اخبار میں ایک خبر شائع ہوئی تھی۔ بڑا زور دار ادارہ بھی لکھا گیا تھا۔ سارے قاعدے کا قانون پورے کر کے کسی نے کھیل باہر بھیجے تھے مگر جب مال خریدار تک پہنچا تو اس میں سے کیا نکلا؟“ ختم نے۔ اس سے پہلے ایک ہمارے ایکسپورٹرز نے ایل سی کھول لیا اور لاکھوں ڈالر کی ایک کھپ میں پھنسے پرائے کپڑے ڈال کے بھیج دیے۔“

”ایسے بے ایمان عمیر فروشوں نے ہی باہر پاکستان کا نام بدنام کیا۔ ہمارے ایکسپورٹرز کی ساکھ خراب کی۔“

”سوال یہ ہے جی کہ کس قسم والوں نے کیا دیکھا؟ مال کیسے پاس ہو گیا؟ قاعدے کا قانون تو بڑے سخت ہیں اور پھر کوئی پکڑا بھی نہیں گیا۔ ایسے ہی ڈراما کرنے کے لیے ایک دو بندے معطل کر دیے جاتے ہیں اور خبر دے دی جاتی ہے اخبار میں۔ کچھ دن بعد وہ بحال ہو جاتے ہیں۔ اللہ اللہ خیر ملا۔ اصل مجرم کبھی نہیں پکڑا جاتا کیونکہ اس کی فرم ہی بومس ہوتی ہے۔“

”اور ایک بومس فرم بلیک لسٹ ہونے سے پہلے ہی وہ دوسری بومس فرم بن لیتا ہے۔“

”بالکل ٹھیک۔ سب انہی کے بندے ہوتے ہیں جی۔ جو قاعدے کا قانون پر عمل درآمد کرانے کے لیے بیٹھے ہیں لیکن

ایک بات بتاؤں آپ کو؟ اسمگلر ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ سب کچھ اپنے رسک پر کرتا ہے۔ اسے پتا ہے کہ منڈی میں اعتبار کی کیا قیمت ہے۔ اس کے علاوہ خریدار بھی اسمگلر ہے۔ وہ بھی قاعدے کا قانون کو نہیں جانتا۔ خود بھیج جاتا ہے یا اپنے بندے کو بھیج دیتا ہے فراڈ کرنے والے کے پاس۔ آپ نے تو سنا ہوگا کہ بے ایمان آپس میں بڑے ایمان دار ہوتے ہیں۔“

”ملک صاحب، میں اس راستے کی بات کر رہی تھی۔“
”اجی دفع کرو۔ وہ کیا کہتے ہیں؟ جہاں جاہ ہے وہاں راہ ہے۔ راستے سب کھلے ہوتے ہیں۔ آپ ہمیں بتاؤ کہ کون سا راستہ کھلا ہوا نہیں ہے۔ بندش کہاں ہے؟ رکاوت ہے کوئی ایسی جو دور دراز کی جا سکے؟“

”یہ تو ٹھیک کہا آپ نے پھر آپ یہ بھی مان لیں کہ آپ کا دھنڈا غیر قانونی ہے۔“ شبنم نے کہا۔

”ایک بارے نامت سے کیا ہو گالی بی!“

”مجھے معلوم ہے کچھ نہیں ہوگا۔“ شبنم نے کہا۔

”پھر کیوں اپنا وقت ضائع کر رہی ہو۔ فرض کرو تم نے بڑی بھاگ دوڑ کر کے ہمارے خلاف ثبوت حاصل کر لیے اور ایک دھماکا کرنے والا مضمون چھاپ دیا اور اس مضمون پر اچانک حکومت کی ساری مشینری ہمارے خلاف حرکت میں آئی۔ ایف آئی اے والوں نے چھاپا مار کے ہمیں گرفتار کر لیا۔ اگلی پچھلی ساری کسٹم ڈیوٹی وصول کر لی۔ سارا مال ضبط کر لیا اور ہمارا سب کا دوبارہ بند کر دیا جسے آپ غیر قانونی کہتی ہو۔ تو آپ کا کیا خیال ہے؟ ملک رب نواز کنگال ہو جائے گا؟ اس کو بیل ہو جائے گی اور اس کے بچے سڑک پر بھیک مانگتے نظر آئیں گے؟ مرا ہوا ہاتھی بھی سوالیہ کا ہوتا ہے مس شبنم۔ ہمارے خاندان میں ہر بچے کے نام پر جتنی جائیداد اور زمین ہے۔“ ملک جذباتی اور مشتعل ہو کے اونچی آواز میں بات کرنے لگا تھا۔

”آپ کے اعتماد میں غور ہے ملک صاحب!“ شبنم نے اس کے خاموش ہوتے ہی کہا ”اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سب آج تک اس ملک میں کسی کے ساتھ نہیں ہوا جو آپ نے مجھے فرض کرنے کے لیے کہا۔“

”اور جو گا بھی نہیں؟ آپ کی دعا ہے۔“ ملک نے ایک نشوونما سے پینٹ خشک کیا۔

”ہاں؟ کیونکہ ابھی آپ میرا مطلب ہے قانون بنانے والے؟ قانون نافذ کرنے والے اور قانون سے ٹھیکے والے؟ سب ایک طرف ہیں۔“
”اور دوسری طرف؟“ ملک نے پرتسخریہ میں کہا۔

"دوسری طرف ہیں اس ملک کے بے بس عوام اور ان سے زیادہ بے بس عدالتی نظام چلانے والے۔"

ملک نے کہا "آخر کسی میں بہت کیوں نہیں ہے؟ یہ جو بڑے چور اور بڑے ڈاکو ہیں اسٹیکر اور کسی مافیہ کے سربراہ ہیں ان کی طرف سب انگلی اٹھاتے ہیں اخبار والے بیوسن رائٹس کے مداری اور اپوزیشن والے لیکن ان پر ہاتھ کوئی نہیں ڈالتا؟"

"یہ آپ بتائیں مجھے، آپ بھی پہلے حکومت میں تھے آج آپ حزب اختلاف کے ساتھ ہیں۔"

وہ ہنسنے لگا "اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ سچ پوچھو تو اپوزیشن بھی حکومت کا ایک حصہ ہوتی ہے۔ ہم تو کہتے ہیں کہ قائد حزب اختلاف کا نام بدل کے وزیر اختلاف رکھ دینا چاہیے اور حزب اختلاف کو وزارت اختلاف کہنا چاہیے۔"

"VERY FUNNY" جنہم نے تکی سے کہا۔

"یہ مذاق نہیں ہے مس جنہم جیسی بھی ہے مگر حقیقت ہے۔ آج ہم جو بیان بازی کر رہے ہیں حکومت کے لیے کر رہے ہیں۔ کل جب ہماری حکومت ہوئی تو آج کے حکمران بھی یہی کریں گے۔ ابھی اس سے اخبار والوں کو سرخیاں اور کالم لکھنے والوں کو مواصلات ہے اور پبلک کو بھی بحث مباحثہ کے لیے موضوع چاہیے۔ عوام فارغ ہیں اور کچھ نہیں کر سکتے تو لا حاصل بحث کرتے ہیں۔"

جنہم نے قدرے توقف کے بعد کہا "ملک صاحب۔ آپ بڑے لکھے آئی ہیں کیا آپ دل پر ہاتھ رکھ کے ایک سچ بول سکتے ہیں؟"

"سچ؟ کیسا سچ؟"

"سچ میں کون سا رنگ نسل یا عقیدے کا فرق ہوتا ہے ملک صاحب۔ میرا اور آپ کا سچ الگ نہیں ہو سکتا۔ آپ مجھے بتائیں کہ ایسے کوئی ملک چل سکتا ہے جیسے پاکستان چل رہا ہے؟"

"کیا ہوا ہے پاکستان کو۔ ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے۔"

"آپ لوگ قرض لیے ہیں اربوں کے مگر واپس نہیں کرتے۔ زکوٰۃ کیا؟ آپ ٹیکس تنگ ادا نہیں کرتے۔ بجلی کا بل ادا نہیں کرتے جس سے آپ کے کارخانے انٹرکنڈیشنر اور ٹیوب ویل چلتے ہیں۔ ٹیلی فون اور گیس کے بل نہیں دیتے۔"

ملک نے بے زاری سے کہا "دیکھو جی، اگر اس نظام میں خرابی ہے تو کیا ہماری وجہ سے؟ کیا ہم نے منع کیا ہے کسی کو دوسری سے؟ کوئی آٹا ہی نہیں۔"

جنہم نے اس کی بات کاٹ دی۔ "واجبات کی ادائیگی کے لیے خود آپ کو جانا چاہیے۔ یہ آپ کا فرض ہے۔"

"فرض" ملک نے تھکے لگایا "یعنی ہم لائن میں کھڑے ہو جائیں کسی بینک کے باہر فٹ پاتھ پر ادھوپ میں؟"

"آج آپ جس سکتے ہیں ایسی باتوں پر۔ دوسرے ہیں عوام مگر دیکھنا ہے ملک صاحب کہ آخر میں کون کس پر ہنستا ہے۔ جس شاخ پر آپ بیٹھے ہوں اسے کب تک کاٹ سکتے ہیں اور کب تک خود کو محفوظ سمجھ سکتے ہیں۔ بالآخر آپ ہی نیچے گرے گئے جو نیچے کھڑا ہے۔ وہ درخت کا مالک ہے۔"

ملک نے ناگوار سی سے اپنی گھڑی دیکھی "اچھا جی بہت باتیں ہو گئیں فضول۔ اب کوئی کام کی بات پوچھیں تو پوچھ لیں۔"

شاید جنہم کو بھی احساس ہو گیا کہ جذبات کی رو میں برے کے اس نے مطلب کی بات تو ابھی تک کی ہی نہیں تھی۔ "یہ آرٹ کے نمونے اور نوادرات آپ کہاں سے حاصل کرتے ہیں جو باہر بیچے جاتے ہیں۔"

"ہر جگہ سے۔ ملک بھر میں ہمارے ایجنٹ ہیں جو ایسی نایاب چیزیں تلاش کرتے ہیں اور خریدتے ہیں۔"

"نایاب خاتون سے۔"

وہ بھرپور ہنسنے لگا "کیا عجیب خانے نوادرات فروخت کرنے والی دکانیں ہیں مس جنہم؟ یہ چیزیں ہم لوگوں سے خریدتے ہیں۔ یہاں ٹیکسوں، بزاروں گردش زمانہ کے ہاتھوں تباہ اور مفلس ہو جانے والے خاندانی رئیس اور نوادوں کے گھرانے ہیں۔ ان کے پاس آٹا و اجودا کی ٹیکسوں نشانیاں ہیں۔ کچھ ان کی اصل قدر و قیمت کو جانتے ہیں اور اشد ضرورت میں کوئی چیز بیچ دیتے ہیں لیکن ایسے بھی بہت ہیں جن کے پاس لا تعداد اشیاء کاٹھ کباڑی طرح بڑی ہیں۔"

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ تاریخی اہمیت رکھنے والی چیزیں اور نوادرات ملک سے باہر نہیں جاسکتے۔ قانونی طور پر پابندی ہے۔ جنہم نے کہا۔"

وہ ہنسنا بند کر دیا "بالکل ہے جی۔ ہم بھی ایسی کوئی چیز باہر نہیں بھیجتے کوئی بھیجتا ہے تو اسے پکڑاؤں۔"

جنہم نے کہا "ملک صاحب۔ یہ گفتگو آف دی ریکارڈ ہے۔ آپ میرے بیک مین دیکھ لیں۔ میں نے کچھ بھی ریکارڈ نہیں کیا ہے۔"

وہ مسکرایا "ہمارے سیکورٹی گارڈ دیکھ لیں گے جب آپ واپس جائیں گی۔ کیرے کی فلم ہو یا کیسٹ۔ وہ نکال لیتے ہیں۔"

"میرا مطلب تھا کہ آپ خواہاں ڈر رہے ہیں۔"

اس نے طنز سے کہا "آپ سے کون نہیں ڈرتا جی اب اجازت دیں ہمیں۔"

"ایک آخری بات" جنہم نے کہا "شاہ عالم کے ساتھ آپ کے نیسے مراسم تھے؟"

"جیسے سیاست میں سب کے ہوتے ہیں" اس نے گول مول جواب دیا۔

"یعنی اس کے ساتھ ذاتی اور کاروباری تعلقات بالکل نہیں تھے؟"

وہ کھڑا ہو گیا "بالکل نہیں۔"

"پھر آپ اسے کیوں تلاش کر رہے ہیں؟ کیوں پریشان ہیں اس کا پتا حاصل کرنے کے لیے؟"

"فرض کرنے کا کیا ہے کوئی آپ کو ہمارے ساتھ دیکھ کے فرض کر سکتا ہے کہ ہمارے نابازر مراسم ہیں اور ہم شادی کرنے والے ہیں آپ سے۔"

جنہم نے اس سے بڑھ کر جواب کا برا نہیں مانا "لیکن میرے پاس ثبوت ہے ملک صاحب۔"

"کیا ثبوت ہے؟" وہ چونکا ہوا تھا۔

"آپ نے رخشندہ کو فون کیا تھا۔ شاہ عالم کی سابقہ بیوی کو۔ یہ پوچھنے کے لیے کہ وہ کہاں ہے؟"

ملک نے اخبار اٹھایا "وہ لندن میں ہے۔ یہ تصویر اور خبر ملاحظہ نہیں فرمائی آپ نے شاید۔ اگر پتا کرنا ہو تو ہم اس ماڈل جینی کرسٹوفر کو آسانی سے تلاش کر سکتے ہیں۔ ہر ایڈورٹائزنگ ایجنسی سے اس کا پتا مل جائے گا پھر ہمیں کسی رخشندہ کو فون کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"مگر آپ نے دھمکی دی تھی اسے اور اس نے آپ کی آواز کو اسے ٹیپ ریکارڈ پر محفوظ کر لیا تھا۔"

جنہم کی بات کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ ملک ذرا سی دیر کے لیے خاموش کھڑا رہا پھر اس نے کہا "اس سے کہیں کہ ہمارے خلاف پراچا کاٹاؤ۔ اس کیسٹ کی بنیاد پر۔"

جنہم نے دوسرا حملہ کیا "آپ کے آئی اسے گھر سے اٹھانے بھی گئے تھے مگر ان سے ایک بے وقوفی ہو گئی۔ ان میں سے ایک ٹیلی فون کا تار کاٹنے پول پر چڑھا تھا کہ رخشندہ نے اندر سے دیکھ لیا اسے شک ہو گیا۔"

"دیکھیں جی بہت سی لی ایم نے آپ کی بکواس۔ آپ عورت ہو اس لیے عزت سے رخصت کرنے پر مجبور ہیں۔ اخبار والا ہونا کوئی تو ہم اسے ننگا کر کے سو جوتے مارتے اور کتے کے بھونکنے کی ضرورت نہیں۔ جو چاہتا ہے ہمارے

خلاف چھاپ دو، ہم منٹ لیں گے آپ بھی کسی غلط فہمی میں مت رہنا، ہم اخبار کے ایڈیٹر سمیت اس کے مالک کو بھی خرید سکتے ہیں اور اس وقت بھی بڑے طرہ خاں اور توپ خم کے اخبار والے ہماری جیب میں ہیں۔ ٹاؤنلیر، ٹرٹ آؤٹ۔"

جنہم اٹھ کھڑی ہوئی "میں بھی واضح کروں آپ پر ملک صاحب کہ اس ملک میں ایک سے بڑھ کر ایک ہائے خاں کو صرف پریس نے ٹیکل ڈالی۔ کسی صحافی سے ٹکر لینے کی بہت کوئی جبریل یا فیملہ مارشل بھی نہ کر سکا۔ آپ جیسے ملک اور چوہدری خان اور وزیرے تراڑ میں مل کر جیتے ہیں۔ ہارس ٹریڈنگ کی پیداوار ہیں۔"

میرا خیال تھا کہ اب ملک رب نواز کے غصے کا شعلہ ایک آتش فشاں بن جائے گا۔ وہ جنہم کو ٹھہرنے مار سکتا بھی گالیاں اور دھکے دے کے نکال دے گا مگر اس کا نتیجہ الٹا نکلا۔ جیسے ہسپتال کے مریض کو ٹھہر ہوش میں لے آتا ہے ایسے ہی جنہم کے جارحانہ لہجے نے ملک رب نواز کو سنبھلنے پر مجبور کر دیا۔

اس سے پہلے کہ میں اٹھتا، جنہم باہر جانے والے راستے پر قدم بڑھا چکی تھی۔ ملک اس کے پیچھے لگا "دیکھئے مس جنہم، آئی ایم سوری، اوور ڈرائیو میں کچھ ملنڈر پشیر کا عارضہ ہے۔"

"وقت آنے کا تو سارے عارضے دور ہو جائیں گے ملک صاحب۔ وقت سب پر آتا ہے۔ جنہم نے چلنے ہوئے کہا۔

"ہم کچھ ذہنی طور پر اپ سیٹ تھے جس کو آگ لگانے والی بات کوئی معمولی نہیں۔ اوپر سے یہ دھمکی۔ بھول جائیں جو ہم نے کہا۔ ہم شرمندہ ہیں۔"

جنہم رک کے مسکرائی "میں حیران ہوں کہ آپ جیسے لوگ بھی شرمندہ ہونا جانتے ہیں۔ خیر کوئی بات نہیں۔"

"NO HARD FEELINGS" ملک نے خوشامد انداز میں کہا۔

جنہم نے تکی میں سر ہلایا۔ "NONE۔"

ہمارے باہر آتے ہی ایک لمبی ترنگی عورت نے جنہم کا راستہ روک لیا "اگر کیرا یا ٹیپ ہے تو کھادو۔" اس نے سپاٹ لیے میں کہا۔

"کیرا میں نے استعمال ہی نہیں کیا" جنہم بولی۔

ملک نے اس عورت کو اشارہ کیا "راستہ چھوڑ دو۔"

میرا خیال ہے کہ ملک نے ایسا خطاب کے لیے کیا۔ وہ غصے میں اچانک آؤٹ ہو گیا تھا اور اپنی غلطی کا احساس ہونے ہی اس نے معافی مانگ کے معاملے کو خراب ہونے

سے بچایا تھا مگر خیر کمالی کے جذبات کا عملی اظہار کرنے کے لیے اس نے ختم کو حلاشی سے EXEMPT کر دیا۔ شاید اسے ختم کی بات پر پہلے ہی اعتبار تھا کہ یہ ملاقات آف دی ریکارڈ ہے اور اس نے کچھ بھی ٹیپ ریکارڈ نہیں کیا۔ گیت کے پاس پہنچ کے ملک کو یاد آیا "مس ختم! آپ نے ایک چیز لانے کے لیے کہا تھا۔"

"ایک سواری کا سارا" ختم بولی "پہلے میں جاننا چاہتی ہوں کہ اس کی کیا اہمیت ہے۔"

"اہمیت یہ ہے کہ وہ تین لاکھ کی چیز ہے۔ اس کا باقی حصہ میرے پاس ہے مگر سر کے بغیر دھڑکی دلیو مفر ہے۔"

"کمان سے برآمد ہوا تھا وہ مجسمہ؟ ٹیکسلا سے یا موہنجودڑو سے؟" ختم نے کہا۔

"کیس سے بھی نہیں" ملک نے مسکرا کر کہا۔

"تو کیا ٹکڑوں کی صورت میں کسی میوزیم سے نکالا گیا تھا؟"

ملک کے تیزی سے بدلتے ہوئے رنگ نے یہ راز فاش کر دیا کہ ختم کا اندھیرے میں چلایا ہوا تیرنٹا نے پر جا لگا ہے مگر وہ بہت قیام آدمی تھا۔ اگلے لمحے میں اس کی صورت کے تاثرات پھر بدل گئے۔ اس نے ایک نقد لگایا "ایسا لگتا ہے جی کہ آپ جاسوسی کمانیاں بہت پڑھتی ہو۔ آپ کا ذہن ہر معاملے میں جرم کا پہلو تلاش کرتا ہے۔ وہ ایک مجسمہ ساز نے بنایا تھا۔ ہم نے اس سے اپنے لیے خرید لیا تھا۔ یہاں لاتے ہوئے گرے کر ٹوٹ گیا۔"

ختم اسے یوں دیکھتی رہی جیسے وہ ایک بچہ ہے جو اپنی کسی غلطی سے ہونے والے نقصان کو چھپانے کے لیے ایک بے سرو پا جھوٹ بر بنی کمانی بنا رہا ہے اور خود بھی سمجھتا ہے کہ اس میں یقین کرنے والی کوئی بات نہیں۔

"میرے دل میں اس مجسمے کو دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہو گیا ہے ملک صاحب۔ یہ کس مجسمہ ساز کے فن کا کمال ہے؟"

ملک نے ہونٹوں پر زبان پھیری "آپ نہیں جانتیں اسے غیر معروف سا بندہ ہے۔ مجسمہ آپ ضرور دیکھنا پورا ہونے کے بعد۔"

"آپ کیا کریں گے؟ سر کو دھڑکے ساتھ کیسے جوڑیں گے؟"

ملک نے بے چینی سے گڑی دیکھی "جوڑ لیں گے جوڑنے والے آپ یہ بتاؤ وہ ہے کہاں؟"

"وہ بالکل محفوظ ہے۔ آج جلدی میں مجھے ساتھ لانا یاد نہیں رہا۔ خیر! اگلی دفعہ میں خود لے کر آؤں گی۔ اب آپ

نے بتا دیا کہ اتنی قیمتی چیز ہے تو اس کی حفاظت بھی ضروری ہے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ پاکستان کے گناہ مجسمہ سازوں کی تخلیق بھی اتنی مضبوط ہو سکتی ہے۔ عام تاثر تو یہی ہے کہ یہاں فنکار بھوکے مرتے ہیں۔ خصوصاً مقنن اور مجسمہ ساز۔" ختم نے کہا۔

اس وقت تک چوکیدار نے گیت کھول دیا تھا اور خود منوذب ہو کے ایک طرف کھڑا ہو گیا تھا۔ باہر آتے ہی میری نظر اس جگہ گئی جہاں گاڑی کو ہوتا چاہیے تھا مگر گاڑی وہاں نہیں تھی۔

ختم نے پریشانی سے کہا "گاڑی کہاں گئی ہماری؟"

میں نے چوکیدار سے پوچھا "گاڑی کہاں گئی ہماری؟"

وہ بدحواس ہو گیا "جتنے مجھے نہیں معلوم۔ گڑی تو یہاں کی تھی تم نے لیکن میں اندر تھا۔"

"گاڑی چوری ہو گئی اور تم نے نہیں دیکھا؟" ملک نے کہا۔

وہ گھبرا گیا "ملک صاحب۔ قسم خدا کی میں اندر تھا۔ میں باہر گیا ہی نہیں۔"

اگلے پانچ منٹ لا حاصل پوچھ چکے اور بھاگ دوڑ میں گزرے۔ ملک رب نواز کے حکم پر ملازم ادھر ادھر گاڑی کو ہوں تلاش کرنے لگے جیسے وہ کوئی نادان بچہ ہے جو موقع پا کر گھر سے نکل کے محلے میں گم ہو گیا ہو اور اس کے بارے میں یہ اطمینان ہو کہ وہ کہاں جا سکتا ہے۔ محلے کی کسی گلی میں نہ ملا تو مسجد سے اعلان کرادیں گے اور کوئی اسے لے آئے گا۔

گاڑی کو نہ ملتا تھا نہ ملی۔ دس منٹ بعد ملک رب نواز نے بڑے افسوس کے ساتھ اعلان کر دیا کہ گاڑی چوری ہو گئی ہے۔ یہ تو اب معمول ہو گیا ہے جی لاہور میں۔ کون سی گاڑی تھی آپ کی؟"

ختم نے کہا "سوزی ایف ایکس تھی۔ چوراسی ماہ۔"

ملک نے سر ہلایا "چلو پھر خیر ہے۔ زیادہ نقصان نہیں ہوا۔"

ختم نے تنہی سے کہا "ملک صاحب۔ میرے لیے وہ آپ کی بے جیرو یا لینڈ کروڈر سے کم نہیں تھی۔ سیکنڈ ہینڈ خریدی تھی میں نے ساتھ ہزار میں مگر بڑی مشکل سے میں نے پالیس ہزار ادا کئے تھے اور پھر میں ماہ تک ایک ہزار روپے ماہانہ ادا کرتی رہی تھی۔"

"میرا مطلب تھا اس ختم کہ گاڑی مل جائے گی آپ کو۔"

"آپ تو اتنے یقین کے ساتھ کہہ رہے ہیں جیسے کوئی خاص علم ہے آپ کے پاس یا روحانی طاقت ہے۔" ختم نے کہا۔

ملک مسکرایا "حوصلہ رکھو لی! اویسے تو آپ کی رپورٹ پر ڈی آئی جی سارے شہر کی پولیس کو پیچھے لگا دے گا لیکن پولیس سے زیادہ یہ ہماری ذمہ داری ہو گئی ہے۔ گاڑی تو پھر گاڑی ہے۔ ہمارے کسی مسماں کی جو بی بی چوری ہو جائے تو بڑے شرم کی بات ہے ہمارے لیے۔"

"گاڑی تو باہر سے چوری ہوئی ہے سڑک پر سے۔ آپ کے گھر کے اندر نہیں تھی۔"

"پھر کیا ہوا؟" آپ مجھ سے ملنے آئی تھیں۔ اب آپ گاڑی کی فکر چھوڑ دو۔ تسلی سے گھر جاؤ۔ گاڑی آپ کو مل جائے گی۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کے بولا "چلو ہم چھوڑ دیتے ہیں آپ کو اپنی گاڑی میں۔"

ختم بہت افسردہ ہو گئی تھی اور کچھ سوچ رہی تھی۔ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ ملک کی باتوں نے اسے بھی شک میں مبتلا کر دیا ہو گا۔ میں اس پورے EPISODE میں اپنے رول کی وجہ سے خاموش رہنے پر مجبور تھا۔ میں ختم کا ڈرائیور اور

بازی گارڈ تھا اور ملک کی نظروں میں میری اوقات ایک نوکر سے زیادہ نہیں تھی چنانچہ میں نے مالکوں کی گفتگو میں بالکل دخل نہیں دیا تھا۔ مجھے بھی شک تھا کہ گاڑی چوری نہیں ہوئی چوری کرائی گئی ہے۔ اس کی ایک سے زیادہ وجوہات ہو سکتی تھیں۔ ملک کا خیال ہو گا کہ مجسمے کا سر گاڑی میں ہے تو اسے قایم کر دیا جائے یا وہ گاڑی کی حلاشی لے کر دیکھنا چاہتا ہو گا کہ ختم نے اس کے خلاف کیا مواد اکٹھا کیا ہے۔ وہ کہہ چکا تھا کہ آپ میرے معاملات میں ضرورت سے زیادہ ملوث ہو۔ یہ اتفاق نہیں ہو سکتا کہ مورٹی کا سر آپ کے پاس پہنچ گیا پھر قیام آپ کے پاس پہنچا اور اب یہ تصویریں

مجھ کی کسی نے آپ کو بھیج دیں اور میرے خلاف فون پر اسٹنگلنگ کا الزام بھی عائد کر دیا۔ کسی نے آپ کو اغوا کیا اور نام میرا بدنام ہوا۔

وہ ختم کے اس جواب سے مطمئن نہیں ہوا تھا کہ لوگ سامنے آکے کچھ کہنے کی ہمت نہ رکھتے ہوں اور تھانے پھری سے ڈرتے ہوں تو اخبار والوں سے رجوع کرتے ہیں مگر سارے شہر میں ایک ختم ہی کیوں جس کو ملک رب نواز کے سارے ذاتی سیاسی اور کاروباری معاملات کی خبر ملے اخبار والے اور بھی بہت ہیں جو اپنے پیسے کے میدان میں غازی اور مجاہد ہیں۔

ملک رب نواز کے لیے ایک شاہانہ شان رکھنے والی سیاہ رنگ کی چمکی دیکھی لینڈ کروڈر نکالی گئی۔ ڈرائیور کو اس نے پیچھے بیٹھنے کا حکم دیا اور خود اس کی جگہ بیٹھ کے لیے آگے والا دو سرا دروازہ کھول دیا۔

ختم اپنی جگہ کھڑی رہی "میرا خیال ہے کہ پہلے مجھے اس چوری کی رپورٹ کھوانے کے لیے تھانے جانا ہو گا۔"

"آئی جی کی کیا ہے؟" ہو سکتا ہے گاڑی مل جائے کے لیے

ہو تا ہے اکثر شہین اور حرای لوگے شغل ملنے کے لیے گاڑی اور پھر چھوڑ دیتے ہیں کیس۔"

"گاڑی کسی پکڑ میں پڑنا نہیں چاہتی۔"

ملک نے کہا "چکر میں پڑتا ہے عام آدمی۔ آپ تو خاص چیز ہو۔"

ختم نے سیکھے لمحے میں کہا "میرا پتہ نہیں مجھے چیز نہ سمجھیں ملک صاحب۔ نہ کھیلنے کی چیز اور نہ نمائش اور نہ خرید و فروخت والی چیز۔"

ملک جھنجھپ گیا۔ "سوری جی۔ ہمارا مطلب تھا کہ اتنی بڑی صفائی ہو۔ آپ پر کون شک کر سکتا ہے اور پھر آپ کے گواہ ہیں ہم آپ ہمارے ساتھ تھیں۔"

"میرا خیال ہے آپ جائیں۔ میں رپورٹ ضرور کھوانا چاہتی ہوں۔ یا پھر آپ بھی گواہی کے لیے میرے ساتھ تھانے چلیں۔"

اس نے بڑا سامنا بنایا "لو جی! آج تک تو ہم چھوٹی موٹی بات کے لیے تھانے گئے نہیں بڑی بات ہو تو تھانے دار کو بلا لیتے ہیں اور ہی۔ اپنے ڈیرے پر تھانے جانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"گاڑی میں میرا رپورٹ بھی تھا۔" ختم نے کہا "اس کا لائنس ہے میرے پاس۔ اس وجہ سے فوراً رپورٹ کھوانا اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔"

"آپ چلو پھر آپ ادھر ہی تشریف رکھو کچھ دیر۔" ملک نے موبائل فون اٹھا کے کوئی نمبر ڈائل کیا۔ "ہاں بھی ڈیوٹی افسر صاحب! انچارج کدھر ہے اچھا! محنت پر کدھر نکلا ہے۔ مشرق کی طرف یا مغرب کی طرف۔ ادوار میں ملک رب نواز بول رہا ہوں۔ ایم پی اے۔ ہاں! اب آئی سمجھ میں بات۔ کیسا بندہ ہے تو اتنی دیر سے قائم برادر کر رہا ہے ہمارا۔ اوسے موبائل نمبر دے انچارج کا۔ میں خود بات کرتا ہوں اس سے۔"

اس نے دوسرے نمبر پر براہ راست انچارج تھانہ سے بات کی اور اسے فوراً رپ نوٹس ہاؤس پہنچنے کی تاکید کی۔ ملک رپ نوٹس کے لیے جسے میں حاکمیت کا غور اور غور تھا۔ عام آدمی کو تھانے میں حاضر ہونے کے بعد بھی انچارج صاحب کے دیدار کی سعادت حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے ماتحت مختصراً ڈیوٹی افسر ہر شخص سے اور ہر معاملے سے اس کی اہمیت کے مطابق غصے کا ہنر جانتے ہیں۔ اول تو کسی واردات کی ایف آئی آر کوٹا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ تھانے کے علاقے میں جرائم کی صورت حال کا ریکارڈ درست رکھنے کے لیے وہ سنگین ذہنی کی واردات کو پھوٹی مولی چوری قرار دینے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ ڈاکو گھر میں گھس کے مار پیٹ کر ہیں اور سب سمیٹ کر لے جائیں یا راہ چلتے گاڑی چھین لیں تو ان کا اصرار ہوتا ہے کہ مال کی گمشدگی یا کار کی چوری کو نامعلوم چوریوں کے کھاتے میں ڈال دیا جائے۔ ڈاکو کون تھے؟ کتنے تھے؟ کیسے تھے؟ یہ سب لکھا جائے تو پھر معاملہ لمبا ہو جاتا ہے۔ انہیں ملزمان کی شناخت اور تلاش اور مال برآمد کرنے میں اپنی کوشش کا حوالہ بھی دینا پڑتا ہے اور فائل آسانی سے بند نہیں ہوتی۔

ہمارے ساتھ معاملہ برعکس تھا۔ جنم خود ایک رپورٹر تھی اور پولیس والے اپنے افسروں کے علاوہ صرف اخبار والوں سے ڈرتے ہیں جو چاہیں تو رانی کا پہاڑ بنا کے سرخی لگا دیں اور سارے شہر میں ڈھول پیٹ دیں اور نہ چاہیں تو پہاڑ گورانی کے برابر بھی اہمیت نہ دیں پھر جنم اس وقت ملک رپ نوٹس ایچ بی اے کے دولت خانے میں مسمان تھی جب کار چوری ہوئی چنانچہ معاملہ دینی اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ انچارج تھانہ خود رپورٹ لکھنے کے لیے حاضر کیے نہ ہوتا۔ ملک نے کہا ”آپ اندر تشریف رکھو گی۔ ہم تو پہلے ہی بہت لیت ہو گئے ہیں۔ تھانے دار ابھی دس منٹ میں آجائے گا خیر۔“

جنم نے سہلایا ”گاڑی میں ایک رپو اور اور بھی تھا۔“ ”میں لائنس والا۔“ ملک مسکرایا ”چلو خیر۔ اس کا ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ملتا ہے مل جائے ورنہ ہم آپ کو دوسرا دے دیں گے۔ اچھا جی، اب مجھے اجازت دیں۔“

ملک چلا گیا تو ہمیں ایک بار پھر اندر لے جاکے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا۔ دس منٹ تو کتنے کی بات تھی۔ تھانے دار کا آدھے گھنٹے سے پہلے آنا مشکل تھا پھر بھی یہاں بیٹھ کے انتظار کرنا تھانے جانے کے رپورٹ لکھوانے کی پریشانی سے بہتر

تھا۔ جنم گاڑی کے چوری ہونے پر بہت افسردہ تھی۔ ”مجھے وہ گاڑی بہت عزیز تھی۔“ ”گاڑی استعمال کی ایک چیز ہوتی ہے۔ چوری ہوتی ہے، فوٹ پھوٹ جاتی ہے تو لوگ بدل بھی لیتے ہیں۔ شوق بھی نئی گاڑیاں خرید لیتے ہیں لوگ اور گاڑی کوئی یوی تو ہوتی نہیں کہ ساری عمر کا رشتہ رہے اس کے ساتھ۔“ ”مردوں کا کیا ہے یویوں کو بھی چھوڑ دیتے ہیں“ وہ بولی ”اور جیسے چار گاڑیاں خریدتے ہیں“ ایسے ہی چار یویاں رکھ لیتے ہیں۔“

میں نے فس کے کہا ”آج کل تو ایک بھی نہیں ہے میرے پاس۔ نہ یوی اور نہ گاڑی۔ میں ریس کی گاڑی میں پھر رہا تھا یا پھر تھماری اس کھارا میں۔“ ”وہ جیسی بھی تھی میری اپنی تھی۔“

”بالکل سچی اور امید ہے وہ مل جائے گی۔ نہ ملے تو اس کے لیے اتنا سوگ منانے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم کل ہی بازار جاکے دو گاڑیاں خرید لیں گے ایک میری ہوگی دوسری تھماری۔ جو تمہیں پسند آجائے بتا دیتا۔“

وہ مجھے دیکھتی رہی ”ایسی آخر تم نے پہلے بھی کئی بار دی ہے۔“

”پہلے یعنی جب میں شاہ عالم تھا؟“ ”ہاں۔ تم نے ایک بار کہا تھا کہ ان دونوں گاڑیوں میں سے جو پسند ہے وہ لے لو۔ ایک بنڈا کا اور دوسری لینڈ کروزر۔“

میرے لیے یہ ایک انکشاف تھا ”دیکھو“ اس وقت کی بات اور تھی۔ میں قیمتی تھے تحائف دیتا رہتا تھا۔ اس میں خلوص نہیں کوئی غرض شامل ہوتی تھی۔“

”میں نے اسی لیے انکار کر دیا تھا۔ میں تم سے اپنی قیمت کے طور پر تاج محل بھی قبول نہ کرتی۔ اپنی اس کھارا کے ساتھ میری ایک جذباتی وابستگی تھی۔ اسے میں نے اپنی عزت کی کمائی سے خریدا تھا۔ حق حلال کی کمائی سے۔ توڑا توڑا بچاکے ورنہ ایک گاڑی کا کیا تھا؟ میں کسی کو ایک میل کر کے جو گاڑی چاہتی، لے سکتی تھی۔ لوگوں نے گاڑی کیا کوٹھیاں تک لی ہیں رشوت میں۔ ہماری صفائی برادری میں بھی کچھ لوگ یہ کام کرتے ہیں۔ انہیں کسی مجربانہ انکشاف سے چشم پوشی خاموشی یا رازداری کی من مانی قیمت مل جاتی ہے۔“

وہ دیو زاد قسم کی عورت جس نے کچھ دیر پہلے جنم کے بیک کی تلاشی لینے کی کوشش کی تھی ”بڑے پراسرار انداز

میں ایک پردے کے پیچھے سے نکل کے سامنے آگئی ”آپ کو بیگم صاحبہ نے یاد کیا ہے۔“ ”جنم نے اتنا غور سے دیکھا ”بڑی اچھی بات ہے مگر ان سے کہو کہ اللہ کو یاد کیا کریں۔“ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نمایاں نہ ہوا ”آپ کو بلایا ہے بیگم صاحبہ نے اندر۔“ ”میں اندر جاؤں گی تو یہ بھی میرے ساتھ جائیں گے“ جنم نے میری طرف دیکھا۔

”زمان خانے میں غیر مرد نہیں جا سکتے۔“ وہ بولی۔ ”یہ میرے لیے غیر نہیں ہیں اور اس پابندی کے ساتھ مجھے اندر جاکے بیگم صاحبہ کو سلام کرنے کا کوئی شوق نہیں“ جنم نے کہا۔

وہ عورت چلی گئی مگر جاتے جاتے اس نے جس طرح مجھ پر اور جنم پر ایک جلائی نظر ڈالی تھی ”اس میں پیچھے ہوتی دھمکی بہت عیاں تھی پھر ایک خادم نے کھانے کی میز پر تن لگانے شروع کئے۔ ایک اور خادمہ کھانے کے ڈوٹے اور ڈشیں لا کے رکھنے لگی۔ یہ ہمارے لیے دوپہر کے کھانے کا اہتمام ہو رہا تھا۔ ملک صاحب کی حویلی میں کھانے کے وقت موجود مسمانوں سے پوچھا نہیں جاتا تھا کہ کیا آپ لچ کریں گے میرا یا جنم کا آج بھی کھانے کا کوئی موڈ نہیں تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ جلد از جلد تھانے دار آکے ہماری رپورٹ درج کر لے۔“

جس پردے کے پیچھے دیو زاد خادمہ غائب ہوئی تھی وہ ایک بار پھر اٹھ اور میں نے اپنے سامنے ایک ایسی عورت کو دیکھا جو ملک رپ نوٹس کی پوری ہی ہو سکتی تھی۔ اس نے ریٹھی شلوار قمیص کے ساتھ قیمتی شال اوڑھ رکھی تھی۔ اس کے باوجود گلے اور ہاتھوں میں پہنا ہوا سونے کا بھاری زیور اور ان میں جڑے ہوئے خیر کن جواہرات بہت نمایاں تھے اور دولت مندی کی شان کا کھلا اشتہار لگتے تھے۔ مجھے قیمتی پتھروں کی یا ان کی مالیت کی کوئی پہچان نہیں مگر اس کا اندازہ تو ہنسنے والے کا اندازہ دیکھ کے بھی کیا جا سکتا ہے۔ ملک کی ایک غوری جتنی ضرورت سے زیادہ صحت مند چالیس سال کی شاندار عورت تھی۔ میں صرف اس لیے کھڑا ہو گیا تھا کہ اندر آئے والی ایک عورت تھی مگر اس نے سلام نہیں کیا تو میں بھی خاموش رہا۔

ملک کی نے جنم کو محور کے کہا ”تجھے کوئی تیز نہیں سکھائی تیرے ماں باپ نے۔“ جنم نے پرسکون لہجے میں کہا ”میری سوال میں آپ سے

کر سکتی ہوں۔ اندر“ نے والے کو سلام میں پل کرنا چاہیے۔“ ”بڑی لمبی زبان ہے تیری۔ میں نے سنا کہ اخبار کے دفتر میں کام کرتی ہے تو؟“ ملنے سے تو کھتا ہے کہ فلموں میں کام کرتی ہوگی۔ ”ملک کی بڑے رعب سے میرے سامنے بیٹھ گئی۔ ”اس فضول بات کا میں کیا جواب دوں؟“ جنم نے کہا۔

”اخبار میں کیا کام ہے تیرا؟“ ”INVESTIGATIVE REPORTING“ جنم نے جانتے بوجھے ایک مشکل اصطلاح استعمال کی۔ ”ملک سے کیا رشتہ ہے تیرا؟“ اس کے ماتھے پر پل پڑ گئے۔

”پہلے آپ بتائیں کہ آپ کا کیا رشتہ ہے؟ کیوں کر رہی ہیں یہ سوالات آپ مجھ سے؟“ جنم کے ماتھے پر بھی توری نمودار ہو گئی۔

”میں یوی ہوں ملک کی“ وہ چیخ کر بولی۔ ”جنم کے ہونٹوں پر ایک پراسر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ”پہلی دوسری یا تیسری؟“

ملک کی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ جنم نے یقیناً اس کی دھمکی رنگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ ”چو بھی کیا تو ہوگی؟ بہت بڑھ بڑھ کے بول رہی ہے۔“

جنم نے حقارت سے کہا ”یہ جو سامنے بیٹھا ہے یہ ڈرائیور ہے اور باڈی گاڑا ہے میرا۔ کسی ملک یا چوہدری کے حرم میں قید ہونے سے بہتر یہ سمجھوں گی میں کہ اس سے شادی کروں کیونکہ یہ ایک بہت اچھا اور سچا انسان ہے۔ ایماندار ہے اور دوخوار ہے۔ اور یہ دوغلا نہیں ہے۔“

”کیا نکاح اس کے جاری ہے؟“ ملک کی نے مشتعل ہو کر کہا ”میں تجھے یہی بتانے آئی تھی کہ کسی گمان میں مت رہنا۔ سب دیکھ رہی تھی میں تیرا ناز خرا اور چنگ ملک اور یہ بھی کہ ملک کیسی آپ جناب کر رہا ہے اور ایسے آگے پیچھے رال پکارتا ہے۔ تجھے تحائف بھی بہت دیتا ہوگا تجھے۔ بڑے وعدے کرے گا کہ تجھے الگ کوٹھی میں رکھے گا۔ کوٹھی تیرے نام ہوگی اور تو کر چاکر ہوں گے تیری خدمت کے لیے مگر ایک بار شادی کر کے تو بیچ گئی اس کے بند روم میں تو آنکھیں کھل جائیں گی تیری پھر پتے چلے گا ملک رپ نوٹس کا اصل روپ جب تو بھی قید ہو جائے گی اس حویلی میں۔“

جنم اسے ہمدردی سے دیکھتی رہی ”آپ کے ساتھ یہ سب ہوا تھا؟“

خلاف توقع وہ آتش فشاں کی طرح نہیں پھٹی۔ اچانک اس کی آنکھوں میں ایک براحتیاج نے بسی رکھنے والا پشیمانی کا درد آ کر آیا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور صوفے کی پشت سے سرگاہ کے چھت کو دیکھنے لگی۔

جب نے کہا ”جواب آپ کی خاموشی سے مل گیا ہے مجھے لیکن میری طرف سے آپ بے فکر رہیں۔ میں نے ایسے مردوں کی دنیا میں رہ کے اپنی حفاظت کرنا سیکھ لیا ہے۔ ابھی تک تو ملک نے ایسی کوئی بات بھی نہیں کی۔“

مکائی نے اسے بے یقینی سے دیکھا ”کمال ہے۔ اتنی خوبصورت ہے تو اور جو مزاج کی بھی تیز ہو وہ ملک کے لیے ایک چیلنج بن جاتی ہے۔ وہ جس کو تری کو دانہ ڈالے اس کو جال میں اتار ہی چاہیے۔ جو دانہ کھا کے اڑنے کی کوشش کرے وہ کتنا ہی اونچا کیوں نہ اڑے ملک سے بچ نہیں سکتی۔ ہاتھ نہ آئے تو ملک اسے شکار کر لے گا۔ اسے مار کے اپنے کتوں کو ڈال دے گا۔ سوئی۔“

جب نے کچھ دیر انتظار کیا ”کیا ہوا سوئی کو؟“
”سوئی لڑکی اور سوئی کو تری پر سوئی چیز جو ملک کے دل کو بھاجائے اس کی ہو جاتی ہے۔ بھی نہ بھی۔ صاف لگتا تھا کہ اب وہ بات پلٹ رہی ہے۔“

”سوئی ایک لڑکی ہے۔ شہینہ نام ہے اس کا۔ نیکی کی پیروی بھی بہت خوب صورت تھی۔ یہ اس کی چھوٹی بہن ہے۔“

مکائی خالی خالی نظروں سے جب کو دیکھتی رہی ”ہوگی۔“
”آپ اس کے بارے میں کچھ کہتے کہتے رک گئیں کیوں آخر؟“

”ایسی کوئی بات نہیں۔“
جب نے کہا ”ایسی بات ہے۔ آپ یقیناً ڈرتی ہیں ملک کے غصے سے۔ کچھ بتانا نہیں چاہیں۔ ملک نے نیکی کی پیروی کو قتل کر دیا تھا۔“

”اسے میں نے قتل کر لیا تھا“ مکائی نے سکون سے کہا۔
میرا اور جب نے اس پر چونکا ایک فطری بات تھی ”آپ نے مگر کیوں؟“

اسی وقت دیو زاد خادمہ نمودار ہو گئی ”چھوٹی مکائی۔“
تھانے دار صاحب آئے ہیں۔“

جب کا اندازہ ٹھیک تھا۔ وہ ملک کی پہلی بیوی ہوتی تو بڑی مکائی کھاتی مگر اس کا نمبر دو سرا یا تیسرا تھا۔ شاید خاندانی دستور کے مطابق پرانی پہلی اور خاندانی بیوی آج بھی گاؤں کی حویلی میں رہتی ہوگی۔ اپنے اکیلے پن اور قید تنہائی کے

احساس کو اس خیال سے بسلاتی ہوگی کہ ملک کے چاہے تانے کی بیٹی ہونے کی وجہ سے اسے پورا تحفظ حاصل ہے۔ وہ برتر ہے اور باقی سب داشتہ قسم کی بیویوں پر فوقیت رکھتی ہے۔ وہ خاندان کی ہر تقریب میں عزت کے ساتھ بلائی جاتی ہے اور حویلی کے اندر اس کے حکم کا سکہ چلتا ہے۔

مکائی اٹھ کھڑی ہوئی ”میں نے تجھے خیردار کر دیا ہے لڑکی۔ ویسے تو بھی کم سیانی نہیں ہے۔ جا اندر لے آتھانے دار کو لالی!“

جب نے جلدی سے کہا ”چھوٹی مکائی۔ اگر مجھے پھر بھی آپ سے ملنا ہو صرف آپ سے؟“

پردے کے پیچھے غائب ہوتے ہوئے مکائی نے جب نے دیکھا تو مجھے اس کے چہرے پر ایک سوہم سی مسکراہٹ کا شہ ہوا۔ جب وہ اتنی تھی تو اس کے تیر کچھ اور تھے مگر اب وہ بات نہیں رہی تھی۔ اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا مگر جس طرح اس نے لالی کی طرف دیکھ کے سر ہلایا اس کا مطلب اور کچھ نہیں نکلا جا سکتا تھا سو اسے اس کے کوالی سے پوچھو یا لالی کے ذریعے رابطہ کرو۔ لالی اس دیو زاد خادمہ کا نام تھا جس کا نام کالی ہوتا تو زیادہ حسب حال ہوتا۔

تھانے دار دیکھنے میں ویسا ہی تھا جسے تھانے دار ہوتے ہیں مگر یہاں اس کا رعب اور دبدبہ مگر بہن لگے سورج کی روشنی جیسا محسوس ہوتا تھا۔ اس نے اپنی مونچھوں کو عادت کے مطابق تاؤ دیتا جاری رکھا لیکن تھانے داری مچاؤنے کی کوشش بالکل نہیں کی۔ اسے معلوم تھا کہ شکایت کنندہ کڑوا کر لاپٹیم چڑھا ہے۔ جب خود صفائی ہے اور پھر ملک صاحب کی سمان ہے۔ اس کا بار بار میری طرف مشکوک نظروں سے دیکھنا ایک دلی خواہش کی عکاسی کرتا تھا کہ وہ کار چوری کی رپورٹ پر تفتیش کا آغاز مجھ سے کرے۔

”آپ کو شک ہے کسی پر؟“ اس نے مجھے ٹھوکر کر کہا۔
”شک تو ہے اور میرا شک کبھی غلط نہیں ہوتا۔“ جب بولی۔

”اچھا اس پر شک ہے؟“
”ملک رب نواز پر۔“ جب نے کہا۔

تھانے دار ایسے اچھلا جیسے جب نے اچانک بیگ سے دیو لور نکال کے اس کے کان کے پاس فائر کر دیا ہو۔ ”ٹھیک ہے۔ آپ ہمیں لکھ کر دے دو جو آپ کے بیان میں ہو گا اسی پر ہم ایف آئی آر کاٹ دیں گے۔“

”یعنی بہت ہے تم میں۔ تم ملک رب نواز کا نام زال سکتے ہو ایف آئی آر میں۔ میں تمہیں لکھ کر دیتی ہوں“ جب نے

نے کہا ”لالی۔ مجھے ایک کانڈ لا کر دینا۔“

لالی کے لوت کر آنے سے پہلے ہی تھانے دار کی بے چینی بڑھ گئی ”دیکھو جی رب نواز صاحب! آپ نے مذاق کیا تھا تو کوئی بات نہیں لیکن خدا کے لیے رپورٹ میں ایسا مت لکھنا۔ ہماری نوکری مشکل ہو جائے گی۔ میں اپنے باپ کا نام ڈال سکتا ہوں ایف آئی آر میں ملک رب نواز کا نہیں۔“

جب نے سوچ کے کہا ”ایک شرط پر میں ملک کا نام نہیں دوں گی اگر گاڑی نہیں مل جائے تو سیٹ کے نیچے دیکھنا اس میں دو دیو لور ہوں گے ایک کلاسکس میرے نام پر ہے دوسرا لاوارث ہے۔“

”آپ فکر مت کرو دونوں آپ کو مل جائیں گے کسی کو معلوم نہیں ہو گا کہ اس گاڑی سے اسلحہ برآمد ہوا ہے۔ آپ صرف اتنا لکھ دو کہ گاڑی ملک رب نواز صاحب کی کو تھی کے باہر کھڑی تھی۔ گاڑی نمبر رنگ نازل انجن اور محسوس نمبر کیا تھا یہ لکھنا ضروری ہے۔ انشاء اللہ کل تک گاڑی مل جائے گی۔“

جب کو لالی نے ایک رجسٹریشن کیا ”اپنے بیگ میں سے نازک اور سنہرے رنگ کا شیفرڈ ٹھک نکال کے جب نے لکھنا شروع کیا ”کیا ایسا بھی ہوتا ہے تھانے دار صاحب۔ گاڑی آج تک ہو اور کل مل جائے؟“

تھانے دار نے سر ہلایا ”دیکھو جی ناراض مت ہونا۔ آپ کی گاڑی ایسی نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے خاصی پرانی ہے۔ گاڑیاں روز چوری ہوتی ہیں یا چھپی جاتی ہیں مگر وہ بالکل نئی کو دولا یا آلتو اور شیراز جیسی زیادہ قیمت والی گاڑیاں ہوتی ہیں۔ وہ ابھر سے سندھ یا بلوچستان بھیج دی جاتی ہیں۔ یا پھر ان کو رنگ بدل کے نیا انجن اور محسوس نمبر زال کے مارکیٹ میں لاتے ہیں۔“

”میری گاڑی چوری ہونے کے لائق بھی نہیں؟“ جب نے افسوس سے کہا۔

”ایسی گاڑیاں لے جاتے ہیں شوقہ فنکار۔ میرے پانے کرتے ہیں اور پھر چھوڑ دیتے ہیں نہیں۔“ تھانے دار بولا۔

”ملک صاحب بھی یہی کہہ رہے تھے“ جب نے لکھتے ہوئے کہا ”مگر میں نے سنا ہے کہ پرانی گاڑیاں پر زہ پر زہ ہو کے کباڑی بازار میں بیچ جاتی ہیں۔“

”ہوتا ہے یہی۔ مگر انشاء اللہ۔ آپ کی گاڑی کل مل جائے گی۔“
جب نے کہا ”اتنے یقین کے ساتھ کہہ رہے ہیں آپ کہ مجھے یقین نہیں آتا مگر دیکھ لیتے ہیں آپ کے دعوے کو

بھی۔ کل کس وقت آجاؤں میں گاڑی لینے؟“
تھانے دار نے کہا ”آپ آجاؤ کل شام چھ سات بجے۔“

”گاڑی اسی حالت میں ملے گی مجھے۔ جس حالت میں چوری ہوئی تھی۔ میرا مطلب ہے کہ ٹائر اور بیٹری وغیرہ سب اس کے اپنے ہوں گے گاڑی ملنے کے قابل ہوگی۔ ویسے تو عام طور پر گاڑی کا ڈھانچا ہی ملتا ہے۔“ جب نے رپورٹ لکھ کے تھانے دار کو دی۔

اس نے رپورٹ پر ایک نظر ڈالی۔ اسی دوران میں ملک رب نواز کا فون بھی آگیا اور تھانے دار بڑی مستعدی کے ساتھ جی جناب جی ملک صاحب کرنا رہا اور پھر رپورٹ لے کر رخصت ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد لالی پھر نمودار ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ وہ پردے کے پیچھے سے اندر نہیں جاتی تھی۔ وہ دروازے سے گلی کھڑی رہتی تھی۔ اس کی حیثیت لیڈی باڈی گاڑ جیسی تھی۔ یہ عمدہ است اپنی غیر معمولی جسامت اور قد و قامت کی وجہ سے حاصل ہوا ہو گا۔ اس کا قد فٹ سے کچھ کم تھا جو خواتین کے اوسط ساڑھے پانچ فٹ کے مقابلے میں بہت زیادہ لگتا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس کا وزن بھی ڈیڑھ سو پونڈ ہو گا۔ اس کی صورت کے نقوش اور جسمانی غدد خال میں نسوانیت کی نزاکت سے زیادہ مردانہ سخت تھی۔ جیسے کسی ملک کی کثیر خاص اس کی رازدار اور جاسوس بھی ہوتی تھی۔ ایسے ہی لالی کو مکائی کا اعتماد حاصل تھا اور وہ یقیناً اس کے لیے اندر رہا برکی ساری اہم اور غیر اہم خبریں حاصل کرنے کا ذریعہ تھی۔

لالی نے کہا ”مکائی کا حکم ہے کہ سمان کھانا کھا کے جائیں گے۔“

جب نے کہا ”مکائی کا شکر یہ ادا کر کے کہہ دو کہ میں یہاں سمان بن کے نہیں آئی تھی۔ کام سے آئی تھی اور ویسے بھی ہم کھانا اپنے دوستوں کے گھر میں دوستوں کے ساتھ بیٹھ کے کھاتے ہیں۔“

لالی ہمارا پیغام پہچانے اندر گئی۔ ہم رخصت کے انتظار میں کھڑے تھے کہ لاؤنج کی طرف سے مکائی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آئی اور کھانے کی میز کے آخری کونے پر بیٹھ گئی۔ جب نے میری طرف بے بسی سے دیکھا۔ وہ خود اپنی بات کے جال میں پھنس گئی تھی۔ اب انکار کرنا یقیناً بد اخلاقی میں شمار ہوتا۔

ملک کے مقابلے میں یقیناً اس کی بیوی کا رویہ زیادہ

فراخ دلانہ تھا۔ ملک نے مجھے دور بٹھایا تھا اور مجھے چاہے بھی الگ نوکروں کے استعمال کے برتنوں میں دی گئی تھی۔ ملک نے میرے ساتھ ایک ہی میز پر بیٹھ جانا منظور کر لیا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ ملک کی بیوی ہونے کی وجہ سے ملک کی بیوی تھی۔ اصل ملک کی پہلی خاندانی بیوی تھی جو بھی ایسا نہ کرتی۔ اپنی ذہنیت اور مزاج کے اعتبار سے وہ بھی ملک کے رویے کی پیروی کو اعلیٰ خاندانی روایات کے مطابق سمجھتی لیکن یہ خدشی بیوی اپنی تعلیم یا خدشی مزاج کے باعث اس حد تک اونچ نیچ کے کہ نہیں کاٹھا کر سکتی تھی۔

کچھ دن بعد ختم نے کہا "کیا میں آپ کی نجی زندگی کے بارے میں کوئی سوال کر سکتی ہوں؟"

وہ جیسے اس سوال کے انتظار میں تھی "بالکل نہیں۔ چپ کر کے کھانا کھا لؤ گی۔"

ختم آسانی سے حوصلہ ہارنے والی نہیں تھی۔ اس مثال سے کسی کی اہانت منظور نہیں مگر صحنائی ایسے اصل سچائی اور اندر کی بات کی جستجو کرتے ہیں جیسے کتے کوڑے کے ڈھیر میں سے بڑی تلاش کرنے کے لیے بچے مار رہے ہوتے ہیں اور بار بار دھک مارے جانے کے باوجود باز نہیں آتے۔

ختم نے کہا "کیا میں پھر کسی وقت آسکتی ہوں؟"

"میں بلا ضرورت کسی سے نہیں ملتی" ملک نے کہا۔

"آپ کی باتوں سے میں نے اندازہ کیا ہے کہ ملک صاحب شوخ مزاج آدمی ہیں۔"

ملک نے ساٹھ لہجے میں کہا۔ "سب مرد ہوتے ہیں۔ کچھ کم کچھ زیادہ۔"

"ملک صاحب کچھ زیادہ شوقین لگتے ہیں۔ خصوصاً عورتوں کے معاملے میں۔"

ملک نے کہا "جوا۔ شراب۔ عورت۔ سیر و تفریح۔ سیاست۔ سب ریسوں کے شوق ہیں۔"

"آپ کے لیے اعتراض کی کوئی بات نہیں؟" ختم نے کہا۔

"کیسی بے وقت کی باتیں کرتی ہے تو لڑکی۔ بڑھی لکھی ہے اور اخبار میں کام کرتی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہمارے ملک میں دولت مند جاگیردار تاجروں اور صنعت کار کیسے رہتے ہیں۔ میرے اعتراض کی کیا حیثیت ہے تو بدل سکتی ہے ان کی سوچ کو اپنے اخبار میں کالم لکھ کے یا مولوی صاحب بدل سکتے ہیں اسے دعا سے۔ اللہ مجھے معاف کرے" ایسا کہنے پر لیکن اب تو لگتا ہے خدا ابھی کچھ نہیں کر سکتا جس سے یہ سارے لوگ بدل جائیں۔ شرافت اور پاکبازی کی زندگی

گزارنے والے سچے مسلمان ہو جائیں۔ یہ سب جو اخلاقی قدروں کی اور VALUES کی بات کرتے ہیں، حق اور انصاف، ایمان اور نیکی اختیار کرنے کا شور مچاتے ہیں۔ یا بزدل ہوتے ہیں یا پھر مجبور۔ خود کوئی برائی کر ہی نہیں سکتے بے چارے تو دوسروں کو برا کہتے ہیں۔ جیسے میں۔ "اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ شدت جذبات میں زیادہ بول گئی ہے۔ ختم اسے خاموشی سے دیکھتی رہی "میں سمجھ سکتی ہوں کہ آپ ایسا کیوں سوچتی ہیں؟"

"تم کیا سمجھ سکتی ہو؟" وہ برہمی سے بولی "کیا تجربہ ہے زندگی کا تمہیں؟ کتنا میں آدمی کو علم نہیں دے سکتی جو حالات سے گزر کر کہتا ہے۔ جو تیرا جانتا ہو مگر دُوب رہا ہو" اس کے لیے تیرا کیا سکھائے، دلے ماہرین کا علم کس کام کا؟"

"آپ اپنی گفتگو کے انداز سے ایک تعلیم یافتہ خاتون لگتی ہیں۔"

"لگتی ہوں کا کیا مطلب۔ میں اسسٹنٹ پروفیسر تھی۔ سوشیالوجی میں ایم اے کیا تھا میں نے تمہاری عمر میں" کیا لطیفہ ہے؟" وہ خفنی سے بولی۔

"اگر آپ برائے نہ مانتا میں۔"

"برا کیوں نہ مانوں۔ رب نواز کا انٹرویو لے لیا تم نے۔ میرا انٹرویو مست لو۔ اتنی دیر سے تم مجھے اپنے سوالوں سے EXPLOIT کر رہی ہو۔ کیا چاہتی ہو تم آخر مجھے بلیک میل کرتا۔ یا میری پرسنال لائف کا اسکیٹل بنا کے سنسنی پھیلاتا۔ میں اور کوئی بات نہیں کروں گی۔" وہ ٹیسے میں اچھی۔

"مستزب نواز! آپ کی میرے بارے میں یہ رائے بھی غلط ثابت ہوگی۔ جو گفتگو یہاں ہمارے درمیان ہوئی ہے اس کا میری صحافت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کا ایک لفظ بھی باہر کیس حوالے کے طور پر استعمال نہیں ہوگا۔ یہ میرا وعدہ ہے اور آپ خود دیکھ لیں گی کہ میں نے آپ کے اعتماد کو دھوکا نہیں دیا۔" ختم کدھے پر بیک لٹکا کے کھڑی ہو گئی۔

ملک نے کاغذ ایک احساس پشیمانی میں بدل گیا "تو عجیب لڑکی ہے۔"

"میرا علم کتابی ہے اور میں عمر میں بہت چھوٹی ہوں آپ سے لیکن بعض اوقات چھوٹے بھی عقل کی بات کر جاتے ہیں۔ دیکھئے، ایک فارمولے کے تحت یہ نہیں کہا جاسکتا کہ سارے ملک اور چودری ظالم بدکردار اور بے ضمیر ہوتے ہیں۔ ایک پاگل کن کاٹ لے تو ایسا نہیں سمجھنا چاہیے کہ سارے کتے پاگل ہوتے ہیں۔ سارے کتوں والے راشی نہیں ہوتے۔ پریس میں بھی فرض شناس لوگ ہیں۔ صحافتی

سب بلیک میل نہیں ہوتے۔ ہر جگہ ہر شر اور ہر ملک میں ہر معاشرے اور طبقے میں۔ ہر کھٹکے اور پٹے میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے آج بھی۔ اسی لیے یہ دنیا کا نظام قائم ہے اور چل رہا ہے۔ آپ کی مسمان نوازی کا شکریہ۔"

میں بڑی طرح ہنس گیا تھا۔ ہر بات سننا اور خاموش رہنا میرے لیے قوت برداشت کا امتحان ہو گیا تھا لیکن اسے کہنے کا کیا علاج۔ میں ختم کے دوست "ہم پیشہ ساحتھی یا شوہر کا کردار بھی کر سکتا تھا مگر میں نے ڈرائیور یا بازی گارڈ کا رول قبول کیا تو مالکوں کی گفتگو میں دخل در مقولات کے امکانات از خود پائی نہ رہے۔ ختم نے کوئی غلط بات نہیں کی مگر میرا خیال تھا کہ برابری کی سطح پر مجھے بھی بولنے کا موقع ملتا تو میں اور بہت سے سوالات کرتا جو ختم نے نہیں کئے۔

باہر آکے میں نے کھڑی دیکھی تو سر پر کے ڈھائی بیج تھے۔ یہاں آتے ہوئے ہمارا خیال تھا کہ ملک رب نواز سے محدود وقت میں صرف کام کی بات ہوگی اور ہم ایک گھنٹے میں فارغ ہو جائیں گے لیکن معاملات طویل پکڑتے گئے۔ پہلے رب نواز نے ایک گھنٹا دیا۔ پھر گاڑی چوری ہونے سے رپورٹ لکھوانے کی کارروائی تک ایک گھنٹا گزر گیا پھر ملک کی باتوں میں اور کھانے کے پکڑ میں ایک گھنٹا لگ گیا۔

باہر جانے والے راستے پر ایک سرخ رنگ کی تقریباً نئی آلٹو کار کھڑی ہوئی تھی۔ اس کا رخ دروازے کی طرف تھا اور ایک ملازم اس کی صفائی سے فارغ ہونے کے بعد ہاتھ میں کپڑا لیے بیڑا کھڑا تھا۔ اس نے گاڑی کی چابی میرا ہاتھ پھیلا کے پھٹکی پر رکھ دی "ملک صاحب نے کہا ہے کہ جب تک آپ کی گاڑی نہیں ملتی یہ آپ رکھیں۔"

میں نے ڈرائیور کی جگہ بیٹھ کے گھوڑا کپار ٹنٹ میں دیکھا "اس کے کاغذات کہاں ہیں؟"

"کاغذات ملک صاحب لے گئے ہیں۔" وہ بولا۔

"کاغذات کے بغیر کسی نے پکڑ لیا پھر؟" میں نے کہا۔

"کوئی نہیں پکڑے گا" ملازم بولا "گاڑی کے آگے پیچھے ایم بی اے کی سختی لگی ہوئی ہے۔"

ختم نے چابی مجھ سے لے کر واپس ملازم کو دے دی "ہم پر ملک صاحب کی گاڑی چوری کر کے لے جانے کا الزام تو آسکتا ہے۔ ہم یہ دیکھ نہیں لے سکتے۔"

ملازم پریشان ہو گیا "ایک منٹ ٹھہرو۔ میں پوچھ کے آتا ہوں۔"

"کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ کوئی اتنی بہت بھی کر سکتا ہے کہ تم جیسی صفائی خاتون سے فکر لے تم پر کار کی چوری کا الزام

عائد کر دے؟" میں نے کہا۔

"بے وقوف اور کینہ پرور آدمی کچھ بھی کر سکتا ہے۔ بدنامی تو ہو جاتی ہے خواہ بعد میں ملک کو کیس واپس لینا پڑے یا صفائی مانگی پڑے" ختم نے کہا۔

"میرا خیال اس کے برعکس یہ ہے کہ تمہاری گاڑی اب نہیں ملے گی۔ اس کے بدلے میں ملک صاحب یہ گاڑی تمہارے نام کرادیں گے۔ نقصان کی طمانی کے نام پر تمہیں ایسے ہی ختم دیا جاسکتا تھا۔"

"یہ خیال کیوں آیا تمہیں؟" ختم نے نقل سے کہا۔

"ملک صاحب کاغذات اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ اس سے مجھے شک ہوتا ہے۔ اب چاہو تو شرط لگو مجھ سے۔"

"میں ہرگز قبول نہیں کروں گی۔"

"جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ قاضی جی کا نوٹی بھی یہی ہوگا کہ یہ تم پر حلال ہے۔" میں نے کہا۔

ملازم کے بجائے اندر سے لائی نمودار ہوئی "ملک کی بولتی ہے۔ آپ بے فکر ہو کے گاڑی لے جاؤ۔ کوئی بات ہو تو ان کو بتانا۔" اس نے کاغذ کا ایک رزہ آگے بڑھایا۔ اس پر پینسل سے ایک ٹیلی فون نمبر لکھا ہوا تھا۔

ختم نے کاغذ لے لیا "یہ ملک صاحب کا نمبر ہے؟"

"نہیں۔ یہ ملک کا نمبر ہے" لائی نے کہا اور چابی آگے کر دی۔

اب خطرے کی کوئی بات نہیں رہی تھی تو ختم کے لیے بھی قابل قبول ہو گئی تھی "ملک کا شکریہ ادا کرنا میری طرف سے۔"

لالی نے سر ہلایا اور چونکہ ارکوٹ کھولنے کا اشارہ کیا۔ جب میں گیٹ سے گزرا تو اس نے مجھے سلام بھی کیا۔ تین گھنٹے بعد میرا رجب اتنا بلند ہو گیا تھا کہ میں اسے پھینرنا تو یہ بات میرے سر پہ کے خلاف ہوئی۔ وہ خاموش رہتا تو مجھے لطف ہی نہ آتا۔

ختم نے اس پر زبے پر لکھے ہوئے ٹیلی فون نمبر کو اپنی ڈائری میں اتار کے پرزے کو مزید پرزہ کر دیا۔ "ملک کی بڑی صفائی سے یہ عندیہ ظاہر کر دیا ہے کہ وہ ہم سے پھر بات کر سکتی ہے۔"

"ہم سے نہیں، صرف تم سے۔ ایک آٹو کے پیچے ڈرائیور کی کیا اوقات ہے کہ کوئی اس سے بات کرے۔"

"اعتراض بھی تم نے کیا تھا۔ پروفیسر نے مجھے شوہر سمجھ لیا تھا۔ آخر میری بھی کوئی عزت ہے؟" ختم نے میری نقل اتاری۔

"افس! اتنی دیر نہ بند کر کے بیٹھنے سے میرے جڑے درد کرنے لگے ہیں۔ جب وہ ملک رب نواز بات کر رہا تھا تو کئی بار میرے خون میں ابال آیا۔ میں نے سوچا کہ میں مذاکرات کی ٹیبل پر ایسے کوبڑوں جیسے بڑک مار کے پنجابی غلوں کا ولن بہرو گئے سامنے کو داتا ہے۔"

"پھر کیا ذر گئے؟"

"ڈرنے والے پر لعنت! میں سب کو بڑوں کے وارڈ میں داخلے کے قابل بنانے نکل جاتا مگر عقل نے دامن قہام لیا۔"

"جبم نے سخت حیرت کا اظہار کیا "اچھا؟ کیا ایسا بھی ہوتا ہے تمہارے ساتھ۔"

"میں نے کہا "تمہارے ساتھ نہیں ہوتا اس لیے تمہیں معلوم نہیں۔ عقل ہونی چاہیے دامن قہمانے والی۔"

"مجھے ملکانی سے مل کے خوشی ہوئی۔ ابھی تک میں نے اسے EXPLOIT نہیں کیا تھا مگر اب کون کی وہ خود اس کے لیے تیار ہے۔" جبم بولی۔

"اگر تم اس خیال میں ہو کہ ملکانی کو ملک کے خلاف استعمال کرو تو اس خیال کو دل سے نکال دو۔ اسے لاکھ شکایات ہوں اپنے شوہر سے مگر وہ ہر حال ایک شرعی عورت ہے۔"

"وہ ایک تعلیم یافتہ عورت ہے۔"

"رائس! ایک جاہل عورت سوچے سمجھے بغیر کوئی قدم اٹھا سکتی ہے۔ ملکانی کو شادی سے پہلے بھی علم ہو گا کہ ان حویلی والے سیاسی جاگیرداروں کی خاندانی روایات کیا ہیں اور ان کے مزاج کی تربیت کیسے ماحول میں ہوتی ہے۔ دوسری یا تیسری بیوی کا اسٹیشن کیا ہوتا ہے اور اس کے حقوق کیا ہوتے ہیں۔ ملک رب نواز ایم پی اے کے گھر کی چار دیواری میں اس پر کیا پابندیاں عائد ہوں گی اور اس کی آزادی یا آزاد خیالی کی حد کہاں تک ہوگی۔ یہ سب وہ جانتی ہوگی پہلے سے۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"یار! عقل سے کام لے کر تم بھی اندازہ کر سکتی ہو کہ یہ شادی کوئی مجبوری کی شادی نہیں تھی۔ یعنی دونوں طرف کے اماں یا راضی تو کیا کرے گا قاضی۔ وہ کوئی نادان لڑکی نہیں، پروفیسر تھی۔ ملک اس سے ملا ہو گا تو شادی کا مرحلہ آنے سے پہلے بھی بہت مرحلے آئے ہوں گے۔ ملک نے پروپوز کیا ہو گا تو خاتون نے کچھ سوچ کے ہی ہاں کی ہوگی۔ سب کچھ دیکھا بھلا ہو گا۔ معلوم کیا ہو گا۔ ظاہر ہے اس وقت بھی ملک کی کم سے کم ایک بیوی تھی۔ پروفیسر صاحب یا تو ملک رب نواز کی

مردانہ وجاہت پر ریجہ کشیں یا پھر اس کی دولت اور شان و شوکت پر۔"

"خدا خواہ ہر بات فرض کر رہے ہو تم۔ کوئی مجبوری بھی تو ہو سکتی ہے اس شادی کے پیچھے۔"

"ایک پروفیسر کو کیا مجبوری؟" میں نے کہا۔

"جبم نے کہا "ملک رب نواز کسی کے لیے بھی مجبوری پیدا کر سکتا ہے۔ ممکن ہے ملکانی کو بلیک میل کیا ہو اس نے۔"

"بلیک میل ہونے کے اسباب خود پروفیسر صاحب نے فراہم کئے ہوں گے۔ زبردستی کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"سب کچھ ہو سکتا ہے یہاں۔ کوئی پیچھے ہرجائے سارے خاندان کے دھمکیاں دے یا اغوا کر لے۔ تو کیا کرے گی ایک شریف عورت۔ فردا لے کر تھانے جانے کی۔ عدالت میں دہائی دے گی؟ ناممکن! وہ شادی کی صورت میں ایک باعزت تعینہ کر لے گی۔ خواہ وہ کتنی ہی ناپسندیدہ شرائط پر ہو۔"

"میں نے کہا "پلو تمہاری مجبوری والی اسٹوری ٹھیک ہے مگر وہ مجبوری تو آج بھی ہے۔ کیا ملکانی کو اندازہ نہیں کہ ملک رب نواز ملک حرامی اور غداری کے جرم کی کیا سزا دیتا ہے۔ بیوی تو ہوتی ہے پاؤں کی جوتی۔"

"شرم آتی چاہیے تمہیں! ایسا کہتے ہوئے" جبم خفا ہو گئی۔

"افوہ! یہ قول کیا میں نے ایسا کیا ہے۔ بزرگ فرما گئے ہیں ایسا۔ ملک جیسے شوہر آج بھی بزرگوں کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ ذرا شک بھی ہو تو بیوی کو باعزت طریقے پر رخصت کر دیتے ہیں۔ عزت دار عورت کی باپ کے گھر سے ڈولی اٹھتی ہے تو شوہر کے گھر سے جنازہ اٹھتا ہے۔ یہ بھی بزرگ کہتے ہیں اور اس سے کیا جہالت ہوتا ہے؟"

"کچھ نہیں۔ بس مردوں کی نامعزیت اور بد معاشری، فحشا اگر دی۔"

"میں نے جس کے کہا "ساری قتل و غارت گری کے سامان تم عورتوں کے پاس ہیں۔ چاہنے والوں کے دلوں کا اور اربانوں کا خون کرتی پھرتی ہو۔ تازہ وادے سے جو دو جفا ہے۔ کبھی تیر نظر چلا کے، کبھی برقی جسم گرا کے۔"

"پلو رہنے دو۔ بہت بے وقوف بنالیا ایسی شاعری سے۔ میں بات کر رہی تھی ملکانی کی۔"

"وہ ایک خطرناک عورت ہے۔"

"ہر عورت خطرناک ہو جاتی ہے۔ جب اسے اندازہ ہوتا ہے کہ محبت کے نام پر اس کے ساتھ دھوکا ہوا تھا۔"

"پھر وہی عورت کی مظلومیت کا رونا اور بلاوچہ کی دکائیت۔ ابھی کچھ پچ نہیں تمہیں کہ حقیقت کیا ہے مگر تمہیں ہمدردی کا بخار ہو رہا ہے۔ یہ دیکھو کہ کتنی بے وقوفی سے اس نے ہمارے سامنے ایک قتل کا اعتراف کر لیا۔ ہم تو ملک رب نواز کے دامن پر لو کے داغ تلاش کر رہے تھے مگر خیکے کی بیوی کا خون کرنے والی سے نکلی۔"

"اس کے اسباب ملک رب نواز نے پیدا کئے ہوں گے۔ رقابت میں اس کی بیوی نے قتل کر دیا۔"

"تمہارے خیال میں یہ بالکل جائز تھا۔ وہ ایک شادی شدہ عورت تھی۔ ملک رب نواز کو پسند آئی تو یہ کون سی انوکھی بات تھی۔ ملکانی جانتی ہے کہ اس کے شوہر کیا ہیں۔ کیا وہ ہر عورت کو قتل کرے گی جس کے ملک سے مراسم ہوں گے۔ ملک اگر چہ بھی شادی کے بعد دس شادیاں اور کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ شرع کی حد ایسے لوگوں کے لیے ایک ٹھیل ہے۔ ایک کو چھوڑ دو دوسری کو لے آؤ۔ چار کی شرعی حد میں سب جائز ہے۔ اصل بات کچھ اور ہوگی جس میں جبم نے معاملہ صرف خیکے کی بیوی کا نہیں، اس کی بہن کا بھی ہے۔ ملکانی کو شہینہ عرف سونی کے معاملات کا بھی علم ہے مگر وہ کچھ بولتے بولتے رک گئی تھی۔"

"اچھا ہوتا اگر وہ پہلے بتا دیتی۔ سونی کی زبانی ہم وہی کہانی بعد میں سنتے۔" جبم نے کہا۔

ریش خانے بیچ کے میں نے سونی کو دیکھا تو حیران رہ گیا۔ آرام کرنے کے بعد نمادھو کے اور لباس بدل کے اس کی شخصیت ایک نئے روپ میں سامنے آئی تھی لیکن حیران کرنے والی اس کی صورت میں جبم کی مشابہت تھی۔ قد و قامت کے اعتبار سے اس میں اور جبم میں صرف یہ فرق تھا کہ وہ شاید دو انچ کم ہوگی۔ جبم کا قد پانچ فٹ آٹھ انچ تھا تو اس کا پانچ فٹ پانچ انچ ہو گا۔ وزن بھی ان کا ایک جیسا ہی لگتا تھا۔ شاید سونی کا چار پانچ پائونڈ کم ہو لیکن یہ فرق دیکھنے میں محسوس نہیں ہوتا تھا۔ ان کے رنگ میں بھی ایسی جیس کا فرق تھا۔ جبم کے اچلے پلے میں ہلکی سی ملاحظہ تھی۔ آنے میں نمک کے برابر لیکن یہ نمک نہ تو دورانی ہیکلی لگتی ہے۔ جبم کی گوری رنگت میں ہلکے سے سانولے پن کی جھلک سے حسن کی کشش میں نیا انداز پیدا ہو گیا تھا یا شاید مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا۔

سونی کا رنگ زیادہ اچھا تھا۔ اس کی بے داغ سفیدی میں ہلکی سی زردی جھلکتی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کی جلد دھوپ کی لکڑی کا شکار ہے یا اسے خون کی کمی ہے۔ حیرت انگیز

مشابہت جبم اور سونی کی صورت کے نقوش میں تھی۔ ان کی آنکھیں، ناک، ہونٹ اور چہرے کے خدو خال ایک ہی سانچے میں اٹھائے ہوئے لگتے تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ کوئی آنکھیں دیکھ کر جڑواں کہیں سمجھتا لیکن جبم کو بڑی اور سونی کو چھوٹی بس فرض کر لیا ایک فطری بات ہوئی۔

میں اس لیے بھی حیران تھا کہ آخر اس مشابہت کا احساس مجھے پہلے کیوں نہیں ہوا تھا۔ شاید اس کی یہ وجہ تھی کہ جبم نے اسے پہلی بار دیکھا تو وہ کسی جنگلی جانور کی طرح خوف اور وحشت کا شکار تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے اور کپڑے بھی جیسے ہوئے تھے پھر وہ رات کا وقت تھا اور بیڈ لائنس کی تیز روشنی میں جنگل سے گرفتار ہونے والی لڑکی پر غور کسی نے نہیں کیا تھا۔ دن بھر ہم نے سنا کیا تھا اور پھر تھک کر سو گئے تھے صبح میں سونی کے اٹھنے سے پہلے ہی جبم کے ساتھ نکل گیا تھا۔

اس وقت جبم اور سونی میں جو نکاحینے والی یکسانیت کا احساس پیدا ہونے کی سب سے اہم وجہ تھی اس کا لباس۔ اس نے جبم کے کپڑے پن رکھے تھے جو اس کی مجبوری تھی کیونکہ خیکے کے ساتھ وہ صرف کلا شخوف لے کر گئی تھی اور جب ہم نے اسے پکڑا تھا تو وہ بالکل خالی ہاتھ تھی۔

ایک بہت بڑی تبدیلی سونی کے رویے میں آئی تھی۔ اب وہ ڈاری اور سخی ہوئی نہیں تھی۔ وہ رہیں کے ساتھ تاش کا کوئی کیم کھیل رہی تھی اور زور زور سے ہنس رہی تھی۔ اس کے متقابل مجھے رہیں کچھ بدحواس اور ہکا بکا نظر آیا۔

رہیں نے مجھے دیکھتے ہی بے چینیک دیے۔ "ابے یہ کیا حرامی پن ہے تم دونوں کا۔ آٹھ کھلتے ہی کسی کو کچھ بتانے بغیر نکل گئے۔"

میں نے کہا "کس کو بتاتے، ب مرے بڑے تھے۔"

"آخر قرار کیوں نہیں ہے تمہیں۔ ایک مشین سے چل رہے ہو دونوں۔ ایک کو نیند نہیں آتی تو دوسرے کو بھی نہیں آتی۔ ایک کے پیٹ میں آوارہ گردی کا موزا اٹھتا ہے تو دوسرے کے بھی اٹھتا ہے۔ ایک روٹا ہے تو دوسرا بھی روٹا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے پیارے کہ جس دن ایک کی سانس بند ہوئی تو دوسرے کی بھی ہو جائے گی۔"

"انشاء اللہ!" میں نے اس کے سامنے بیٹھ کے کہا "مجھے پریشانی کیوں ہے؟"

"یار! قسم اللہ کی۔ تمہاری خبر نہیں تھی تو بڑے پرے پرے خیال آ رہے تھے دل میں۔ آخری رسوم اور سوگ، چلم

کے۔

میں نے کہا "جیسی منحوس شکل ویسا ہی منحوس خیالات والا دل۔"

سونی نے ایک قہقہہ مارا "کو استاد کیسی کمی۔ بولتی بند ہو گئی؟"

میں نے اور خبشم نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ رئیس نے جینیب کے کہا "یار" پر چاکھ کے چھوڑ جاتے "آخر ایسی کیا آفت آگئی تھی صبح صبح۔"

میں نے کہا "میں دس بجے کے بعد گئے تھے اور اسے صبح صبح نہیں کہا جاسکتا۔"

خبشم نے کہا "ملک رب نواز سے ملاقات کی ہم نے۔"

"بڑا اچھا کیا۔ ناشتا بھی نہیں کیا ہوگا مگر اب کھانا تو کھاؤ۔ تمہارے انتظار میں ہمارا بھوک سے دم نکلنے والا تھا۔"

میں نے کہا "ہم کھانا کھا کے آئے ہیں۔"

رئیس بگڑ گیا "یوں کو کتنا سالے کہ میری سائے کرنے گئے تھے ہم یہاں خواہ مخواہ فکروں میں پڑے تھے، خرم نہیں آتی تھیں۔"

سونی نے پھر قہقہہ لگایا "ارے چھوڑ استاد۔ ان دونوں کا آپس میں ٹانگا جڑا ہوا ہے تو پریشانی کیسی۔ جوانی سالی ہوئی کس لیے ہے۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ میں نے دیکھا تو خبشم بھی سولی کو بے یقینی سے دیکھ رہی تھی "یہ تمہیں کیسے بات کرتی ہو؟"

وہ ذرا اگلی نہیں جھپٹی "کیوں کون سی غلط بات کی میں نے؟"

رئیس نے کہا "یار" میں کھانا لگانے کا کہتا ہوں، تمہیں مارخان سے۔"

میں نے کہا "میں مارخان سے مجھے یاد آیا۔ کیا اس نے نہیں بتایا تھا مجھے ہم تو اسے بتا کے گئے تھے۔"

رئیس نے اسے آواز دی "ابھی پوچھتا ہوں سالے سے۔"

سونی ہنسی "ان دونوں کی بھی گوٹ پھنسی ہوئی ہے ایک دوسرے کے ساتھ۔ رب نے ملائی جوڑی، لیکن میں کام کم کرتے ہیں عاشقی ماضی زیادہ ہوتی ہے۔ میاں بیوی کی طرح رہتے ہیں شادی کے بغیر۔"

مجھے پھر شاک لگا لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا تھیں مارخان نقش فریادی بنے حاضر ہو گیا۔ "آپ یاد فرمائی۔"

"یاد کے بچے۔ تو نے بتایا کیوں نہیں تھا کہ یہ کہاں گئے ہیں۔ کیا کہہ کر گئے تھے تجھ سے جاتے وقت؟"

"ساب" ام عرض کرتی "امارا مغز میں ہر بات رہتی مگر آج امارا دماغ صدمہ اٹھاتی، امارا یادداشت تشریف لے جاتی۔"

خبشم نے کہا "یادداشت چلی گئی تھی تمہاری، وہ کیسے؟"

"وہ دوسرا جلاؤ۔ امارا سر عزیز پر لیٹا فرمائی۔ پہلے من سے فرمائی بان رسید فرمائی۔ ام چکر نوش کرتی۔ جسم میں اندھیرا تشریف لاتی لیکن وہ دشمن جاں ترس نوش نہیں فرمائی۔"

میں مارخان کے بات کرنے کا اپنا ہی انداز تھا جس کے ہم سب عادی تھے کھانا کچھ بھی ہو، نوش فرماتا تھا۔ غم نوش فرماتا یا چکر نوش فرماتا تھا۔ دوسرے کے کرنے کو وہ فرماتا کھانا تھا۔ جیسے اس نے کہا کہ آپ یاد فرمائی۔ خود اپنے لیے وہ عرض کرتی جیسے انکساری کے الفاظ استعمال کرتا تھا۔ سونی اس انداز گفتگو پر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئی۔

میں مارخان نے اپنی بات جاری رکھی "جناب" وہ دوسرا عالم دار فرماتے کا واسطے فرمائی بان بلند فرمائی۔ ام سر کو بجاتی، فرخ پر یکفخت دروازہ ہوتی لیکن اور فرمائی بان کا تصادم ڈالنا کا ڈانٹ ہوتی یا پانچ کلو کا ڈانچہ تشریف لاتی اور امارا سر کے اوپر اتارتی۔ ام بھی میں غرق ہوئی۔ یادداشت رخصت ہوئی۔ ام ہوش میں آئی تو اس خانہ خراب کی بجلی سے پوچھتی۔ ام کہہ رہی ہوئی "وہ فرمائی کہ تم رعلت فرمائی، ختم میں تشریف لے جاتی۔"

اب میرے اور خبشم کے لیے بھی ہنسی کو روکنا مشکل ہو گیا تھا۔ میں مارخان کا بیان نہ جانے کب تک جاری رہتا مگر رئیس نے جوتا اٹھالیا۔ "سالے" ماراد کے گھنجا کردوں گا۔ کیوں بانک رہا ہے اور ہر ادھر کی۔ سیدھی طرح کیوں نہیں کتا کہ بھول گیا تھا۔ جھوٹ بولنا نہیں آتا تو بولنا کیوں ہے؟"

میں نے کہا "آخر تم پر یہ قاتلانہ حملہ کیوں ہوا تھا؟"

میں مارخان آب دیدہ ہو گیا "صاحب۔ وہ ام کو مونچھ والا پہاڑی بکرا فرمائی۔ ام عرض کرتی کہ اس کا والد حرام جانور ہوئی۔ یہ خدا امارا مطلب ہوئی کہ صاب۔ وہ خنزیر سمجھتی امارا کیا تصور ہوئی۔"

سونی نے ہنستے ہنستے کہا "تو نے سوری کی بھی کیوں نہیں کہہ دیا اسے سیدھی طرح۔ نامردوں کی طرح دگھڑا دو رہا ہے یہاں ہمارے سامنے۔ سالی کی۔ پر ایک لالت مارنا۔"

ایک دم سناٹا چھا گیا کیونکہ جو لفظ سونی نے بڑی روانی سے استعمال کیا تھا وہ مزہ بھی اس بے تکلفی سے استعمال

نہیں کر سکتے۔ خصوصاً اس محفل میں جہاں سب کے ساتھ خواہشیں بھی گفتگو میں شریک ہوں۔

میں نے سخت ہلکے میں کہا "ذرا اپنی زبان کو اور اپنے آپ کو قابو میں رکھو سونی۔ یہ کس قسم کی بازاری زبان بولتی ہو تم۔"

اس کا رنگ پیکا پڑ گیا "کیا بولیا اگر ایک لفظ پھسل گیا زبان سے۔ ایسی ہی زبان بولتی ہوں میں کیونکہ میں ایسی ہی عورت ہوں۔"

خبشم نے افسوس سے کہا "دیکھنے میں تم شریف لگتی ہو۔"

"یار" دیکھنے میں تم سب بھی شریف لگتے ہو۔ اندر سے کیا ہو، یہ کہے پتا۔ میں نے بھی بہت دیکھے ہیں ایسے شریف خاں شریف۔ وہ پچھلی ہنسی ہنس کے بولی "چار سال میں چالیس حرامیوں کے حرامی شریف زادے ملے۔ سب کی شرافت جھگٹی ہے میں نے۔"

رئیس اسے اپنے ساتھ کھانے کی میز پر لے گیا۔ اس کے طرز خطاب اور غیر شرفانہ اطوار نے مجھے اور خبشم کو شدید صدمے سے دوچار کیا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ صورت سے اتنی معصوم اور مذہب نظر آنے والی لڑکی کا کردار اس حد تک گمراہ اور قاتل فحرت ہو سکتا ہے۔ اس کی صورت میں خبشم کی مماثلت اب میرے لیے نہ امانت بھرا پر آزار احساس ہو گئی تھی۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ مجھے افسوس تھا کہ سونی کی صورت خبشم سے کیوں ملتی ہے؟ ان کی فطرت میں زمین آسمان کی دوری تھی۔ ایک واقعی خبشم تھی، بزرگ گل پر ٹھہرا ہوا اس کا موتی۔ حسن فطرت کی پاکیزگی کی علامت۔ دوسری گز میں بننے والے سیاہ بدو دار بچہ کا ایک چھینٹا۔ جو دامن پر آجائے تو لباس کے ساتھ بدن بھی ناپاک کر دے۔

"نغوذ باللہ!" میں نے کہا "کتنی جلدی اصل روپ سامنے آگیا اس کا۔"

خبشم نے سوچتے ہوئے کہا "کیس اس نے کچھ پائی تو نہیں لیا ہے۔"

"بے وقوفی کی بات مت کرو۔ کہاں سے پنے گی یہ کچھ۔ یہاں نشے کی بات کرنا بھی حرام ہے" میں نے کہا۔

"پھر اسے کیا ہو گیا ہے۔ کل تک تو یہ ایسی نہیں تھی۔ ہم نے اسے بس میں دیکھا۔ اس وقت اور پھر راستے میں۔ کہیں ایسی زبان نہیں بولی اس نے۔"

میں نے کہا "اس وقت وہ خوف کے دباؤ میں تھی۔ اب

کھلی ہے پوری طرح۔"

"یہ کوئی نفسیاتی بے چینی ہے۔ وہ ذہنی طور پر بیمار ہے۔ کچھ تو اس کی باتوں سے اندازہ ہو گیا ہے" بانی بات۔

میں نے اس کی بات کاٹ دی "کوئی ضرورت نہیں یہ روگ پالنے کی۔ بانی بات کچھ بھی ہو، ہم کیوں سنیں۔ اسے چلا کر یہاں سے۔"

"کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ ہم اس لڑکی کو یہاں لائے تھے اس کی مدد کرنے کے خیال سے۔ اس کو تحفظ دینے کے لیے اور اب جبکہ ہمیں یہ بھی پتا چل گیا ہے کہ وہ ذہنی مریض ہے۔ نفسیاتی الجھنوں کے رد عمل کا شکار ہے۔ تو ہم اسے نکال باہر کریں؟ اسے اب پہلے سے زیادہ ہماری مدد دی اور توجہ ملنی چاہیے۔"

میں نے کچھ شرمندگی محسوس کی "وہ تو ٹھیک ہے مگر سوچ لو۔"

"اس میں کیا سوچنے کی بات ہے ناصر۔ پہلے ہم اسے ملک رب نواز کے عتاب اور پولیس کے جبروت سے بچانے کے لیے اپنے ساتھ لائے تھے۔ اب یہ بھی پتا چل گیا ہے کہ اسے صرف جسمانی خطرہ نہیں، ذہنی روگ بھی لاحق ہے اور اس کے ذمے دار ہیں وہ سب شریف لوگ، چار سال میں ملنے والے چالیس شریف زادے جن کو اس نے حرامیوں کے حرامی کہا تھا۔ وہ ایک مظلوم لڑکی ہے۔ پتا نہیں اس کے ساتھ دینا نے کیا ظلم کیا۔ ابھی تو اس کی عمر بھی کچھ نہیں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے؟ تم اس کی مدد کر سکتی ہو؟"

"صرف میں ہی کیوں، تم کچھ نہیں کرنا چاہتے؟" خبشم نے غصے سے کہا۔

"اوکے ہم سب مل کے کیا کر سکتے ہیں؟ اور کیا ہمارے مدد کرنے سے فائدہ ہوگا؟"

"سیت کرنے سے پہلے ہی فائدے کی بات مت کرو۔ ہم بیک نیچے سے کوشش ضرور کر سکتے ہیں۔ ہر کوشش کے لیے کامیابی کی جنگی ضمانت کون دے سکتا ہے۔ ہم خدا سے امید رکھ سکتے ہیں اور دعا کر سکتے ہیں زیادہ سے زیادہ۔"

میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا "اچھا بھائی، غلطی ہو گئی مجھ سے۔ تم کو جو کرنا ہے میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

"تم نے ایک بات ٹوٹ کی؟"

"ہاں۔ حسین بڑے پھر دل مشہور ہیں مگر تمہارا دل تو موم کا بنا ہوا ہے۔"

وہ مسکراتے لگی "میں سونی کی بات کر رہی تھی۔ اس کا

چو مجھے دیکھا ہوا لگتا ہے۔
میں نے ایک قصبہ مارا "آئینے میں دیکھا ہوگا۔"
"آئینے میں!" وہ سوچ میں پڑ گئی اور پھر ایک دم چنگی
بجائے ہولی "رائٹ!"

"انجی سمجھ میں بات؟"
"ہاں مگر تاثر کیا واقعی اس کی صورت مجھ سے ملتی
ہے؟ تم نے بھی نوٹ کیا؟"

میں نے کہا "آج اس نے تمہارے کپڑے پہن رکھے
ہیں تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے یک نہ شدہ دوشہ۔ ایک تو اس کے
اور تمہارے بالوں کے امتزاج کا فرق ہے۔ اور دو وزن میں
کم ہے مگر کوئی بات نہیں "اتفاق فرق چلے گا۔"
"چلے گا کیا مطلب؟"

"بھئی اگر اصل ضائع ہو جائے کبھی تو کاہن کا پی سے
کام چل جاتا ہے۔ یہ تو قسمت ہے میری کہ خدا نے میرے
لیے اسٹینڈ بائی ARKANGMENT کر دیا۔"

"تجی آسانی سے ضائع ہونے والی چیز نہیں ہوں میں۔
مروں گی تو پہلے تمہیں مار سکے ابھی سے کاہن کا پی پر نظر
ہے۔" جھنجھٹنے لگی۔

"کسی کو بتایا نہ جائے تب بھی وہ اس کو تمہاری چھوٹی
بہن سمجھے گا۔ مرحوم خلیق کی مرحوم بیوی کا درجہ اور مقام
حاصل کر لیا ہے تم نے اور شاید اسی لیے ہمدردی کے جذبات
اٹھ پڑے ہیں۔"

شاید کچھ لوگوں کے لیے شینہ عرف سونی کی کہانی میں
کوئی بھی نئی بات نہ ہو کیونکہ ایسی ہیکیوں ہزاروں کہانیاں
اخبارات اور رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ کچھ حقیقی

کچھ آدھی حقیقت، آدھا افسانہ اور کچھ ادھر ادھر سے
گھومے جوڑ کے تیار کی جانے والے۔ چار عورتیں چار
کہانیاں۔ پانچ مرد پانچ کہانیاں۔ عجیب بتیاں "اس بازار کی
داستانیں۔ یہ سب زندگی کے آئینوں کی کڑیاں ہیں جن کو
کڑیاں اس کوپ سے آگے لگا کر دیکھا جائے تو ہر پہلو سے ایک نیا
منظر نئی ترتیب کے ساتھ نظر کو جیران کرتا ہے ہر کہانی کے
بنیادی عناصر وہی رہتے ہیں۔ کہیں مرد، کہیں عورت، معاشی
اور معاشرتی ناہمواری اور استحصال کا جب تدبیر تقدیر کی
بالادستی۔ ناامیدی کا عذاب اور خوابوں کی شکست کا دکھ۔
عبرت سرائے دہر میں ایک مشت خاک کا اجاز۔

شینہ عرف سونی بھی ایک ایسی ہی کہانی ہے جو ہماری
کہانی کا حصہ بن گئی ہے چنانچہ اس سے صرف نظر ممکن
نہیں۔ یہ کہانی ہم نے بڑی کوشش سے ٹکڑوں کی صورت

میں اور کسی ترتیب کے بغیر سنی۔ بہت سی لاحق حاصل تفصیلات
اور حذف کر دیئے کے قابل واقعات ناقابل برداشت
سچائیوں کی تختی اور ناقابل دید مناظر کی غلاخوں کو الگ
کر کے جو تصویر بنی وہ کچھ ہوں ہے۔

سونی ایک پرائمری اسکول ٹیچر کی بیٹی تھی۔ وہ سیالکوٹ
کے ضلع پسرور میں بڑی قاعدت کے ساتھ رہتے تھے۔ اسکول
ٹیچر کا آبائی مکان خاصا بڑا تھا۔ پہلے اس کے حصے داروں میں
دو بھائی اور ایک بہن بھی شامل تھے مگر بہن شادی کے بعد
کراچی گئی تو پھر لوٹ کے نہیں آئی۔ اس کے بارے میں کسی
کو اطلاع نہ تھی کہ وہ زندہ ہے یا مر گئی۔ ماسٹر ایک بار اسے
علاش کرنے کراچی بھی گیا تھا مگر بڑی مشکل سے وہ ایک
پرانے پتے پر پہنچا۔ آگے راستہ بند تھا۔ اسے کوئی نہ بتا سکا کہ
اس کی بہن کا کیا نمکنا ناماں ہے۔ کراچی میں دو سندر تھے۔
ایک کھارے پانی کا دوسرا انسانوں کا۔ وہاں ایک انسان یا
ایک تنکا تلاش کرنے کے لیے عمر خضر بھی ناکافی ہوتی۔ ماسٹر
مایوس لوٹ آیا اور بہن کو بحال کیا۔

ماسٹر کا ایک بھائی رات کے وقت آخری شود کچھ کر
لوٹے ہوئے تانگے سے کرا اور اس کے پتے کے نیچے آگیا۔
وہ آگے بیٹھ پر نہیں "اس ڈنڈے پر بیٹھا ہوا تھا جو ٹھوڑے
کی دم سے شروع ہوئے اس کے کانوں پر ختم ہوتا تھا۔ تانگے
کا بالٹ بائیں جانب والے ڈنڈے پر تھا مگر اسے بہت
پریشانی تھی۔ ماسٹر کا بھائی سوج میں تھا اور قلم کے سب سے
بیجاں خیر رص کو یاد کرتے ہوئے لٹک لٹک کے وہ گیت گارہا
تھا جس پر نیلے ایک ہوشیار دانش کیا تھا۔ اس کا گراہر حق
تھا۔

ماسٹر کا دوسرا بھائی دینی کیا تو اتنا دولت مند ہو گیا کہ اس
نے آبائی مکان میں اپنا حصہ چھوڑ دیا اور یوں ایک وسیع مکان
بلا شرکت غیرے ماسٹر کی ملکیت ہو گیا۔ اس کا نصف کرائے پر
تھا۔ باہر کی جانب اس میں چار دکانیں تھیں۔ ان میں سے
تین کا کرایہ آتا تھا۔ چوتھی "شاپن جس ایڈ اسٹیشنری
اسٹور" کو ماسٹر خود چلاتا تھا۔ اسے سیالکوٹ کے علامہ اقبال
صاحب سے بڑی عقیدت تھی۔ دکان کا نام اس کی عقیدت کا
منظر تھا۔ ماسٹر اسکول سے فارغ ہونے کے بعد رات تک
دکان پر نظر آتا تھا اور اسے نوکری سے زیادہ دکان سے آمدنی
ہو جاتی تھی۔ اسکول کے سب طلبا ماسٹر کے مستقل گاہک
تھے۔

ماسٹر نے شادی بھی خود ہی کی تھی کیونکہ ماں باپ تو یہ
فریضہ پورا کرنے سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو گئے تھے اور

خاندان کے بزرگوں میں جو دور کے رشتے دار تھے وہ سب
اپنی اپنی لڑکیوں کو اس کے سرمذہنا جانتے تھے۔ ماسٹر کے
خیال میں وہ سب لڑکیاں اس قابل تھیں کہ انہیں سندر میں
فرق کر کے ضائع کر دیا جائے۔ ماسٹر بڑھا لکھا اور خوبو تھا۔
اس کی آمدنی بہت تھی اور وہ خود مختار تھا چنانچہ اس کا داغ
خراب ہو گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے لیے ایک سے
ایک اچھا رشتہ مل سکتا ہے اور یہ خیال کچھ اتنا غلط بھی نہیں
تھا۔

ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی جو ماسٹر کو ایک آئینہ مل داماد
سمجھتے تھے۔ اور ادھر ادھر کے لوگوں کی کوشش سے بالآخر ایک
جگہ ماسٹر کی بات بن گئی۔ وہ سیالکوٹ کے ایک انیسپورٹر کی
بیٹی تھی جو تقسیم ہند سے بھی پہلے سے کھیلوں کا سامان بنا رہے
تھے لیکن اب انہوں نے اپنی پیداوار کو کرکٹ کھیلنے کے
سامان تک محدود کر لیا تھا۔ ان کے اسپورٹس کی مارکیٹ
انگلینڈ سے آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ تک تھی۔ کرکٹ بیٹ ان
کی SPECIALITY بن گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ماسٹر کو
شادی کے بعد اپنے کاروبار میں شریک کر لیں گے۔ اس سے
کہیں گے کہ ٹیچری اور کتابیں کا پانا بچنا چھوڑ کے جنوبی
افریقہ کی مارکیٹ چکڑے اور ذہنی طور پر ماسٹر بھی تیار تھا کہ
آپائی گھر چچ کے سیالکوٹ شفٹ کر جائے اور پھر آگے بڑھتا
جائے لاہور، کراچی اور بالآخر جنوبی افریقہ۔ کرکٹ کھیلنے
والے سارے ممالک کی مارکیٹ اس کے لیے سیالکوٹ کے
بازاروں کی طرح ہو کہ چھوڑ چکا تھا۔

تقدیر کو مگر کچھ اور ہی منظور تھا۔ مٹکی کی تقریب میں
ماسٹر نے دلہن کی ایک سہیلی کو دیکھ لیا جو بہت اچھا ناچ رہی
تھی۔ خوشی کے موقع پر گھر کے اندر اس محفل میں دلہن کی
بہنیں، کزن اور سیلیاں خاندان کے محدود ناظرین کے
سامنے ایک انڈین گانے کی دھن پر اپنا رقص پیش کر رہی
تھیں تو سوائے دو چار پرانے خیالات رکھنے والے بڑعوں
کے "اس میں کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ اب یہ سننے لکھ کر کا
حصہ تھا۔

ماسٹر کی نظر کے سامنے ایک برق سی لہاری تھی اور وہ
مہوت بیٹھا اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا جس کے رقص کی ہر اور
ہو شیا تھی۔ ماسٹر ہزار جان سے اس پر فریفت ہو گیا۔ اس نے
معلوم کیا تو پتا چلا کہ وہ دلہن کی سہیلی ہے اور کسی کالج میں
پڑھتی ہے۔ مٹکی ابھی ہوئی بھی نہ تھی کہ ختم ہو گئی۔ لڑکی
والے سخت پریشان ہوئے کیونکہ ماسٹر کے اقدام سے خاندان
میں لڑکی کے بارے میں چھ بیگونیاں شروع ہو گئی تھیں اور

شکوک پیدا ہو رہے تھے۔ ماسٹر ان سے منہ چھپاتا پھر رہا تھا
لیکن بالآخر انہوں نے ماسٹر کو چکڑ لیا۔ دلہن کے دو بھائی اور
ان کے دوست ماسٹر کو اٹھالائے۔ انہوں نے ماسٹر کی اچھی
خاصی پچھنی لگائی اور قتل کرنے کی دھمکی بھی دی مگر یہ سب
لاحاصل تھا۔ ماسٹر نے ان سے بہت معافی مانگی لیکن مٹکی
توڑنے کی وجہ پتانے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ تم مجھے
قتل کر سکتے ہو مگر زبردستی میری شادی نہیں کر سکتے۔ اب لڑکی
دلوں کو احساس ہوا کہ جس بات کو وہ ایک خولی شمار کر رہے
تھے وہی ان کے حق میں برائی بن گئی تھی۔ آج اگر لڑکے کے
ماں باپ بزرگ ڈسے دار ہوتے تو شاید بات نہ بگڑتی۔

ماسٹر نے ایک سال بعد اس ڈائس لڑکی سے شادی کر لیا۔
اس کے لیے ماسٹر کو بہت باز پٹینے پڑے۔ اس نے بہت سے
ممتاز لوگوں کو کوچ میں ڈال گئے اپنی ٹیک چلنی کی ضمانت فراہم
کی۔ اسے ایک بہت بڑا جھوٹ بھی بولنا پڑا کہ پہلے اس نے
مٹکی کیوں ختم کی تھی۔ اس نے کہا کہ میں مریخوں کا گروہ
بات زبان پر نہیں لاؤں گا۔ سمجھنے والے سمجھ گئے کہ ایک
لڑکی کے بارے میں معلوم ہونے والی ایسی راز کی بات کیا
ہو سکتی ہے۔ وہ ضرور کسی اور کو جانتی تھی اور اللہ جانے بات
کہاں تک بڑھ گئی تھی کہ ماسٹر کو بھی معلوم ہو گئی۔ اب
آنکھوں دیکھی کبھی کون نکلتا ہے۔

بعد میں ماسٹر کا یہ جھوٹ ایک جہ بن کر اس کے سامنے
آیا۔ اس نے ایک بے قصور شریف لڑکی کے کردار کو داغ
دار کیا تھا۔ شاید یہ اس کی سزا تھی کہ شادی کے کچھ عرصے
بعد ہی ان کی ازدواجی زندگی اختلافات کا شکار ہو گئی۔ ماسٹر
پلاشبہ اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا تھا مگر یہ محبت یکطرفہ
تھی۔ اسے بہت جلد اپنی بیوی کی سرد مری اور ناخوشی کا
احساس ہو گیا۔ اس نے بیوی کو خوش رکھنے کے لیے اور زیادہ
کوشش کی مگر اس کی بیزار، افسردہ اور بے تعلقی کے
روپے میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ ماسٹر کو پھر بھی خیال نہ آیا کہ
اس کا سبب کچھ اور ہو سکتا ہے۔

ماسٹر نے اسے پاس تھا اور شادی کے وقت اس کی بیوی
نے انٹر کا امتحان دیا تھا۔ ماسٹر کے خیال میں یہ تعلیم گھریلو
ضرورت کے لیے کافی تھی۔ اسے کون سا بیوی کو بھی نیچر پانا
تھا۔ شادی کے بعد اس کا نتیجہ آیا تو وہ ایک پرے میں رہ گئی
تھی۔ بیوی کے اصرار پر ماسٹر نے اسے ایک پیپر کٹیر کرنے کی
اجازت دی۔ اس کے خیال میں یہ بہت جائز مطالبہ تھا۔ دو
سال کی محنت کو صرف ایک پرے کی دجہ سے ضائع کرنا غلط
ہوتا لیکن ایف اے کے بعد اس کی بیوی نے بی اے میں

اغلے لینے کی ضد پکڑ لی۔ بی اے بھی وہ ریٹوٹ نہیں کالج میں داخلے کر کرنا چاہتی تھی۔ یہ ماسٹر کے خیال میں ناممکن تھا۔ ایک عورت شادی کے بعد بچے پالتی ہے اور گھر سنبھالتی ہے۔

یہاں ان کے درمیان دوسرا شدید اختلاف پیدا ہوا۔ ماسٹر کی بیوی نے بی اے پاس کرنے تک ماں بننے کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ قدرت نے اس کا ساتھ نہیں دیا اور خواہش نہ رکھنے کے باوجود اس کے ماں بننے کے آثار پیدا ہو گئے۔ اس نے بہت کوشش کی کہ بچہ پیدا نہ ہو مگر بی بی اپنی ماں سے زیادہ ضدی ثابت ہوئی۔ شادی کے ٹھیک نو ماہ بعد ٹینس کی بڑی ہنس ہنس دنیا میں آگئی۔

شادی کے بعد ماسٹر نے اپنی بیوی کو بتایا تھا کہ کس طرح وہ ایک تقریب میں رقص کرتا دیکھ کے پاگل ہو گیا تھا۔ شروع شروع میں اس نے بہت اصرار کیا کہ وہ اسے ڈانس کر کے دکھائے مگر بیوی نے اسے ٹال دیا کہ شادی بیاہ کی بات اور ہوتی ہے پھر خاندان میں دو شادیاں ہوئیں اور وہاں اس کی بیوی نے اپنے رقص سے سناں باندھ دیا۔ لوگ دم بخور بیٹھے اس بجلی کو لہراتا مل کھاتا دیکھتے رہے جس نے ماسٹر کے دل پر گر کے اسے خاموش کر دیا تھا۔ ماسٹر کو معلوم ہوا کہ وہ کالج کے ہر فکشن میں ڈانس کرتی تھی اور گزرتا کالج کے مقابلہ رقص میں لاہور جاکے اول انعام بھی حاصل کر چکی تھی۔ اسے ڈانس کا اتنا شوق تھا کہ اس کا ارادہ فلوں میں اور اسٹیج پر ڈانس کرنے کا تھا۔ ماسٹر کو یہ جان کے خوش نہیں ہوئی افسوس ہوا۔ شاید اس کی بیوی کی اداسی اور پیزاری کا یہی سبب تھا۔

ماسٹر نے اس کے خاندان کے لوگوں اور ملنے جلنے والوں سے پوچھا تو کچھ اور باتیں معلوم ہوئیں۔ مثلاً یہ کہ اس کی بیوی رقص کی باقاعدہ تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھی اور کسی ڈانس ماسٹر (جو خود کو مہاراج غلام حسین گنگوٹکاشا کا شاگرد کہتا تھا) نے گھر آ کے اسے رقص سکھانے کی باہی بھلی تھی مگر سلاکوٹ میں معاشرے کی سوچ اتنی بے باک نہیں ہوئی تھی کہ اہل ثروت بھی اپنی بیٹیوں کو اس کی اجازت دیں۔ مانا تاجا شوق کی حد تک اچھا تھا۔ یہ پیشہ بہر حال میراٹوں اور گجراتوں کا تھا۔

خود ماسٹر نے کئی بار اچانک گھر آتے پر یہ توٹ کیا کہ اندر اس کی بیوی کمر باندھ کر کسے تاج رہی تھی۔ ڈانس کے کیسٹ وہ ساتھ لائی تھی لیکن جب ماسٹر نے پوچھا تو پہلے اس نے انکار کیا مگر اس کے چہرے پر چپکنے والا ہنسنہ اور اس کی بھولی بھولی

سانس نے اس جھوٹ کا راز فاش کر دیا۔ ماسٹر نے وی سی آر میں لگا ہوا کیسٹ بھی پکڑ لیا۔ اس نے بیوی کو سرزنش کی کہ ایسے چھپ کے ڈانس کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ پہلے تم سب کے سامنے ڈانس کرتی تھیں تو اب میرے سامنے کیا پردہ میں تو اسے کوئی برا کام نہیں سمجھتا۔ یہ ایک طرح کی انکسار سا بھی ہے اور تمہارا شوق بھی لیکن اس کے باوجود وہ کبھی اپنے شوہر کے سامنے نہیں ناچی۔ ماسٹر نے اسے شرم و حجاب پر محمول کیا۔

شادی کے دو سال پورے ہونے سے پہلے ہی تجزیہ بھی پیدا ہو گئی مگر ماسٹر کی بیوی کے شوق یا جنون میں کوئی کمی نہیں آئی پھر اچانک ماسٹر کو ایک نئی بات معلوم ہوئی۔ جس نے اسے تشویش میں مبتلا کر دیا۔ اس کی بیوی ہر جمعرات کو اپنے گھر جاتی تھی۔ وہ صبح جا کے رات کو لوٹ آتی تھی۔ ایک بار اسے یوں لگا جیسے اس کی گھر سے روگائی اور سیکے آمد کے وقت میں کچھ فرق تھا۔ دوسری بار یہ فرق الٹ گیا یعنی وہ سات بجے اپنے گھر سے واپس ہوئی مگر ماسٹر کے گھر تو بجے پہنچی۔ ماسٹر کے پوچھنے پر اس نے کہہ دیا کہ راستے میں ایک سیمپلی مل گئی تھی۔

ماسٹر کی بیوی دو بچوں کی ماں بننے کے باوجود روز اول کی طرح دلی پکلی خوبصورت اور پرکشش تھی۔ اس کا بدن ایک راقصہ کا بدن تھا۔ تناسب کے سانچے میں ڈھلا ہوا۔ پھلنے پھونکنے کی صلاحیت رکھنے والے دانوں سے بنا ہوا۔ لچک رکھنے والے قوس و خم کا مجموعہ۔ جسم کی ہر حرکت میں لوج سے بھرا ہوا۔ تاہم مزاج کے اعتبار سے وہ ماسٹر کے لیے ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ اسے ماسٹر سے تو خیر کبھی رغبت نہ تھی مگر بچوں سے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ روز بروز زیادہ غنیمت، خج مزاج اور بد لحاظ ہوتی جا رہی تھی۔ وہ موقع بے موقع ماسٹر سے شادی کو اپنی بد قسمتی قرار دیتی تھی۔ ماں باپ کو کوستی تھی، جنہوں نے اسے زبردستی شادی کے بندھن میں جکڑ دیا۔ ازدواجی زندگی کو وہ قید باسقت قرار دیتی تھی اور ہر ماہ سیکڑوں روپے اپنے حسن کی آب و تاب کو برقرار رکھنے والی کمرہوں اور ٹوشنوں پر خرچ کر دیتی تھی۔

جب ماسٹر کے دل میں شک کا بھوتا تو بدگمانی کی جزیں بڑی تیزی سے پھیلنے لگیں۔ ماسٹر نے بیوی کے گزشتہ دو سال کے رویے کا تجزیہ کیا تو اس کی سمجھ میں یہ بات آنے لگی کہ وہ یقیناً کسی اور کو چاہتی تھی مگر اس کی مرضی کے خلاف اسے ماسٹر کے حوالے کر دیا گیا۔ وہ شخص کون تھا؟ ماسٹر نے بیوی کی نقل و حرکت کی نگرانی شروع کی تو جمعرات میں گزیرا نظر آئی۔

اس کی بیوی کا میکہ دس منٹ کی پیدل مسافت تھی۔ صبح ماسٹر کو سات بجے اسکول جانا ہوتا تھا۔ وہ بیوی کو میکہ چھوڑنے نہیں جاسکتا تھا لیکن وہ رات کے وقت بھی واپسی پر کسی کو ساتھ نہیں لاتی تھی۔ جب ایک گھنٹے کے فرق کا تاج چلا تو ماسٹر کے جسم میں خون سنسانے لگا۔ اس نے خاموشی سے جاسوسی شروع کی اور پتا چلا کہ بیوی ہر جمعرات کو ایک گھنٹا کلاس غائب ہو جاتی ہے۔

وہ ہر ہفتے ایک گھنٹے کے لیے ڈانس ماسٹر کے گھر جاتی تھی۔ یہ انکشاف اتنا اشتعال انگیز تھا کہ پہلے ماسٹر نے ان دونوں کو قتل کر دینے کا فیصلہ کیا۔ وہ راتے راتے ہاتھوں انیس پکڑ لیتا تو قتل کے بعد آگے قتل سمیت تھانے میں حاضر ہو کے اعتراف کر سکتا تھا اور بتا سکتا تھا کہ وہ ایسا کرنے پر کیوں مجبور ہوا۔ غصے اور نفرت میں یہ قتل کوئی سنگین جرم نہ سمجھا جاتا اور ماسٹر کی سابقہ نیک نامی کے پیش نظر اس کے سزا سے بچ نکلنے کے امکانات بہت روشن تھے لیکن اس نے ڈانس ماسٹر کو دیکھا تو اپنا خیال بدل دیا۔ وہ ساٹھ سال کا بیڑے جیسا سیاہ فام لیکن صحت مند شخص تھا۔ اس کی کلکتی حسن رکھنے والی بیوی اس جسم بد صورتی سے محبت نہیں کر سکتی تھی۔ اس وقت ماسٹر کی عقل میں یہ بات نہیں آئی کہ عورت جب کسی فنکار کی پرستار ہوتی ہے تو اس کے جسم میں صرف فن کا حسن دیکھتی ہے۔

ماسٹر نے کچھ فوری اقدامات کئے اس لیے بیوی سے کہہ دیا کہ آئندہ سے وہ جمعرات کے بجائے اتوار کو اپنے گھر جاسکتی ہے اور اتوار کے دن اسے چھٹی ہوتی ہے چنانچہ وہ بھی اس کے ساتھ جانے لگا۔ اس نے بیوی کے ڈانس والے کیسٹ بھی صاف کر دیے۔ بیوی نے اس پر قیامت برپا کر دی مگر ماسٹر نے صاف انکار کر دیا کہ اس نے کچھ نہیں کیا۔ خود بیوی کی غلطی سے ایسا ہوا ہو گا لیکن اس جھوٹ کے پیر نہیں تھے۔ ان کے درمیان جھگڑا بڑھ گیا اور بیوی اپنے میکے جا کے بیٹھ گئی۔ ماسٹر نے سسرال جا کے فریادی اور سارا کیس ان کے سامنے رکھ دیا۔ فیصلہ ماسٹر کے حق میں ہونا لازمی تھا مگر اس کی بیوی نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ وہ اب کسی صورت ماسٹر کے ساتھ رہنے پر آمادہ نہ تھی۔ اس نے اپنے گھر والوں سے بھی کہہ دیا تھا کہ اس پر دباؤ ڈالا گیا تو وہ انیس بھی چھوڑ دے گی۔

اس سے پہلے کہ طلاق یا مصالحت کے معاملات آگے بڑھتے ماسٹر نے اپنی بیوی کو ڈانس ماسٹر کے گھر میں داخل ہونا دیکھ لیا۔ اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے اور ماسٹر اپنے

دیکھل سے قانونی مشورہ کر کے لوٹ رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنے گھر والوں سے چھپ کے وہاں آئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے ماسٹر کے دماغ کا فیوز آگیا اور اس نے سوچا کہ وہ ابھی گھر جا کے کھڑی لائے اور استاد شاگرد کو جنم رسید کر کے یہ جھگڑا ہی ختم کر دے مگر بنیادی طور پر وہ ٹھنڈے خون اور ٹھنڈے دماغ والا آدمی تھا۔ کچھ لوگوں کے نزدیک اسے بزدلی اور بے غیرت بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ بیوی سے اس کی محبت اب نفرت میں بدل چکی تھی اور اسے ایسی جذباتی بے وقوفی کا شدت سے احساس ہونے لگا تھا جو اس نے ایک پیدائشی ڈانسر سے شادی کی صورت میں کی تھی۔ وہ ایک اچھی گھڑی بیوی کیسے بن سکتی تھی؟

وہ کچھ دن ڈانس ماسٹر کے دروازے سے لگا کھڑا رہا پھر اسے اندر سے ٹھکڑو بجنے کی آواز صاف سنائی دینے لگی تو اس کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ یہ اس کی شریک حیات اس کے بچوں کی ماں اور اس کی منکوحہ تھی جو ایک مکروہ شکل والے میراثی ٹائپ ڈانس ماسٹر کے سامنے تاج رہی تھی۔ اس نے اپنے شوہر کے سامنے ایک بار بھی رقص کرنا منظور نہیں کیا تھا جو اس کے رقص پر ہی اس کا دباؤ نہ بنا تھا اور اگر وہ اس کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تو وہ ساری عمر اس کا پرستار بن رہا۔

ماسٹر طیش میں سیدھا گھر گیا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس بے حیا عورت کی خاطر پھانسی نہیں چڑھے گا۔ ایسی عورت کبھی اچھی بیوی بن ہی نہیں سکتی۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ بالآخر وہ اپنی ضد پوری کرتے ہوئے اپنے شوق پر اپنا سب کچھ قربان کر دے گی۔ وہ ڈانس ماسٹر کے ساتھ بھاگ جائے گی اور فلوں میں ناچے گی یا لاہور میں شاہی محلے کے کسی گوشے پر۔ اس کے لیے سب سے بھیاں سزا موت نہیں فن کی موت ہوتی۔

ماسٹر ایک کھڑی کے ساتھ واپس لوٹا جس کا پھل روشنی میں چمکتا تھا۔ وہ ایک دھماکے سے ڈانس ماسٹر کے گھر میں داخل ہوا۔ اس کی بیوی ایک کرسی پر بیٹھی اپنے ٹھکڑو کھول رہی تھی۔ اس کے چہرے پر خوشی اور طرمانیت کا ایسا نور تھا جو ماسٹر نے صرف ایک بار پہلے بھی دیکھا تھا۔ جب وہ اس کے سامنے مٹکئی کی محفل میں پہلی بار تاج کے فاسخ ہوئی تھی اور اس کو ہر طرف سے واہ واہ ملی تھی۔

ڈانس ماسٹر اس کے سامنے دو زانو بیٹھا تھا اور اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ مندر میں دیوی کے استھان پر رکھی ہوئی مورتی ہے اور وہ اس کا پجاری۔ ماسٹر کھڑی کے ساتھ

داخل ہوا تو ایک سیکنڈ کے لیے وہ دونوں مفلوج ہو گئے۔ انہیں ماسٹر کی آنکھوں میں اپنی موت صاف نظر آئی تھی۔ خوف سے اس کی بیوی کی آنکھیں اُبل آئیں۔ اس کی آواز حلق میں پھنس گئی اور وہ ہاتھ اٹھا کے خود کو متوقع وار سے بچانے لگی۔

ڈانس ماسٹر نے پہلے اٹھنے کی ہمت کی تو ماسٹر نے اسے دھکاوے کر پیچھے گرایا۔ دیوار پر سر ٹکے سے اس کو چکر اُٹیا اور وہ پھر نہ اٹھ سکا۔ ماسٹر نے کھڑی اٹھائی تو اس کی بیوی نے ایک چیخ ماری اور ہاتھ اپنے گلے پر رکھ لیا ماسٹر کا نشانہ اس کی گردن نہیں تھی، کھڑی کمر پور وار بڑے بچے تھے انداز میں رقاصہ کے ایک پاؤں پر بنا۔

ایڑنی کے پاس سے ماسٹر کی بیوی کا پیچہ کٹ کے جسم سے الگ ہو گیا۔ اس کی بیوی نے دہشت اور دیوانگی میں چیختے ہوئے دیکھا کہ ماسٹر نے پیچہ جھک کر کٹا ہوا پاؤں اٹھایا اور اس کے سامنے پلانے لگا۔ وہ پاگل پن میں ہنس رہا تھا۔ ”حرام زادی۔ کبجری“ اس پر ناز تھا سمجھ اب ناچ دل بھر کے ”وہ چیخ کے بولا اور پھر اس کے منہ پر تھوک کے باہر بھاگ گیا۔ وہ گنا ہوا پاؤں اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اس وقت تک رقاصہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

ماسٹر کو تین سال کی قید ہوئی جو اکیلے پر بھی برقرار رہی۔ تاہم اس جرم کی سبب کی سزا میں یہ سزا سزا کم تھی۔ ماسٹر کو قتل کر کے یہ خوشی پر گزرتی جاتی جو اسے ایک رقاصہ کو پاؤں سے محروم کر کے ملی تھی۔ جب وہ جیل سے رہا ہوا تو اسے معلوم ہوا کہ ڈانس ماسٹر اور اس کی بیوی شریچوڑ کے جاچکے ہیں۔ اس کی بیوی جاستے وقت دونوں بچپوں کو بھی اپنے ساتھ لے گئی تھی۔

ماسٹر کی بیوی کا مستقبل تاریک ہو گیا تھا۔ وہ بہت عرصے صدمے سے پاگل رہی۔ اسے اکثر خیال آتا تھا کہ تین سال کی جیل اس کے شوہر کے لیے کوئی سزا نہیں تھی۔ اسے چاہیے تھا کہ وہ ماسٹر کو برادری کی سزا خود دیتی۔ لیکن پڑاؤت اور بھی قسم نہ ہونے والی سزا۔ جیسی کہ ماسٹر نے اس کا رقص کرنے والا پیر کاٹ کے دی تھی۔ معلوم نہیں اس پیر کا ماسٹر نے کیا کیا، کتنا اچھا ہوتا اگر وہ ماسٹر کی آنکھیں پھوڑ دیتی۔ اس کی آنکھوں میں تیزاب ڈال سکتی اور اس کی زبان بھی کاٹ دیتی۔ وہ سراسر خیال اسے خود کشی کا آتا تھا۔ اسے اپنی آنکھوں کی لنگڑائی ہوئی اور غیر محترم زندگی جینے کے قابل ہی نہیں لگتی تھی۔ اس کے لیے اپنے حسن و دلکشی میں اب کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ وہ چپ بیٹھی غلامی اپنے ماضی کو دیکھتی رہتی

تھی۔ اس وقت کی برصغیر میں دیکھتی تھی۔ جب اس کے دونوں ہر عمل تھے اور وہ بجلی کی طرح تھرتھاتی تھی، ٹھوس تھی، ہوا میں تھرتھاتی تھی اور لڑاتی تھی۔

ڈانس ماسٹر کی عمر زیادہ تھی عمر وہ ایک صحت مند مرد تھا۔ وہ رقاصہ کا دل بہلاتا تھا اور اسے جینے کا حوصلہ دیتا تھا۔ ان کے درمیان میاں بیوی جیسے تعلقات پر کوئی غن نہ تھی۔ قانون مذہب یا معاشرہ اس تعلق کی نوعیت سے لگاتار تھے۔ ڈانس ماسٹر کے خواب بھی چلتا چور ہو گئے تھے۔ جو اس نے ایک حسین سمارے کی مدد سے فلمی دنیا میں کامیابی کے لیے دیکھے تھے اب اس نے شینے کی ماں کو ایک ڈانس انٹرنیٹ ٹیوٹ گھولنے پر راضی کیا۔ کیا ہوا اگر وہ خود رقص نہیں کر سکتی۔ وہ دوسروں کو رقص سکھا سکتی ہے۔ وہ بڑے کماسکتے ہیں اور عیش سے رہ سکتے ہیں۔ ان کے پاس مستقبل کا سرمایہ نسیبہ اور شینہ ہیں۔

ڈانس انٹرنیٹ ٹیوٹ ایک ایسے علاقے میں قائم ہوا جو پیشہ سے بدنام تھا مگر رقص سیکھنے والوں کی اکثریت وہیں سے آتی۔ مگر کا ایک کمرہ ہر وقت موسیقی پر طبلے کی تھاپ اور ٹھنڈی لڑائی کی تھاپ سے گونجتا رہتا تھا۔ لنگڑی میڈم کو ٹیوٹ والیوں کو رقص کی تعلیم دینے لگی۔ ٹھہریں ہر وقت ادب و عورتوں مردوں کا آنا جانا شروع ہو گیا۔ آمدنی بھی معقول حد تک بڑھ گئی۔ آنے والوں میں ہر طرح کے شوقین مزاج تھے۔ نئے چروں کے ملاشی کچھ پروڈیو سراور ڈانس ڈائریکٹر بیسے والے اور جوان مرد تھے۔ انہوں نے لنگڑی میڈم کی ایک ٹانگ کے نقص کو نہیں دیکھا۔ اس عورت کو دیکھا جو سراپا قیامت تھی۔ لنگڑی میڈم عالی شان کاہنوں میں ان کی کوٹھیلوں پر دعوؤں میں شریک ہونے لگی۔ ایک دو دنے سنجیدی سے اسے شادی کی پیش کش بھی کی مگر وہ ایک زندگی میں دوبارہ عہدہ کمانے پر راضی نہیں ہوئی۔ اس نے اب ایک مرد کے انتقام کی سزا سب مردوں کو دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

رفتہ رفتہ وہ شراب کی عادی ہو گئی۔ اس نے ڈانس ماسٹر کو لات مار کے اپنے گھر اور اپنی زندگی سے نکال دیا اور خود لاہور کے ایک پوش علاقے میں شفٹ ہو گئی۔ اس کا گھر ایک مازن کو مل گیا تھی مگر حقیقت قہر خانہ تھا۔ جس مازن میں نسیبہ اور شینہ نے پرورش پائی اس میں شرافت کا نام ایک گالی کی طرح تھا۔ آٹھ دس سال کی عمر میں ان کی نظریں ہر نظارہ دیکھ چکی تھیں۔ ان کے کان ہر غلط آواز سے آشنا ہو گئے تھے اور انہیں ہر طرف لاپچی گدھ منڈلاتے نظر آتے تھے جن کی ہوسناک لاپچی آنکھوں سے ایک سوال پیش

جھانکتا رہتا تھا۔ آخر تم جوان ہونے میں اتنی دیر کیوں لگا رہی ہو؟

ان کا بس چلتا تو وہ انہیں نو دس سال کی عمر میں ہی جوانی کی سند عطا کر دیتے مگر ماں ان کی حفاظت ایسے کرتی تھی کہ کسی کو قریب آنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ ماں کو اپنی بیٹیوں کی صورت میں اپنے سارے خواب پورے ہوتے نظر آ رہے تھے۔ وہ انہیں بڑی دل جی سے رقص سکھا رہی تھی اور ساتھ ساتھ اسکول بھی بھیج رہی تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ جب وہ بڑھ لکھ جائیں اور مکمل ڈانس رین جاسیں تو انہیں ایک دھماکے سے فلمی دنیا میں اتار دے۔ دونوں بیٹیاں پر بھی تھیں اور کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ روزانہ سے فلمی رقص میں اپنی بادشاہت کا اعلان کریں تو انہیں آنے والے ہیں چپکس برسوں کی حکمرانی کا حق تفویض نہ کیا جائے۔

لیکن اس کے خوابوں کا یہ دوسرا عمل بھی بہت جلد زمین بوس ہوا۔ اس کا پرانا ڈانس ماسٹر ایک دن پھر گیا۔ منطقی اور بیماری سے اس کا حال قابل رحم ہو رہا تھا۔ پرانی شاگرد نے ترس کھا کے اسے لازم رکھ لیا اور اسے دو وقت کی روٹی ملنے لگی۔ جب اس کی حالت کچھ تسخیل تھی تو اسے اپنی ذلت کا بدل لینے کا خیال آیا اور اس نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت نسیبہ اور شینہ کے ہاتھ ذہن میں ماں کے خلاف زہر بھرا شروع کیا۔

ڈانس ماسٹر نے انہیں بڑی تفصیل سے بتایا کہ ان کا باپ کون تھا۔ اس نے کہا کہ وہ ایک نیک نفس، عزت دار اور تعلیم یافتہ شخص تھا۔ سیالکوٹ کے قصبے پسرور کی آدمی آبادی اس کو جانتی تھی۔ وہاں ان کا ذاتی مکان کتنا بڑا تھا اور

اسے کیسے طے تھا۔ اس نے دونوں کو نانا نانی اور ماما کی بے بسی میں بتایا کہ وہ کتنے عزت دار لوگ تھے اور آج بھی ہوں گے۔ اس نے دونوں بچپوں کو ماسٹر کی شادی کے بارے میں بتایا اور ان کے ذہن میں یہ اثر بٹھانے میں کامیاب ہو گیا کہ انہیں ایک شریفانہ اور باعزت ماحول سے جدا کرنے کی ساری ذمہ داری ان کی ماں پر عائد ہوتی ہے۔ اگر ان کی ماں شرافت سے گزرا کر تھی تو آج وہ اس غلط اور بدنام ماحول میں نہ ہوتیں۔ اب ان کا کوئی مستقبل نہیں، ان کی ماں انتظار کر رہی ہے کہ وہ جوان ہو جائیں تو انہیں پچاسے فلموں میں اور کوٹھوں پر۔ ریسوں کی بجی مخلوق میں اور اسٹیج پر اور ان کے جسم کی کمائی پر دولت مند ہو جائے لیکن کیا ان کا دل نہیں چاہتا کہ وہ بھی معاشرے میں عزت دار

کھلائیں۔ ان کا بھی اپنا گھر ہو اور بچے ہوں۔ ایک محبت کرنے والا شوہر ہو۔

لڑکیوں کے ہاتھ ذہن ایک دور ہے پر انہیں کا شکار ہو گئے۔ ایک طرف وہ زندگی تھی جو ان کی ماں گزار رہی تھی۔ یہ زندگی کسی طرح بھی باعزت مستقبل کی ضمانت نہ تھی۔ ڈانس ماسٹر کی یہ بات صحیح تھی کہ ماں ان کی کمائی پر اس لگے بھی ہے۔ اپنے باپ اور ایک خاندان کا خیال بھی دل کو کھینچتا تھا مگر یہ ڈراپنی جگہ تھا کہ شاید اب انہیں کوئی قبول نہ کرے۔

دونوں بیٹیوں کے دل میں ماں کے خلاف نفرت پیدا ہوئی تو انہوں نے بغاوت کی۔ آہستہ آہستہ یہ طعج ہوتی گئی اور ماں کے خلاف زہر اگلنے لگیں۔ بہت جلد ماں کو اندازہ ہو گیا کہ یہ منصوبہ کے پردے میں خدا بول رہا ہے۔ اس کی بیٹیوں کو بغاوت کا سبق پڑھانے والا ڈانس ماسٹر کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک بار پھر اسے جوتے مار کے نکال دیا گیا مگر وہ جاتے جاتے بھی اپنا کام کر گیا۔ وہ دونوں لڑکیوں کو بہت سے بچے اور حوالے دے گیا جن کا تعلق ان کے خاندان اور ماضی کے رشتوں سے تھا۔

سولہ سترہ سال کی عمر میں ہی انہوں نے پر پڑے نکال لئے۔ جس ماحول میں اخلاقی قدروں کا کوئی تصور نہ ہو وہاں نوجوانی کے ہنکے ہوئے باقی جذبات کو روکنا کس کے اختیار میں تھا۔ شکار خود زبردوام آنے کے لیے بے قرار ہو تو شکاری کب چوکے ہیں۔ انہوں نے ماں کی ہر پابندی کو اعلان یہ توڑا۔ اپنی مرضی سے ہر جگہ آنے جانے لگیں۔ سگریٹ تو کوئی بات ہی نہ تھی۔ انہوں نے شراب کے سرور سے بھی کچھ حاصل کر لیں۔

اسی زمانے میں ایک اور بات ہوئی جس نے نسیبہ اور شینہ کی زندگی کے دھارے کو سیل بے عتاق کر دیا۔ ان کی ماں ایک دن میاں میر صاحب کے مزار پر چار چڑھانے گئی تو وہاں سے واپسی پر ایک ملنگ نے اس کا راستہ روک لیا۔ اس کے بال جھاڑ جھکاڑ تھے اور ان میں گرد پڑی ہوئی تھی۔ اس کی داڑھی بھی جنگل کی بھاڑی بنی ہوئی تھی۔ وہ پھنپھن پھنپھن ہوتے تھا اور اس کے بدن پر تھے سیل کیل سے بو کے بھلے اٹھ رہے تھے۔

شینہ کی ماں نے اپنے کئے ہوئے پیر کی جگہ مصنوعی پاؤں لگوا لیا تھا اور اس کے سارے پر وہ عام لوگوں کی طرح سیدھی چلتی تھی۔ اس مصنوعی پاؤں پر ایک بھاری موانہ قسم کا جوتا تھا جس کے تسمے پندلی پر بندھے رہتے تھے اوچی

ایڑی والا زمانہ جو تا صرف اس کے پائیں پیر میں ہوتا تھا اور اس پر صورتی کو چھپانے کے لیے وہ پیش ساڑی استعمال کرتی تھی۔ شلواریں بیروں کا نقص چھپانا ممکن نہیں تھا۔ ملنگ نے چلا شروع کیا "ارے دیکھو دیکھو۔ لنگڑی کی چال دیکھو۔ دیکھو دیکھو۔ چال کا کمال دیکھو۔"

اس نے دہشت زدہ ہو کے کہا "کون ہو تم۔ بٹو راستہ سے۔"

ملنگ ہنسنے اور ڈانس کرنے لگا "ناچ ناچ تو بھی ناچ۔ ایک ٹانگ بر ناچ۔"

اس نے شینہ کی ماں کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے گھما لے گا۔ اس پاس کچھ لوگ اس مقام سے بہت محفوظ ہوئے مگر کچھ اس کی مدد کرنے کے لیے آگے بڑھے کیونکہ وہ اپنے سابق شوہر کو پہچان کے بری طرح چیختے لگی تھی۔

اس سے پہلے کہ کوئی اسے ملنگ کی گرفت سے چھڑاتا، شینہ کی ماں کو تازن بر قرار نہ رکھ سکے اور لنگڑی۔ پاؤں مڑنے سے اس کا معنوی پیر الگ ہو گیا۔ پنڈی پر سے اس کے کسے ٹوٹ کر الگ ہو گئے تھے۔ آگے بڑھنے والے ذرا سی دیر کے لیے رک گئے کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ بظاہر ٹھیک نظر آنے والی اس پیش قیمت ساڑی اور ہماری گتوں میں لدی عورت کے بارے میں اس پاگل کو کیسے علم ہوا کہ وہ لنگڑی ہے۔

وہ چار شریف لوگوں نے اسے سارا دے کر کھڑا کیا اور اس پاگل ملنگ کو دھکے دے کے بنایا "چل بھاگ ورنہ ہلاکتیں ہیں پولیس کو" کسی نے کہا۔

"ہلاؤ۔ ہلاؤ پولیس کو بلاؤ۔ ارے یہ یوپی ہے میری۔ نسیم اور شینہ کی ماں ہے" ملنگ چلانے لگا۔

شینہ کی ماں کا سارا بدن تھر تھرا کپ رہا تھا "جھوٹ۔ جھوٹ بولا ہے یہ۔ بکواس کرنا ہے۔"

"یہ آج بھی میری یوپی ہے۔ میں نے اسے طلاق نہیں دی تھی۔ یہ مجھے جھوٹ کے بھاگ گئی تھی۔" ملنگ پھاڑا۔

شینہ کی ماں کے اعصاب جواب دے گئے۔ وہ بے ہوش ہو کے گر گئی۔ وہاں ایک مجمع لگ گیا۔ عرس کے موقع پر پولیس کی نفری بھی زیادہ تھی۔ ذرا سی دیر میں وہ راست صاف گرانے آگئے۔ پاگل ملنگ اور بے ہوش عورت کا معاملہ بڑا عجیب تھا۔ عورت کچھ دیر بعد ہوش میں آگئی اور ملنگ پھر اس کے پیچھے رہ گیا۔ وہ بعد تھا کہ عورت اس کی یوپی ہے۔ اس کے بچوں کی ماں ہے۔ پولیس نے ان کو تھانے پہنچا دیا مگر سمجھا۔

تھانے سے کوئی باضابطہ اطلاع ملنے سے پہلے ہی کسی نے

شینہ اور نسیم کو فون پر اطلاع دی کہ مبارک ہو تمہارے باپ نے تمہیں تلاش کر لیا ہے۔ وہ اور تمہاری ماں اس وقت پولیس کی تحویل میں ہیں۔ اگر تم چاہو تو اپنے باپ سے جا کے مل سکتی ہو۔ شناخت کے سارے حوالے تمہارے پاس ہیں۔ اگرچہ فون کرنے والے نے اپنا نام نہیں بتایا تھا مگر قسم نے اس کی آواز سے شناخت کر لیا۔ وہ یقیناً بڑھا ڈانس ماسٹر تھا جو ان کے پاس دو ہفتے گیارہ میں رہا تھا اور صبح شام گاڑی دھونے پر ملازم تھا۔

تھانے دار صاحب نے اس کہیں میں بغلی نصیب قبتیش فرمائی۔ نصف شب تک انہوں نے اس عورت کو زیر قبتیش رکھا جس کا واحد نقص دائیں پاؤں میں تھا۔ اس کا پیچہ نہیں تھا لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ جسمانی حسن کے دیگر تمام لوازمات اس کو قدرت نے بڑی فیاضی سے عطا کئے تھے اور وہ بڑی مدام گزیدہ وہاں دیدہ عورت تھی۔ اس نے تھانے دار کو واقعی اتنا خوش کیا کہ وہ اس کو بے گناہ قرار دے کر ایک پاگل سے پیشہ کے لیے آزادی دلوانے پر راضی ہو گئے۔

جب پاگل کو قبتیش کے لیے لایا گیا تو وہ دیوانہ بکار خوش ہو شیار ثابت ہوا۔ اس نے بہت سے نامی حوالوں سے ثابت کر دیا کہ وہ واقعی اس عورت کا شوہر ہے۔ یہ سارے حوالے سیالکوٹ کے ایک قصبے پھوسر سے ملتے تھے۔

تھانے دار نے عورت سے کہا "یہ کیا کہہ رہا ہے؟ کیا تم ان سب لوگوں کو جانتی ہو جن کا ماسٹر نے ذکر کیا؟"

"میں کسی کو نہیں جانتی۔ یہ جھوٹا ہے۔" عورت گھبرا گئی۔

"تھانے دار صاحب سارے گواہوں کو بعد میں طلب کیا جاسکتا ہے مگر ایک گواہ تو یہاں بھی ہے۔ اسی لاہور شہر میں۔ وہ ڈانس ماسٹر جس کے ساتھ یہ فرار ہوئی تھی۔ آپ اسے بلوائیں" ماسٹر نے کہا "اگر وہ میرے بیان کی تائید نہ کرے تو میں جھوٹا۔"

"میں کسی ڈانس ماسٹر کو نہیں جانتی" عورت ہنسائی لہجے میں چلائی۔

"اس ڈانس ماسٹر کو نسیم اور شینہ بھی پہچانتی ہیں۔ یہ عورت کئی سال اس کی یوپی بن کر رہی۔ کسی قانونی یا شرعی حق کے بغیر پھر اسے بھی چھوڑ دیا۔ ڈانس ماسٹر نے اس کی بیٹیوں کو بھی یہ سارے واقعات بتا دیے ہیں۔ آپ ان سے تصدیق کر سکتے ہیں" ماسٹر نے کہا۔

"کیا وہ ڈانس ماسٹر تم سے مل چکا ہے؟" تھانے دار بولا۔

"ہاں۔ وہ مجھے داتا دربار کے باہر عرس کے موقع پر نظر آیا تھا مگر بھیڑ بھاڑ میں کہیں کھو گیا۔ میں ایک سال تک وہاں انتظار کرتا رہا کہ کسی دن مجھے اپنی بیوی ضرور نظر آئے گی۔ میں ہر آتی جاتی عورت کو گھورتا رہتا تھا اور ٹھکی بابا مشہور ہو گیا تھا پھر میں یہاں آیا۔"

"گواہ اب تمہارے پاس یہاں کوئی گواہ نہیں" تھانے دار بولا۔

"ہے سب سے بڑا گواہ میں ہر وقت ساتھ رکھتا ہوں۔" اس نے اپنے پیچھے پرانے پنڈی کے ایک جب میں ہاتھ ڈال کے کچھ نکالا۔ یہ ایک انسانی ہر کا پیچہ تھا۔ نئے سے نیچے تک انگلیوں کی ہر ہڈی کے جوڑ کے ساتھ مکمل نیچے۔ اسے وہ عورت کے سامنے لہرائے لگا۔ سوکھی ہڈیاں کڑکڑائیں اور عورت نے ایک وحشتناک چیخ ماری۔

"یہ ہے میرا سب سے بڑا گواہ تھانے دار صاحب! یہ پیچہ اسی عورت کا ہے۔ اس کی ٹانگ میں نے کالی خمی پھر پورے تین سال کی جیل کالی عمر میں نے اس نشانی کو محفوظ رکھا۔ آپ ملا کے دیکھ لو۔ بیڑوں کے کسی باہر کو بلا کے دکھاؤ۔ اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو گا۔ یہ اسی عورت کا پیچہ ہے جو میری بیوی تھی۔"

تھانے دار نے زندگی میں ہر قسم کے کیس ڈیل کئے تھے مگر اس پاگل کے ہاتھ میں ایک نیچے کا ڈھانچا دیکھ کے وہ حیران رہ گیا۔ اس نے عورت کے کتے ہوئے پیر کو دیکھا اور ایک لمحے میں اس نے جان لیا کہ وہ پاگل ہی سچا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنے وعدے کے مطابق عورت کی مدد کے لیے کچھ کرنا، پاگلوں کی طرح چیختے والی عورت نے جھٹ کر وہ دیوار اٹھالیا جو تھانے دار نے ایزی ہوئے کے لیے کرت کھول کے میز پر ڈال دیا تھا۔ دوسرے لمحے کیے بعد دیگرے کئی فائر ہوئے اور وہ پاگل لہو لہان ہو کے تھانے کے فرش پر گرا۔ چند منٹ پھر کتے کے بعد وہ ساکت ہو گیا لیکن وہ پیچہ مرنے کے بعد بھی اس کے ہاتھ میں رہا۔

تھانے دار ایک دم میز کے نیچے ٹھس گیا تھا۔ تھانے میں عورت کے چیختے کی آواز پر کوئی متوجہ نہیں ہوا تھا۔ تھانے دار صاحب تو ایسے ہی قبتیش فرماتے ہیں مگر فائر ہوئے تو تھانے میں ہلکے ڈچ گئی۔ سخت ہر طرف سے بندھن لے کر دوڑے اور انہوں نے دیوار اور ہاتھ میں لیے لکڑی قبتیش لگانے والی عورت کو ہر طرف سے پاگل کتے کی طرح گھیر کر گولی ماری۔ وہ دیوانہ دار چلا رہی تھی۔ ماسٹر کی اولاد۔ ثبوت کا پیچہ۔ بڑا آیا تھا میرا خصم بن کے۔

ہر گولی پر وہ اچھل۔ اس کے ہاتھ ہوا میں لہرائے۔ وہ گھوی اور مل گھا کے اس آوی پر گر گئی جو اس کے ایک رقص پر اپنی زندگی باریک تھا۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو اس موت کے رقص کو کچھ کے بھی دیوانہ ہو جاتا۔ ان کا لوا ایک ہو کے تھانے کے فرش پر بسنے لگا۔ یہ ایک پاگل کی داستان محبت کا بڑا چرچرہ قلمی انجام تھا۔ یہ منظر اگر ایسے ہی کسی قلم کے آخری عین میں ڈالا جاتا (اور خون کا پتہ دھارا ہی END THE بن کے الفاظ بن جاتا) تو دیکھنے والے آٹھ آٹھ آنسو بہاتے جاتے۔ اسے محبت ترے انجام پہ رونا آیا۔

نسیم اور شینہ کے لیے چند دن بڑے تنہا ثابت ہوئے۔ ان کو اپنی ماں اور مینہ باپ کی لاشیں شناخت اور وصول کرنے کے لیے تھانے جانا پڑا پھر پوسٹ مارٹم کی رسی کارروائی اور تدفین کے مراحل سے گزرنا پڑا لیکن یہ کام ڈانس ماسٹر کی مدد سے آسان ہو گئے۔ اس نے ان کی قبریں بھی ساتھ ساتھ بنوائیں اور ان پر ایک جیسے کتبے لگوائے۔ ان کی عمارت کے مطابق وہ مرتے دم تک میاں بیوی تھے۔

نسیم اور شینہ اپنی موجودہ زندگی سے پہلے ہی خطر تھیں۔ اب ان کے لیے خود مختاری کا خواب ایک حقیقت بن گیا تھا۔ ان کی راہ میں رکاوٹ کوئی نہیں رہی تھی۔ شینہ اپنے ایک چاہنے والے کے ساتھ نکل گئی جو اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ وہ بڑا بانکا بھلا جوان تھا اور کسی بہت بڑے ٹیکے دار کا بیٹا تھا۔ شینہ عرف سونی پر ماں کی المناک موت کے واقعات کا بہت اثر تھا۔ اس کا غم بھلانے اور دل بھلانے کے لیے سونی کا چاہنے والا اسے دیا دے اس ٹکرے سے گیا تھے۔ بندہ نہ بندے دی ذات ہووے۔ مری سے تنہا تھی۔ نارائن کاغان اور جمیل سیف الملوک تک انہوں نے بہترین بنی سون گزرا۔ ظاہر ہے بنی سون پہلے ہو گیا تو شادی کی ضرورت نہ رہی۔

سونی کا نہ ہونے والا شوہر ایک دن اسے ایٹ آباد کے ایک ہوٹل میں سونا چھوڑ کے نکل گیا۔ سونی کو قلع تو ہوا مگر اس قلع سے ہوٹل کا مل ادا نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ساڑھے چار ہزار وصول کرنے کے لیے فیجی نے اسے ساڑھے چار دن یعنی چار دن اور پانچ راتیں اپنے پاس رکھا۔ لاہور کا ایک قلم یونٹ کاغان میں لوکیشن پر قلم بندی کے لیے جاتے ہوئے اس ہوٹل میں رکا تو سونی نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور ایک کیرا مین کے اسٹنٹ کی سفارش سے یونٹ میں شامل ہو گئی۔ کیرا مین کے اسٹنٹ نے بھی موقع سے فائدہ اٹھایا اور حسب توفیق یونٹ کے دیگر ارکان نے بھی ایک

بیٹے بعد وہ پھر اپنے شہر لاہور پہنچی۔ ابھی تک اسے قلم میں ایک شرا کا رول تک نہیں ملا تھا۔ ہر وعدے پر اپنی زندگی کی ایک رات نذر کرنے کے باوجود لیکن سونی کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ جیسی زندگی گزار چکی تھی، اس میں ہر مرد صرف مرد تھا۔ ایکس، والی زینہ، فنکار، صنعت کار، ہدایت کار، تھانے دار، ٹھیکے دار، کارکن، بازگیر، سب اس کے لیے مرد تھے۔

کئی ماہ اس نے قلمی دنیا میں ویسے ہی گزارے جیسے نا تجربہ کار اور بے وقوف، رہا یا مادھوری، ڈکٹ بننے کے خواب دیکھنے والی اور بزم خود ان سے زیادہ باصلاحیت اور حسین۔ ہر شہر اور قصبے سے آنے والی سیکڑوں لڑکیاں کزناتی ہیں۔ اس کے نہ جانے کتنے ڈوٹیشن اور اسکرین ٹیسٹ ہوئے۔ اس کی تصویریں کچھ عرصہ سسٹی پھیلانے کا سبب بنیں اور نوجوانوں کے خفیہ الم کی زینت ہوئیں پھر پری لڑکیاں آئیں۔ لوگ پرانے وعدے بھول گئے۔ وہ ایک شرا گرل ہو گئی پھر کال گرل ہو گئی۔ بچپن سے زندگی کا یہی چلن تھا۔ آزاد ہو کے بھی سونی آزاد نہ ہوئی۔ اس کے اپنے کہنے کے مطابق پہلے بھی وہ اپنی بے وقوفی سے چھ بار حاملہ ہوئی اور ماں بننے سے بال بال بچی۔

آخری بار وہ میک اپ کا سامان بنانے والی ایک بین الاقوامی کمپنی کے سلیز منیجر کے ساتھ کراچی سے اس کی کار میں لاہور آ رہی تھی کہ بالہ کے قریب سلیز منیجر کو ڈاکو لے گئے۔ سلیز منیجر نے سونی کو یقین دلایا تھا کہ انہیں اپنی مصنوعات کی پبلسٹی کے لیے ایک نئی ماڈل کے چرے کی ضرورت ہے اور بہت عرصے سے پرانے چرے پیش کرنے والی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کے لیے تو سونی کا چہرہ کسی لازمی کے ٹکٹ سے کم نہیں۔ وہ اسے منہ مانگا معاوضہ دیں گے اور ایک بار وہ کسی اشتہار میں کلک کر گئی تو پھر ماڈلنگ کی دنیا کو فتح کرنا اس کے لیے ذرا بھی مشکل نہیں ہوگا۔ ماڈلنگ سے ٹی وی اور چھوٹے اسکرین سے بڑا اسکرین۔ یہی وہ صحیح راستہ جو بابا شریف نے بھی اختیار کیا تھا اور اس جیسی بہت سی بیویوں نے۔ دو ماہ بعد نادان کی رقم نہ ملنے اور پولیس کے دخل درمستقات کرنے کی وجہ سے سلیز منیجر مارا گیا۔ سونی چھ مہینے ڈاکوؤں کے ساتھ رہی۔ ان کا سرغندہ ایک خوفناک دازھی والا سونی کو دیکھ کے جذباتی ہو گیا۔

ہر آدمی دنیا میں ایک تقدیر لے کر آتا ہے۔ چنانچہ جو کچھ وہ ہے وہی اس کو ہونا تھا۔ یہی بات ایسے بھی کہی جاتی ہے کہ آدمی وہ ہے جو اسے حالات بناتے ہیں۔ یہی لیکن اس ڈاکو کا مدار

بھی تھا جس نے کبھی ڈاکو بننے کا نہیں سوچا تھا۔ غالباً اس نے بھی اپنے ماں باپ کی آنکھوں سے ڈاکو بننا اچھیتر بننے کے خواب ضرور دیکھے ہوں گے۔ مستقبل میں چور یا ڈاکو کے بیٹے کو کیڑے کے طور پر اختیار کرنے کی کون سوچتا ہے لیکن جو بعد میں ہوا وہ تقدیر میں لکھا تھا۔ اس کی ایک ہی چھوٹی بہن تھی جس کی بد قسمتی یہ تھی کہ وہ خوب صورت تھی اور اسے ایک وزیر سے پسند کر لیا۔ لڑکی سے پہلے اس کے ماں باپ نے بد قماش اور بوڑھے وزیر سے کو انکار کر دیا۔ انہیں اس کی سزا بہت سخت ملی۔ ان کا گھر بار کھیت موسیٰ سب تباہ ہو گئے۔ وزیر سے اس کے باپ پر چوری کا الزام عائد کیا اور اسے پولیس نے اتنا مارا کہ وہ تشدد کی تاب نہ لاکے ہلاک ہو گیا۔ اس کی ماں کے بڑھاپے کا خیال کئے بغیر اسے گاؤں کی گھوٹ میں تنگا پھرایا گیا اور گلے میں رسی ڈال کے کیتا کی طرح چاروں ہاتھوں بیڑوں پر چلنے پر مجبور کیا گیا پھر اسے ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ یہی کب تک روپوش رہ سکتی تھی۔ وزیر سے کے شکاری کتے ارد گرد کے دس گوس تک ہر گاؤں میں اسے تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ بالآخر وہ ایک نمک حرام کے گھر سے برآمد ہوئی۔ نمک حرام کا گھر جلا کے راکھ کر دیا گیا اور وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ اندر ہی جل کے مر گیا۔ لڑکی کا بھائی یعنی وہ ڈاکو اس وقت لاڈکان کے میڈیکل کالج میں فرسٹ ایئر کا طالب علم تھا اور تقدیر میں ہوتا وہ ڈاکو ضرور بن جاتا مگر اسے ڈاکو بننا تھا۔ اپنی بہن اور ماں باپ کے ساتھ ہونے والے ظلم کا انتقام لینے کے لیے وہ ڈاکو بن گیا۔ اس کی بہن مرتبگی تھی مگر ڈاکو کے ذہن میں ایک نفسیاتی گہر بڑھی تھی۔ اب اسے اپنی بہن کی ہم عمر ہر لڑکی میں اپنی بہن کی صورت نظر آتی تھی۔

اس نے سونی سے پوچھا "اب تو کہاں جائے گی؟"

"جہاں تقدیر لے جائے۔" سونی نے بے پروائی سے کہا۔

"جہاں کیا مطلب؟ گھر کہاں ہے تیرا؟"

"گھر اپنے ہیں سارے" وہ ہنس پڑی "جہاں رات بسر ہو۔"

وہ سونی کو گھور رہا تھا "ماں باپ نہیں ہیں کیا؟"

"ماں باپ کے بغیر کوئی پیدا ہو سکتا ہے؟ ساری عمر الگ رہے۔ مرنے کے بعد ساتھ ساتھ لینے ہیں قبروں میں۔" سونی نے نفرت سے کہا۔

ڈاکو نے اسے غور سے دیکھا "یہ بندہ کون تھا؟ تیرا گھر والا؟"

سونی پھر ہنس پڑی "مجھے تو ایک سو ایک خصم ہیں۔ روز خصم بدلتی ہوں میں پاؤں کی جوتی کی طرح۔ تو چاہے تو۔"

ڈاکو نے اس کے ایک جھانپا رسید کیا "ہم ڈاکو ضرور ہیں بابا مگر عورت کی عزت نہیں لوہتے۔ ٹیڑوں کو لوہتے ہیں ہم۔ تجھے جہاں جانا ہو جانا۔ ہم عزت سے چھوڑ آئیں گے۔"

وہ تھپڑ کھانے بھی ہنسی رہی "کون سی عزت کی بات کرتا ہے تو۔ میری عزت؟ وہ ایک چادر تھی۔ گلے سے لٹکے ہوئے پھر لیئر لیئر دھجی دھجی۔ اس کا ایک ایک دھکا کھانچ لیا گیا۔ وہ ہنستے ہنستے روئے گئی۔

ڈاکو چپ چاپ اسے دیکھتا رہا "ابھی جا آرام کر۔ تیرا جی ٹھیک نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہوں میں۔ تھوڑی سی شراب ہو تو دے دے۔"

وہ آنسو چھکے کے بولی۔

ڈاکو چٹکا "تو شراب پیتی ہے؟"

"کیوں۔ تو نہیں پیتا؟ تیرے جیسے مرد ہی پلاتے تھے مجھے۔ اپنا لطف دہلا کر کے لے۔"

"نکو اس مت کر۔ یہاں شراب نہیں لی سکتی تو۔"

"چھالا سگریٹ دے۔" سونی نے کہا اور ایک گالی دی۔

ڈاکو نے اس کے ایک اور تھپڑ مارا۔ اپنی آنکھوں میں گالیاں استعمال کرنا سونی کی عادت ہو گئی تھی "سگریٹ بھی نہیں لے گی اور پھر گالی دی تو جان سے مار دوں گا تجھے۔ یہاں شرافت سے رہنا پڑے گا مجھے۔ یہ بد معاشی نہیں چلے گی۔"

سونی اسے حیرانی سے دیکھتی رہی۔ ایک ڈاکو اس سے عزت کی بات کرتا تھا اور اسے شرافت سے رہنے پر مجبور کر رہا تھا۔ وہ رات کے وقت اس کے خیمے میں آیا تو سونی اس کا مطلب کچھ اور سمجھی۔ ایک مہینے سے وہ کچھ جنگلوں میں پھر رہے تھے۔ وہ بدھت دس دن سے زیادہ ایک جگہ نہیں رہتے تھے۔ ہر جگہ ان کا ٹھکانا دریا کے قریب ہوتا تھا جہاں وہ اپنے چھوٹے چھوٹے خیمے لگا لیتے تھے۔ ایک میں اس قیدی کو رکھا گیا تھا جس کے لیے وہ ایک کوز روپے کا آواں طلب کر چکے تھے۔ اسی خیمے میں ڈاکوؤں کا سرغندہ بھی سوتا تھا۔ وہ سراسر خیر اس کے باقی تین ساتھیوں کے لیے تھا جو رات کو شراب پی کے خوب غل غپاڑہ کرتے تھے اور گندی گندی باتیں کرتے تھے۔ تیسرا خیمہ خاص طور پر سونی کے لیے لگا گیا تھا اور قیدی کے خیمے کے ساتھ ہی تھا۔

سونی نے ڈاکو کو دیکھتے ہی اپنے کپڑے اتارنے شروع کئے تھے کہ ڈاکو نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "بابا یہ کیا کر رہی ہے تو۔ خدا کا خوف کر۔"

سونی نے حیرانی سے کہا "آخر تم کس لیے آئے ہو؟"

ڈاکو نے سونی کو بٹھار دیا اور خود اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ "غلط مت سمجھ مجھے ایک مہینہ ہو گیا ہے تجھے ہمارے ساتھ۔ کسی نے تیری طرف بری نظر سے بھی دیکھا؟ آخر کیوں؟ ڈاکو شریف لوگ تو نہیں ہوتے۔"

"ہاں یہ بات بڑی عجیب ہے۔"

ڈاکو نے اپنی قمیص کی جیب سے ایک پھولا ہوا بڑا نکالا اور کھول کے سونی کے سامنے رکھ دیا۔ اس میں کسی لڑکی کی مسکراتی ہوئی تصویر لگی ہوئی تھی، سونی نے اسے غور سے دیکھا "کون ہے یہ لڑکی؟"

"بابا تو نہیں پہچانتی اسے؟" ڈاکو مسکراتے لگا۔

"نہیں۔ میں کیسے پہچان سکتی ہوں؟"

"تو اپنی تصویر کو نہیں پہچانتی۔ ارے بابا یہ تیری اپنی تصویر ہے۔ غور سے دیکھ۔" اس نے تصویر نکال کے سونی کو تھمادی۔

سونی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ جو لڑکی اس کے سامنے تھی اس کی صورت بالکل مختلف تھی۔ سوائے اس کے کہ اس کی بھی دو آنکھیں دو کان اور ایک ناک تھی اور وہ حسن تھا۔ جو خدا داد تھا۔ اس میں اور سونی میں کوئی بات مشترک نہیں تھی مگر ڈاکو مصر تھا کہ سونی کی اور اس کی بہن کی بالکل ایک ہی شکل و صورت ہے۔

"تجھے دیکھا تو مجھے اپنی بہن یاد آگئی۔ میں تو حیران رہ گیا۔ ایک دم کہ وہ کدھر سے آگئی۔ یہ لوگ تجھے یہاں لے کر آئے تو میں نے کہا کہ بابا ابھی خیال کرنا یہ اپنی چھوٹی بہن ہے۔ بالکل ویسی ہے کہ نہیں؟ وہ میرے پر ہنستے تھے اور اسنے نہیں تھے۔ پر میں نے کہا کہ میری بات سمجھ لو۔ جو نہیں سمجھے گا اس کو پتا چل جائے گا۔"

سونی اسے حیرانی سے دیکھتی رہی "مجھے اپنی بہن کے بارے میں بتاؤ۔"

اچانک سونی نے محسوس کیا کہ اس جنگل میں وہ اتنی محفوظ ہے جتنی شہر میں نہیں تھی جہاں قانون ہوتا ہے اور قانون کے رکھوالے بھی ہوتے ہیں اور جہاں رہنے والے شریف اور مذہب کہلاتے ہیں۔ اس کا خوف دور ہو گیا اور یہ قید اسے آزادی سے زیادہ اچھی لگنے لگی۔ اس نے لوٹ کر جانے سے انکار کر دیا اور چھ مہینے تک ڈاکوؤں کے ایک گردہ

☆ 137 ☆ مدار

کے ساتھ پھرتی رہی۔ وہ بڑے بڑے دولت مندوں سے تاوان وصول کرنے کے لیے پورے علاقے میں دہشت پھیلاتے تھے۔ فصول کو آگ لگاتے تھے اور باغ اجاڑ دیتے تھے۔ یا کسی تاجر، صنعت کار اور سرکاری افسر کو اٹھالائے تھے پھر پولیس اور نیم فوجی دستے ان کا تعاقب کرتے تھے۔ وہ جنگوں میں جیتتے پھرتے تھے۔ ان کے بقیہ راستوں اور کس گاہوں تک پہنچنا آسان نہیں تھا۔ آئے دن ان کا پولیس سے مقابلہ ہوتا تھا جس میں دونوں طرف سے خوب فائرنگ ہوتی تھی۔

سونی نے اس پر خطرناک سنی خیز ایڈوانس والی زندگی کو مست انجوائے کیا۔ اس نے ہر قسم کا اسلحہ استعمال کرنا سیکھ لیا تھا۔ وہ گھوڑے پر سواری کر سکتی تھی اور انتہائی دشوار گزار جنگوں میں بے خوفی سے جاتی تھی۔ اسے یہ یقین تھا کہ کوئی دو ٹانگوں والا انسان نظر آنے والا حیوان اس کا کچھ نہیں بگاڑے گا۔ اس کے بھائی کی دہشت پر ایسی تھی۔ جنگل کے دوسرے جانوروں سے وہ نہیں ڈرتی تھی۔ ان چھ مینوں میں بے فکری، اچھی خوراک، تازہ ہوا اور دھوپ، سکون اور آزادی کے احساس نے سونی کی صحت پر بہت خوشگوار اثر ڈالا۔ وہ جنگل کی بہتی جھری ہوئی۔ خوبصورت اور پھرتی، معصوم اور شری۔

پھر اچانک ایک دن اس کا بھائی اور اس کے سب ساتھی ایک پولیس مقابلے میں ہلاک کر دیے گئے۔ یہ کوئی پولیس مقابلہ نہیں تھا۔ ایک مقامی تجربے پولیس کی راہنمائی کی اور پولیس نے انہیں سوتے میں گولی مار دی۔ پولیس کو گرفتاری، تفتیش اور مقدمے بازی کے طویل عمل سے بچنے کے لیے اس بات کی اجازت تھی کہ وہ خود ہی جج بن کے مجرموں کو جائے واردات پر سزائے موت دے دیں۔

اپنی جان بچانے کے لیے سونی مظلوم بن گئی۔ اس نے بتایا کہ اسے چھ مینوں کے ساتھ ایک کسانانہ بنانے والی ایک مین الا تواری گھنٹی کے سیلابیج کے ساتھ اغوا کیا گیا تھا جسے ایک کروڑ کا تاوان نہ ملے جا رہا تھا مگر ڈاکوؤں نے اسے نہیں چھوڑا تھا۔ اس کا والی وارث کوئی نہیں تھا جس سے وہ تاوان وصول کر سکتے۔ سوائے ایک بہن کے جس کے بارے میں وہ خود نہیں جانتی کہ کہاں ہے۔ تصدیق پر یہ کہانی درست ثابت ہوئی۔ سونی کی تصویر اخبار میں شائع ہوئی کہ پولیس نے ڈاکوؤں کے گروہ کا قلع قمع کر کے چھ ماہ قبل اغوا کی جانے والی دو شیر کو چھڑا لیا۔ سخت مقابلے کے بعد ڈاکو ہلاک۔

سونی کی بہن نسیم نے یہ تصویر اخبار میں دیکھی اور

اسے اپنے ساتھ لے آئی۔ نسیم نے بھی کچھ ایسی ہی زندگی گزار دی تھی۔ وہ در در بھتیجی گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتی اور مختلف باتوں سے گزرتی پانی خرمک رب نوازی پناہ میں پہنچ گئی تھی۔ ملک نے اسے پہلے اپنے آفس میں سیکریٹری رکھا اور پھر اسے اپنے کام کی تربیت دی۔ وہ نیکی کے ساتھ کوشش آئے جانے لگی۔ ملک کی لیے اس کے اور اپنے شوہر کے مراسم پر اعتراض کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ایسی نہ جانے کتنی ہیں جو ملک کی زر خرید ہیں۔ گزریا اس وقت ہوئی جب نسیم پر ملک رب نواز کے بڑے بیٹے کی نظر پڑی۔

ملک رب نواز کا بیٹا اعلیٰ تعلیم یافتہ جوان اور خود تھا۔ آہستہ آہستہ دفتری معاملات میں اس کا دخل بڑھ رہا تھا۔ اس نے ایم بی اے کیا تھا اور ملک چاہتا تھا کہ اب کاروبار سے متعلق تمام فیصلے دی کرے۔ اس نے نسیم کو اپنی سیکریٹری بنالیا۔ ملک رب نواز جانتا تھا کہ وہ کوئی اچھی سیکریٹری نہیں ہے لیکن بیٹے نے استعمال کی ایک چیز مانگی تو اس نے بادل ناخواستہ دے دی۔ بالکل اسی طرح جب وہ باپ سے اس کی سیریا کرنا مانگتا تو وہ کہتا کہ بیٹا یہ تو پرانی ہے۔ نئی بنواؤ یا باہر سے منگوا کر وہ ضد کرتا تو اسے پرانی چیز بھی دینی پڑتی۔

نسیم بوشیار عورت تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ مستقبل ملک رب نواز کا نہیں اس کے بیٹے آصف نواز کا ہے۔ اگر وہ ابھی اس پر قبضہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو کل وہی سارے کاروبار اور جائیداد کی مالک بنے گی۔ مین ممکن تھا وہ اپنے مقدمے میں کامیاب بھی ہو جاتی مگر کسی نے آصف نوازی کی ماں کو خیرباد کر دیا۔ اس کے لیے یہ خیال ہی سخت باعث ذلت تھا کہ باپ کے بعد وہی عورت اس کے بیٹے کی داشت بنے۔ مگر بننا تو خیر ناممکنات میں سے تھا مگر یہ دفنی رشتہ بھی ملک کی لیے ایک گالی بن گیا۔ اس نے ملک سے پوچھا "یہ نسیم کون ہے؟"

ملک نے بے نیازی سے کہا "ہے ایک لڑکی۔ دفتر میں کام کرتی ہے۔"

"میں نے اس کے اور آصف نواز کے بارے میں سنا ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟ سچ ہے تو شرم اس کے باپ کو آتی چاہیے۔" ملک نے کہا۔

ملک سوچ میں پڑ گیا "آخر ایسی کیا بات سنی ہے تم نے؟"

"یہ دو ٹکے کی چھوڑی پہلے تمہاری منظور نظر تھی۔ اب وہ تمہارے بیٹے پر ڈورے ڈال رہی ہے۔ شادی کرنا چاہتی

ہے اس سے۔" ملک چونکا "شادی! نہیں! میرا بیٹا اتنا احسن نہیں ہو سکتا۔"

"یہ سوال عقل کا نہیں، اس عمر کے جذبات کا ہے۔ برطانیہ کا تخت و تاج چھوڑنا تھا ملک ایڈورڈ نے ایک معمولی عورت مسز سمپسن کے لیے۔ جو بیوہ بھی تھی۔" آئین سے آشنا ملک نے کہا "آصف کو روک سکتے ہو تم؟"

ملک نے متحکرم ہو کے کہا "اچھا۔ میں کرتا ہوں کچھ بندوبست۔" "دیکھو۔ آصف کو کسی بہانے کچھ عرصے کے لیے باہر بھیج دو اور اس کے واپس آنے سے پہلے ہی اس لڑکی کی شادی کر دو۔ یہ جو تمہارا ڈرائیور ہے رفق مجھے پتا چلا ہے کہ وہ دور کے کسی رشتے سے اس لڑکی کے چچا کا بیٹا ہے۔ وہ پسند بھی کرتا ہے نسیم کو۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔"

"واہ بھئی۔ بڑی سیانی ہے تو ملک کی۔ سارا بندوبست پہلے ہی کر لیا ہے۔ آصف کو دو چار دن میں ایک ورلڈ ٹور پر بھیج دیتے ہیں۔ تو کر لے پیچھے سے سارا کام۔" ملک نے کہا۔

نسیم بہت اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ اس کے عزائم کا راز فاش ہو گیا تھا۔ سواری کی اینٹ کے لیے جو بارے چرنے کے خواب دیکھنا اتنا سنگین جرم تھا کہ نیکی سے شادی تو کوئی سزا ہی نہیں تھی۔ ملک چاہتا تھا تو اسے یوں غائب کر سکتا تھا جیسے نسیم نام کی کسی لڑکی کا نہیں وجود ہی نہیں تھا اور وہ فی الحال مرنا نہیں چاہتی تھی۔ رب نواز سے جواب بڑے ملک صاحب کے مرتبے پر فائز تھا۔ تعلقات کا اس نے خوب فائدہ اٹھایا تھا۔ فائدہ اٹھانے کا فن اسے حالات نے سکھایا تھا اور وہ سمجھتی تھی کہ جب تک اس کے حسن و شباب میں ترغیب اور سنجیدگی طاقت ہے اس کی فتوحات کا سلسلہ چلتا رہے گا۔ کسی نیکی سے شادی سے اسے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔

لیکن نیکی سے شادی ہو گئی تو آصف نوازی کی اس میں دلچسپی خود ہی ختم ہو گئی۔ یہ باپ دادا کے خون کا اثر تھا کہ حسن پرستی اس کی سرشت اور مزاج میں شامل تھی۔ اس نے لاعلمی میں باپ سے نسیم کو مانگ لیا تھا۔ بعد میں اسے معلوم ہوا کہ وہ باپ کے استعمال کی چیز ہے تو اسے خود ہی بہت شرم آئی۔ اس نے نہ صرف نسیم کو برطرف کیا بلکہ اس کا آفس میں داخلہ تک بند کر دیا۔ تاہم نسیم کے بڑے ملک صاحب سے مراسم کسی حد تک برقرار رہے اور وہ خصوصی مشن پر کوئٹہ بھی جاتی رہی۔ سنگاپور، ہانگ کانگ اور دہلی کے

دوروں پر وہ ملک صاحب کی سیکریٹری بن کے ساتھ رہتی تھی۔ اس کی مالی پوزیشن پہلی بار اتنی مستحکم ہوئی تھی کہ وہ جب چاہتی نیکی کو لات مار کے دائرہ شوہریت سے خارج کر سکتی تھی اور آزادانہ زندگی گزار سکتی تھی۔

اسی زمانے میں نسیم نے اپنی چھوٹی بہن شبنم عرف سونی کی تصویر اخبار میں دیکھی جس کے بارے میں اسے برسوں سے کوئی خبر نہیں تھی اور وہ مایوس ہو کے اسے بھول چکی تھی۔ ملک صاحب کا اثر رسوخ نہ ہوتا تو شاید وہ اتنی آسانی سے سونی کو پولیس کے قبضے سے نکال کے نہیں لاسکتی تھی۔ پولیس کے پاس اسے اپنے پاس رکھنے کے بہت بہانے تھے۔ وہ ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل تھی۔ وہ چھ مینوں ان کے ساتھ گزار چکی تھی اور ان کی ہر واردات میں سونی کی حیثیت ایک چشم دید گواہ جیسی تھی۔ مزید یہ کہ وہ لاوارث بھی چنانچہ پولیس اپنی مرضی سے اس کو استعمال کر سکتی تھی۔

کچھ عرصے بعد نسیم نے سونی کو ایک مہرے کی طرح آگے بڑھا دیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ جو بازی وہ نہیں بہت سکی وہ سونی کے لیے مشکل ثابت نہیں ہوگی۔ اس کے حسن و شباب کا سونا تجربات کی بھٹی میں چپ کر کندن ہو گیا تھا۔ اپنی خدا داد صلاحیت اور ذہانت میں سونی نے خود کو بڑی بہن سے کئی ہاتھ آگے ثابت کیا۔ اس کا تقرر چھوٹے ملک صاحب یعنی آصف نواز نے براہ راست اپنی سیکریٹری کے طور پر کیا۔

سونی اپنی بڑی بہن کی STRATEGY کے مطابق پیش قدمی کر رہی تھی کہ نیکی کی ایک غلطی سے سارا کھیل چوہٹ ہو گیا۔ اس نے ملک صاحب کا کچھ نقصان کیا۔ نقصان اتنا بڑا نہیں تھا جتنی بڑی غلطی نیکی نے بغاوت کر کے کی۔ دراصل وہ چاہتا تھا کہ شادی کے بعد نسیم ایک بیوی بن کے رہے اور ملک سے ہر قسم کا تعلق ختم کر دے۔ اسے واقعی نسیم سے بہت محبت تھی۔ اس نے یہی بات ملک صاحب سے کہہ دی اور ملک صاحب نے اسے اپنی بے عزتی سمجھا۔ فیکا معتب ہو گیا مگر سزا پانے سے پہلے وہ بھاگ گیا۔ ملک نے نقصان کو بہانہ بنالیا اور نیکی کو مفہور مجرم قرار دیتے ہوئے پولیس کے انداز میں اس کی بیوی کو اغوا لیا۔

نسیم کو اپنے اغوا کئے جانے پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ ملک باؤس سے واپس ہی نہ جاتی۔ سونی اس کے پیچھے پیچھے دہاں بچ گئی۔ اس نے کہا کہ وہ انکی اس گھر میں کیسے رہ سکتی ہے۔ اسے ڈر لگتا ہے۔ چھوٹے ملک صاحب نے اسے ملک باؤس میں اپنی بہن کے ساتھ رہنے کی اجازت دے دی۔ ان دونوں کے لیے حویلی کا ایک

ہی کرا "سب جیل" قرار دے دیا گیا تھا۔

بد قسمتی یہ ہوئی کہ رات کو کسی وقت ملکائی نے سونی کو اپنے بیٹے کے کمرے سے لٹکا دیکر لیا۔ اسے یہ علم نہیں تھا کہ حویلی میں مسید کے ساتھ اس کی چھوٹی بہن بھی موجود ہے۔ وہ سونی کو نہیں ہی سمجھی۔ اس نے یہ جاننے کی کوشش بھی نہیں کی کہ اس کا بیٹا کمرے میں موجود تھا یا نہیں، وہ اس رات گھر آیا ہی نہیں تھا۔

ملکائی کے غصے کی بجھتی ہوئی آگ دوبارہ یوں بھڑک اٹھی جیسے کسی نے اس پر بیڑول پھینک دیا ہو۔ شادی سے مسئلہ حل نہیں ہوا تھا۔ اس نے مسید کا قصہ پیش کے لیے ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اگلے دن ملکائی کے حکم پر اس کے تنک خواروں نے مسید کو گھاٹوٹ کے ہاک کر دیا۔ اس آپریشن کلین آپ کی مگرانی خود ملکائی نے ہی اور سونی نے یہ بھی ایک مٹھریا تھ روم میں سے دیکھا جہاں اس کی موجودگی کا علم کسی کو نہیں تھا۔ وہ بہن کے لیے کچھ بھی نہ کر سکی۔ اگر اس کے پاس اسلحہ ہوتا تو وہ وہاں موجود ہر شخص کو بھون کے رکھ دیتی۔

ملکائی کے حکم پر ہی مسید کی لاش اس کے گھر میں پھنکوا دی گئی۔ سونی وہاں اس وقت تک چھپی رہی جب تک اسے آصف نواز کے لوٹ آنے کا علم نہیں ہوا۔ موقع پاتے ہی وہ آصف نواز کے کمرے میں گھس گئی اور اس نے درود کر اس کو اپنی بہن کے ساتھ ہونے والے ظلم کی داستان سنائی۔ اسے سخت صدمہ ہوا جب آصف نواز نے صاف کہا کہ اس معاملے میں وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔

"ماں نے جو بھی کیا، کبھی وجہ سے کیا ہوگا اور میں ان سے پوچھ نہیں سکتا کہ وجہ کیا تھی؟"

سونی نے رویتے ہوئے کہا "ملک صاحب تمہاری ماں نے میری بہن کو قتل کیا ہے۔"

"پھر تم کیا چاہتی ہو۔ میں ان کے خلاف ایف آئی آر لکھواؤں؟" آصف جھوٹا "یا ان کے خلاف گواہ بن جاؤں؟"

سونی وہ ماں ہے میری۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ کل کچھ میرے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔"

"ہاں۔ ہو سکتا ہے بلکہ مجھے تو ذرا ہے، کہیں ان کو تمہارے بارے میں پتا بھی چل گیا کہ تم یہاں ہو تو میری شامت آجائے گی۔"

"اور اگر میں خود بتا دوں انہیں کہ تم نے ہی مجھے یہاں بلایا تھا؟"

ملک نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا "پھر تباہی کی ڈنٹے دار بھی تم خود ہوگی۔ مجھ سے کچھ توقع مت رکھنا۔"

"تم مجھے بھاؤ گے نہیں کچھ بولو گے بھی نہیں؟"

آصف نے نفی میں سر ہلایا "دیکھو۔ تم جس حویلی میں ہو اس وقت اس کی روایات کچھ اور ہیں۔"

"تم ان روایات کو توڑ کے کچھ نہیں کر سکتے؟ مجھ سے شادی بھی نہیں؟"

"بھی نہیں؟" یہ ناممکن ہے۔ ایسا کبھی سوچنا بھی نہیں۔ اچھا ہے کسی کو کچھ معلوم نہیں، چلو میں تمہیں باہر چھوڑ آتا ہوں۔"

آصف نے کہا "اور دیکھو ان حالات میں تمہارے لیے بھی یہی بہتر ہے کہ تم مجھ سے دور رہو۔ اگر ماں کے کان میں بھٹک بھی پڑتی تو۔"

"تو وہ مجھے بھی قتل کرا دیں گی؟"

"وہ کچھ بھی کر سکتی ہیں" آصف نے بے بسی سے کہا "فی الحال آفس آنے کی بھی ضرورت نہیں۔ تمہاری سزاؤں جہیں ملتی رہے گی۔"

سونی انتہائی احساسِ ذلت سے مجروح دل کے ساتھ اس حویلی سے نکل تو اپنی بے بسی کا انتقام لینے کی خواہش سے مغلوب تھی۔ اس نے اپنی بہن کو اپنی نظروں کے سامنے قتل ہوتے دیکھا تھا اور وہ کچھ بھی نہیں کر سکی تھی۔ یہ خیال اس کی روح کا آزار بن گیا تھا کہ وہ اس ظلم کے خلاف آواز تک نہیں اٹھا سکتی۔ فریاد نہیں کر سکتی۔ انصاف کا دروازہ نہیں کھٹکتا سکتی۔ بے شک یہ اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے۔ یہاں ایک آئین بھی ہے اور قانون بھی ہے۔ یہاں انسانی حقوق کے علمبرداروں کی تنظیم بھی ہے۔ اسلام کے نظام عدل نافذ کرنے کے دعوے دار بھی ہیں مگر اس کے باوجود جدوجہد لا حاصل ہے۔ اسے بھی ملک یوں ختم کرا دے گا جیسے وہ ایک چیونٹی ہے یا کتا ہی ہے۔ ان کو مار دیا کوئی جرم نہیں۔ ان کے مرنے سے کسی کو فرق بھی نہیں پڑتا۔ یہ کیسی بے بسی ہے۔ کیسی مجبوری ہے۔ صرف اس لیے کہ وہ ملک سے ڈرتی ہے۔ ملک اس کی جان لے سکتا ہے اور وہ زندگی سے پار کرتی ہے اس لیے ڈرتی ہے مگر کیا وہ ملک کی جان نہیں لے سکتی۔ کسی سے مدد مانگے بغیر فریاد کے بغیر اسے ختم نہیں کر سکتی۔

فیصلہ پلے ہی ختم خوردہ تھا اور اپنے زخم چاٹ کر درود ہا تھا۔ سونی نے اسے انتقام پر اکسایا۔ وہ چھ مہینے تک ڈاکوؤں کے ایک گروہ میں ہر طرح کی خوریزی و بدمعاشی آ رہی تھی اور ایک تربیت یافتہ کمانڈو سے کم نہیں تھی جسے ہر قسم کے اسلحے

کا استعمال آتا تھا۔ جو گورلا جنگ کے اصولوں سے واقف تھی۔ چھپ کر وار کرنا اور ہاتھ نہ اٹانا جتنی بھی۔ انہوں نے مل کے ایک منصوبہ بنایا۔ بس کی جاتی اس کا پہلا حصہ بھی مگر بد قسمتی سے فیکا پہلے ہی مقابلے میں کام آگیا۔

سونی نے اپنے بارے میں ہر بات سچائی کے ساتھ بیان کر دی تھی۔ اس کی زندگی کے کچھ پہلو بڑے گھناؤنے اور نفرت انگیز تھے مگر اس کی فطرت میں بہت سی اچھائیاں بھی تھیں جن کو بچنے کا موقع حالات نے نہیں دیا تھا۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ برائی کو اس نے اختیار کیا یا برائی کو اچھائی سمجھ کے قبول کیا۔ وہ بہتری کے لیے کوشاں رہی۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر موز پر ملنے والے قدر انوں نے اسے خوابوں کی جنت میں گھما بھرا کے پھر جہنم میں چھوڑ دیا۔

وہ اپنی بات سناتے ہوئے کئی بار روئی۔ کئی بار سسٹیا میں جٹا ہوئی۔ یہ صرف ہمارا بعدِ روانہ رویہ تھا اور ایک پُر تحفظ ماحول تھا جس میں اس نے وہ سب غبار نکال دیا جو برسوں سے اس کے دل میں جمع ہو رہا تھا۔ وہ خوفزدہ اور اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ بے یقینی کا شکار تھی۔ بڑی مشکل سے اس کو بہن کے گھر کا ٹھکانا سیر آیا تھا۔ اب وہ بھر بے آسرا تھی اور اسے ملک جیسے سفاک اور طاقتور دشمن کا سامنا تھا۔ مظلوم ہونے کے باوجود وہ قانون کی نظر میں مجرم تھی اور ملک رب نواز کے ہاتھوں میں قانون بھی اس کے خلاف ایک ہتھیار بن گیا تھا۔

ہمارے ساتھ اس نے خود کو محفوظ ہاتھوں میں تصور کیا تو اس کا اعتماد بحال ہونے لگا۔ وہ کچھ ٹرسکون ہو گئی۔ دوپہر سے شام کی چائے تک اور پھر رات کے کھانے تک بہت سے وقفے آئے مگر اس کے بعد باتوں کا سلسلہ چلتا رہا اور جیسا کہ میں نے کہا "اس کی کمائی بہت بے ربط تھی۔ یہ مختلف واقعات کا مجموعہ ہے جو اس نے مجھے کسی ترتیب سے نہیں سنائے تھے۔ اس کا انداز بیان بھی ناقابلِ بیان حد تک خراب تھا۔ وہ غصے میں گالیاں بکتے لگتی تھی اور ایسے واقعات کی تفصیل کو سن کر نہیں کرتی تھی جو خاصے شرمناک تھے۔ ان پر خجمن کا چوہ سرخ ہو جاتا تھا اور ہم بڑی مشکل سے بات کو آگے دھکیلتے تھے اس سے میں نے خجمن نے اور رئیس نے بہت سے سوالات کئے اور بہت سی باتیں اس کے ماضی کی راہ کو کریدنے سے چنگاری کی طرح سلکتی تھیں۔ مثلاً خجمن نے اس سے پوچھا کہ اس نے وہ کاشکوف کہاں سے حاصل کی تھی؟

سونی نے جواب میں کہا "ڈاکو اپنا اسلحہ اور لوٹ کا مال

ایک جگہ دبا کے رکھتے تھے۔ اس جگہ کا علم ان کے سرخند کو تھا۔ وہ ہر مہینے جگہ بدل دیتا تھا مگر مجھے معلوم ہو جاتا تھا۔ مرتے وقت اس کو اپنی سہلت ہی نہ ملی کہ وہ کچھ کر سکتا۔ آخری جگہ کا کچھ پتا تھا۔ میں غصے کے ساتھ وہاں گئی تھی لیکن میں نے غصے کو دور کرکے اکر دیا تھا کہ پڑا ہوا ہے۔

"تمہارے لیے فیکا بھروسے کے قابل تھا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں مگر اور کون تھا جس پر میں بھروسہ کرتی۔ میرا دماغ خراب ہو رہا تھا اس وقت۔ ایک بہن کی موت کا صدمہ تھا پھر آصف کے اچانک بے موت ہوجانے کا صدمہ تھا اور اپنی ذلت اور بے بسی کا صدمہ تھا۔"

"چنانچہ تم نے غصے کا آلہ کار بننا بھی قبول کر لیا؟" خجمن بولی۔

"میری عقل اس وقت کام نہیں کر رہی تھی۔"

"غلط۔ اتنی عقل تھی تمہارے پاس کہ تم نے اسے اپنا خفیہ خزانہ نہیں دیکھنے دیا تھا۔ تم کبھی نہیں کہہ اس پر قابض ہو جائے گا۔ ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔ نہ ہم اس کے بارے میں پوچھیں گے کہ وہ جگہ کہاں ہے؟ لیکن ایک بات تم بتا سکتی ہو وہاں کتنا اسلحہ ہے؟"

"بہت ہے۔ ریوالتور، رائفلیں، گلاشکوف ایک اور بھی ہے۔ ایک میں نکال لائی تھی۔ کاربائن اور ریٹر۔ چار دستی بم ہیں اور ایک وائرلیس سیٹ جس کی ریج پچاس کلومیٹر سے زیادہ ہے۔"

رئیس نے پوچھا "مال کتنا ہے؟"

خجمن نے اسے گھورا "میں کیا۔"

سونی نے کہا "تقد کچھ نہیں ہے۔ سونے چاندی کے زیورات برتن ہیں اور ایسی ہی چیزیں۔"

"تم نے بعد میں کبھی اس خزانے کو نکالنے کا سوچا۔ تمہارے سوا کسی کو اس کا علم نہیں؟" میں نے کہا۔

"اگر پولیس مجھے تعیش میں شامل کرتی تو مجھ سے ضرور اس کا پتا پوچھ لیتی مگر میں باقی کی وجہ سے بچ گئی تھی مگر مجھے ڈر لگتا تھا اور ہرجاتے ہوئے بھی۔ شاید کبھی ضرورت پڑتی تو نکال لائی سب کچھ۔"

میں نے کہا "اب تم نے اپنے مستقبل کے بارے میں کیا سوچا ہے؟"

"کچھ نہیں، میرا کیا مستقبل ہے؟ اپنی مرضی سے میں نے کبھی کچھ نہیں کیا۔ لوگ اپنی زندگی پٹان کر رہے ہیں۔ اپنے سامنے کوئی مقصد رکھتے ہیں۔ جدوجہد کرتے ہیں کچھ بننے کے

لے۔ کچھ بانے کے لیے مگر میں کچھ سوچنے کے لیے آزاد نہیں تھی اور کبھی سوچا تو شاید غلط سوچا کہ انجام الٹا ہوا۔

”چلو ماضی کو بھول جاؤ“ اب اگر موقع ملے تمہیں؟

”آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔ میں کسی پر بار نہیں ہوں مگر جتنی مدت آپ نے کی اس کا شکریہ۔ میں چلی جاؤں گی کہیں بھی۔“ وہ بگڑ گئی۔

ختم نے اسے سمجھایا ”ایسی بات نہیں ہے۔ یہاں تم اپنی مرضی سے جب تک چاہو رہ سکتی ہو۔ کوئی کسی پر بار نہیں یہاں۔ ہم سب دوست ہیں لیکن ایک خاندان کی طرح مل کے رہتے ہیں۔ خون کا رشتہ نہیں ہے ہمارے درمیان مگر جو غلوں اور محبت کا رشتہ ہے وہ کہیں زیادہ مضبوط ہے۔“

میں نے کہا ”تم بھی ہمارے ساتھ ایسے ہی رہ سکتی ہو۔ بے غولی سے اور اعتماد کے ساتھ۔ ہم دیکھیں گے کہ تمہارے لیے کیا کر سکتے ہیں۔ ابھی تم آرام کرو۔ مگر دے ہوئے وقت کے آزار اور پشیمانی کے احساس سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کرو اور سوچو کہ باقی زندگی تم کیسے خوش و خرم رہ سکتی ہو۔ ہم کو دیکھو، ہماری مصروفیات کو دیکھو، کوئی جلدی نہیں۔ اطمینان سے ملے کرو کہ تم کیا چاہتی ہو پھر ہمیں بتا دو۔ ہم سے مشورہ کرو اگر چاہو تاکہ ہم تمہیں اپنی عقل اور تجربے کی روشنی میں کچھ بتا سکیں۔ باہر کی دنیا خاصی غیر محفوظ ہے۔ ایسا نہ ہو کہ سوچے سمجھے بغیر قدم اٹھا کے تم پھر دلدل میں اتر جاؤ۔“

وہ بڑی ممنونیت اور جذباتی طمانیت کے ساتھ ہمیں دیکھتی رہی ”میں ایک بہت بُری لڑکی ہوں“ آپ سب بہت اچھے ہو۔“

”جو برا ہے وہ چاہے تو اچھا بن سکتا ہے۔ اگر تمہیں اس کا احساس ہے تو یہی اصل بات ہے“ ختم بولی ”اچھا اب تم سو جاؤ۔ باقی باتیں سچ کر سن گے۔“

سوئی بہت خراب زبان بولتی تھی مگر فی الحال ہم نے اس کو کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اس کی اخلاق و کردار کی طرح اس کی زبان بھی محبت نے خراب کی تھی۔ ہماری محبت میں وہ اپنے آپ کو بدل سکتی تھی۔ اس کا انحصار سوئی کے فیصلے پر تھا کہ وہ ہمارے ساتھ رہنا پسند کرتی ہے یا نہیں۔ جب سوئی کے ساتھ ختم بھی سونے چلی گئی تو میں نے رئیس کو ختم اور ملک رب نواز کی ملاقات کے بارے میں بتایا۔ وہ اس میں زیادہ دلچسپی نہیں لے رہا تھا اور گھوم پھر کے سوئی کے موضوع پر آ جاتا تھا۔

میں نے کہا ”لو کے پیسے۔ تیرے اعصاب پر سوئی کیوں

سوار ہے؟“

”یار میرا دل خون کے آٹھ آٹھ آنسو روتا ہے اس کے لیے۔ وہ بڑی مصیبت کی باری ہے“ رئیس سیدھا لپٹا چھت کو دیکھتا رہا اور ایک ٹانگ ہلاتا رہا۔

”ہم سب مصیبت کے مارے ہیں ایسے ہی۔ کس نے ناز و نعم میں پرورش پائی تھی۔ یاد کر تھیم خانے کے زمانے کو۔“

رئیس بولا ”مگر سوئی ایک لڑکی ہے یار۔“

”اس نے کاندھ بھی تم نہیں اٹھایا اپنے لڑکی ہونے سے۔ ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی“ میں نے کہا۔

”وہ کیا؟“

”جب یہ ہمیں ملی تھی تو ایسی زبان نہیں بولی تھی اس نے۔“

رئیس ہنسے گا ”ابے یار۔ وہ کچھ مجھ سے امیر لیں ہو گئی۔ اپنی کو پیارے عادت ہے شروع سے ایسے ہی بات کرنے کی۔“

”یعنی تیری وجہ سے وہ آگئی اپنی اصل زبان پر؟“

”ایسا ہی سمجھ لے۔“ رئیس نے سر کھپایا ”میں نے تو کہا تھا کہ فری ہو کے بات کرو وہ کچھ زیادہ ہی فری ہو گئی۔“

”ملک رب نواز کو ہوا بھی نہیں لگتی چاہیے اس بات کی۔ کہ سوئی ہمارے پاس ہے ورنہ وہ کہے گا کہ اسے میرے خوالے کرو۔“

”ابے ایسی کی تہی ایسا مطالبہ کرنے والوں کی“ وہ جوش میں اٹھ بیٹھا۔

”مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ کوئی نیم کھیل رہا ہے لیکن یہ ہماری کا کھیل ہے۔ ابھی اپنی سمجھ میں آیا نہیں“ میں نے کہا ”آخر ختم کی وہ کہنا را گاڑی غائب کرنے کا کیا مقصد تھا اور اس کے بدلے میں یہ بالکل نئی کارروائی کے وہ کیا چاہتا ہے؟“

”برامت مانا پیارے۔ اپنا تو خیال ہے کہ اس کا دل آگیا ہے ختم پر۔ رشوت اور تحفہ دینے والے ایسا ہی کرتے ہیں۔“

میں نے ہنس کے کہا ”یہ ٹھیک ہے کہ حسین عورت کو دیکھ کے اس کی دال ٹپکنے لگتی ہے۔ اپنی دولت کی خوب خرید پر بہت غور ہے اسے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ہر عورت بکاؤ ہے اور یہ غلط فہمی اس لیے پیدا ہوئی کہ اس کا واسطہ ہی ان عورتوں سے پڑا جو مجبور تھیں۔“

”ابے یہ ڈرامے بازی ہیں۔ شریف عورت کبھی مجبور

نہیں ہوتی۔“

”تو نے ٹھیک کہا۔ مجبور کی ڈھال کے پیچھے مرد ہر گناہ ہر جرم اور ہر غلط کام کرتے ہیں۔ رشوت دیتے بھی ہیں، لیتے بھی ہیں۔ انکم ٹیکس سے بجلی تک ہر چیز کی چوری بھی کرتے ہیں۔ عورت اپنی خواہشات سے مجبور ہو جاتی ہے۔ اچھے گھڑے، گھنے، مٹن کے پرستار اور محبت جتانے والے، کلیر اور شہرت کی ترنما۔ ان سب کے خلاف اس کی مزاحمت کمزور پڑ جاتی ہے۔ ہوٹلوں، کلبوں اور اس سوسائٹی میں جہاں ملک رب نواز اٹھتا بیٹھتا ہے، ایسی عورتیں بہت لگتی ہیں۔ ان کے لیے ایسی جگہ کسی شکار گاہ سے کم نہیں۔ کچھ واقعی مفلسی کے عذاب کو جھیلنے کا حوصلہ نہیں رکھتیں اور استحصال کا شکار ہو جاتی ہیں۔ کچھ بلقاتی سطح پر کمزور ہوتی ہیں مگر ختم کو ملک رب نواز آج سے نہیں، کئی سال سے جانتا ہے۔ اس جیسے نہ جانے کتنے ہیں جو یہ بات سمجھ چکے ہیں کہ یہاں ان کی دال نہیں ٹپکے گی۔“

”پھر یہ گاڑی کیا رشوت میں دی ہے؟ اگر ختم میں نہیں دی؟“

”پتا چل جائے گا اور کیا پتا میرا اندازہ غلط ہو۔ ختم کی گاڑی مل جائے اور ملک رب نواز داپس منگوالے۔“ میں نے کہا۔

رئیس اٹھ بیٹھا ”ابے یہ آواز کیسی ہے؟“

آواز میں نے بھی سنی تھی ”یہ اندر کہیں سے آ رہی ہے۔“

”ہمارے گیراج کی طرف سے۔“ رئیس بولا۔

میں نے دھیان سے سنا۔ ایسی آواز تھی جیسے کوئی باہر لوہے کے شکر کو توڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ رات کے سناٹے میں معمولی سا شور بھی زیادہ محسوس ہوتا ہے اور باہری نہیں اس وقت اندر بھی مکمل خاموشی تھی۔

رئیس کا یہ وسیع و عریض فائدہ نما گھر ”رئیس خانہ“ دراصل دو گھروں پر مشتمل تھا۔ اس کا رخ مشرق کی طرف دوسری گلی میں تھا اور پہلے اس کا مین گیٹ بھی آئندہ رفت کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس وقت رئیس خان بھی سیاست میں بالواسطہ طور پر سرگرم تھے۔ میں یعنی شاہ عالم ایک سیاسی جماعت پی جے ایف کا سربراہ اور تحلیل شدہ صوبائی اسمبلی کا رکن تھا۔ آئندہ انتخابات میں مجھے اتنی پیشین حاصل کرنے کی امید تھی کہ اکثریت حاصل کرنے والی پارٹی بھی میرے حلقوں کے بغیر قطعی اکثریت کے ساتھ حکومت نہ بنا سکے۔ رئیس کی سرگرمیوں کا دائرہ مختلف تھا۔ وہ آخر میں خدا بخش

مندرال کے ساتھ تھا۔ اس کا کام سیاسی حریفوں کے جلے ناکام بنانا، جلوس منتشر کرنا، ان کے کارکنوں کی پٹائی اور اغوا۔ ان کے پوسٹر اور بینر اتارنا۔ احتجاجی مظاہروں کا بندوبست اور استقبال کے لیے جو شیلے کارکن فراہم کرنا اور ایسے ہی بد معاشی کے معاملات تھے۔

پھر شاہ عالم مر گیا۔ دوبارہ زندہ ہوا اور پھر سیاسی موت مار دیا گیا۔ وہ سیاست سے تائب ہو کے روپوش ہو گیا۔ میں نے شاہ عالم بن کے اس کی زندگی گزارنے کی کوشش کی تھی اور اس میں بری طرح ناکام ہوا۔ اب میں پھر نامرعیتم تھا۔ اس تجربے میں میں نے کیا کھو یا تھا؟ کیا پایا تھا۔ یہ میری کمائی تھی۔ میرے ساتھ ہی رئیس نے بھی سیاست کو خیر یاد کر دیا تھا اور پھر ایک طویل عرصہ ہم نے اپنی جان بچانے کے لیے روپوشی میں گزارا تھا۔ ہمارے خون کے پیاسے کرائے کے قاتل اور جان کے دشمن سیاسی حرف ہر جگہ ہمیں تلاش کرتے پھر رہے تھے۔

اس وقت میں نے رئیس خانے میں پناہ لی تھی۔ رئیس نے مشرق کی جانب کا مین گیٹ بند کروا تھا اور ہم آئندہ رفت کے لیے چھپ چھپ گئی کاراستہ استعمال کرتے تھے۔ رئیس خانے میں آگے پیچھے دو مکان تھے اصل رئیس خانہ بھی دس کنال پر تھا۔ اس کے پیچھے مغرب کی رخ دو سرا گھر تھا جو رئیس نے خریدا تھا اور بیچ کی دیوار سے راستہ نکال کے انہیں ایک کر دیا۔

یہ ایک حفاظتی انتظام تھا جو ہماری جان بچانے کا سبب بن گیا۔ سامنے سے رئیس خانہ کئی ماہ سے بند پڑا تھا اور ہر دیکھنے والا ایک نظر میں اندازہ کر سکتا تھا کہ یہاں مدت سے کوئی آیا نہ گیا۔ پہلے مین گیٹ پر چوبیس گھنٹے کا پیرائیں مارخانہ لگام خود دیتے تھے۔ اسے ہر وقت وردی میں ہمیشہ مستند اور مسلح دیکھا جاسکتا تھا۔ میں حیران ہوتا تھا کہ وہ سوتا کس وقت تھا۔ یہ بات اب خواب و خیال ہو گئی تھی جب میں اپنی شاہانہ لینڈ کروڈز میں آتا تھا اور خود رئیس خان بھی ایسے ہی دندناتے پھرتے تھے۔ اب تو تین ماہ سے ہم چوروں کی طرح چور دروازے سے آتے جاتے تھے۔

چور دروازہ پچھلی یعنی مغرب کی طرف والی گلی کے مکان کا وہ گیٹ تھا جو باہر سے دیکھنے میں کسی دکان کا شکر لگتا تھا جسے اوپر اٹھا کے کھولا جاتا ہے اور نیچے کر کے قفل لگا دیا جاتا ہے۔ یہی وہ گیراج تھا جس میں ہماری گاڑیاں کھڑی ہوتی تھیں۔ اس گیراج میں پہنچنے کا راستہ بھی بہت پرچہ اور خفیہ تھا۔ جو رئیس خان کے ذہن کی اختراع تھی جس کا میں بہت مذاق

مت دے" اور میں نے کہا کہ جو تیرے نصیب میں ہے وہی ملے گا تجھے۔

اس نے شاید میرا جواب سنا ہی نہیں اور دوڑتا ہوا رئیس خانے کی چھت کو عبور کر کے پچھلی گلی والے مکان کی چھت پر اتر گیا۔ میں سامنے کی طرح اس کے تعاقب میں رہا۔ پھر ہم منڈیر پر سے جھانک کر گلی میں دیکھتے رہے۔ عین گیراج کے سامنے دو افراد ہاتھ میں سرے اٹھائے کھڑے تھے۔ غور سے دیکھتے پر اندازہ ہوا کہ وہ سرے نہیں پرانی قسم کی لمبی ٹال والی شکاری ہندو قبیلہ تھے۔ وہ آپس میں کچھ مشورہ کر رہے تھے۔ سڑک کے کنارے ایک گاڑی کھڑی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کی صورت کے نقوش واضح نہیں تھے مگر میں ایک مسلسل پپ سن سکتا تھا۔ جیسے دل کی دھڑکن بتانے والے آلے کی آواز۔ یہ سنل بہت ہلکا تھا اور کار کے اندر سے سنائی دے رہا تھا۔



ایک محبت وطن کی انوکھی اور دلچسپ گزشت
کیا اُسے وطن سے محبت کرنے کی سزا ملی؟
وطن عزیز کے گلی کو چھ جب اُس پر نامہ رہاں ہوئے
تو وہ اندر سے ٹوٹ ہی گیا مگر بہت اور قوت سے فتح
اس کا مقدر ٹھہری۔ قیمت - ۹۰/- ڈاک خرچ - ۲۰/-

ناشر
علی میاں بی بی پبلی کیشنز
عزیز نگر گیت - اردو بازار
لاہور فون ۴۲۴۴۱۴
اسٹاکسٹ
علی بیگ سٹال
نسبت روڈ چوک میر سیتال
لاہور فون ۳۲۲۸۵۳

ہم بالکل سامنے پہنچ جائیں گے۔
"ہم اوپر سے چلتے ہیں" رئیس نے کہا۔
"کیوں نہ انہیں بھی جگا دیں۔"

رئیس نے میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچا "ابے سوئے دے انہیں آرام سے۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ یہاں تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔"

میں نے کہا "آخری وقت تک خطرے کو خطرہ نہ سمجھتا ہے وقتی ہوتا ہے۔ کم سے کم تیس مارخان کو ہوشیار کر دیں۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے" رئیس بولا۔
تیس مارخان اپنی خواب گاہ یعنی کچن میں جھوٹی کے ساتھ یوں جو خواب تھے کہ ایک جان دو قالب ہوئے پڑے تھے۔ وہ سوئے تو الگ الگ ہوں گے مگر بعد میں شاید جذبات کی مقناطیسی کشش غالب آجی۔ ایسے میں انہیں اٹھانا ایک مشکل کام تھا۔ وہ تو اٹھنے کے بعد شرماتے۔ مجھے بھی شرم آ رہی تھی مگر اس کے باوجود چارہ نہ تھا۔ میں نے تیس مارخان کی ٹانگ پکڑ کے بلانی تو جھوٹی پہلے بیچ مار کے اٹھ بیٹھی۔ اپنا تک است احساس ہوا کہ وہ کہاں ہے۔

"ہائے میں مر گئی۔" اس کا ہاتھ فوراً اپنے دوپٹے کی تلاش میں اوجھڑا دھر گیا۔ جیتہ کہ سب خوابیں کاجا آئے۔ میں نے کہا "ابھی مت مرو۔ پہلے اس مروے کو اٹھاؤ۔"

جھوٹی اتنی نزوس تھی کہ مجھے خود ہی تیس مارخان کو ٹھوکر مار کے اٹھانا پڑا اور جب وہ جاگ گیا تو میں نے اسے کم سے کم الفاظ میں خطرے کی نوعیت سے آگاہ کیا۔
"ضرورت پڑے تو شہین اور سوئی کو لے کر سامنے سے نکل جانا، بڑی گاڑی میں۔"

اس نے نیند میں دہائی دینی شروع کی "صاب" بڑی گاڑی کب سے حرکت نہیں فرمائی، اس میں بیٹول کی جگہ ہوا ہوتی۔"

رئیس نے کہا "یہ سب میں نہیں جانتا۔" رئیس نے میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور میں اس کے پیچھے دوڑا۔ گیٹ کی طرف جانے والا زینہ سامنے کی طرف مگر گیٹ کی مخالف سمت میں میرے بائیں ہاتھ پر تھا۔ اس پر گٹلے اٹک پڑے تھے۔ چھت پر کچھ دھنسنی تھی جو اوجھڑا دھر سے منکس ہو کے پتی رہی تھی۔ اس میں مجھے دُش تو صاف نظر آئی مگر کیبل کا تار نظر نہیں آیا۔ میں الجھ کے منہ کے بل کرنے کے لیے آگے گیا تو رئیس سے ٹکرایا۔ اس نے پلٹ کے کہا "ابے دیکھ تو

کھڑی تھیں۔ ایک رئیس کی پرانی شراذتھی جسے ہم مرگت کہتے تھے کیونکہ وہ اپنا رنگ بدلتی رہتی تھی۔ اس کے پیچھے ملک رب نوازی کی سرخ آلتو تھی۔ شر توڑنے کی آواز اسی طرف سے آئی تھی اور اگر رات کی خاموشی نہ ہوتی تو شاید سنائی بھی نہ دیتی۔

میں اور رئیس کسی شے کے بغیر ایک ہی نتیجے پر پہنچے تھے کہ کوئی اس طرف سے شر توڑ کے اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ شر کو توڑنا عملاً ناممکن تھا۔ اگر اس پر ہتھوڑے وغیرہ مارے جاتے تو پورا محلہ کیا، سارا شرجاگ اٹھتا۔ دوسرا طریقہ اس کو ویلڈنگ ٹارچ سے کاٹنے کا تھا۔ یہ بھی ناممکن تھا۔ تیسرا طریقہ اس کے نالے توڑنے کا تھا مگر نالے اندر کی طرف لگے ہوئے تھے۔ ایک بک شر کے پچلے حصے میں تھا اور دوسرا سینٹ کے فرش میں مضبوطی سے گڑا ہوا تھا۔ جب شر فرش سے مل جاتا تھا تو دونوں میں ایک خاصا بڑا کھٹکے سے بند ہونے والا چائینر لاک لگا دیا جاتا تھا۔ یہ لاک شر کے دونوں طرف لگائے جاتے تھے اور ان کو توڑنا بھی مشکل تھا۔ باہر سے تو بالکل ناممکن تھا مگر یہ ہو سکتا تھا کہ کوئی لوہے کی رانچ نیچے پھنسا کے زور لگائے اور شر کو اوپر اٹھانے کی کوشش کرے تو ویلڈ کیے ہوئے بک نکل جائیں۔ رئیس کے ساتھ ہی میں بھی کھڑا ہو گیا "یہ سالا کون ہو سکتا ہے؟"

میں نے کہا "سالا جو بھی ہو، ہمارا دشمن ہی ہوگا۔"
"ہاں دوست تو اب کوئی نہیں رہا اور وہ آتے ہیں تو بتا کے آتے ہیں۔ ہم خود ان کے لیے دروازہ کھولتے ہیں" رئیس نے الماری میں سے اپنا دیوار اور کال کے لوڈ کیا۔
میں نے کہا "سوال یہ ہے رئیس خان کہ کسی دشمن نے یہ راستہ کیسے دیکھا؟"

"بے اپنی دو آنکھوں سے دیکھا اور کیسے دیکھا؟ چل کے پوچھ لیتے ہیں۔"

میرا دیوار الود پہلے سے بھرا ہوا تھا۔ "کیا ہم انہیں اندر آنے کا موقع دیں؟"

"اندرا آنا کیا بچوں کا کھیل ہے۔ سالے نینک لے کر آئیں تو سیدھے گھر سے گئے ہیں ورنہ شر توڑیں۔ اس کے بعد اوپر جکراتے پھریں کہ گاڑیاں تو کھڑی ہیں، بندہ بھر کوئی نہیں رہیں ہنس۔"

میں نے کہا "مگر ہم مین گیٹ سے نکل کے اور پھر پوری گلی کا چکر لگ کے پیچھے والی گلی میں گئے تو بہت وقت لگے گا اور

اڑایا کرتا تھا لیکن بعد میں یہی خفیہ راستہ ہماری سلامتی کا ضامن بن گیا تھا۔ ہم بیک وقت دنیا سے روپوش بھی تھے اور رابطے میں بھی تھے۔

رئیس خانے کا ایک حصہ - خانے پر مشتمل تھا جس میں اس وقت ہم مقیم تھے اس میں دو بڑے روم تھے۔ لاؤنج اور کچن وغیرہ کے ساتھ یہ ایک مکمل رہائشی یونٹ تھا جہاں ضرورت اور آسائش کے تمام لوازمات فراہم کئے گئے تھے۔ اس یہ خانے کے ایک اسٹور سے سیدھے ہاتھ پر جانے والی سیڑھی سے ہم اصل رئیس خانے میں پہنچ سکتے تھے مگر ادھر جانا ہم نے تقریباً آٹھ ماہ سے چھوڑ رکھا تھا۔ جو لوگ سامنے سے دیکھتے ہوں گے یا رئیس سے ملنے آتے ہوں گے وہ خانہ ویرانی کو دیکھ کے لوٹ جاتے ہوں گے۔ وہاں کھڑی ہوتی رئیس کی پیچیدہ کا اصل رنگ گرد کے نیچے چھپ گیا تھا۔ پوریج اور برآمدے، باغ اور لان میں بھی لمبی دھول اور گونڈے بکھرے کے ڈھیر تھے جو ہوا کے ساتھ اڑ کے اندر آگیا تھا۔ پورے خشک ہو گئے تھے اور گھاس بڑھ کے کھیت کی طرح للہاری تھی۔

پچھلی گلی کے راستے باہر جانے کے لیے ہم دوسری سیڑھی استعمال کرتے تھے اور یہ ایریا راستہ تھا جو کسی کو نظر بھی نہیں آسکتا تھا۔ اسے بھی رئیس نے ویران کیا تھا۔ اوپر والے حصے میں کپڑوں کی ایک الماری تھی جس کے پچھلے حصے کی دیوار ایک عین دبانے سے شق ہو جاتی تھی اور دوسری طرف کچن کے بعد اسے دوسرا عین دبا کے برابر کیا جاسکتا تھا۔ دوسری طرف یہ راستہ ایک اسٹور میں کھلتا تھا چنانچہ ادھر سے صرف وہی آسکتا تھا جو اس نظام کو سمجھتا ہو۔ یہ بڑا چراسرا اور کسی حد تک فلمی قسم کا خفیہ راستہ تھا مگر میں نے اسے مستقبل کے خدشات کو ذہن میں رکھ کے وضع کیا تھا۔ ضرورت پڑنے پر اس کی افادیت ثابت ہوگئی۔ دیوار کے شق ہونے کا نظام سلائیڈنگ ڈور والا تھا۔ مگر اس میں موٹریں استعمال کی گئی تھیں۔ جو نیچے نصب تھیں۔ رئیس کو یہ خیال اپنی پیچیدگی کی یاد دہندہ کو دیکھ کر آیا تھا۔

باہر نکلنے کے لیے ہم یہ احتیاط کرتے تھے کہ شر اٹھا کے پہلے یہ اطمینان کر لیتے تھے کہ گلی میں کوئی بھی اوجھڑا نہ ہو۔ کسی شر اٹھانے ہی گاڑی رپورس میں باہر آجاتی تھی۔ کسی کو پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ کس گھر کے گیٹ سے نکلی ہے پھر شر گرا کے لاگ کر دیا جاتا تھا۔ زیادہ تر لوگ یہ سمجھتے ہوں گے کہ شر کے پیچھے کوئی دکان ہے جو ہیش بند رہتی ہے۔

اس وقت شر والے گیراج میں دو گاڑیاں آگے پیچھے

رازدارانہ سرگوشی کے لیے رئیس نے میرا کان چھپانے کی کوشش کی "پارے" یہ کون مغزے ہیں۔
میں نے کان میں ایک انگلی ڈال کے ہلائی "اتنی ادنی آواز میں آپ دوش دور سے بھی بات کر سکتے تھے ان میں ایک مداری ہے اور دو بیچے جمورے ہیں۔"
"سالے بندوچی کی اولاد۔ وہ جوان کا باپ گاڑی میں بیٹھا ہے آخر وہ کون ہے؟" رئیس بولا۔
میں اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ کے دیکھنے کی پوری کوشش کر رہا تھا "میں اسے صورت تو کسی کی بھی نہیں پہچانی جاتی لیکن یہ اپنے ملک رب نواز کے جاں نثاروں کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔"

رئیس نے سر ہلایا "ابے اتنا تو خیر ہم بھی سمجھتے ہیں مگر یہ کیا کر رہے ہیں یہاں اس وقت چاہتے کیا ہیں آخر؟"
میں نے کہا "مجھے یہ آواز سنائی دے رہی ہے۔"
"ہاں۔ جیسی دل کی دھڑکن تانے والی مشین سے آتی ہے۔"

میں نے کہا "یہ سنگل ہے۔"
"میں سمجھ گیا۔ یہ کسی کو سنگل دے کر تیار ہے ہیں کہ ہم یہاں ہیں۔ تم بھی آجاؤ۔" رئیس بولا۔
"نہیں۔ یہ سنگل رہیو کر رہے ہیں اور یہ سنگل ہمارے گھر میں سے دیا جا رہا ہے۔"

رئیس بوکھلا گیا "ابے یہ کیا کہہ رہا ہے تو؟" یہاں سے کون۔"
مگر میری بات کی تصدیق فوراً ہی ہو گئی۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے شخص نے پوچھا "اوسے دیر کس بات کی ہے؟ کیا کر رہے ہو م لوگ۔"

شرکے سامنے کھڑے ہوئے ایک شخص نے بندوق کو ٹال کی طرف سے ڈنڈے کی طرح پکڑ رکھا تھا۔ وہ گاڑی کے قریب گیا "استادی۔ شر میں آگے لگے ہوئے ہیں بڑے ظالم قسم کے۔"

"اوسے ظالم دے پڑ۔ تو اتنی چایاں لایا تھا اپنے ساتھ۔ ان میں سے کوئی نہیں لگی۔"
وہ بولا "بڑی ٹرائی ماری ہے میں نے۔"
گاڑی میں بیٹھا ہوا شخص مایوس ہو گیا "آگے توڑے بھی نہیں جاسکتے۔"

شرکے پاس دو سرا شخص بندوق کو کندھے پر رکھے مثل رہا تھا۔ ان دونوں کی عمر طبعی اور جسامت میں کوئی خاص فرق

نہیں تھا۔ دونوں کے پیٹ غیر ضروری طور پر باہر نکلے ہوئے تھے "استادی۔ آپ حکم کرو۔ تھاکہ کر کے اڑا دیں؟"
استادی نے فحش سے کہا "کیسا بالکل داپڑ ہے۔"
قریب کھڑے شخص نے اس خیال سے اتفاق کیا "ابھی بندوق کی ٹال بیچے چمنس کے شرانگھاں چاہتا تھا۔ ملک صاحب کی شکاری بندوق ہے۔ ٹال ٹیڑھی ہو جاتی تو اسے بھی ٹیڑھا کر کے چھوڑتے ملک صاحب۔"

"چلو دفع کرو۔ ہم جانے ملک صاحب کو بتا دیتے ہیں۔ کل کسی ایچھے ماہر کو ساتھ لائیں گے تو درمٹ میں ٹالا کھول دے گا۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے شخص نے کہا۔
"استاد۔ کیا پتا ہے گاڑی اندر ہی ہے۔"
استاد نے کہا "اوسے شک کی کون سی بات ہے۔ یہ آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔"

"لیکن ادھر تو کوئی بھی نہیں رہتا۔ توڑی دیر پہلے میں نے پتا کیا تھا ادھر ادھر سے۔ دو سال سے دکان بند ہے۔"

استاد شک میں پڑ گیا "یار میں نے بھی آگے پیچھے جانے دیکھا تھا۔ سنگل کمزور پڑ جاتا ہے مگر یہاں بت کلیر ہے اور دیکھ سوتی بھی ادھر ہی اشارہ کر رہی ہے۔"
"وہ تو ٹھیک ہے جی لیکن گاڑی ایک دکان میں۔"
استاد نے کہا "دکان کس کی ہے؟"

"پرچون کی۔ دو سال پہلے کوئی بڑھا بیٹھا تھا۔ وہ اسکول نیچر تھا۔ ریٹائر ہونے کے بعد وقت گزارنے کے لیے دکان خالی لی تھی۔ سامنے ایک پرائمری اسکول ہے۔ بچے ٹانیاں شانیاں لیتے تھے یہاں ایک بیٹا تھا اور بوس۔ بڑھے کی اپنی بیوی شاید مر گئی ہوگی پھر بڑھا بھی فوت ہو گیا۔ بیٹا بوس یہ مکان بچے کے کہیں چلے گئے۔"

استاد نے معلومات کے اس ذخیرے پر غور فرمایا "ہوں۔ یہ پتا نہیں کیا کہ مکان خرید اکس نے تھا؟"

"پتا کیا تھا جی۔ کسی عورت نے لیا تھا۔ عمر تو زیادہ نہیں تھی اس کی عمر وہ بہت موتی تھی اور اس کے ساتھ جو بندہ تھا وہ اس کا شوہر ہی لگتا تھا۔ وہ بالکل سوکھا چھوڑا تھا۔"
رئیس نے مجھے کہنی ماری "دیکھا؟ اپنی عقلمندی کام آئی۔ اس وقت اپنی اس سالی رس ملائی کی زلفوں کے سفیر تھے۔"

"سفیر نہیں۔ امیر جاہل کی اولاد میں نے کہا۔"

"ابے ہاں وی۔" رئیس جھنجھ کر بولا "مگر اب یہ کچھ پتا نہیں لگا سکتے۔ رس ملائی پسند آئی ایک حلوئی کو۔ اس کی باہر کہیں دکان بھی مٹائی کی۔ وہ شادی کر کے چلی گئی ہے۔"

"جیسے اس کے علاوہ ایک درجن اور چل سکیں۔ بٹی، جلیبی، پلو شاہی اور امرتی۔ کوئی کب تک انتظار کر سکتی ہے آخر؟ تیرا تو کام ہی یہ تھا مفت میں منہ میٹھا کرنا۔ حلوئی کی دکان کھلایا پوری مگر بیٹ بھرانہ نیت بھری۔"
رئیس اگڑا ہوا "سچ کہتا ہے یا تو۔"
گاڑی میں بیٹھے ہوئے شخص نے بالآخر وہاں ہی کا فیصلہ کر لیا "اوسے چلو دفع کرو۔ ہم جانے ملک صاحب کو بتا دیتے ہیں کہ گاڑی خیر سے اپنی جگہ پر موجود ہے پھر وہ جیسا کہیں گے ویسا کریں گے۔"

قریب کھڑے شخص نے کہا "شکر ہے کسی نے شک نہیں کیا ہم پر ورنہ دخت پڑ جاتا۔"
"اوسے آج کل کوئی کسی کے معاملے میں نہیں پڑتا۔ زمانہ ہی ایسا ہے اپنی جان بچاتے ہیں سب" استاد نے تجربے کی بات کی "چل تو بیٹھ۔"
گاڑی میں بیٹھے سے پہلے اپنے ساتھی کو آواز دی "چل اوسے کھیل آ جا فانٹ۔"

شرکے پاس کھڑا ہوا شخص ابھی تک تالوں کی ساخت پر غور فرماتے ہوئے انہیں کھولنے یا توڑنے کے دیگر امکانات کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ تپ کے پلٹا "کرلا ہو گا تیرا باپ۔"
باقی دو بھنبے غالباً کرلا اس کی چڑھی۔ گاڑی اندھیرے میں بیٹھ لائیں کے بغیر نصف دائرے میں جگر کاٹ کے واپس ہوئی۔ اگر اس پر کوئی نمبر ہوتا تو اسٹریٹ لائٹ پڑنے سے صاف نظر آتا مگر اسے چھپانے کے لیے نمبر لائٹ پر شانہ چونا پھیر دیا گیا تھا۔

میں گاڑی کو گلی کے موڑ تک غائب ہوتا دیکھتا رہا۔ صورت حال میں یہ تبدیلی ایک خطرے کی نشاندہی کرتی تھی۔ ملک نے جھنم سے کچھ نہیں پوچھا تھا کہ وہ اخبار کے دفتر میں بھی نہیں ملتی اور آزاد صاحب کے ساتھ بھی نہیں رہتی تو پھر اس کا ٹھکانا کہاں ہے اس نے بڑی ہوشیاری اور ذہانت سے کام لیتے ہوئے معلوم کر لیا تھا کہ جھنم کس راستے سے کہاں گئی ہے۔ جھنم کی گاڑی کے چوری ہونے کے پیچھے کیا مقصد کار فرما تھا۔ اب واضح ہو گیا تھا۔

جو گاڑی جھنم کو پیش کی گئی تھی اس میں کوئی چھوٹا سا نظریہ آنے والا اور بیڑی سے کام کرنے والا ایسا آگے لگا دیا گیا تھا جو خاموشی سے مسلسل ایک ہی فریکوئنسی پر سنگل نشر کر رہا تھا۔ کسی کو بھی اس کی موجودگی کا علم نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ عام وادی کی قسم کا نظام تھا۔ گاڑی سے نشر ہونے والا

دور۔

دور۔

سنگل دو سرے آگے پر سیپ کی صورت میں سنائی دیتا تھا۔ جب ہم ملک ہاؤس سے فراہم کی جانے والی خوبصورت اور نئی ٹولٹی دمن جیسی سرخ تالوں میں روانہ ہوئے تو وہیں سے کسی گاڑی نے ہمارا تعاقب کیا۔ تعاقب کرنے والی گاڑی کو ہمارے قریب آنے اور ہمیں نظر میں رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سنگل وصول کرتے ہوئے ایک کلو میٹر پیچھے رہ کے بھی ہمارا سراغ لگا سکتے تھے اور اس جدید سائنسی نظام کی بدولت وہ بالکل صحیح جگہ پر پہنچ گئے تھے۔ ان کے آنے سے پہلے ہم کیران میں گاڑی بند کر چکے تھے مگر دکان جیسے شرکے باہر بھی سنگل صاف سنائی دے رہا تھا۔ گاڑی خود بول کے بتا رہی تھی کہ میں یہاں ہوں۔

آخر ملک کو جھنم کے ٹھکانے کی تلاش کیوں تھی؟ اس ایک سوال کا جواب بہت سے مفروضات کی بنیاد پر مل سکتا تھا مگر مجھے زیادہ تشویش اس خیال سے لاحق تھی کہ جھنم کے ساتھ ہی ملک کو میرے بارے میں معلوم ہو جائے گا۔ یہ پتا چل جائے گا کہ میں درحقیقت ڈراپوٹریا بازی گاڑی نہیں ہوں۔ اسے رئیس کے بارے میں معلوم ہو جائے گا اور سب سے زیادہ خطرناک بات یہ ہوگی کہ اسے سولی کے بارے میں پتا چل جائے گا کہ اسے ہم نے یہاں چھپا رکھا ہے۔ وہ قانون کی مجرم تھی اور اس سے بڑھ کر ملک رب نواز کی مجرم تھی۔ قانون اسے عدالت میں اپنی بے گناہی ثابت کرنے، معقولیت کی بنیاد پر رعایت حاصل کرنے اور سزا میں انصاف کے ساتھ رحمانہ سلوک کا موقع فراہم کرتا تھا مگر ملک رب نواز کے ذاتی قانون اور اپنی عدالت میں اس کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اگر وہ ملک رب نواز کے ہاتھ لگ جاتی تو اس کے عبرت ناک انجام میں سفاکی اور درندگی کی کسی انتہا کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

میں انہی پریشان کرنے والے خیالات میں غم کھڑا تھا کہ رئیس نے مجھے متوجہ کرنے کے لیے چنگی بجائی "ابے کیا پیچ گیا دو سرے جہاں میں پیارے۔ کھڑے کھڑے اللہ کو پکارا ہو گیا۔"

میں نے کہا "ابھی سے کہاں یار۔ دشمنوں کی بددعا جو ہے۔ اس نے سر کھپایا "کیا مطلب؟"
"مطلب یہ کہ کسی کی بددعا کی وجہ سے اللہ میاں ملت دیتے جاتے ہیں کہ تم کرلو جو کرتا ہے۔ تمہارے چاہنے سے کچھ ہونے والا نہیں ہے۔"

"لیکن پیارے" ان سالوں کا یہاں آتا ہے بڑی نحوست کی بات۔"

کی بات۔

میں نے کہا "یہ تو میں بھی سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرنا چاہیے ہمیں۔ خیر چل بیچے کوئی نہ کوئی حل کل ہی آئے گا اس مسئلے کا بھی۔"

رکھیں نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا "حل تو ہم نے ڈھونڈ بھی لیا ہے ہمارے۔ قسم اللہ کی" اور تو سنے کا تو حیران رہ جائے گا۔ اپنی عقل جیسی بھی ہے کام کر جاتی ہے بھی۔"

بچے ہمارے استقبال کے لیے جہنم مجسم شعلہ بنی کھڑی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ کمر پر تھا اور ماتھے پر ہر شکن ایک سوال بن گئی تھی۔ "آدھی رات کے وقت یہ کیا ایکٹوٹی ہو رہی ہے کہاں ہیں آپ لوگ؟"

میں نے کہا "عرض کیا ہے۔ ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی۔"

رکھیں بولا "ہم دیکھنے گئے تھے کہ رات کے وقت آج کل چھوڑ کر کیا ہوتا ہے۔"

جہنم مسکرائی "پھر کیا دیکھا ہو رہا ہے؟"

میں نے کہا "افسوس کہ اب کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ہمارے زمانے میں بہت کچھ ہوتا تھا۔"

"آپ کے زمانے میں؟" جہنم ہنسی "کیا ہوتا تھا بزرگوار۔"

میں نے ایک آہ بھر کے کہا "بہت کچھ ہوتا تھا نور چشم راز و نیاز، عمد و بیان، لڑکیاں انجام کی پروا کیے بغیر کھٹے پٹ جاتی تھیں اور ان کے چاہنے والے جان بھیلی پر رکھ کے دیواریں پھاڑتے آتے تھے اور اترنے کے لیے پر تال بھی نہ ملے تو چھت سے گلی میں کود جاتے تھے پھر ساری عمر لنگراتے پھرتے تھے۔"

"بہت پرانی بات ہے گویا۔ پچھلی صدی کی۔" جہنم بولی۔

سوچ رہی ہے "رکھیں تم بتاؤ؟"

"پہلے تم بتاؤ کہ سب سو رہے ہیں، تم کیوں جاگ رہی ہو؟"

"کون سو رہا ہے؟" جہنم نے ناراضی سے کہا "غیر آئی ہی تھی کہ تمہارے اس تیس مارخان نے دروازے پر گئے مار کے چلانا شروع کر دیا۔" خواتین ام عرض فرماتی۔ حالات سخت خطرناک ہوئی۔ بد بخت دشمن یلغار فرماتی۔ آپ فوراً سے پشتریا ہر تشریف نہیں لاتی تو جام شہادت نوش فرماتی۔ ناصر صاحب حکم صادر فرماتی اور ریش خان صاحب کے ساتھ راہ فرار اختیار فرماتی۔ ام بتلیم خود ملاحظہ کر لیں۔ وہ دونوں زینے کے راستے تشریف لے جاتی اور تشریف کو واپس نہیں لاتی۔"

میں نے ہنس کے کہا "یعنی اس کا خیال تھا کہ ہم بھاگ گئے؟"

رکھیں جھوٹے لگا "سالے کی زبان اتنی بے قابو ہو جاتی ہے کہ خدا سے پتا نہیں ہو آیا ایک رہا ہے۔"

"سوئی تو بہت ڈر گئی تھی۔ وہ کبھی شاید پولیس آگئی ہے۔" جہنم نے کہا۔

"مگر وہ اب کہاں ہے؟" رکھیں بولا۔

"اپنے کمرے میں پچھپی بیچی ہے۔ عجیب لڑکی ہے۔" جہنم بولی۔

"عجیب کیسے ہے؟" میں نے کہا۔

"یار زندگی کے ہر تجربے سے گزر چکی ہے اور سخت ترین حالات کا مقابلہ کر چکی ہے۔ ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل تھی۔ کلا شکوف چلا سکتی ہے لیکن انھد سے اتنی ڈر پوک ہے۔" جہنم نے افسوس سے سر ہلایا۔

صاف کرنے کی کوشش میں وہ خود محو ہو گیا تھا۔

رکھیں خان نے اس پر براہ راست چڑھائی کر دی "اچھا ہوا تو خود ہی آیا۔" الو کے پیچھے۔ اب یہ بتا کہ پہلے سو جوتے کھائے گایا سو پناز "جلدی بول۔"

تیس مارخان کا چہرہ مظلومیت اور دکھ کی تصویر بن گیا "صاحب! ام سے ایسا کیا قصور سرزد ہوئی؟"

"اے قصور کے بچے کیا ہنگامہ برپا کیا تھا تو نے سالے اور تیری اس ہری مرچ نے۔ دونوں نے مل کے دہشت پھیلانی۔"

تیس مارخان نے ایک دم ڈبا پھینک دیا اور زمین پر بیٹھ گیا "الی آپ سخت نا انصافی فرماتی۔ ام دی کرتی جو آپ فرماتی۔ ام خواتین کو خواب غفلت سے بیدار کرتی۔ خطرے کا اعلان کرتی۔ کیا ام غلط کرتی؟ پھر آپ فرماتی کہ بڑی گاڑی چلائی۔ آپ کچھ خیال نہیں فرماتی۔ بڑی گاڑی کا ایک پیسہ میں ہوا نہیں ہوتی۔ پیسوں کی شکل میں ہوا ہوتی۔ ام گاڑی صاف کرتی۔ آئل پانی چیک کرتی لیکن گاڑی حرکت کے ناقابل ہوتی۔"

رکھیں نے کہا "گاڑی اگر چلنے کے قابل نہیں ہے تو یہ کس کی نالائقی ہے؟ تیرا کام تھا اسے ریڈی رکھنا۔ تیری سزا ہے سو پناز اور سو جوتے۔"

تیس مارخان نے فریاد کے انداز میں آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے "یا خدا اوند صاحب! ام کو معاف فرماتی، ام خود کشی کرتی۔"

میں نے کہا "ایسی کیا بات ہے آخر۔"

جواب میں اس نے ایک طویل، دردناک اور رقت خاری کرنے والی تقریر کی جس کا لب لباب یہ تھا کہ پہلے جب وہ صرف چوکیدار تھا تو صرف چوکیداری کرتا تھا پھر اسے ڈرائیور کی ذمہ داری بھی سونپ دی گئی۔ مالی کے فرائض وہ شوقیہ اور رضا کارانہ طور پر سرانجام دیتا تھا مگر اب وہ بچن میں غاسناں کا کام بھی کر رہا ہے۔ دیگر امور خانہ داری میں چھوٹی اس کی مدد کے لیے اب آتی ہے ورنہ اسے سب اکیلے ہی کرنا پڑتا تھا۔ اس نے بھی شکایت نہیں کی اور بھی تنخواہ بڑھانے کی بات نہیں کی مگر یہ جو اس پر نااہلی کا الزام ہے یہ اس کے لیے ناقابل برداشت ہے اور اسے جس قصور کی سزا کے طور پر سو پناز اور سو جوتے کھانے پر مجبور کیا جا رہا ہے وہ ہرگز کوئی غلطی نہیں ہے۔ اس کے پاس بڑی گاڑی کو ریڈی رکھنے کے لیے وقت ہی کہاں تھا اور اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

اس کی شب و روز کی خدمت گزار کی کا انعام اگر نااہلی کا

الزام ہے تو ایسی ناقدری کے بعد اس کا جینائی لا حاصل ہے۔

"اب ام فوت ہو کے عالم بالا میں سکونت اختیار کرتی اور سکون سے رہتی" اس نے آنسو بہاتے ہوئے کہا "آپ ام کو رخصت عنایت فرمائی۔ ام ابھی روٹا گئی رائے خود کشی اختیار کرتی۔ اباباص اور والدہ صاحب کے پاس جاتی۔"

رکھیں نے کہا "ہماری طرف سے اجازت ہے۔ جہاں چاہے جائے۔"

"ام فوراً رکشا میں بیٹھ کے بادشاہی مسجد جاتی۔ دو غسل ادا کرتی اور مینار پر چڑھ جاتی۔ گلہ بڑھ کے بیچے آتی۔ زینے کے بغیر۔ ادھر امارا سرپاش پاش ہوتی اور لمارا ہڈی کا سرمہ بن جاتی۔ ام فوراً اللہ کو بار بار ہوتی۔"

چھوٹی چائے لے کر آئی تو اس منظر کو دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ اس کا اگلوتا پرستار چھوٹا سا تیس مارخان اتنی پالنی مارے بیٹھا آنسو بہا رہا تھا اور آنسو اس کے رخساروں پر بہتے موٹھوں میں ایسے تک گھے تھے جیسے جنگلی گھاس پر جہنم کے قطرے پانی سب اس پر ہنس رہے تھے۔

چھوٹی نے چائے کی ٹرے میز پر رکھ دی اور تیس مارخان کے پاس بیٹھ گئی "ارے کیا ہو گیا ہے مجھے کم بخت کس کی جان کو رو رہا ہے۔ اماں اپنا تو کب کے مر گئے۔ اب کیا میری بہت پر آنسو بہانے بیٹھ گیا ہے۔ دنیا کو دکھانے کے لیے نوسے بہا رہا ہے۔ ویسے تو پتا ہے مجھے کہ میں جج جج مرھاؤں تب بھی تیری آنکھ سے ایک پوند نہیں نکلے گی۔ آخر یہ الو جیسی آنکھوں کے نکلے کیوں نہ پٹ پٹ رہے ہیں؟"

تیس مارخان نے رقت سے لبریز آواز میں جواب دیا۔

"ام بہت تکلیف میں ہوتی۔"

"ارے سیدھی طرح بتا کیا ہوا ہے؟ دشمنوں نے چلنے تو بے پر ہٹا دیا ہے۔ تجھے یا مرچیں جھونک دی ہیں تیری آنکھوں میں۔ عقل کا اندھا تو پہلے ہی تھا۔ درود کے آنکھوں کا اندھا بھی ہو جائے گا کیا؟"

چھوٹی جب بولنے پر آتی تھی تو اس کی زبان کی کاٹ کے سامنے قینچی بھی باندھنا لگتی تھی۔ الفاظ اس کے منہ سے یوں نکلتے تھے جیسے کلا شکوف کے برست سے گولیاں نکلتی ہیں۔ اس کی خوش گفتاری کا یہ عالم تھا کہ جہاں ایک لفظ کا جواب کالی ہو وہاں اسے پورا جملہ کہہ پڑتا تھا اور جہاں جملے سے کام چل سکتا ہو وہاں وہ ایک سانس میں پیرا گراف بول جاتی تھی۔ اگر بولنے کی آزادی مل جائے تو پھر سننے والوں کا اللہ ہی حافظ۔ وہ کہیں اور سنا کر بے کوئی۔

میں نے کہا "ارے نیک بخت اب کچھ نہیں ہو سکتا۔"

بستر ہے تم اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔“
وہ نہیں نے کہا ”ہاں۔ اس نے خود کشی کے پروگرام کا
اعلان کر دیا ہے۔“

میں نے کہا ”ہاں اور یہ ہے بات کا دعویٰ۔ منہ سے جو
بات نکل گئی اس پر قائم رہنے والا۔“
چھوٹی نے ایک جج ماری ”ہائے میں مر گئی۔ اسے کیا یہ
ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ تو خود کشی کرے گا؟ حرام موت مرے گا
حرام خور۔“

تیس مارخان نے آنسو بھری نظروں سے اپنی محبوبہ کو
دیکھا ”ابھی ام تم کو بھی الوداع عرض کرتی۔ عرش پر خوروں
کے پاس جاتی۔“
”اسے مت کر ایسی پاگل پن کی بات۔ بتا ہے حرام
موت مرنے والے کا جنازہ بھی جائز نہیں ہوتا۔“ چھوٹی
چلانے لگی۔

تیس مارخان نے اس بکتے پر غور کیا ”مہرام اوھر سے
تیز کام پر سوار ہو کر راجی جاتی۔ اوھر بہت بڑا سمندر ہوتی
اس میں با بھی تشریف لے جاتی تو غرق ہوتی۔ ام کشی میں بیٹھ
کے بہت دور جاتی اور سمندر میں غرق ہو جاتی۔“
”آئیڈیا اچھا ہے۔“ وہ نہیں بولا۔

میں نے کہا ”ہاں۔ نہ کہیں جنازہ اٹھاتا نہ کہیں مزار
ہوتا۔“

”جب قیامت تشریف لاتی“ اسرائیل صاب صو میں
پھونک مارنی پھرام سمندر سے برآمد ہوتی اور میدانِ حشر میں
حاضر ہو جاتی۔“

چھوٹی نے اس کے ایک دو تہڑ مارا ”ارے اتنا ہی شوق
ہے مرنے کا تو کچھ کر کے مر۔ ان سب کو مار کے مرنے
مرنے پر اکسار ہے ہیں۔“

وہ نہیں ہنسنے لگا ”بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے چھوٹی۔ پہلے
اپنے سارے دشمنوں کو ٹھکانے لگا دے بلکہ اس چھوٹی کو بھی
موت چھوڑ۔ ورنہ بعد میں تیری روح کتنی ترپے گی اگر اس
نے کسی اور سے شادی کر لی۔ عورت کی ذات میں وفا نہیں
پارے۔“

میں نے کہا ”ایک بہادر کی طرح مرنے پر تو کچھ سے
سہی کاٹنے والی چھری اٹھا کے چلا جا تشریف۔ کشتوں کے پٹے
لگا دے۔ دشمن کی فوج کو گاجر مولیٰ کی طرح کاٹ کے رکھ دے
اور شہید ہو جا۔“

وہ نہیں نے تعریفی انداز میں سہلایا ”سید حاجت میں
جائے گا۔ ورنہ یہاں جو ہے مار گولیاں کھا کے یا گلے میں

چھند ازال کے چھت سے لٹکے گا تو ترپ ترپ کے جان دے
گاسب کے سامنے۔“
چھوٹی رو ہانسی ہو گئی ”صاحب جی کیوں کرتے ہو ایسی
باتیں۔“

میں نے کہا ”چھوٹی۔ ابھی تک تم نے اس سے یہ بھی
نہیں پوچھا کہ آخر یہ خود کشی کیوں کرنا چاہتا ہے اور وہ بھی
تمہاری اجازت کے بغیر۔“

چھوٹی نے ضبط کا حوصلہ جواب دے گیا اور وہ ہاتھ
جوڑ کے کھڑی ہو گئی ”اللہ کے واسطے آپ اسے معاف کر دو۔
آپ کے ہاتھ لگ گیا ہے کاٹھ کا الو اور آپ نے اسے تماش
بنالیا ہے۔ اس کی جان لے کر رہو گے آپ اس کھیل میں۔
میں اس سے کیا پوچھوں آپ کو معلوم ہے تو آپ ہی بتا دو
مجھے کہ یہ کیوں مرنے چاہتا ہے آخر؟ اس کا اپنا داغ ہوتا تو میں
کتنی کہ داغ چل گیا ہے بد بخت کا۔“

جواب میں وہ نہیں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑے
”اچھا میری اماں۔ غلطی کی ہم سب نے تو معاف کر دے
ہیں۔ اسے بھی ساتھ لے جا اپنے اور خود بھی رفع ہو جا۔ تو
ہی ہر وقت لڑتی رہتی ہے اس سے۔ اس وقت کھڑی ہو گئی
ہے حمایت کرنے ورنہ تو کیا کم دشمن ہے اس کی جان کی۔“

وہ جاتے جاتے پھر رک گئی ”ہائے صاحب جی۔ ایسا
مت کہو۔ اس کے علاوہ اب میرا کون ہے اس دنیا میں۔ لڑتی
ہوں تو خیال بھی رکھتی ہوں اس کا اور آپ کو کیا معلوم پیار
میں لڑنے سے کیا ہوتا ہے؟“

میں نے حیرانی سے کہا ”کیا ہوتا ہے؟“
”پیار بڑھتا ہے“ وہ شرمکے ہوئی ”دل صاف ہو جاتے
ہیں۔ میل کوئی نہیں رہتا اور یہ پتا چل جاتا ہے کہ کس کو کیا
بات بڑی لگتی ہے۔ کیا کرنا چاہیے کہ کیا نہیں کرنا چاہیے
ایک دوسرے کی خوشی کے لیے۔“

جب وہ چلی گئی تو کہیں نے کہا ”قسم اللہ کی پیارے یہ
چھوٹی کتنی بڑی بات کہہ گئی۔“

میں نے کہا ”وہیں خان صاحب۔ یہ دنیا ہے محبت کی
ابدی چٹائی تھی۔ ادب عشق کا بنیادی نکتہ تھا۔“
”ابنی تو آنکھیں کھول دی ہیں اس نے“ وہ نہیں
سہلانے لگا۔

”چل ٹھیک ہے۔ اب اپنی آنکھیں کھلی رکھنا۔“
”دیکھ پیارے۔ ہماری کتنی لڑائیاں ہوتی تھیں۔ کوئی
بات بڑی لگتی تھی اور ہم نے لپٹ کے گالی دی سالی کو اور اس نے
زبان چلائی تو مار دیا ایک ہاتھ۔“

”اور جواب میں اس نے لات مار کے نیچے گر ادیا یا جوتی
فائر کر دی۔ یہ بھی ہوتا ہوگا“ میں نے کہا۔

وہیں جھینپ کے ہنسنے لگا ”ہاں یار۔ ایسا بھی ہوتا تھا۔
وہ بھی سنا جی تھی کہ حرامی یاد ہے قلاں دن تو نے میرے ابا کو
بھنگ چرنے والا بھنگی کیا تھا۔ اس کے بعد پھنڈا شروع۔ کبھی
زبانی کھای تو کبھی فری اسٹاکل ہاتھ پائی۔ دے مارے
ساڑھے چار۔ چائے کا کپ بھاڑا۔ جوڑا۔ جو ہاتھ میں آیا
داغ دیا۔ ایک بار تو سالی نے نیانپ ریکارڈ رکھنا مارا تھا۔ وہ
تو کچھ کر لیا میں نے ورنہ مگر کیا تھا۔“

میں نے ہنس کے کہا ”الو کے نیچے! جواب میں نی وی
مارتا اس کے سر پر تو داغ درست ہو جاتا اس کا مگر تو بات کس
کی کر رہا ہے؟“

وہ نہیں نے ایک آہ بھری ”ابے اسی بے وفا کی۔ رس
ملائی کی۔ سالی نے اپنے ابا سے اور بھائیوں سے کتنا پڑا
تھا۔ تو نہ دیکھا تھا۔“

”گھڑی ہوئی باتوں کو یاد کر کے دکھی ہونے سے کیا
فائدہ۔ عشق میں یہ سب ہوتا ہے۔“ میں نے اسے تسلی دی
”اور عقلمندی کی وہ بات یاد رکھ کہ لڑی اور بس کے پیچھے مت
دوڑ۔ ایک نکل گئی تو دوسری آتی ہوگی۔“

”خاک آتی ہوگی۔ اپنا تو لگتا ہے عشق کا کوٹا پورا ہو گیا۔
بس اب زندگی ایسے گزرے گی جیسے ریگستان میں اٹیکے اونٹ
کی۔“

میں نے کہا ”کیا تو بوزھا ہو گیا ہے وہیں خان! بوزھوں
کا بھی دل جوان رہتا ہے۔ ایسی مایوسی کی باتیں کرنے لگا ہے
تو۔ شوق بھی سب بھلا دیے ہیں تو نے۔ مدت سے کوئی بازی
نہیں چیتی۔ کہاں گئے تیرے عمران خان اور وہیم اکرم۔“

اس نے ایک اور ٹھنڈی سانس لی ”جج کتا ہے تو۔ پتا
نہیں کیوں اپنا دل اجاٹ ہو گیا ہے پیارے۔ سیاست
چھوڑ دی۔ مدت سے مرغ بازی کا مکر کہ نہیں ہوا۔ کسی سے
عشق نہیں ہوا۔ سب نفیب کے کھیل ہیں۔ رس ملائی ایک
طوائی سے شادی کر کے دینی چلی گئی پھر کسی لی نہیں۔ عمران
خان کھلانے لائق کوئی مرنا نہیں ملا۔“

میں نے کہا ”تجھ پر رقت طاری ہو رہی ہے۔ بہت جلد تو
روئے لگے گا۔“

”اچھا!“ جھنم نے اندر آ کے کہا ”میں نے کبھی وہیں کو
روئے نہیں دیکھا۔“
وہیں جھینپ کے ہنسا ”دیکھ لیتا گھر ٹھٹھٹ اٹھا کے اپنی
رخصتی کے وقت۔“

اب جھنم جھینپی مگر اس نے بڑی صفائی سے بات کو ٹال
دیا۔ سوئی اس کے ساتھ ہی آئی تھی اور خاصی پڑ سکون نظر
آ رہی تھی۔ ”آرام سے بیٹھ جاؤ۔ اب خطرے کی کوئی بات
نہیں۔“

وہیں نے کہا ”تنا ہے تو ذرے چوبی کی طرح ڈبک گئی
تھی؟“

سوئی نے تیز ہو کے کہا ”یہ کون حرامی کتا ہے۔“
میں نے صورتِ حال کو سنبھالنے کے لیے کہا ”جھنم
ذر نہیں لگا تھا؟“

”ذر لگتا ہے مجھے پولیس سے اور کسی سے نہیں۔“
اس نے رانی عادت کے مطابق گالی کی ”چھ مینے جس ڈاکو
کے ساتھ تھی میں کوب۔ بھی بس پولیس سے ہی ذرا تھا۔“

جھنم نے کہا ”سوئی خدا کے لیے۔“
وہیں دباؤ ”ارے اس پر کوئی اثر نہیں ہو گا۔ واسطے
دینے کی ضرورت نہیں۔ قسم اللہ کی“ اب اس نے گالی کی تو
ایسا جھانپڑا مڑاں گا کہ دانت باہر آجائیں گے۔“

”کیا۔؟ تم مارو گے مجھے؟“ سوئی کا رنگ فق ہو گیا۔
”ہاں۔ یہ آخری بار کہہ رہا ہوں کہ شریفوں کی زبان
میں بات کرنا سکھ لے۔ ورنہ دفع ہو جا یہاں سے۔“

”چل جاؤں گی“ سوئی کی آواز گھوگر ہو گئی ”اندازہ ہو گیا
ہے مجھے کہ کتنا دم ہے تم میں۔ دعوے تو بہت کیے تھے۔ دو
دن میں حوصلہ جواب دے گیا۔“

میں نے کہا ”دیکھو سوئی۔ وہیں کا یہ مطلب نہیں
تھا۔“

”اور کیا مطلب تھا؟ یہاں رو کے مار کھاؤں گی میں“ وہ
روئے لگی۔

”ہاں جب تک مار نہیں پڑے گی تجھے تو سدھرے گی
نہیں اور جانے کی کیا دھمکی دیتی ہے۔ پولیس کے نام سے دم
لٹکا ہے تیرا۔ باہر پولیس سب سے پہلے استقبال کرے گی
تیرا۔“

میں نے کہا ”کیو اس بند کر اپنی۔ سوئی ہمارے ساتھ
رہے گی۔ یہ لاکھ جانے کی بات کرے“ جانے کون دے گا
اسے۔“

جھنم نے اسے قریب کر کے اس کے آنسو پونچھے ”مت
رو سوئی۔ یہ وہیں تو ایسے ہی بکارتا ہے۔ کس کی مجال ہے
جو تیری طرف انگلی بھی اٹھائے۔“

وہیں اپنی بات پر اڑا رہا ”مگر اس نے پھر گالی دی تو
میں بھی وہیں خان نہیں“ اگر اس کے جھانپڑنا مارا۔“

جنم نے کہا "نہیں کے گی یہ گالی۔"
سونی نے آنسو پونچھ کے کہا "باجی، پہلے اس سے کوکھ
خود تو گالی بکنا چھوڑ دے۔ مرد ہے تو سمجھتا ہے عورت پر ہاتھ
اٹھا سکتا ہے۔ قسم خدا کی میں بھی منہ توڑوں گی بیچ مار سکے۔
اتنے کمزور ہاتھ نہیں ہیں میرے۔"
سونی کی بات نے مجھے اور جنم کو جتنا حیران کیا اس سے
زیادہ رئیس کو خفت میں مبتلا کر دیا "میں کب گالی بکنا ہوں"
خواہ خواہ۔

"اور یہ کیا ہے۔ سالار حرامی! الو کا پٹا۔ حرام زادہ۔
سوڑ کا بچہ۔ یہ گالیاں نہیں ہیں تو کیا خاندانی نام ہیں تیرے۔
خطابات ہیں؟"

سونی آتش فشاں نظروں سے رئیس کو دیکھ رہی تھی۔
مجھے اور جنم کو رئیس کی حالت پر بے اختیار ہنسی آئی۔ اس
کے پاس سونی کے الزامات کو رد کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں
تھا۔ صرف رئیس ہی نہیں "میں بھی عام منگتوں میں ان الفاظ کا
استعمال بے تکلفی سے کرتا تھا۔ ہمارے نزدیک یہ گالیاں ہی
نہیں تھیں۔ اس کو شرفاء ادبی یا شائستہ زبان بھی نہیں کہا
جاسکتا۔ یہ الفاظ غیر لسانی ضرور تھے مگر خوش یا ناقابل
اشاعت نہیں سمجھے جاتے تھے جبکہ سونی کی زبان پر بے اختیار
آجانے والی گالیاں سو فیصد مروانہ اور شرمناک حد تک
مندی تھیں۔

بات ختم کرنے کے لیے میں نے کہا "اوکے اوکے
گالی کوئی نہیں بکے گا۔ ختم کرو یہ جھگڑا۔ نہ تم سونی اور نہ تم
رئیس خان!"

"اے یار ہم تو مرد ہیں" رئیس نے احتجاج کیا۔
"مرد ہونے کا مطلب ہے تمہیں لائسنس حاصل ہو گیا
ہے ہر بد معاشی کا" سونی بھڑکنے لگی "مجھ پر نہیں چلے گی تیری
دھونس۔"
"یہی تو گالیاں بکے گی۔ دیکھتا ہوں میں بھی" رئیس بھر
طیش میں اٹھیا۔
"کیا دیکھے گاؤ۔ ابھی دیکھ لے سامنے آکے" سونی کھڑی
ہو گئی "ہاتھ میں ریو اور یا کٹا شگوف ہو تو سب ہی ہمارے اور
زور آور بن جاتے ہیں۔" آمار مجھے جھانپتا اور پھر دیکھ میں کیا
حال کرتی ہوں تیرا۔"

رئیس کی حالت غیر ہو گئی۔ اسے ہرگز امید نہ تھی کہ
مردہ حال اس حد تک بگڑ جائے گی۔ اب وہ بڑی مشکل میں
پھنس گیا تھا۔ ایک لڑکی نے اسے چیلنج کر دیا تھا اور اس کے
تیور بڑے خطرناک تھے اس کے اعتماد نے رئیس خان کو

مقابلے پر آنے سے پہلے ہی پریشانی میں مبتلا کر دیا تھا۔ خود مجھے
صاف نظر آ رہا تھا کہ مرغوں کو لڑاکے جیت کا جشن منانے
والا اور ایسے کی طاقت پر بد معاشی کا کاروبار چلانے والا
رئیس اخلاقی طور پر تو مار کھائی چکا ہے جسٹانی طور پر بھی
ایک ذلت آمیز شکست کا تماشا اس کا مقدر ہو گیا تھا۔ مقابلے
سے انکار بھی اعتراف شکست کے مترادف سمجھا جاتا چنانچہ
اس نے وہی کیا جو ہر مرد اپنی کمزوری کا بھرم رکھنے کے لیے
کرتا۔

اس نے حقارت سے کہا "کیا؟ میں مقابلہ کروں تجھ
سے؟ ایک عورت سے۔ کوئی مرد ہو تا تو میں دیکھتا۔"

"ارے چھوڑو ہمارے مت بٹا۔"
رئیس نے میری طرف امداد و غلب نظروں سے دیکھا
"یار تو ہی سمجھا اسے۔ یہ کوئی شریف عورتوں کے ڈھنگ
ہیں۔"

"بڑا آیا شریف زادہ۔ مجھے کیا پتا نہیں کہ ساری عمر
تو نے کیسی شرافت کی زندگی گزار دی ہے۔ تیرے سب
دھندے جاتی ہوں میں۔ چکر بازی اور بد معاشی کے علاوہ آج
تک کچھ کیا ہے تو نے؟"

جنم نے اسے ڈانٹا "سونی! بس کرو۔ کیا ہو گیا ہے
تمہیں۔ جو تم میں تیا کتی جاری ہو چلو بیٹھو اور۔"

سونی بیٹھ گئی مگر اس کی شعلہ بار نظرس رئیس پر جمی
رہیں "باجی! میں نے سب بتا دیا تھا اپنے بارے میں۔ میں نے
کوئی شرافت کی زندگی نہیں گزاری۔"

"چلو چھوڑو برائی باتیں" جنم نے کہا۔
"میں شرافت سے رہتا ہو گا تجھے" رئیس اسے گھورتا
رہا۔

"صرف مجھے کیوں" اپنی داد گیری مت چلا مجھ پر۔ پہلے
خود شریف بن کے دکھا" سونی نے بیچ کے کہا۔

میں نے رئیس کے ہاتھ مارنے کی کوشش کی "بند کرتا
ہے اپنی بکواس یا نہیں۔"
رئیس خود کو بچا کے ہنسنے لگا "اے یار سب کے سامنے
بے عزتی خراب کردی اس نے۔ قسم اللہ کی دو کوڑی کا
کر دیا۔"

میں نے کہا "تو مانتا ہے؟"
جنم بھی ہنسنے لگی "نہیں مانے گا تو سونی منوالے کی خود
ہی۔ کسی خوش فہمی میں مبتلا مت رہنا۔"
رئیس نے ہاتھ جوڑے "خوش فہمی کیسی میری ماں۔ وہ
تو شکر ہے اللہ کا کہ تم دونوں ہی تھے یہاں۔ سب کے سامنے

رئیس خان کی عزت تو مل جاتی خاک میں۔ ناک کھنے سے بیچ
گئی سرعام۔"

"ناک تو خیر کٹ گئی مگر چشم دید گواہ بس ہم دونوں ہیں۔
ہم نہیں بتائیں گے کسی کو بھی" جنم چائے بنا لے گئی۔

"ضرورت پڑنے پر ایک میل کر سکتے ہیں ہم تجھے" میں
نے کہا "زیادہ اکثر فوں دکھائی کبھی تو ہم سونی کا نام لے کر
ڈرائیں گے تجھے۔"

"مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے میں سانپ ہوں اور تیرے
ہاتھ لگ گیا ہے نیلا۔ مداری کے بیچے۔ تو تمنا شاید کیٹنا چاہتا
ہے ہمیں لڑاکے۔"

سونی کے لیوں پر کچھ شرمساری مسکراہٹ آگئی "ایسے
کون برا سکتا ہے ہمیں۔ لڑنا ہو گا تو ہم اپنی مرضی سے لڑیں
گے۔"

رئیس خوش ہو گیا "اور نہیں لڑنا ہو گا تو بالکل نہیں
لڑیں گے۔"

"مفتد کچھ تیز ہے میرا" مجھے معلوم ہے جیسے زبان پر
قابو نہیں لیکن میں آہستہ آہستہ اپنی بڑی عادتیں چھوڑوں
گی" وہ نظر جھکا کے بولی۔

چائے پیتے ہوئے میں نے جنم کو بتایا کہ ہم نے جھپٹ پر
سے کیا دیکھا تھا اور کیا سنا تھا۔

جنم سوچ میں پڑ گئی "تم نے گاڑی کو چیک کیا؟"
"ابھی کر لیں گے لیکن شک کی بات کوئی نہیں۔ وہ کہہ
گئے ہیں کہ کسی اچھے تالا کھولنے والے کو ساتھ لے کر چلو
آئیں گے۔"

"کب آئیں گے؟"
"میرا خیال ہے تم فون کر کے ملک رب نواز سے ٹائم
پوچھ لو" میں نے کہا۔

"میرا مطلب تھا کہ۔۔۔ دن میں کوئی کسی کے گھر میں تالا
توڑ کے گھس جائے" ایسا بھی اندھہر نہیں ہے اور ایسے تالے
توڑنے کا کوئی مقصد بھی ہونا چاہیے۔ چلو مانا! انہوں نے
سنگل کی مدد سے اس گاڑی کا سراغ لگایا جو ایک خاص مقصد
کے تحت مجھے دی گئی تھی۔ انہیں معلوم ہو گیا کہ گاڑی یہاں
موجود ہے۔ کیا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ میں بھی یہاں
موجود ہوں؟ ہرگز نہیں۔ جو معلومات انہوں نے حاصل
کیں وہ گمراہ کن تھیں۔ انہیں یہ پتا چلا کہ شر کے پیچھے
ایک پرچوں کی دکان تھی جو مدت سے بند پڑی ہے۔ یہ کسی گھر
میں داخلے کا راستہ نہیں ہے۔ وہ کیسے فرض کر سکتے ہیں کہ میں
بھی گاڑی میں اس شر کے پیچھے بند ہوں۔ کیا میری بات

تمہاری سمجھ میں آ رہی ہے؟"
"بالکل آ رہی ہے" میں نے سعادت مندی سے کہا۔

"اگر ملک صاحب کا مقصد میرا اغوا ہوتا تو یہ نیک کام وہ
ہر وقت ہر جگہ کر سکتے ہیں۔ میں کوئی بکتر بند گاڑی میں نہیں
پھرتی اور نہ میرے آگے پیچھے کوئی توپ خانہ چلتا ہے۔ ان
کے پاس اغوا کے ماہرین بھی ہوں گے۔ وہ مجھے کیا چڑھا کرے
باجی کو اغوا کر کے لے جاسکتے ہیں۔"

"وہ میرا پاکستان کو اغوا کر سکتے ہیں" میں نے کہا۔
"اگر کار پر آمد کرنی ہوئی تو وہ کار مجھے دیتے ہی کیوں؟

اور اگر مقصد مجھ پر چوری کا الزام عائد کرنا ہو تا تو رات کے
وقت چوروں کے اس ٹالاقی ٹولے کو کیوں بھیجا جاتا۔ وہ
پولیس اور مجسٹریٹ کے ساتھ دن دہائے دہائے ہوئے
آتے کہ برآمد کر لیں یہاں سے وہ گاڑی جس کی چوری کی
رپورٹ میں لکھوا چکا ہوں۔ نو سر ملک رب نواز کچھ اور
چاہتا ہے۔"

"مثلاً تم سے اگلا رحمت۔ یا عقد مسنون؟"
"بکومت۔ اس نے پہلے بندوبست کیا ہمارا پتا ٹھکانا
معلوم کرنے کا۔ اب ماہرین اسے رپورٹ دیں گے کہ سرچی
گاڑی تو مل گئی مگر ایک دکان میں کھڑی ہے۔ شکر کرے ہوئے
ہیں اور ہم نے پتا کر لیا ہے" وہ پرچوں کی دکان عرصے سے بند
پڑی ہے۔ رب نواز ان احمقوں کی سراغ دہی پر انہیں
شکایت نہیں دے گا۔ وہ کہے گا کہ تم سب گدھے ہو۔"

"ممکن ہے سزا کے طور پر انہیں اعطیل میں گھوڑوں
کے ساتھ باندھ دے اور گلے میں توپا لٹکا دے۔" رئیس
بولا۔

"رب نواز دل ہی دل میں ہماری چالاکی پر مسکرائے گا۔
وہ سمجھ جائے گا کہ شہزادی دکان در حقیقت چور دروازہ ہے جو
ہم سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر آنے جانے کے لیے
استعمال کرتے ہیں۔ اب وہ اپنی کمائو فورس کو روانہ کرے
گا۔ ممکن ہے ان کی قیادت وہ بظلم خود فرمائے اور آج رات
وہ شر کھول کے چور راستے سے اندر پہنچ جائیں۔"

میں نے کہا "تم نے دلائل سے ہمیں قائل کیا مگر عزیزہ
ان کی تحریف آوری کا مقصد ابھی تک واضح نہیں۔"

"میرا شک ایک ہی چیز کی طرف جاتا ہے۔"

میں نے سونی کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ نرمس ہو گئی تھی۔

"سونی کوئی چیز نہیں ہے" جنم نے وضاحت کی "ابھی تو
ملک رب نواز کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں کہ جائے واردات
سے سونی بھوسے بن کے کہاں غائب ہو گئی۔"

☆ 153 ☆ ساتواں حصہ
مداری

”جتنی بن کر“ میں نے صبح کی۔
”فیکا تو مار گیا لیکن ان کی بس کو آگ لگا کے تباہ کرنے والی اور ان کے لاکھوں کے مال کو جلا کر خاک کرنے والی نیکی کی سالی جنگل میں روپوش ہو گئی تھی۔ پولیس نے جنگل کا محاصرہ کر کے چپا چپا چھان مارا ہو گا اور ملک کی بڑی خواہش ہو گی کہ سونی ہاتھ لگ جائے تو۔ خیر سب اندازہ کر سکتے ہیں کہ ملک اسے کیا سزا دے گا مگر ہمارے جیتے جی یہ ناممکن ہے۔“

”رائٹ۔ بالفرض محال وہ اچانک یہاں پہنچ جاتا ہے ہاتھ میں توپ اٹھائے تو میں اس کا راستہ روک کے اسے لٹکا دوں گا۔ اوسے سونی تک پہنچنے کے لیے مجھے میری لاش پر سے گزرنا ہو گا۔“ میں نے کہا۔

”اے کام سے کام رکھ۔ یہ ڈانٹنا لگ مجھے بولنا ہے۔“ رئیس نے کہا۔
”مگر ختم کا خیال ہے کہ یہاں وہ سونی کے لیے نہیں آ رہا ہے۔“ میں نے کہا۔

”ختم نے کہا“ خیال نہیں یقین ہے میرا۔ ابھی تک ایک چیز کی طرف دھیان نہیں گیا کسی کا جس کی ملک رب نواز کو تلاش ہے اور وہ چیز ہمارے پاس کب سے ہے کار پڑی ہے۔ ہم نے اس کی قدر قیمت کا اندازہ کرنے کی کبھی سنجیدگی سے کوشش بھی نہیں کی۔“

میں نے چٹکی بھائی ”وہ نموس مورتی کا سر۔“
”رائٹ۔ ملک اسے لاکھوں کا نقصان قرار دیتا ہے مگر ممکن ہے اصل نقصان اس سے کہیں زیادہ ہو۔ اس کی وجہ سے خادم مرزا اور خالد عثمان نے اپنی جان گنوائی جو ملک رب نواز کے خاص آدمی تھے مگر اس مورتی کے سر کی اہمیت اتنی زیادہ تھی کہ ملک نے ان کی کو تابی کو معاف نہیں کیا۔“

”کیا پتا انہوں نے جانتے ہو جیتے ملک سے کسی پرانی رنجش کا بدلہ چکایا ہو۔“ میں نے کہا۔

”وجہ کچھ بھی ہو“ خادم مرزا کا یہ جرم ناقابل معافی سمجھا گیا۔ اسے بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اس کے ٹھکانے کے احکامات جاری کر دیے گئے ہیں۔ وہ روپوش ہوا اور پھر اس نے چوری چھپے ہم سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ اسے قتل کرنے پر مامور لوگوں میں یقیناً خالد عثمان شامل تھا مگر نہ جانے کیوں وہ خادم مرزا کی لاش پر یہ مورتی کا سر پھینک گئے تھے۔“

”ہاں۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔“
”کیا پتا اس کو وہ نقلی کچھے ہوں۔ خادم مرزا نے اصل غائب کرنے کے لیے کوئی عملی بنوائی ہو۔ اس کام میں وہ ماہر

ہیں۔“
میں نے کہا ”وہ خود ماہر نہیں ہیں“ انہیں جعلی نوادرات اور نقلی چیزیں تیار کرنے والے ماہرین کی خدمات حاصل ہیں۔“
”غالباً خادم مرزا کو اصل کی جگہ نقل رکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس کے قاتل غلط فہمی کے باعث اصل کو نقل سمجھ کے پھینک گئے۔ وہ چیز اتفاق سے ہمارے ہاتھ لگ گئی۔“

میں نے کہا ”ہاں۔ کچھ دیر بعد جب انہوں نے محسوس کیا کہ خادم مرزا کی لاش کو بھی غائب کر دینا چاہیے تو وہ واپس آئے مگر اس وقت تک میں نے مورتی کے سر کو چھپا دیا تھا۔ انہوں نے اسے کوئی خاص اہمیت بھی نہیں دی تھی اور لاش اٹھا کے لے گئے تھے۔ غلطی کا احساس تو انہیں بعد میں ہوا ہو گا۔ اس کا فیاضہ خادم مرزا کے بعد خالد عثمان نے بھگتا اور بالآخر قتل لے لے۔ اس نے بھی سزائے موت سے بچنے کے لیے ہماری پناہ میں آنے کی کوشش کی تھی مگر اس وقت تک بہت دیر ہو گئی تھی۔ ملک نے اس کی پوری کو اغوا کر لیا تھا۔ پہلے وہ رب نواز کے غائب کا شکار ہوئی۔“

سونی نے اچانک کہا ”اسے ملکائی نے قتل کر لیا تھا کیونکہ۔“

”ہاں۔ یہ بتایا تھا تم نے۔ باپ کے بعد وہ بیٹے کو پسند آگئی تھی۔ شوہر کی حد تک ملکائی نے سب برداشت کیا مگر یہ اس کے لیے ناقابل برداشت بات تھی کہ شوہر کی داشت بن کے رہنے والی۔“

”ختم نے مجھے ٹوکا“ اب چھوڑو پر عمل باتیں۔ کم سے کم سونی کا ہی خیال کرو۔“

سونی نے آہستہ سے کہا ”نہیں باجی۔ جو حقیقت ہے وہ مجھے۔“

رئیس نے کہا ”اے بارہا بات مختصر کرو۔ ختم نے ٹھیک کہا ہے۔ ملک اس مورتی کے سر کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اسے یہ معلوم ہے کہ وہ چیز ختم کے پاس ہے اور اگر اس کے پاس نہیں ہے تو اسے معلوم ضرور ہے کہ مورتی کا سر کہاں ہے؟ ختم نے اس سے بات کی تھی کہ وہ سودا کر سکتی ہے لیکن کسی وجہ سے بات بنی نہیں اور ملک نے اسے آدمی ختم کے پیچھے لگا دیے۔ اسے ایک بار اغوا بھی کیا گیا“ باعث طریقی سے مگر ہم اسے فیکے کی مدد سے نکال لائے۔ یہ فیکے کی بغاوت تھی۔“

”ہاں۔ ملک رب نواز سے معافی حاصل کرنے میں

ٹاکا کی کے بعد اس کے پاس کوئی راستہ باقی نہیں بچا تھا۔ اس نے ہماری مدد کی اور ہمارے ساتھ ہو گیا۔ صرف تحفظ حاصل کرنے کے لیے۔ اسے یقین تھا کہ ملک جیسے خطرناک اور طاقتور دشمن سے ہم ہی اسے بچا سکتے ہیں لیکن وہ جلد باز اور بے وقوف آدمی تھا۔“ ختم نے کہا۔

سونی نے کہا ”یہی کے قتل پر اس کے لیے جذبات قابو رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔“

میں نے کہا ”اغوا کی کوشش میں ٹاکا کی سے ملک حوصلہ ہارنے والا آدمی نہیں تھا مگر اس کے بعد ختم غائب ہو گئی۔ کم سے کم ملک نے ایسا ہی سمجھا ہو گا۔ اس نے اخبار کے دفتر جانا چھوڑ دیا پھر ایک طرح سے ملازمت کو ہی خیرباد کہہ دیا۔ ٹوکا اپنا قتل پر قرار رکھا۔ ختم نے آزاد صاحب کے گھر میں رہائش بھی ترک کر دی۔ اس کے بعد ملک کو خود ختم نے فون کیا اور اس سے ملنے گئی اور جو باتیں ہوئیں اس کے بعد ملک کے لیے شک کی کوئی بات نہیں رہی کہ ختم کا ان لوگوں سے قریبی رابطہ ہے جن کے پاس وہ مورتی کا سر ہے۔“

”ختم یہ بھی واضح کر چکی ہے اس پر کہ اسے ملک صاحب کے غیر قانونی اور وطن دشمن کاروبار کے بارے میں سب معلوم ہو گیا ہے۔“ میں نے کہا۔

رئیس بولا ”پھر پتا رہے۔ وہ یہاں مورتی کے سر کے لیے نہیں آ رہا ہے۔ اسے چاہیے ختم ختم اسے مورتی کا سر واپس دلانے شرافت سے۔“

”شرافت! یہ شرافت کون ہے؟“ میں نے خرا کے ختم کو دیکھا۔

رئیس ہنسا ”ہم سب ہیں تا شرافت کے پستل ملک صاحب کو یقین ہو گا کہ اب ختم انہی کے ساتھ ہے جن کے پاس مورتی کا سر ہے۔“

”اور یہ بات غلط بھی نہیں“ ختم بولی۔

میں نے کہا ”اس خیال کو غلط ثابت کرنے کے لیے ہم کیا کر سکتے ہیں۔“

سونی نے اپنی زبان کھولی ”ہمیں کچھ کرنا چاہیے۔ باتوں کے علاوہ کچھ۔ ورنہ وقت گزر جائے گا۔“

”ختم اچھ کھڑی ہوئی“ پہلے میں گاڑی کو چیک کر لوں۔“
میں نے پوچھا ”کبھی کھول کے دیکھا ہے کہ گاڑی میں انجن آگے سے پانچھ۔“

”غاف کو ناکہ تم بے وقوف ہو۔ تمہیں کیا پتا چلے گا۔ میں ہوں عقل کل ہر معاملے میں“ ختم بگڑے ہوئی۔

چاہتا تھا۔“
”تم ہمارے مرد ای کیلیکس میں جلا جتے ہو ہر وقت“ بریج۔ ساری عمر“ پیشہ“ رتوں کو UNDERESTIMATE کر کے خوش رہنا چاہتے ہو۔“
میں نے کہا ”اچھا“ میں کچھ نہیں کہوں گا۔ یوں گا بھی نہیں۔ بس دیکھتا رہوں گا کہ تم عقل کی جگہ بھوسا کیسے استعمال کرتی ہو۔“

”ختم چراغ پا ہو گئی“ بھوسا بھرا ہوا ہے میرے دماغ میں۔ یہ کہہ رہے ہو تم؟“

میں نے مزید انکساری سے کام لیا ”مجھے کچھ کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ جو ہے سو مناجاب اللہ ہے۔“
”اے اب تمہاری بہ بک شروع ہو گئی۔ جلدی سے جا کے دیکھ آؤ کہ ملک نے کیا حرا می کیا ہے پھر ہم بتاتے ہیں تمہیں اپنا پلان۔ قسم اللہ کی پیارے“ آج ثابت ہو جائے گا کہ اپنے دماغ میں بھوسا نہیں ہے۔“

میں نے ختم کے ساتھ جاتے جاتے کہا۔ ”سونی تم ذرا کچن میں جا کے دیکھو وہ کھلی جھون کیا کر رہے ہیں۔ ناشتے کی تیاری کر رہے ہیں یا انتہائی زود کشی کی۔“

”ختم نے گیلراج کے کپ اندھیرے میں لائٹ کا سوچج آن کرنے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ اسی وقت میرا ہاتھ بھی سوچج کی طرف گیا اور ہوا یوں کہ ختم کا ہاتھ میرے ہاتھ میں آ گیا۔“

اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی ”یہ کیا کر رہے ہو؟“

میں نے کہا ”ترا ہاتھ ہاتھ میں آ گیا کہ چراغ راہ میں جل گئے۔ مجھے سہل ہو گئیں منزل میں کہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے۔“

وہ ہنسی ”اتارو مینٹک موڑ کیسے ہو گیا اچانک؟“
میں نے لائٹ جلادی ”ختم مجھے تمہاری طرف سے بڑی غمراہی ہو گئی ہے۔ تم نے ملک رب نواز کے خلاف محاذ آرائی میں خود کو بہت EXPOSE کر لیا ہے۔ وہ ایک خطرناک اور کینہ دشمن ہے اور تم اس کا ڈائریکٹ ٹارگٹ بن گئی ہو۔“

اس نے ہاتھ ڈال کے گاڑی کا بونٹ کھینچا۔
”فکر کی کون سی بات ہے اس میں۔ تم جو میرے ساتھ ہو۔“
”مگر میں سامنے نہیں ہوں۔ ہم سب پیچھے ہیں۔ پیچھے ہوئے ہیں اور مجھے اس پر شرم آتی ہے“ میں نے کہا۔
”ختم نے انجن کے اندر جھانکتے ہوئے کہا ”سب کو ایک

جنہ نے وہ چیز تاشے کی میز پر رکھ دی "یہ ہے خاموشی
 سے بولنے والی بجلی کی چڑیا۔ اس نے چار ہمارا۔"
 رئیس نے اسے دلچسپی سے دیکھا "بڑی آسانی سے
 پکڑ لیا تم نے۔"

”آج دو سب باتیں بڑی عجیب لگتی ہیں۔ اپنا تو وہ حال ہے پیارے کہ کہنے کی دُم سمجھ لے۔ جب تکہ نکل میں ہے، سیدھی دوند بھڑوی۔ پہلے تو اپنے ساتھ تھا تو تیرے پیچھے پیچھے ہم بھی سیدھے راستے پر چلتے رہتے تھے پھر ہوا اور تیرا ساتھ پھوٹ گیا تو اپنی چل پڑے پرانے بد معاشی کے راستے پر۔ پڑھا لکھا ہوا تو شاید کچھ اور کرتے مگر تجربہ جوانی سب ایسے ہی آوارہ گردی میں گمزدگئی۔ ایک پنڈال چوکڑی تھی اپنی۔ کیسے کیسے باکمال لوگ تھے اس میں۔ اب ایک جبر الیڈز رو گیا ہے۔ بعد میں اپنے بھندے وہی رہے مگر ہم بڑے بد معاش بن گئے اور اپنا ایک گردہ بنالیا۔ سارے شہر میں دہشت تھی۔ ہمیں کے نام کی اور جی بات ہے پیارے۔ دہشت نام کی نہیں، طاقت کی ہوتی ہے۔ اپنی طاقت تھی کھا شکوف اور ہمارے ہاتھ میں کھا شکوف تھمانے والوں نے جھپکی دے کے کھا تھا کہ جاؤ بیٹا! سات خون معاف ہیں تمہیں۔ کوئی گولی مار دے تمہیں تو اور بات ہے مگر قانون کے ہاتھ تم تک نہیں پہنچ سکتے۔ سناخوں کے پیچھے جو ہیں سمجھنے بھی نہیں گراؤ گے تم اور جو تھانے دار ایسی غلطی کرے گا اس کا چالوہ تمہاری

خجمن نے کہا "اور یہ جو دو گاڑیاں گیراج میں کھڑی ہیں؟"

کی تعمیر میں کسی ڈیزائنر کے مشورے سے زیادہ ریس خان کے اپنی پسند اور خواہش کو اہمیت دی تھی جتنا پتہ چلی ہوئے کے باوجود یہ کوئی جدید طرز رہائش کا کوئی کلاسیکی نمونہ نہیں تھی۔ اس نے عمارت کو مختلف خانوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ یہ خانہ ریس میں ریس، اور میں نے اپنے سیاسی حریفوں اور حلیفوں سے دوپہر کی عرصہ گزارا دیا تھا۔ تین کشادہ کمروں پر مشتمل تھا۔ ان میں سے دو بڑے روم کے طور پر استعمال کیے جاتے تھے۔

حیثیت حاصل تھی۔ ہر کمرے کو استعمال کی ضرورت کے مطابق فرش کیا گیا تھا اور آرام و آسائش کے سارے لوازمات کی موجودگی میں یہ احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ ہم زمین کے نیچے کسی خانے میں چھپ کر رہے ہیں۔

اگر آج بھی وہیں سے کام لیا جاتا تو ہمیں خانہ پانچ بیڑے دو، ڈرائنگ ڈائننگ اور لاونج والی ماڈرن کونویں کا روپ اختیار کر سکتا تھا۔ اس کی تعمیر میں خرابی نہیں تھی۔ رہنما خان کی رہائش کے انداز میں وہی بنے رہیں اور پریشان حالی تھی جو اس کی زندگی میں نظر آتی تھی۔ اسے اور گھر کو سنبھالنے کے لیے کسی گھروالی کے سکھانے، سینے اور انتظامی کنٹرول کی ضرورت تھی۔

خانے میں گزرا ہوا تمام وقت ہمارے ذہن اور اعصاب پر قید تھانی اور جلاوطنی کے احساس کی طرح سوار رہتا تھا۔ ہم دوست احباب، سوسائٹی، اور شناسائی کے سارے رشتوں سے کٹ کر رہ گئے تھے۔ شہر میں وہ کے بھی شہر سے دور تھے اور گمنا کی نقاب اندازہ کر بھی ڈرتے تھے کہ کہیں کوئی ہمیں پہچان نہ لے۔ زندگی کا یہ چلن ابھی جاری تھا لیکن خانے سے اوپر کی دنیا میں زندہ انسانوں کا سطح پر آگے ایک نفسیاتی اطمینان ضرور حاصل ہو سکتا تھا کہ اب ہم قبر جتنی گمراہی میں مردوں کی سطح پر نہیں ہیں۔

رہیں نے یہ فیصلہ کرنے کے بعد کہ اب ہم رہیں خانے میں رہیں گے، ہمیں مارخان اور چھوٹی کو طلب کیا۔ چھوٹی بالکل حادثاتی طور پر اس گھر میں آئی تھی پھر بڑی ہو شکاری سے اس نے پہلے ہمیں مارخان کے دل پر اور اس کی زندگی پر اختیار حاصل کیا پھر امور خانہ داری سنبھالا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے تمام معاملات اپنے مکمل کنٹرول میں کر لیے خواہ ان کا تعلق ہمیں مارخان کے دلی جذبات سے ہو یا اس گھر کے انتظامی مسائل سے۔ وہ صرف ہمیں مارخان کے لیے ہی نہیں، ہم سب کے لیے بھی ناگزیر اور اہم ہو گئی۔ دراصل پریشان کن حد تک باوقوفی، ہلاک اور فتنہ پرور نظر آنے والی اس مختصر عورت کے اندر تعمیر کی بحرور و توانائی رکھنے والی ایک مکمل عورت پوشیدہ تھی۔ وہ عورت جو مرد کی ساری زندگی اور کائنات کو بنانے سنوارنے اور سنبھالنے کی خدا داد صلاحیتوں سے مالا مال ہوتی ہے، جو کبھی ماں کے دوسرے پر فائز نظر آتی ہے تو کبھی شریک حیات کے روپ میں دکھائی دیتی ہے اور جس کے بارے میں نام نہان گواہی دیتی ہے کہ ہر مرد کی کامیابی کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔

دورے میں خود کشی پر آمادہ تھا تو چھوٹی نے جس طرح اسے جذباتی سارا دیا تھا اس نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ اچانک وہ ایک لڑاکا محبوبہ سے محافظ ٹھگرا رہی تھی اور اس نے ایک طرف ہمیں احساس دلایا تھا کہ ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تو دوسری طرف ہمیں مارخان کو بھی لٹا دیا تھا کہ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔

ہمیں مارخان سامنے آیا تو بالکل نارمل اور ٹھیک تھا۔ چھوٹی نے اس کے اچھے بوجانے والے کل پرزے ٹائٹ کر دیے تھے۔ کچھ دیر پہلے آئسوہانے والے ہمیں مارخان کی موجودگی کے نیچے سے مسکراہٹ چھوٹی پڑی تھی۔ رہیں نے اسے ایک لکھا لکھا جوتا جس میں رہیں خانے کی از سر نو آباد کاری کے بارے میں ہدایات شامل تھیں۔ ہمیں مارخان پرانی عادت کے مطابق مونچھیں موڑنا اور کھینچنا تھا۔

”اب بات، یعنی سمجھ میں آ؟“ رہیں نے بالآخر چر کے کہا۔ ہمیں مارخان نے گھرے جیسا سہلایا ”نہیں صاب“ ام کچھ نہیں سنتی۔“

”کیا؟ یعنی میں اتنی دیر سے بھونک رہا تھا“ رہیں مجھ گیا۔

چھوٹی نے کہا ”میں نے سب من لیا ہے صاحب جی۔ آپ نے جیسا کہا ویسا ہی ہوگا۔“

”مگر یہ کیا کان میں روٹی ڈالے کھڑا تھا؟“ رہیں نے کہا۔ ”صاحب جی۔ میں نے اسے سمجھا دیا ہے۔ آج سے یہ صرف باہر کا کام کرے گا۔ اندر کے سارے کام کھلے آپ مجھ سے کہو گے ابھی جو کچھ آپ نے کہا اس میں اس کے سننے کی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ اس کے کام کی بات ہوگی تو میں من کے کیا کروں گی۔ جب مجھے کچھ کرنا ہی نہیں۔“

رہیں شاید اور بڑا ٹکڑا میں نے اسے روک دیا ”چلو یہ تقسیم کار ہوگی ہے قسمت اچھا ہے ہم خیال رکھیں گے۔“

چھوٹی نے کچھ ہنسی کے کہا ”دوست دراصل۔ کپڑے۔“ رہیں نے کچھ گھمراہ کر دیا ”تم بھی حد کرتی ہو۔ کپڑے کہاں ہیں اس کے پاس؟ تم تو سوٹ کیس بھر کے لے آئی تھیں۔“

سونی گھبراہٹ ”وہ ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھے زیادہ شوق نہیں ہے ان چیزوں کا۔ باقی ابھی تو بدلے ہیں میں نے کپڑے۔“

”اچھا“ ایسے چلنا ہے تو پھر اٹھو۔“ جنم نے کہا۔

”نہیں۔ میں کیس جانا نہیں چاہتی۔ میں گھر میں ہی رہوں گی۔ کچھ کام کرواؤں گی، آپ جاؤ“ سونی نے کہا۔

جنم نے یوں کندھے ہلائے جیسے کہہ رہی ہو کہ ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔ ہمیں مارخان نے من میٹ کا لاک کھول دیا تھا۔ وہ سائنڈ والے چھوٹے میٹ سے باہر نکل گئی۔ رہیں نے چھوٹی کو صفائی ستھرائی، ترتیب و آرائش اور سب کے رہائشی انتظامات کے بارے میں مزید ہدایات جاری کرنے کے بعد سونی کی طرف دیکھا ”تم کیا کوئی گھر میں بیٹھ کے ہم بھی اپنے کام سے چلے جائیں گے۔“

سونی مسکرائی ”بیٹھنا تو مجھے آتا ہی نہیں۔ میں چھوٹی کے ساتھ اس کے کام میں ہاتھ بٹاؤں گی۔“

”ہرگز نہیں۔ تم گمراہی کرو گی“ رہیں نے کہا ”بلکہ تم یوں کرو کہ جو کچھ میں نے ابھی کہا اس کو بھول جاؤ۔“

سونی حیران ہوئی ”بھول جاؤں؟“

”ہاں۔ تم خود دیکھو اور فیصلہ کرو کہ کیا ہونا چاہیے۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو ہمیں مارخان سے کہہ دو۔ وہ لے آئے گا۔ رنگ کے سوا سب بدلنا چاہو تو بدل دو۔ فرنیچر پرے قالین، رنگ بدلنے میں ناگم لگتا ہے۔“

سونی نے سہلایا ”میں دیکھ لوں گی۔ کوئی چیز خراب ہوگی تو بدل دی جائے گی۔ ورنہ گزارا کیا جاسکتا ہے۔“

”اُسے بھی گزارا نہیں کرنا۔ دراصل ہم تو کچھ جانتے نہیں۔ بس جو دکان دار نے کہا لے آئے۔ اچھے بڑے کی تیز بوتلی ہے عورتوں کو۔ گزارا ہم کر رہے تھے۔ اب ایک چھوڑ دو عورتیں ہیں گھر میں ہم سے زیادہ سمجھ دار۔ تو گزارا کرنے والی بات نہیں ہونی چاہیے۔“

میں نے رہیں کو حیرانی سے دیکھا ”یہ احساس پہلے بھی نہیں ہوا تھیں۔“

وہ مسکرایا ”کیسے ہوتا یا۔ ساری زندگی اکیلے ہی رہے۔ نہ ماں نہ باپ۔ نہ بھائی نہ بہن۔ گھر میں آنے والی کوئی گھر والی نہ تھی۔ اس سے پہلے ہی ساتھ چھوڑ دی گراں معاملہ کچھ اور ہے۔ پہلی بار لگتا ہے اپنی بھی ایک پہلی ہے۔ کم سے کم اس گھر کو سنبھال سکتا ہے کوئی۔ ہمیں سنبھالنے نہ سنبھالے۔“

میں نے کہا ”مگر تم ہوئے کو سنبھال جاسکتا ہے۔ مگرے

ہوئے کو نہیں۔“

وہ اُڑا اس ہو گیا ”سچ کہا تو نے پارے۔ بہت گرا ہوا شخص ہوں میں۔ یہ کون سی نئی بات ہے۔ خود اپنی نظر میں گر کر رہے ہمیشہ۔“

میں نے کہا ”لو کے پٹھے میں مذاق کر رہا تھا“ میری بس مت ہو۔“

رہیں نے سونی کو دیکھا ”اب دیکھو گالی کس نے دی ہے۔“

میں نے دھناتی سے کہا ”یہ گالی نہیں۔ نام ہے تیرا اور بالکل ٹھیک نام ہے۔“

رہیں ہنسنے لگا ”دیکھو سونی۔ پورے گھر کو اچھی طرح دیکھو پہلے۔ جو چیز تمہیں بُری لگے اسے نکال دو۔ بالکل نئے

سرے سے سب سیٹ کرو۔ یہ بھی تم ہی بہتر سمجھ سکتی ہو کہ اپنی اپنی ضرورت کے مطابق کس کو کہاں رہنا چاہیے۔ میرا

مطلب ہے کس کمرے میں۔ بہت سی فالتو چیزیں بھی جمع ہیں گھر میں۔ سارا کاٹھ کباڑ نکال دو۔ اس کباڑ خانے کو ایک گھر

بنادو۔ جیسا کہ شریفوں کے رہنے کے لائق ہوتا ہے۔ جلدی کوئی نہیں، سب آج ہی نہیں ہو سکتا لیکن تم گمراہی یہ

سب۔“

سونی کے چہرے پر عجب سی خوشی اور طمانیت آگئی۔ اس نے اقرار میں سہلایا ”میں کو شش ضرور کروں گی۔ چلتی تو پہلے بھی بہت سے قبول کئے ہیں۔ یہ ذرا مختلف ہے مگر میں

کروں گی۔“

”قائن!“ میں نے اس کے کندھے پر تھکی دی ”پھر ہم چلتے ہیں۔“

یہ راج کی طرف جاتے ہوئے بھی رہیں کچھ جذبات



سے مغلوب تھا "یار" اکیلے آدمی کی بھی کوئی زندگی ہوتی ہے۔ جیسے دروہ کی ٹھوکریں کھانے والا کتا۔"

میں نے کہا "اس معاملے میں ہم سب ایک جیسے بد نصیب تھے مگر خاندان اور خون کے رشتوں سے محرومی کا احساس سب کا یکساں ہے۔"

"ہاں یار۔ اپنی تو سمجھتے تھے کہ صرف ہم ہی ہیں جن کا خدا کے سوا دنیا میں کوئی نہیں تھا مگر تیرم خاندان کے باہر بھی لاکھوں تیرم اور لاوارث ہیں۔"

"مگر تو جنم کا بھی کوئی نہ تھا مگر وہ کچھ خوش قسمت تھی کہ اسے آزاد صاحب جیسے شخص نے سایہ عاطفت فراہم کیا۔ سوئی زیادہ بد قسمت رہی۔"

"ہاں یار۔ ہم تو موصیے خوار ہو کے بھی جی لیے۔ عورت اکیلے ہو تو اس کے ساتھ وہی ہوتا ہے جو سونی کے ساتھ ہوا۔ خیر خدا نے اسے مکمل تباہی اور زلفت کی انتہا سے پہلے ایک موقع دے دیا" رئیس بولا۔

میں نے کہا "سب قدرت کے کھیل ہیں۔ اگر اس رات ہم اسے نہ پکڑتے تو وہ پولیس کے ہاتھ لگتی اور پلاٹر خرب ملک رب نواز کی خدمت میں دست و پا بست پیش کی جاتی کہ یہ ہے آپ کی بجرم۔ اب آپ جو سلوک اس کے ساتھ کریں آپ کو اختیار ہے۔ اس کے بعد چاہیں تو قانون کے حوالے کریں۔ تھانوں بعد التوں کے تفتیشی چکر سے نکل کر یہ زنانہ جیل میں پہنچے گی۔ اس کی جوانی ایک داستانِ عبرت بن چکی ہوگی۔ یہ بھول جائے گی کہ وہ ایک عورت تھی۔"

رئیس نے کان پکڑ لیے "تو یہ یار۔ جنم کا خدا اب بھی کچھ نہیں۔ زنانہ جیل پہنچ جائے والی عورت کی زندگی دیکھی تو نہیں میں نے مگر مجھے معلوم ہے سب خیر جوڑان باتوں کو یہ شرافت۔"

میں نے تانوں کے قتل کھول کے شرابا خیا توں کا اجالا میری آنکھوں میں چکاچوند پیدا کرنے لگا۔ پچھلی گلی میں صبح کے پہلے پھر کی رونق اور لپٹل ماند پڑ چکی تھی۔ دودھ والے اور اخبار والے کارخانوں اور دفتر کو جانے والے اور اسکول کے بچے گلی سے گزر چکے تھے۔ اب گھروں میں عورتیں ناشتے کے بعد کام سمیٹ رہی تھیں اور بوڑھے شاید اخباروں کے صفحات میں گم تھے یا بیوی کے سامنے ستارے تھے سبزی بیچنے والے اور خالی بوتلیں ڈسے لینے والے انہی پہنچے نہیں تھے گلی میں خاموشی تھی اور سکون تھا۔

میراج خالی کرنے کے لیے دونوں گاڑیوں کا ہٹایا جانا

ضروری تھا۔ مجھے خیال آیا کہ ایک گاڑی جنم لے جاتی تو کچھ وقت ہمارا بیچ جاتا اور وہ خود بھی ٹیکسی رکشے کے چکر میں پڑنے سے بچ جاتی۔ رئیس کی سفید سوڑی آلٹو کو استعمال کے بعد وہ آزاد صاحب کے گھرا آئیں کے باہر کہیں بھی کھڑا کر سکتی تھی۔ مسئلہ صرف ملک صاحب کی رعایت کروہ سرخ رنگ کی سوڑی آلٹو کا تھا۔ اس میں سے وہ آکر نکالے جانے کے بعد جو آواز دے کے شائبہ کرنے والوں کو بلاتا تھا، خطرے کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ اگر اسے ہم اس پاس ہی کہیں سڑک کے کنارے پارک کرتے تو ملک صاحب کے کارندے اسے یہ آسانی تلاش کر لیتے اور ملک صاحب کو بتا دیتے کہ گاڑی تو مل گئی ہے مگر اس کا سراغ دینے والے آلے کا راز فاش ہو گیا ہے اور آپ کی جان کے دشمنوں نے اسے خاموش کر دیا ہے یا غائب کر دیا ہے۔ اسے ہم نے سروس کے لیے ایک پٹرول پمپ والوں کے حوالے کر دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ اب ہم شام کو آئیں گے ہم دو تین گھنٹے انتظار نہیں کر سکتے۔

رئیس کی گاڑی میں چلا رہا تھا۔ وہ میرے ساتھ آ بیٹھا۔ "چل پارے" ایک کام تو ہو گیا۔ اب مزہ آئے گا۔"

"ہاں۔ اگر ہماری توقعات کے مطابق وہ پھر پہنچے۔"

"یار وہ آئیں گے ضرور آئیں گے" رئیس شاید تصور میں ان کی بایوسی اور جھجکاہٹ سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

پروگرام کے مطابق رئیس مجھے سیدھا باغبان پورے لے گیا۔ پرانی آبادی کے بازار بھی گلی گلی کی طرح تنگ ہو گئے تھے۔ پیدل اور سائیکل سواروں، تانوں ریزوں اور رکشاؤں کی بلیڈار میں گاڑی کو بحفاظت نکالنے لے جانا ڈرائیو تنگ کا سخت ترین امتحان تھا جس میں مجھے دوبار ٹاکائی ہوئی۔ ایک سائیکل والا مخالف سمت سے تھمکی طرح آیا۔ وہ چند روزہ سولہ سال کا ایک لڑکا تھا جس نے ایک ہاتھ سے سائیکل کا ہینڈل پکڑ رکھا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں ایک پتنگ تھی جسے وہ تھمکتے ہی پھرت پھرت چاکے اڑاتا۔ میں نے بدوقت گاڑی روک لی مگر وہ بچ کے نکلنے کی کوشش میں سائیکل سمیت سڑک کے کنارے سکون سے جھکے کے ٹھہرے اور مل کے لڑو بیچنے والے ایک شخص کے خوابے پر چڑھ گیا۔

"یہ تو ہوتا ہی تھا" رئیس نے پیچھے دیکھ کے کہا "اتنی تنگ جگہ پر کیسے مزے سے خوابو لگائے بیٹھا ہے جیسے یہ مال دوڑے اور ٹریفک بڑی دیر سے گزر رہی ہے۔"

"لو کے تو لو کے ہوتے ہیں۔ یہاں تو سب ہی ہوا کے

گھوڑے ر سوار پھرتے ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ وہ جان بوجھ کے ایسی جگہ بیٹھا ہے کہ کوئی خوابو گرائے اور وہ پکڑے اسے کہ نقصان پورا کرو۔"

"بڑی ذہانت کی بات ہے۔ سارا دن بیٹھ کے کھیاں جھلے اور آٹھ آنے روپے کی دکانداری کرنے سے یہ بہتر ہے کہ سارے مال کی قیمت ایک ہی سے وصول کر لی جائے۔ ویسے تو کوئی گارنٹی نہیں ہوتی کہ رات تک بھی خوابو خالی ہو۔"

دھولی کھول کے پھر ٹائٹ کرنے والے ایک بزرگ کی کسٹی گاڑی کے باہر کان کی طرح ٹپکے ہوئے شیشے سے ٹکرائی۔ وہ رئیس کے دامن کو دانتوں سے پکڑے سامنے نہیں بچے رکھتے آ رہے تھے۔ انہوں نے چلا کے کہا "اوئے اندھے! مگر دھولی کو بدوقت نہ منجھال سکے۔ لوگوں کے ہاتھ ایک تفریح آگئی۔ میں ان سے معذرت بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ سامنے شاہی رتھ سوار کی طرح اپنے ریز پر بکھڑا ہوا ایک شخص چابک لڑاکے چلا رہا تھا "اوئے آگے چل بابو۔ پیچھے مت دیکھ۔"

بالآخر ہم ایک گلی میں رک گئے اور خوش قسمتی سے مجھے ایک تانگے کے پیچھے گاڑی کھڑی کرنے کی جگہ بھی مل گئی۔ تانگے کا انجن کچھ فاصلے پر اندھن کھا رہا تھا اور بڑا ہلکا لگا تھا جیسے ایک طرف سے گھوڑے کے اندر جانے والا چارہ فاسٹ فارورڈ ہو کے دوسری طرف کھادی صورت میں برآمد ہو رہا ہے۔ تانگے سے گھوڑے کا رشتہ قائم رکھنے والے دونوں ڈنڈے دو طیارہ ٹھکن توپوں کی طرح آسمان کی جانب اٹھے ہوئے تھے۔

بالکل سامنے کسی گھر کے صحن میں بیٹونی دیوار کی جگہ بتائی جانے والی چھوٹی سی پرچوں کی دکان پر اٹھا نہیں تھیں سال کا پہلوان ٹائپ شخص فارغ بیٹھا اپنے تازہ شیو کیے ہوئے سر پر ہاتھ پھیر کے وقت گزار رہا تھا۔ اس کے وجود میں کسی طائر نسلی کی روح قید نظر آتی تھی۔ دکان میں پرچوں کا سامان بڑی بے ترتیبی سے پڑا ہوا تھا۔ چاول اور چینی کی بوریوں کے درمیان مجھے جو بے دوڑے نظر آئے۔ والوں اور مسالوں کا رنگ بڑا عجیب نظر آتا تھا۔ دھنیا پاؤڈر کا رنگ کچھ زردی مائل تھا۔ ہلدی میں سرخی نظر آ رہی تھی۔ یہی ہوئی سرخ مچ پر گرم سالے کا اور گرم سالے پر سرخ مچ کا گمان ہوتا تھا۔ جتنے جو چمت میں بنے چڑیوں کے گھونسلوں سے گرے تھے سب میں شامل ہو گئے تھے۔ اگر اس میں پرندوں کے نظام اخراج کی سقوات بھی شامل تھی تو یہ صحن ٹھکن تھا۔ ٹانگوں اور بسکٹوں کے مرتبان کھلے پڑے تھے۔ ان

کے ذائقے کا تصور کر کے مجھے متلی سی محسوس ہونے لگی۔ رئیس نے لوہے کا اسٹول مجھے پیش کیا اور خود ایک پاؤں ٹھہرے پر رکھ کے کھڑا ہو گیا "کیا حال ہے تیرا بھولے بادشاہ۔ دھندل گیا چل رہا ہے؟"

بھولے بادشاہ نے اپنی ٹیٹھی ہوئی آواز میں کہا "میں نے وہ کام چھوڑ دیا ہے۔"

"وہ تو نظر آرہا ہے۔" رئیس نے جزل اسٹور کا عمومی جائزہ لیا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوا "بھولا سو روپے روز پر جیلس اور جیلسوں میں ٹھہرے لگا تھا۔"

میں نے سر ہلایا "زیادہ چلانے سے اس کی آواز بیٹھ گئی۔ اس کے VOCAL CHORDS کو نقصان پہنچا؟"

"نہیں۔ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ دراصل ایک باریہ نواز شریف کے خلاف مردہ باد کے نعرے لگتا ہوا پولیس کے ہتھے چڑھ گیا۔ انہوں نے اس کے حلق میں سے لاؤڈ اسپیکر نکالنے کی کوشش کی۔ بڑے غلط قسم کے آوازوں کی مدد سے۔"

بھولے نے ایک آہ بھری "نقصان اس سے نہیں ہوا تھا۔"

رئیس نے کہا "ہاں۔ دوسری باریہ بے نظیر کے خلاف نعرے لگتا ہوا پکڑا گیا اور اتفاق سے وہی حوالدار اس تھانے کا انچارج تھا جس نے پہلی بار اس کی آواز حق کو خاموش کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ دوسری بار اس نے بھولے بادشاہ کو سیندر کھلایا۔ آسان کام کیا۔ اس کی آواز بالکل بیٹھ گئی۔"

"اپنا تو بھنا بیٹھ گیا جناب!" بھولے نے سر پر ہاتھ پھیرنا جاری رکھا۔

"خیر۔ یہ بتاؤ کیا سوچا ہے تم نے اس کاروبار کے بارے میں؟"

"اپنے بس کا نہیں ہے جی یہ کاروبار۔ ہم نے تو بتا دیا تھا۔ آپ سوا کر لو۔"

رئیس نے دکان کا پھر جائزہ لیا "کتنے کا ہو گا سارا مال۔ جو بھی ہے دکان میں سب۔"

"دھر تو سب مفت میں لینا چاہتے ہیں۔ بڑی بڑی دکانوں والے سب نے میرے خلاف ایکا کر لیا ہے۔ گاہک کو آنے ہی نہیں دیتے۔ پورے دس ہزار کا مال ڈالا تھا میں نے پانچ سو کا بھی نہیں ٹھکا پورے مینے میں۔"

بھولا اپنی اتالیقی اور بد انتظامی۔ عدم دلچسپی اور کابلی کو الزام دینے کے بجائے یہ ثابت کرنے میں لگا رہا کہ ایک سازش کے تحت اس کے بڑس کو چلنے نہیں دیا گیا۔ اگر اس

میں کاروباری سمجھ بوجھ ہوتی تو وہ دس کے مال کو بیس کا بناتا اور کہتا کہ اسے سارے مال کے پندرہ ہزار تو کھڑے کھڑے مل رہے ہیں اور اسی حالت میں دکان سمیت مال کے خریدار بھی بہت ہیں مگر وہ واقعی بھولا تھا۔

”میں نے کہا ”فرض کرو میں تمہیں دس پورے دے دوں پھر تم کیا کرو گے۔“

اس نے سوچ کے کہا ”گندیاں پتنگ۔ ڈورے مانجھا۔ یہاں اس کی کوئی دکان نہیں ہے۔ چلے گی۔“

”اس سے پہلے تم نے کتابوں کا پوس اور پینل ربر کی دکان کے لیے بھی کہا تھا کہ آگے اسکول ہے۔ خوب چلے گی اور اس سے پہلے۔“

”طوبی اللہ علیہم! تمہیں میری ماں جلوا بڑا اچھا بناتی ہے۔ خاص دیکھی تھی کہ مگر لوگ ڈالڈا کھانے لگے ہیں۔“

اس نے افسوس سے سر ہلایا۔

میں نے کہا ”یار! بھولے بادشاہ کو کسی نہ کسی کاروبار میں ضرور کامیابی حاصل ہوگی۔ تم سو اکر اور چلو۔“

”بھولے بادشاہ دس ہزار پورے تمہارے۔ حالانکہ پانچ سو کا مال کم ہو گیا ہے مگر تم کو یہ مال آج اور ابھی پچانا ہو گا۔“

”میں بولا۔“

اس کا منہ کھل گیا ”کہاں؟“

”ہاں! لکھ دوں گا۔ سامان ایسے ہی ڈالو ریڑھے میں۔ دو پھیرے کر دیا چار گھنٹہ چار بجے تک لے آؤ اور پیسے نقد لے لو۔ منظور ہے تو بولو“

”میں نے دو ہزار اس کے سامنے ڈال دیے ”باقی بعد میں مال ملے گا۔“

اس نے کانپتے ہاتھوں سے نوٹ اٹھائے ”پنگا جی! آپ جگہ بتا دو۔“

واپس آتے ہوئے میں نے بھولے بادشاہ کی اقتصادی جدوجہد پر افسوس کا اظہار کیا۔ میں نے مجھ سے اتفاق کیا کہ وہ کوئی بھی کاروبار نہیں کر سکتا۔ وہ صرف بد معاشی کر سکتا تھا مگر اب اس میں بھی جسمانی طاقت کا کوئی مصرف نہیں رہا تھا۔ اسٹے کے دور پر ایسے لوگ طاقتور ہو گئے تھے جن کو پھونک ماری جائے تو آڑ جائیں۔ پہلوانی کا فن بھی ختم ہو گیا تھا۔ یہ مبارت اور مقابلے کا دور تھا۔ اعلیٰ ذہنی اور جسمانی صلاحیت کا بھرپور استعمال کرنے والوں کے لیے مواقع کی کمی نہ تھی مگر بھولے بادشاہ جیسے لوگوں کو سائنس اور کمپیوٹر کے آنے والے دور میں بھٹا کا شکار ہو چکا تھا۔ وہ صرف اس خیال سے دل کو خوش رکھ سکتے تھے کہ خدا اب کارزار کا ہے مگر کیا خدا نے ہر انعام کو جدوجہد سے مشروط نہیں کیا؟

میں نے دوپہر سے پہلے ہی پرانے فرنیچر کی کھاڑی مارکیٹ سے کچھ ایک اور الماریاں وغیرہ بھی خرید لیں۔ ہم نے چلتے پھرتے بند کباب کا کچا کیا اور اوپر سے ٹھنڈی بوتل انڈیلنے سے شام چار بجے تک ہم سب نے مل کے کیراج کے اندر کا نقشہ بدل دیا تھا۔ دائیں بائیں دیواروں پر پرانے ایک نصب کر دیے گئے تھے۔ پیچھے الماریاں کھڑی ہو گئی تھیں۔ میں نے رومی کے پرانے اخباروں سے پچھلی پوری دیوار کو ایسے ڈھک دیا تھا کہ وہاں کسی کو ہمارے خفیہ راستے کی موجودگی کا شک بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ پرانے اخبار بھی بچے ہوئے تھے اور ان کے اوپر اخباروں سے نکالی جانے والی ایک تصویریں لگادی گئی تھیں اور ایک سال پرانا کسی واشنگ مشین کے اشتہار والا کلینڈر اور سال پہلے کا اوقات سحر و انظار والا الدین جیورلز کا کلینڈر لٹکانے کے بعد گویا فرشتک کا کام مکمل ہو گیا۔

جب پرچون کا مال آنا شروع ہوا تو میں نے تیس مارخان نے اور رہیں نے اسے براہ راست ایک اور الماریوں میں قفل کیا۔ کچھ چیزیں دیواروں پر لٹکانے والی تھیں۔ آئے چاول اور چینی کی بوریاں اور مٹی کے تیل کے ڈرم فرش پر ایسے رکھے گئے جیسے پرچون فروش رکھتے ہیں۔

سامنے سے دکان کا شٹر بروز کی طرح کرا ہوا رہا۔ ہر چیز سامنے والے گیٹ سے اندر لائی گئی۔ سوائے ایک اور الماریوں کے جو ہاتھوں ہاتھ خفیہ راستے سے دکان میں پہنچائی گئی۔ ہم نے بلب کی روشنی میں اندر پرچون کی دکان کا پورا سیٹ سورج غروب ہونے سے پہلے ہی لگا دیا۔

”ختم شام کے وقت آئی تو یہ سب دیکھ کے دم بخور ہو گئی۔“

”یہ سب کیسے ہو گیا؟“

میں نے ہاتھ جھاڑ کے کہا ”جو اب میں شعر سنیں۔ وہ کون سا عقیدہ ہے جو داہو نہیں سکتا۔ کوشش کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا۔“

”تم نے واقعی کمال کر دیا“ اس نے تعریفی نظروں سے ہمارے انتظامات کا جائزہ لیا ”یہ بہت مشکل کام تھا۔“

”اب اندازہ ہو کہ صحافت کتنا آسان کام ہے بلکہ کوئی کام ہی نہیں ہے۔ یہ پرچون کی دکان چلا کے دکھاؤ تو انہیں۔“

”جو بھولے بادشاہ سے نہیں چلے“ میں بولا۔

آخری کام ہم نے یہ کیا کہ چاولوں کی بوری میں سٹکل نشر کرنے والا آکر چھپا کے اس کا نام بیچے سے نکالا اور پھر پچھلی دیوار سے گزرا کر اسے اس طرف پہنچایا۔ شٹر گرانے کے بعد ہم نے اس میں آسانی سے نکل جانے والے آٹے لگائے

اور کھلی کھینک لگا کے سامنے سے رکھیں خانے میں لوٹ آئے۔ ہم نے سٹکل نشر کرنے والے آٹے کے تاروں کو بارہ دھرت کا سٹیشن دے دیا۔ ظاہر ہے ”اس کے بعد وہ کام کرنے لگا ہو گا مگر ہم اس کے سٹکل ریسو کرنے سے قاصر تھے۔ ہمارے پاس اس کی فریکوئنسی معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا اور نہ اس مخصوص فریکوئنسی کا ریسور تھا۔

ہماری کیفیت اب اس شکاری جیسی تھی جو شیر کی گزرگاہ پر کسی درخت کے نیچے بکرا باندھے اور خود درخت کے اوپر بھان بنہنڈق لے کر بیٹھا جائے۔ اس سسٹم اور انتظار میں کہ جسے کی بکار پر شیر اسے کھائے اور گوشت کا نشانہ بننے کے لیے آتا ہے یا نہیں۔ چھٹی حس جو ایسے معاملات میں راہنمائی کرتی ہے یا کم سے کم امید دلاتی ہے ہماری مدد کرنے سے زیادہ کنفیوژن میں اضافہ کر رہی تھی۔ میری اور سونی کی چھٹی حس کا کہنا تھا کہ ہماری محنت کا ثمر حاصل کی۔ اس جال میں پھنسنے کے لیے کوئی نہیں آئے گا۔ میں خان کی جو اس منصوبے کے خالق تھے اور ختم کی چھٹی حس سستی تھی کہ آئے گا۔ آئے گا آئے گا۔ آئے گا۔ آئے گا۔

نماہ کو کے چائے پیتے ہوئے ہر شخص بار بار گھڑی دیکھتا تھا۔ گزشتہ شب جو لوگ آدھی رات سے کچھ پہلے آئے تھے کیا وہ آج بھی اسی وقت آئیں گے؟ ابھی رات کے آٹھ بجے تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ رات کے کھانے کے بعد ہم دس بجے سے مورچا سنبھال لیں گے۔

ختم نے اپنی دن بھر کی مصروفیات میں پہلے آزاد صاحب سے ملاقات کا حال سنایا۔ وہ بڑے اچھے موڈ میں تھی۔ اس نے آزاد صاحب کی ایسی نقل اتاری کہ سب ہنس ہنس کے بے حال ہو گئے۔ سونی کا آزاد صاحب سے محض عابثانہ تعارف تھا لیکن ہم سب کو بتا دیکھ کے وہ بھی ہنسی رہی۔

”آزاد صاحب تو بہت خفا ہوں گے“ میں نے کہا۔

”خفا تو وہ ہر وقت رہتے ہیں۔ بڑی شکایت ہے دنیا سے کہ کہیں کچھ نہیں ہو گا اور خیر بالکل فضول قسم کی ملتی ہیں۔ قارئین سے خفا ہیں کہ جو خبر سرے سے گویا خبری نہیں ہوتی وہ پڑھتے ہیں۔ ہر طرف جہالت کا دور دورہ ہے اور لوگ اتنے خود غرض ہو گئے ہیں گویا کہ دنیا کی کیا انہیں پڑوسی کی خبر نہیں۔ اخبار کے محلے سے خفا ہیں کہ سب ابوجمل بڑھم خود افلاطون بنے بیٹھے ہیں۔“

”تم سے تو زیادہ ہی خفا ہوں گے۔“

”وہ مت پوچھو۔ پورا ایک گھنٹا ان کی توپوں کا رخ

میری طرف رہا اور وہ پڑی گھن گرج کے ساتھ بولتے رہے۔ میں بھی تیرہ کر کے گئی تھی کہ خاموش رہوں گی اور جی جناب کے سوا کچھ نہیں بولوں گی۔ ایک بار پتا نہیں میں کیا سوچ رہی تھی کہ انہوں نے کوئی سوال داغ دیا اور میں نے کمرہ دیا جی جناب!“

”سوال کیا تھا؟“

”انہوں نے مجھے ذہنی طور پر غیر حاضر دیکھ کے پوچھا تھا کہ ہم سب آوارہ ہیں گویا کہ ہماری آواز تمہارے لیے درخور احتیاج نہیں؟ اور میں نے کہہ دیا کہ جی جناب۔“ ختم کا ہنسی سے برا حال ہو گیا ”کیا ہم گلی کے کتے کی طرح بھونک رہے ہیں کہ تم سن ہی نہیں رہی ہو؟“

”چھ! جی! اٹھائی انہوں نے؟ تمہارے جی جناب کہنے پر؟“

”ہاں! لحاظ کر لیں کچھ۔ علاقہ سی طور پر دو تین بار چچی رسید کی اور بہت دباؤ سے کہ گستاخی ہم سے پروا نہ ہوئی اور ہم کمال ادب کے جس بھروسے کے گویا۔ تم کو بھی بہت یاد کر رہے تھے۔“

میں نے سم کے فریاد کی ”کیوں؟ میں نے کیا قصور کیا ہے؟“

”تمہارا ایک ناقابل معافی جرم تو یہ ہے کہ تم نے ان کی سب سے ہونہار اور نیک نام صحافی کا مستقبل تباہ کر دیا۔“

”وہ کیسے؟“

”تم نے اسے میدان صحافت کے ریس کورس میں مقابلے کی دوڑ سے ہٹانے کے انکھوں پر عشق کی بی بی باندھ دی اور اسے شوریہ سرچیزات کے بحر غفلت میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا۔ اب گویا میری نہ منزل ہے نہ منزل کا پتا ہے۔“

”یہ سراسر بہتان ہے چھ پر“ میں نے احتجاج کیا۔

”بہت ہے تو ان کے سامنے جا کے اپنی صفائی پیش کرو۔ وہ اس لیے بھی خفا تھے تم سے کہ چلی محض تمہاری ہونہار دستیابی کے باعث عرصہ دراز سے ساکت وصامت اور نقل و حمل کی بنیادی صلاحیت سے محروم ہے گویا۔“

میں نے کہا ”کسی دن میں چلی کو معنوی سیارے کی جگہ راکٹ سے باندھ کر خلا کی طرف روانہ کر دوں گا۔ شٹر تک خلا میں چلتی رہے گی“ میں نے خفگی سے کہا۔

”آزاد صاحب نے تمہیں چوبیس گھنٹے کا نوٹس بھجوایا ہے کہ اپنی اربعین فرصت میں چلی کو دواں دواں کر دو ورنہ۔“

”ورنہ کیا؟“ میں نے کہا۔

”آزاد صاحب نے لٹریچر سانس لے کر کہا تھا، ورنہ... ورنہ کیا؟ کچھ بھی نہیں ہو گا گویا۔ بس ہم حسب سابق جوتیاں چھتاتے پھریں گے شہر کے کوچہ و بازار میں گویا تم چلے جاؤ تا کسی دن۔“

میں نے کہا ”الاحول ولا قوت۔ میں کیا سونڈ کھینک ہوں۔ ٹھیک لے لیا ہے میں نے چٹلی کو ٹھیک رکھنے کا۔ آزاد صاحب سے زیادہ عمر ہوگی اس کی۔ اس کے زمانے کی کوئی گاڑی سوکھ نظر نہیں آتی۔“

جب میں نے کہا ”دس بجے تک ان کے دل کا غبار نکل گیا تو وہ گھر چلے گئے سونے کے لیے۔ کہنے لگے کہ بس اب تمہاری طرف سے اطمینان ہو گیا۔ آج کچھ سکون کی نیند آئے گی۔ میں نے کچھ دیر دفتر میں بیٹھ کے کام کیا۔“

”کچھ اخبار میٹھن حاصل کی۔ کپیٹرز سے اور CLIPPINGS سے پھر میں چلی گئی رشتی کی طرف۔“ جب میں اچانک سیریس ہو گئی ”وہ بہت ناراض ہیں ہم سے۔ فرید بھی اور رشتی بھی۔ ان کی امی بھی۔“

”مگر ناراضگی کی وجہ؟“

”انہیں شکایت ہے کہ کب سے ہم نے ان کی خبری نہیں لی۔ فرید عباسی کا اپنے کزن سے کسی معاملے میں اختلاف ہو گیا۔ وہ الگ ہو گیا۔“

”وہ کزن جس کی قانونی فرم تھی؟“

”ہاں۔ فرید نے علیحدگی اختیار کر لی۔ آج کل کچھ بھی نہیں کر رہا ہے۔ رشتی نے بہت سمجھایا کہ تم اپنی پرنسپل کرو۔ دو چار سال میں سیٹ ہو جاؤ گے ابھی کون سے قانون کا اندیشہ ہے بے روزگاری سے۔“

”میں نے کہا۔ سولہ آنے ٹھیک کہا رشتی نے۔“

”مگر فرید نے تو قسم کھائی ہے وکالت نہ کرنے کی۔ کتنا ہے یہ میرے بس کی بات نہیں۔ قانون میں نے پڑھا تھا لوگوں کو انصاف دلانے کے لیے مگر عدالتوں میں سب سے زیادہ جھوٹ خود وکیل بولتے ہیں۔ جھوٹے بیان، جھوٹی شہادت، جھوٹی گواہی۔ یہ سب وکیل لاتے ہیں۔ غریب اور لاوارث آدمی کو حق پر ہونے کے باوجود انصاف نہیں ملتا۔ بے بس جج انصاف خرید لینے والے کے حق میں فیصلہ دینے پر مجبور ہوتا ہے۔“

میں نے کہا ”جب اس نے وکالت پڑھی تھی تو کیا یہ اسے معلوم نہیں تھا؟“

”اس نے تو جب پولیس فورس میں شمولیت اختیار کی

تھی تو اسے معلوم تھا، اس جھگے میں کیا ہوتا ہے مگر وہ بہت جوشیلا اور پُر امید تھا کہ فرض شناسی اور ایمان داری کی مثال قائم کرے گا۔ انجام کیا ہوا؟ اکیلا چٹا بھڑا کو نہیں پھوڑ سکا۔“

میں نے کہا ”آخروہ کیا کرے گا؟ ایسا کوئی پیشہ ہے جس میں سو فیصد ایمان داری کو برداشت کیا جاتا ہو؟ جہاں اسے اخلاقی اصولوں پر مفاہمت کرنے پر مجبور نہ ہونا پڑے۔ بے ایمانی سے محفوظ ہے کوئی پیشہ؟“

”جتنے بڑے لوگ ہر جگہ ہیں۔ فرق صرف ان کے تناسب کا ہے۔ کچھ ادارے زیادہ بدنام ہیں کیونکہ وہاں بے ضمیر لوگ زیادہ ہیں۔“

میں نے کہا ”نہیں۔ فرق صرف مواقع کی کمی بیشی کا ہے۔ پولیس اور کسٹم جیسے حکموں میں رشوت اور بے ایمانی کے مواقع زیادہ ہیں۔ جہاں یہ مواقع کم ہیں یا نہیں ہیں وہاں ایمان داری زیادہ نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ اپنے فرید صاحب کچھ زیادہ ہی REACT کرتے ہیں۔ پولیس یا کسٹم میں بھی جو ایمان دار رہتا چاہے ہیں اور حلال کی روزی پر اکتفا کرتے ہیں وہ دوسروں سے صرف نظر کرتے ہیں کہ بھی جو کھاتا ہے حرام وہ کھائے، ہم نہیں کھائیں گے۔ جانا تو سب کو اپنی اپنی قبر میں ہے۔ اگر وہ بھی نہ کھائیں گے اور نہ کھانے دیں گے کی پالیسی پر عمل کرنے لگیں فرید صاحب کی طرح تو کہیں نہ تک پائیں۔ ہر جگہ سے نکالے جائیں۔“

جب میں نے کہا ”تم نے کیا بات چیموڑی۔ میں بتانا چاہتی تھی کہ اماں خاصا علیل ہیں آج کل اور انہیں بہت شکوہ ہے کہ کسی نے پوچھنے کی زحمت نہیں کی۔“

”میں نے کہا۔ اگر ہمیں معلوم ہوتا تو ضرور جاتے۔“

میں نے کہا ”ہاں۔ ایسے الہام تو ہوتا نہیں کسی کو بھی۔“

جب میں نے کہا ”دراصل فرید نے ہمیں اس خیال سے کچھ نہیں بتایا کہ ہمیں خود اپنے چکروں سے فرصت نہیں ملتی اور یہ غلط بھی نہیں۔“

”یہ چکر تو زندگی کے ساتھ ہیں۔ کب سے قریٰ خیر خیر نہیں لی۔ فرید کی طرف بھی چکر نہیں لگایا۔“ میں نے کہا۔

”فون بھی نہیں کیا کسی نے نہ ہم نے نہ اس نے۔“

”کیوں؟“

”جب میں نے کہا ”فرید کی امی بات کرنا چاہتی ہیں تم سے۔“

”جھجھکے؟“

”یہ تم انہی سے پوچھو۔ ہو گا کوئی ایسا مسئلہ جو صرف

آپ ہی حل کر سکتے ہیں۔ مجھے تو انہوں نے اس قابل نہیں سمجھا کہ کچھ بتائیں۔“

میں نے کہا ”برائے نام کی کون سی بات ہے اس میں؟ اگر انہیں میری عقل اور تجربے پر بھروسہ ہے اور تمہیں وہ سمجھ جائے۔ IMMATURE قسم کی لڑکی سمجھتی ہیں، تو جلتی کیوں ہو؟“

جب میں نے کہا ”اب کیا میں کسوں کو جلتی ہے میری جوتی۔“

دس بجے پچھلی گلی میں سنا ہوا گیا۔ یہ قدرے خوش حال متوسط طبقے کا رہائشی علاقہ تھا۔ شام کے وقت باہر کچھ رونق نظر آتی تھی۔ بچے اور نوجوان ٹینس کی بال سے کرکٹ کھیلتے تھے اور چوکے چھلے ہمارے تھے تو خاصا شور ہوتا تھا۔ کبھی بال کسی گھر میں جا گرتی تھی۔ کسی لڑکی کا شیش ٹوٹ جاتا تھا تو بال ضبط کر لی جاتی تھی۔ خود کو جاوید میاں اور دوسم انکرم سے کم نہ سمجھتے والے خیر انداز میں اُدھر اُدھر دیکھتے تھے کہ کسی درختے کی اوٹ سے کسی کی مسکراہٹ کا خراج تحسین مل جائے۔ فٹ پاتھ پر کرسیوں پر اوٹھنے والے بوڑھے کن اکھیوں سے سب ناڑتے رہتے تھے اور معنی خیز انداز میں مسکرا کے سہلاتے تھے جیسے اعتراف کر رہے ہوں کہ ہاں، یہی سب کچھ ہم نے بھی کیا تھا اپنی جوانی میں۔ عورتیں پھوٹے بچے گود میں اٹھائے بڑوں سے تازہ ترین افواہوں کا بڑی رازداری سے تبادلہ کرتی تھیں۔

مغرب کے بعد اندھیرا ہوتا ہی سب غائب ہو جاتے تھے عام طور پر لوگ کوٹھو کے تیل تھے اور اپنی اپنی زندگی کے گنگے بندھے معمول میں یوں جیتے تھے کہ ان کا گڑرا ہوا دن ان کے آنے والے دن جیسا ہی ہوتا تھا۔ نوکری یا کاروبار کے بھیلوں سے منٹ کر گھر آنے والے، عشا کی نماز باجماعت ادا کرنے والے، کوئنگ سینٹروں میں پڑھنے یا پڑھانے والے سب نوبے تک واپس آ کے اگلی صبح تک اپنے اپنے گھروں میں بند رہتے تھے پھر کھانا، ٹی وی دیکھنا یا کچھ نہ کرنا اور سو جانا۔ ان کے دن کا اختتام بھی ایک یکسانیت رکھنے والے معمول کے مطابق ہوتا تھا۔

اس وقت بھی باہر کے گیٹ بند تھے۔ کہیں کہیں گیٹ لائٹس روشن تھیں ورنہ گلی میں مکمل تاریکی کا راج ہوتا۔ اسٹریٹ لائٹس اپنے فہرزدہ ہوجانے والے بلبوں کے ساتھ حاکم شرعی بد انتظامی پر شرمسار نظر آتی تھیں۔ کبھی گلی کے موڑ پر اچانک کوئی گاڑی نمودار ہوتی تھی تو روشنی کا سیلاب سا آ جاتا تھا پھر گاڑی کسی گھر کے کٹے گیٹ میں غائب ہو جاتی تھی اور گلی پہلے سے زیادہ اندھیری محسوس ہونے لگتی تھی۔

گیارہ بجے رئیس کو تشویش ہونے لگی ”وہ سالا جبر الیلہ ابھی تک قائب ہے۔“

میں نے اسے تسلی دی ”وہ بھولنے والا نہیں ہے، فکر مت کر۔“

”ابے یار! اپنی شکل دکھانا ہمیں تو تسلی ہو جاتی۔ ہم ایسے ہی فرض کیے بیٹھے رہیں کہ وہ بچ گیا ہے۔“

جب میں نے اسے ساتھ سولی نمودار ہوئی۔ ان کے ہاتھوں میں چائے کے کپ تھے۔ جب میں نے ایک کپ مجھے تھماوا اور سولی نے دوسرا نہیں گودے دیا۔

جب میں نے کہا ”ابھی وقت ہے پھر سوچ لو۔“

میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا ”دل کے معاملات سے دماغ کا کیا تعلق۔ بے فکر کو پڑا آتش نمودار میں عشق۔ اب کیا سوچنا۔“

وہ بیٹنے لگی ”سوچو کہ ملک رب نواز کے بندے خطرناک اسلحہ ساتھ لے کر آئے تو کیا ہو گا؟“

”دشمن کو کمزور سمجھنے کی غلطی مت کی جاسکتی ہے۔“ سونی نے کہا۔

”ہم ر نہیں ہیں۔ غلطی کریں وہ بھی سستی۔ یہ ہماری شان کے خلاف ہے۔“ رئیس بولا۔

میں نے کہا ”اب آپ تشریف لے جاسکتی ہیں۔“

”ہمارا اس کھیل میں کوئی رول نہیں؟“ جب میں نے شکوہ کیا۔

”رول ہے لیکن تمہارے کمرے میں ہے۔ اسے ریڈی رکھنا۔“ میں نے کہا ”اب جاؤ سڑب مت کو نہیں۔“

”ہمارا ایمان موجود رہتا بھی گوارا نہیں تمہیں۔“ جب میں نے کہا۔

”ہاں۔ کیونکہ تم میں سے ایک چندے آفتاب ہے اور دوسری چندے مایاتاب اور آدھی رات کے وقت آفتاب اور مایاتاب اس چھت پر روشن نظر آئیں گے تو ہمارا پلان چوہٹ ہو جائے گا۔“ میں نے کہا۔

”کتنا اجالا پھیل گیا ہے گلی میں بھی۔“ رئیس بولا۔

وہ دونوں مسکراتے ہوئے واپس چلی گئیں۔ ہم چھت کی منڈیر سے گلی میں جھانکتے رہے اور اندھیرے میں حرکت کرنے والے ہر سامنے کو گھورتے رہے۔ غلطی رہے اور ہر دس سینکڑے کے بعد گھڑی دیکھ کے ایک دوسرے سے سوال کرتے رہے کہ کیا وہ آئیں گے؟ اگر وہ نہ آئے تو بڑی مایوسی کی بات ہوگی۔ ہم نے جو اتنی محنت کی ہے۔

بارہ بجے گلی کے آخری حصے میں روشنی لہرائی، پھر ایک

گاڑی نمودار ہوئی جو سیدھا گزر جانے کے بجائے عین ہماری ناک کے نیچے اور دکان کے سامنے آکے ٹھہر گئی۔ میں اور رئیس اپنی اپنی جگہ ٹھہر ہو گئے۔ میں نے ہاتھ پلا کے ذہین کے درمیان مستعد کھڑے ہوئے تیس مارخان کو ایکشن کا شکل دیا۔

وہ آج دوسری گاڑی میں آئے تھے۔ اندھیرے کے باوجود میں نے ان دونوں کو پہچان لیا جو گزشتہ شب تاہل تیار کی کے باعث لوٹ گئے تھے۔ آج ان کے ساتھ تیسرا شخص بیٹھنا کوئی ماہر قتل ساز تھا۔ اس کے ہاتھ میں اوزاروں کا تھیلہ بھی ظاہر کرتا تھا۔ چند سیکنڈ بعد ایک نے سوال کیا "استاد جی۔ ایک بار پھر چیک کرلو۔"

"اوسے تو بندہ ہے کہ کر لیا۔ ادھر مکی کے موڑ سے صاف آواز سنائی دے رہی ہے۔ شک کی کون سی بات ہے؟" استاد نے ہنسی سے کہا۔

کر لے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ غالباً خون کے مگھوٹ پینے میں مصروف تھا۔ اس کے دوسرے ساتھی نے کہا "پھر کام شروع کر دے جندرے والا؟" استاد نے کہا "اوسے پاگل دے پڑے۔ جلدی کرو کیا انتظار ہے کسی کے آنے کا؟"

جندرے والے نے گھبراہٹ میں کہا "کوئی دھبہ نہ پڑ جائے جی۔ ایسا کام میں نے پہلے کبھی نہیں کیا۔"

"فصل کو اس مت کر۔ سارے چور تم سے ہی تالے کھواتے ہیں۔ پتا ہے ہمیں سب پانچ ہزار لے ہیں پانچ روپے والے کام کے۔"

"چھاتی بنا رہی کی کیا بات ہے؟ قتل ساز نے تھیلے کو ٹھولا اور پھر شر کے قریب فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔ ایک چپن ٹارچ کی روشنی کے نقطے کو تالے پر مرکوز کر کے اس نے جیب کی طرف دیکھا۔ "اس آواز کو بند نہیں کر سکتے تم؟"

اس کا اشارہ جیب سے سنائی دینے والے شکل کی طرف تھا جو دکان میں موجود آکر نشر کر رہا تھا۔ رات کی خاموشی میں یہ آواز بہت ملکی ہونے کے باوجود پھٹ تک پہنچ رہی تھی۔ قتل ساز احساس جرم کی کشیدگی کا شکار تھا اور اسے یہ آواز برکھالارام کی طرح "پکڑو۔ پکڑو۔ چور چور" کی طرح چلاتی لگ رہی ہوگی۔

"ہیں۔ یہ کیا ہوا؟" جیب میں بیٹھے استاد نے کہا۔

کر لے نے چوک کے کہا "کیا ہوا جی؟"

قتل ساز گھبرا کے اٹھ کھڑا ہوا "کیا ہوا جی؟"

"اوسے کچھ نہیں ہوا۔ تو کام کر اپنا" استاد نے کہا۔

"چانک وہ آواز بند ہو گئی ہے۔ خود بخود۔"

میں سمجھ گیا کہ نیچے سوئی نے شکل دینے والے آتے کے تار بیڑی سے الگ کر دیے ہیں۔ کر لیا اور اس کا ساتھی بہت مضطرب تھے۔ آج وہ بند قفل ساتھ نہیں لائے تھے مگر یہ فرض نہیں کیا جاسکتا تھا کہ ان کے پاس ریوالور بھی نہیں ہوں گے۔ جندرے والا بڑے زور سے انداز میں مختلف چابیاں آزما رہا تھا۔ ان کے بالکل سامنے جیب بھی چنانچہ مکی میں قریب سے گزرنے والا قفل شکن کی کارروائی کو نہیں دیکھ سکتا تھا اور دور سے آنے والے کو اندھیرے میں دامن بائیں ہر دوڑ کی طرح تاریکی اور سکوت کے سوا کیا نظر آسکتا تھا۔

"مکی" ایک تو کل گیا؟" جندرے والے نے اعلان کیا اور اٹھ کر شر کے دوسرے تالے کے پاس جا پہنچا۔ اسی وقت آخری حصے میں ایک اور گاڑی کی روشنی نمودار ہوئی جو آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آ رہی تھی۔

استاد نے کہا "اوسے جلدی کر۔ تو نے تو کہا تھا ہاتھ لگاتے ہی کل جائے گا جندرے۔"

کر لے نے کہا "یہ کہیں گشتی پولیس نہ ہو۔"

رئیس نے میری طرف دلچہ کے سر ہلایا "یہ اپنا یار انسپکٹر نذیر ہی ہوگا۔"

قریب آنے والی دوسری گاڑی بھی جیب ہی تھی۔ فٹ پاتھ پر کھڑے ہوئے تینوں شخص بہت گھبراہٹے تھے۔ کر لے نے دانت پیس کے کہا "اوسے جلدی کر نیستی۔"

تالا اسی وقت کھل گیا۔ انہوں نے ایک ساتھ شر اٹھایا اور اندر گھستے ہی پھر بند کر لیا۔ دوسری جیب سامنے آکے ٹھہر گئی۔ اس میں سے پولیس کی وردی میں تیرا بلڈ برآمد ہوا۔ میں نے رئیس کو اشارہ کیا اور ہم پلٹ کے بھاگے۔

شہنم کے ساتھ سوئی گیٹ کے قریب حواس باختہ کھڑی تھی "دیکھو ذرا پھر چیک کرلو اپنے ریوالور۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

میں نے کہا "ایسی باتیں کرنے سے بہتر تھا تم امام خاصان باندھ کے ہمیں رخصت کرتیں۔"

"دعا کرنا ہم لڑے بغیر ہی میدان جنگ سے بھاگ آئیں" رئیس بولا۔

"ہم نے تمہارا کھانا معاف کیا" میں نے گیٹ کھولا اور اپنے پیچھے پھر بند کر دیا۔

اوپر سے تیس مارخان نے کہا "صاحب" آپ اندیشہ کیوں فرمائی۔ آپ کا جان عزیز ام پر قربان۔ ادھر آپ جام

شہادت نوش فرمائی اور ادھر ام بی الفور آپ کے قاتلوں کو جنم روانہ کرتی۔ ام بھائی کا پروا نہیں کرتی۔" رئیس نے بگڑے کہا "ابے کیا فضول بولا جا رہا ہے؟ لاؤ اس پیکر کی اولاد۔"

میں نے اور رئیس نے سڑک پر بائیں جانب دوسرے گز کا فاصلہ تیز تیز قدموں سے دو منٹ میں طے کیا۔ اگر ہم دوڑتے تو شک کی زد میں آجاتے۔ دوبار بائیں طرف مڑ کے ہم پچھلی گلی میں آگئے۔ دور سے ہم نے جیرے بلینڈ کو دیکھا جو پولیس انسپکٹر کی وردی میں بڑی شان اور بے خوفی سے کھڑا تھا۔ اس کی جیب میں بیٹھے ہوئے شخص سے بحث جاری تھی۔

میں اور رئیس بے نیازی سے آگے پیچھے چلے ہوئے ان کے قریب سے گزرے تو عام راہ گیر کی طرح تماشا دیکھنے رک گئے۔ پولیس کی غیر متوقع مداخلت نے استاد کو پریشان کر دیا تھا۔ استاد نے پہلے جھوٹ سے کام چلانا چاہا تھا کہ اس کی جیب خراب ہو گئی ہے اور اس نے بندہ سمجھا ہے کہ کینک کو بلالائے مگر جیرے بلینڈ نے اچانک اچھٹیشن سوچ میں آگئی ہوئی چابی تھما کے اچن اشارت کر دیا تو اس جھوٹ کی فلی کل کی۔

"اوسے سچ بتادے کیا کر رہا ہے تو یہاں؟" "اوپنی تھانے دار صاحب کی بات تو یہ ہے کہ میں کسی کا انتظار کر رہا تھا۔" استاد نے شرمندہ ہوئے بغیر بے تکلفی سے کہا۔

"کس کا؟ اور تو بے کون کا انداز میں گاڑی کے؟" "اوجی سب کچھ ہے۔ آپ ملک رب نواز کو جانتے ہونا؟" استاد نے پوچھا۔

"میں اپنے باپ کو بھی نہیں جانتا۔ تجھے تھانے چلنا ہوگا میرے ساتھ۔ مشکوک بندہ ہے تو۔"

استاد نے پینٹرا بڈلا "تھانے دار صاحب" تھانے جا کے جو بات کرنی ہے ادھر ہی کرلو۔ آپ فائدے میں رہو گے۔ ادھر تھانے میں کسی افسر کا فون آگیا تو لگ پتا جائے گا کہ ہم مشکوک ہیں یا نہیں۔"

جیرے بلینڈ نے اس کے ایک ہاتھ مارا۔ یہ وار اتنا غیر متوقع اور بھرپور تھا کہ استاد پر چودہ طبق روشن ہو گئے ہوں گے "مجھے دھمکی دتا ہے۔ یا خریدنا چاہتا ہے۔ سب سمجھ آگئی ہے مجھے تم ڈاکے ڈالتے ہو۔ باقی ساتھی کہاں ہیں تیرے؟" مسلسل گالیاں دینے کے ساتھ جیرے نے اسے باہر کھینچ لیا۔

استاد نے احتجاج کیا "اوپنی یہ ٹھیک نہیں کر رہے ہو

آپ!" میں نے عام راہ گیر کی طرح کہا "آخر کون ہے یہ بندہ۔ پہلے تو ادھر نہیں دیکھا۔"

رئیس نے میری تائید میں سر ہلایا "میں بھی ادھر ہی رہتا ہوں۔ سب کو جانتا ہوں۔"

جیرے نے ہماری طرف دیکھا اور استاد کا گریبان پکڑ کے ایک جھٹکا دیا "کیوں بھی ادھر کسی کو جانتا ہے تو ہے کوئی تیرا گواہ؟"

استاد نے پریشانی سے کہا "اوپنی سارا شر جانتا ہے ہمیں۔"

"ادھر کی بات کر۔ کس کا انتظار کر رہا تھا تو؟" جیرے بلینڈ نے عین تھانے داروں کے انداز میں اسے گالی دی "کس گھر میں گئے ہیں تیرے بندے ڈاکا ڈالنے؟" "جناب عالی۔ میں ملک رب نواز۔"

جیرے سفس کا سر جیب پر مارا "تیرے ملک کی تسمہ؟" میں نے کہا "تھانے دار صاحب اس کو چھوڑنا نہیں۔ وارداتیں بہت ہونے لگی ہیں ادھر اچانک۔"

رئیس نے بھی سر ہلایا "یہ بندہ شکل سے ہی چور لگتا ہے۔"

"چل بیٹھ گاڑی میں میرے ساتھ" جیرے نے اسے گھٹینا شروع کیا۔ "تھانے جا کے بولے گا تو۔ میری مار سے تو کھبا بھی بولے لگتا ہے۔"

استاد اتنا کمزور بھی نہیں تھا کہ گالیوں کے ساتھ مار بھی کھانا دیتا لیکن اس کا واسطہ عام آدمی سے نہیں "ایک وردی والے کے تھانے دار سے پڑ گیا تھا۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ یہ معاملہ بیس ختم ہو جائے یا کم مکی کوئی صورت نکل آئے۔ ملک رب نواز کے نام کا حوالہ بہت مؤثر تھا لیکن اس جیسے شہر میں بہت تھے اور ہر تھانے دار جو ملک صاحب کے مرچے اور مقام سے ناواقف ہو ایسے ہی اکثر فون دکھانا ہے۔ اس نے بہتر سمجھا کہ خاموشی سے تھانے دار کے ساتھ چلا جائے۔ یہاں ہنگامہ آرائی سے لوگوں کو اکٹھا ہونے کا ڈر تھا اور اسے کچھ حاصل بھی نہ ہوتا۔ اسے یقین ہوگا کہ کچھ دور جا کے وہ قتل سے تھانے دار کو سمجھائے گا کہ ملک صاحب کون ہیں اور ان کا کتنا اثر سوچ ہے تو تھانے دار کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے گا۔ اسے فکر لاحق ہوگی کہ اب خود کو معطل یا تھانہ تبدیلی سے کیسے بچائے پھر وہ خود معاملہ رفع دفع کرنے کی کوشش کرے گا اور استاد اسے معاف کر کے چند منٹ میں لوٹ آئے گا۔

استاد نے بڑی چھٹی سے کام لیا۔ وہ تھانے دار کے ساتھ جیب میں بیٹھ گیا۔ شور سن کے بہت سے لوگ گھروں سے جھانکنے لگے تھے اور ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ کیا معاملہ ہے۔ ریس نہیں ہے۔ یہ تو اواز بلند ایک شخص کے سوال کے جواب میں کہا کہ ذہنی کی نیت سے آنے والے بندے پکڑے گئے ہیں۔ اسے معلوم ہو گا کہ اب یہی خبر ایک گھر سے دوسرے گھر تک پھیلے گی تو ہر شخص ذہب داستان کے لیے تھوڑا بہت اضافہ کرنا جائے گا اور شاید کل کوئی یہ کتا بھی سنا جائے کہ رات کو ذہنی کی بڑی زبردست واردات ہوئی۔ لاکھوں کا زور اور بندے لگے ڈاکو پولیس آئی بھی بروقت مگر سنا ہے انہوں نے ڈاکوؤں کو چھوڑا۔ مقابلہ کے بغیر فرار ہونے کا موقع دیا۔ ادنیٰ سب آپس میں ملے ہوئے ہیں۔

استاد کے دونوں شاگرد اور ان کے ساتھ آنے والا قتل ساز بھی بڑی دانش مندی کا ثبوت دیتے ہوئے اندر دیکھ گئے تھے۔ انہوں نے یقیناً باہر ہونے والے ہنگامے کی سب آوازیں سنی ہوں گی اور سمجھ گئے ہوں گے کہ کس سے کوئی بھولا بھنگا تھانے دار اچانک ادھر آگیا تھا اور اس نے استاد کو ملکوک قرار دے کے پکڑ لیا تھا۔ خیر استاد آخر استاد ہے وہ اس جیسے ایک سواک تھانے داروں سے خائف کا تجربہ رکھتا ہے۔ استاد نے اپنی زبان نہیں کھولی تھی اور یہ نہیں بتایا تھا کہ جہاں اسے کوئی نہیں جانتا وہاں وہ تو بھی رات کے وقت جیب میں بیٹھا کیا کر رہا تھا۔ یہ بتانے والی بات بھی نہیں تھی۔ وہ بعد میں تھانے دار کو بتا دے گا کہ کون کیا ہے اور اسے تھانے لے جانے کے تفتیش کی دھمکی دینے والا تھانے دار استاد سے معافی مانگے گا اور افسوس کرتا ہوا چلا جائے گا کہ کب تکا کے اختیارات کو کیش کرانے کا کیا شہری موقع اس کی حماقت کے باعث ہاتھ سے نکل گیا۔ استاد باعزت طور پر واپس آتا ہی ہو گا۔

جب انسپکٹر نذیر یعنی جڑے بلڈ کی جیب نفلوں سے او جمل ہو گئی تو میں نے اور ریس نے بھی اجنبیوں کی طرح اپنا اپنا راستہ پکڑا۔ استاد کی جیب ابھی تک وہیں موجود تھی مگر دیکھنے والوں کے لیے اب کوئی تماشا نہ رہا تھا۔ کھڑکیوں کے پٹ اور دروازے بند ہونے لگے۔ لائش دوبارہ آف ہو گئیں۔ میں نے ریس کو مخالف سمت میں چالیس پچاس قدم کے فاصلے پر رک کے پلٹے دیکھا۔ چھت کے اوپر سے تیس مارخان نے کلا شکوفہ لہرا کے اپنے مورچا بند ہونے کا ثبوت فراہم کیا۔

میں اور ریس تقریباً ایک ساتھ جیب تک پہنچے اور

پچھنے والی سیٹوں پر بیٹھ کے انتظار کرنے لگے۔ ہماری توقعات کے عین مطابق چند منٹ کے بعد دکان کا شٹر تھوڑا سا اوپر اٹھا۔ یہ کام خاموشی سے کیا ہی نہیں جاسکتا تھا۔ شٹر اٹھانے والوں نے کچھ دیر توقف کیا اور پھر شٹر اٹھایا۔ شاید کسی نے نیچے سے جھانک کے دیکھا ہو گا تو اسے باہر نہ کوئی حرکت نظر آئی ہوگی اور نہ کوئی آواز سنائی دی ہوگی۔ اگلی کوشش میں شٹر اتنا اٹھ گیا کہ کوئی ریک کے باہر آسکتا تھا۔ ہم جیب سے اتر کے اس کی اوٹ میں کھڑے ہو گئے۔

”گھنٹی تے کھڑی ہے تھانے“ یہ آواز چندرے والے کی تھی۔ ”میں نکل جاؤں گی؟“

پچھنے سے کسی نے کہا ”نکل جا نہیں تو میں لات مار کے باہر کر دوں گا۔“

”ادنی میرے پیسے“ قتل ساز بولا۔

”پیسے استاد دے گا۔ ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ چل دفع ہو۔“

”استاد تمہاریا ہے تھانے کیا مجھے بھی تھانے جانا ہو گا؟“

قتل ساز نے دہائی دی ”مجھے تو آپ ادھر ہی فارغ کر دوں گی۔“

”سوئے پاگل خانے۔ جان کیوں نکل جا رہی ہے تیری۔“

پیسے کس نہیں جانتے تھے لیکن استاد کو آنے دے ”یہ آواز کر لے کی تھی۔“

”اویار کر لے۔ اگر استاد نہ آیا فیر ہائے میں مر گیا“

قتل ساز چلا۔

عالمبا کر لے نے اسے پچھنے سے لات رسید کی تھی ”پھر کر لے کا تو۔“ کر لے کی باقی بات کو ناقابل اشاعت سمجھا جائے۔

”دیکھو۔ میں نے آپ کے ساتھ نہیں جانا۔ آج اللہ نے بچا لیا ورنہ رات بھر تھانے میں چھترول ہوئی۔ کیا پتا استاد کی شروع ہو گئی ہو۔ اتنی دیر ہو گئی۔“

”ہے کسی کی مجال جو استاد کو تھانے میں ایک منٹ بھی روک سکے“ اس نے ادھر جاتے ہی ملک صاحب کو فون کرنا ہے اور ملک صاحب نے آگے فون کھڑکا ہے کسی افسر کو۔“

”اچھا جی“ میں تو چلا ہوں۔ ایسا نہ ہو آپ کے ساتھ میں بھی پکڑا جاؤں اور میرے پیسے چوہے دان میں سے چوہے پکڑے جاتے ہیں۔“ قتل ساز بولا۔

”کیوں پیسے نہیں لینے؟“

”پیسے میں نے لوں گا ملک صاحب سے۔ وہ بڑے بادشاہ لوگ ہیں۔ غریب کا حق نہیں مار سکتے۔ وہ باہر نکل آتا۔“

پچھنے سے کر لے نے ہنس کے کہا ”دراغریب کو دیکھو۔“

حق کی بات کرتا ہے خرا۔“

قتل ساز نے خوفزدہ انداز میں ادھر ادھر دیکھا اور پھر تیز تیز قدموں سے ادھر ہی روانہ ہو گیا جہر سے جیب آئی تھی۔ استاد کے دونوں شاگرد اب زیادہ بے خوف اور برا اعتماد ہو گئے تھے۔ باہر سب ٹھیک تھا۔ انہوں نے شٹر کو مزید اوپر اٹھایا اور آرام سے باہر نکل آئے۔ جیب سے کچھ فاصلے پر رک کے انہوں نے سرکشیں جلا کیں۔

”یار یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی“ کر لے نے کہا۔ اس کے سامنے نے ایک سونا لگایا ”ہمیں تو کل ہی سمجھ آئی تھی مگر استاد نہیں مانتا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ گڈی دکان کے اندر رہی ہے“ اسے آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

”یار“ آواز بتا نہیں کہ میرے آری تھی۔

”تو نے بھی دیکھ لیا اپنی آنکھوں سے۔ اندر پر چون کے سامان کے سوا کچھ نہیں ہے۔ لوگوں نے جو بتایا تھا غلط نہیں تھا۔“ کر لے کا ساتھی بولا۔

کر لے جیسے خود سے بولا ”کمال ہے پھر تو آواز کیوں آ رہی تھی؟“

”مجھے کیا پتا۔ یہ چیزیں خراب بھی ہو جاتی ہیں“ وہ جھجکا کے بولا ”استاد کو گئے دس منٹ ہو گئے۔“ وہ گھڑی دیکھ کے بے چین ہونے لگا۔

کر لے نے ایک اندیشے کا اظہار کیا ”وہ برا کڑک تھانے دار تھا کوئی۔ کہیں ایسا نہ ہو۔ استاد سے تفتیش شروع کر دے۔“

”ایسا نہیں ہو سکتا۔“ وہ بولا مگر اس کا لہجہ یقین سے عاری تھا۔

”سب ہو سکتا ہے۔ میں نے دیکھے ہیں ایسے تھانے دار جو نہ چپہ لیتے ہیں اور نہ سفارش مانتے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں ہمیں بھی نکل جانا چاہیے۔“

”کیا بکواس کر رہا ہے کر لے۔ استاد کی گاڑی کھڑی ہے ادھر ہی۔ وہ آئے گا تو کیا گے گا۔“ وہ کچھ سوچ میں پڑ گیا تھا۔

کر لے نے کہا ”کچھ بھی نہیں کے گا۔ گاڑی لے کر آجائے گا ہمارے پیچھے۔ ہم چل کے ملک صاحب کو بتا دیتے ہیں۔ ادھر فہرے میں خطرہ ہے یا نہیں تھانے سے اور فوری ”ہمیں پکڑنے کے لیے؟“

”کسی کو ہمارے بارے میں معلوم نہیں۔“

کر لے نے کہا ”اگر استاد نے بتا دیا۔ بندہ مجبور ہو جائے یا پڑے تو۔“

وہ مشتعل ہو گیا ”استاد کے بارے میں پھر ایسی بات کی تو۔“

کر لے نے لجاجت سے کہا ”چل یار ظلمی ہو گئی مگر دیکھ استاد آگے اگر گرم ہو گیا کہ تم کو سوچ ملا تھا تو تم گئے کیوں نہیں۔ ادھر کیوں کھڑے ہو ابھی تک۔ گڈی کی کھڑ چھوڑ گڈی کس نہیں جاتی۔“

”چھوڑ دے۔ اپنے ملک صاحب کو بتا دے گے کیا ہوا تھا۔“

کر لے نے کہا ”دکان کھلی ہوئی ہے۔ بند کر دوں۔“

”دکان کیا تیرے باپ کی ہے جو تجھے فکر ہو رہی ہے۔ چل بیٹھ۔“ کر لے کے ساتھی نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کے کہا۔

ہم نے بڑی مشکل سے خود کو جیب کی اوٹ میں رکھا تھا۔ جلدی میں انہوں نے مڑ کے بھی نہیں دیکھا اور جیب اشارت کر دی۔ اس وقت ہم تھوڑا سا گھوم کے جیب کے پیچھے آچکے تھے۔ وہ جیب کو ہیڈ لائٹ چلائے بغیر چلا کے لے گئے تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ انہیں ہماری موجودگی کا شک بھی نہیں ہوا۔ دراصل یہ پلان بہت سوچ سمجھ کے بنایا گیا تھا۔ اگر ہم چاہتے تو شٹر اٹھا کے اس وقت اندر چلے جاتے جب تینوں چور وہاں موجود تھے۔ ان کے ساتھ ہمارا مقابلہ بالکل یکطرفہ ہوتا۔ اگر وہ مسلح ہوتے تب بھی مار کھاتے اور ہم انہیں گرفتار کر لیتے لیکن اس کا کوئی فائدہ ہونے کے بجائے نقصان ہوتا۔ ملک رب نواز کو شک ہو جاتا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ گھٹل پیلے دکان میں سے صاف سنائی دے رہا تھا پھر بند ہو گیا۔ تو بھی رات کے وقت اس لاوارث دکان میں آگے میرے بندوں کو چھینٹی کس نے لگائی اور کیوں؟ وہ آس پاس اپنے بندے مگرانی کے لیے چھوڑتا تو ہمارے لیے خواہ مخواہ کی پریشانی ہو جاتی۔

اب معاملے کا رخ پلٹ گیا تھا۔ ملک رب نواز نے گزشتہ دن کی رپورٹ پر غمزدہ تھا کہ رات کو اپنے ساتھ کسی اچھے قتل ساز کو لے کر پھر جاؤ اور اس دکان کا شٹر کھول کے اندر چلے جاؤ۔ خاموشی سے اپنا کام کرو اور نکل آؤ۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو خیال رہے۔

وہ کیا کام تھا جس کے لیے انہوں نے اتنا تردد کیا تھا۔ اس کے بارے میں ابھی ہم کچھ نہیں جانتے تھے شاید وہ گاڑی میں بم فٹ کرنے آئے ہوں؟ اس خفیہ راستے سے اندر تو کچھ کاراز معلوم کرنا چاہتے ہوں۔ ان کا مشن اچانک

☆ 169 ☆ ساتواں حصہ

☆ 168 ☆ ساتواں حصہ

☆ 169 ☆ ساتواں حصہ

☆ 168 ☆ ساتواں حصہ

☆ 169 ☆ ساتواں حصہ

☆ 168 ☆ ساتواں حصہ

☆ 169 ☆ ساتواں حصہ

☆ 168 ☆ ساتواں حصہ



وقت فی جلد
250
روپے

دو جلدوں میں مکمل

خونخوار منگول چنگیز خان کے خون آشام عہد کی ایک جھلک
کوہ الطائی کے برف پوش پہاڑوں سے آنے والے ایک
جستی نوجوان کا قصہ جس کا نام سن کر منگول بھی کانپ اٹھتے تھے
پہاڑوں سے نکلنے والے، چٹانوں سے بڑنے والے اور
طوفانوں سے اٹھنے والے وحشی دیوانے کی داستان حیرت

تاریخ کے ڈھکے چھپے گوشوں سے
کشید کیا ہوا ناقابل فراموش ناول

اپنے بارگاہ شہر کے براہتہ بنگل سے عجب نہیں
رقم شگنی مئی آرڈر سال کرنے پر ڈاک خرچ بذمہ دار ہوگا

ناشر
ہلالی پبلکیشنز

۲۰ عزیز مارکیٹ، اردو بازار لاہور 7247414

نسبت روزی
چوک میوہ پستان
لاہور

الاسٹک والا میٹریز چھایا پھر اس کے سر پر ایک کچے کا
غلاف ایسے چھایا جیسے تختہ لکڑی پر لے جائے جانے والے
بحر سوں کے چھایا جاتا ہے۔

”جھل ٹھیک ہے۔ اب پہلے اسے ہوش میں لا“ رئیس
نے کہا۔ ”اس کے ہوش میں آنے سے پہلے باقی
انتظامات بھی کر لینے چاہئیں۔“

پانی کے چھینٹے مارنے اور زور زور سے ہلانے جلاسنے کے
نتیجے میں استاد نے کراہتا شروع کیا تو اسے ایک کرسی پر بٹھا دیا
گیا۔ وہ ادھر ادھر گرے لگا۔ تیس مارغان نے اس کے ہاتھ
کرسی کی پشت کے پیچھے باندھے اور پھر اس کے دونوں بیروں
کو کرسی کے سامنے والے دو پاؤں کے ساتھ باندھ دیا۔ اب
وہ انھنے کی کوشش بھی کرنا تو کرسی سمیت لڑھک جاتا۔

استادی کا سرا بھی تک ان کی گردن کے ساتھ دائیں
بائیں ایسے مل رہا تھا جیسے ان کو جوڑنے والے بیج ڈھیلے
پڑ گئے ہیں۔ اس کے حلق سے اب بے معنی قسم کے
ادھورے الفاظ نکل رہے تھے۔ ہم نے یہاں ایک تھانے
کا منظر ایسے پیش کرنے کی منصوبہ بندی کی تھی جیسے ریڈیو
اشیئن کے ڈراما اسٹوڈیو میں صرف آوازوں کے تاثر سے
سننے والوں کو ہر منظر سنایا جاتا ہے۔ سمندر کا شور، میدان
جنگ کی گھن گھن، ٹرین کا سفر، جیسے ہر سین کو سننے والے
اپنے تصور کی مدد سے دیکھ بھی لیتے ہیں۔

پوری طرح ہوش میں آنے کے بعد استادی نے روایتی
انداز میں پہلے یہی پوچھا کہ میں کہاں ہوں اور جب اپنی
حالت سے اسے خود اپنے سوال کا جواب مل گیا تو وہ پوچھنے لگا
کہ مجھے کس نے ایسے باندھا ہے؟ میں کہتا ہوں چھوڑ دو مجھے
ورنہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ کدھر ہے وہ تھانے دار؟

اس کی کسی بات کا کسی نے بھی جواب نہیں دیا۔ ہم
دوسرے کمرے میں وہی باتیں کر رہے تھے جو عام طور پر
تھانوں میں ہوتی ہیں۔ ہم پولیس کی مخصوص گالیوں سے
مرصع زبان بھی بے تکلفی سے استعمال کر رہے تھے اور اسی
لے ہم نے خواتین کو نہ خانے میں آنے سے ہی روک دیا تھا
حالانکہ تفتیش کے عمل اور نتائج سے انہیں بھی دلچسپی تھی۔
آوازیں سے استادی کو یہ سمجھ آگئی ہوگی کہ اسے
تھانے کے کسی الگ حصے میں رکھا گیا ہے۔ ایسا حصہ بدنام
زمانہ ڈراما گ روم ہی ہو سکتا تھا جہاں ہر مجرم پر تھوڑی ڈگری
کے لرزہ خیز تشدد طریقے آزما کے تفتیش کی جاتی ہے۔ اس
نے یہ بھی اندازہ کر لیا ہوگا کہ دوسرے کمرے میں شریک

قید پولیس کے سراغ لگانے والے کتوں کو کھلا دیتے۔ اس
کے بعد تو یہ کی تھی میں نے۔“

”ہم سے جھوٹ مت بول یا رے۔ چور جاتا ہے چوری
سے ہمیرا پھیری سے نہیں۔“

جبراخت سے سر کھانے لگا ”وہ یا رے۔ بس سال میں ایک
دو بار عید بقرید۔ اپنا خرچا پورا کرنے کے لیے مجبوری میں
وردی پہنتا تھا۔“

”یہ تو نے ایک نیکی کا کام کیا ہے“ رئیس نے کہا۔
”وہ تو اچھا ہوا رات کا وقت تھا۔ اسے زیادہ دن میری
صورت یاد نہیں رہے گی۔ آگے جا کے اس نے مجھے پھر ملک
رب نواز کے نام کی بڑی دی کہ وہ میری وردی چینی اتروا دے
گا۔ سو یا کل فون بھی تھا اس کے پاس۔ میں نے کہا چل تو
بتا دے اسے۔ ہم بھی دیکھ لیتے ہیں وہ کتنی بڑی توپ ہے۔“
میں نے گاڑی کو ایک طرف روک لیا۔

”پھر اس نے فون کیا تھا؟“
”ہاں لیکن ملک سو رہا تھا۔ اس نے پتا نہیں کس کو بتایا
کہ مجھے پولیس نے پکڑ لیا ہے۔ باقی بندے محفوظ ہیں۔ اس
نے میرا نام بتایا اور ساتھ ہی علاقے کا تھانہ بتا دیا۔ اس کا یہی
خیال ہوگا کہ میرا تعلق کسی اور تھانے سے نہیں ہو سکتا اور
ہو تب بھی جس علاقے کی واردات ہو تفتیش تو اسی تھانے
میں ہوتی ہے۔ معلوم نہیں اس سے بات کرنے والا ملک
صاحب کو جگانے پر کیوں راضی نہیں تھا۔ اس نے بڑی گرمی
دکھائی کہ بعد میں ملک صاحب تیری چڑی اور میز دیز کے کمرہ
راضی نہیں ہوا۔“

”اس کا خیال ہوگا کہ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔
ابھی بگایا تو ملک صاحب اسی وقت چڑی اور میز دیز کے کمرے
میں آئے۔“

رئیس نے جھک کر استاد کا معائنہ کیا ”اسے اب تک
ہوش میں آجانا چاہیے۔“
میں نے کہا ”دماغ کی چوٹ کا کیا بھروسہ۔ لوگ میزوں
سلاوں سے ہوش پڑے رہتے ہیں اور اسی حالت میں مر بھی
جاتے ہیں۔“

”یار“ اب ایسے ہی مت ڈرا ہمیں“ رئیس بولا۔
”کوشش کرتے ہیں اسے ہوش میں لانے کی۔ تمیں مارخان“
چل بنا، پہلے تو اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دے کہ سلا بالکل
ہی اندھا ہو جائے، پٹی خود نہ اتار سکے۔“

تمیں مارخان نے بڑی مستعدی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے
استاد کی آنکھوں پر کالے کپڑے کی پٹی باندھنے کے بعد اس پر

پولیس کے آجانے سے ناکام ہو گیا تھا۔ استاد کو پولیس
کئی گھنٹے اور باقی سب اپنی جان بچا کے فرار ہونے میں
کامیاب رہے تھے۔ اب ملک رب نواز سوچتا رہے کہ شر
کے پیچھے واقعی بچوں کی دکان تھی تو پھر وہاں سے گاڑی کی
موجودگی کا سکتل کیوں سنائی دے رہا تھا۔ دکان کا والی وارث
تو کوئی بھی سامنے نہیں آیا تھا اور اس کے بندے دکان کو کھلا
چھوڑ کے بھاگ آئے تھے۔ اندر کوئی گاڑی نہیں تھی۔

ملک رب نواز بھی اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ استاد نے سکتل
تو ساگر آواز کی دست کو سمجھتے ہیں اس سے غلطی ہوئی۔ گاڑی
آس پاس ہی کسی دوسری کو بھی میں موجود ہوگی۔ اس کے
لے زیادہ پریشانی اپنے انخوا شدہ بندے کا سراغ لگانے میں
ہوگی۔ اسے بھی معلوم نہیں ہوگا کہ وہ انسپکٹر پولیس کون تھا۔
جبرالینہ اس وردی پر کئی نام کی پٹی بٹا رہا تھا۔ یہ ہو سکتا تھا
کہ کسی تھانے میں اس نام کا کوئی انسپکٹر یا سب انسپکٹر
جائے مگر ملک رب نواز کا اثر رسوخ بھی استاد کو برآمد کرانے
میں ناکام ثابت ہوگا۔ وہ کسی تھانے میں نہیں رہیں خانے کی
حوالات میں تھا۔

جبرے بلینے استاد کو ایک بے حس و حرکت بنگل کی
صورت میں لا کر تھانے میں ڈال دیا تھا۔ ہمارے پیچھے تک
وہ اسی حالت میں زمین پر پڑا ہوا تھا۔
رئیس نے جبرے کے کندھے پر جھکی دی ”کوئی گزرتو
نہیں ہوئی؟“

جبرے بلینے نفی میں سر ہلایا ”گزرتو کیا ہو سکتی تھی۔ اپنا
اتنا تجربہ ہو گیا ہے پولیس کی نوکری میں لیکن یار“ ایسے کام کے
لے مت کہا کر مجھے۔“
”کیوں۔ اتنے تجربے کے بعد تجھے کوئی ڈر نہیں ہونا
چاہیے۔“

جبرہ اسکرایا ”تجھے پتا ہے میں ایک بار پکڑا گیا تھا۔ اس
زمانے میں برا چرچا ہو گیا تھا میرے کارناموں کا۔ پولیس
والے بڑے کامیاب لوگ ہوتے ہیں۔ کوئی باہر کا بندہ ان کی
وردی پن لے اور ان کے حق پر ڈاکا ڈالنے لگے تو خیر ل جاتی
ہے انہیں۔ آج بھی میرا پیشاب خطا ہو جاتا ہے اس بات کو
یاد رکھ۔“

رئیس نے کہا ”تجھے مرحوم خدا بخش مندرال نے
دوسرے دن ہی چھڑا لیا تھا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مگر اس ایک رات میں مارخان کے انہوں
نے میرا تو قید بنادیا تھا۔ سب بڑے ثواب کا کام سمجھ کے
بڑے جوش و خروش سے کر رہے تھے۔ مرخان میں تو وہ میرا

اخلاقیات کے اصولوں کی سو فیصد پاسداری ہو۔“
 معاشرے میں سب نے اپنا اعتبار کھودا ہے صحافت پہلے نام
 تھا حق کوئی دے باقی کا۔ صحافت ایک مشن تھا جس کے لیے
 بڑی قربانیاں دینی پڑی تھیں اور جابر سلطان کے سامنے کھڑے

طاہر جاوید نعل کے طلسم ہوشربا
تسلم سے ایک خوبصورت
ناول

اندھی

ایک آپ بیتی، خونچکاں
 ایک نندہ ٹرکے والا ایڈوچر جس
 میں آپ بہتے پھلے بجائیں گے

جلد اول: ۱۵۰ روپے
 جلد دوم: ۱۵۰ روپے

اپنے ہا کر یا قریبی بکسٹال سے طلبہ فرمایا
 براہ راست منگوانے کا پتہ:

ناشر: **علی میاں پبلیکیشنز**
 ۲۔ عزیز مارکیٹ اڈو بازار لاہور۔ فون: ۴۲۳۷۳۱۳

بادے۔ تمیں مارخان لے آئے گا۔“
 میں نے اوپر آکے خاصا سکون محسوس کیا۔ میرے
 اعصاب تشدد کے اس مظاہرے سے متاثر ہوئے تھے۔
 میرے کانوں میں استاد کی پُر اذیت چیخوں کا شور گونج رہا تھا
 اور میں خود کو دلائل سے قائل کرنے میں ناکام تھا کہ ہمارے
 پاس معلومات حاصل کرنے کا اور کوئی مؤثر ذریعہ نہیں۔
 ختم اور سونی ایک کمرے میں منہ لٹکائے بیٹھی تھیں۔
 ”کیا ہوا۔ کچھ بتایا اس نے؟“
 میں نے کہا ”بھئی تعیش جاری ہے۔ تم کیوں پریشان
 بیٹھی ہو؟“
 ختم نے کہا ”کتنا تشدد کرو گے تم آخر؟“
 ”ڈکھو بی بی“ صحافت میں سچ اگھوانے کے لیے تم بھی
 کتنے پاپ بلیٹی ہو۔ جائز اور اخلاقی طریقوں سے کبھی تم کو کچھ
 حاصل ہوا؟ ناکامی کے سوا۔ رہیں اور جیڑا بلڈ تجربہ رکھتے
 ہیں سچ اگھوانے کے فن میں۔ چنانچہ میں نے تعیش ان پر
 چھوڑ دی ہے۔ اب تمہارے حق میں یہی بہتر ہے کہ سو جاؤ۔
 ایسے جانگے کا اثر صرف تمہاری صحت پر برپا ہے گا۔“
 ”تم سو سکتے ہو آرام سے؟“ ختم نے کہا۔
 ”اچھا دکھو“ چائے چاہیے رہیں اور جیڑے بلڈ کو۔
 تمیں مارخان آکے لے جائے گا۔ ایک کپ مجھے بھی دے
 دیتا۔“
 سونی فوراً اٹھی ”میں بتاتی ہوں چائے۔ آپ کو تو نیچے
 بھی دے آؤں۔“
 ”تم ہرگز نہیں۔ تمہارا وہاں جانا قطعی نامناسب
 ہے“ میں نے کہا۔
 وہ مسکرائی ”آپ فکر مت کرو۔ برا مضبوط دل ہے
 میرا۔ سب دیکھ اور جمیل بچکی ہوں میں۔“
 میرے منع کرنے کے باوجود وہ چائے لے کر خانے
 میں پہنچ گئی۔ میں ختم کو چمت پر لے گیا اور اس کا ہاتھ تمام
 کے ٹٹکارا ہاروں کو شش کرتا رہا کہ اس کا حیان اچھا دھڑکی
 باتوں سے بناؤں۔ وہ دھم سے زیادہ TENSE تھی۔ میرے
 لیے اسے لطفینا کے شائنا بالکل ناممکن تھا مگر ایک موضوع
 ایسا تھا جس میں وہ دلچسپی لینے پر مجبور ہو گئی۔
 ”آج جب تم نے مجھے بتایا کہ فرد عباسی نے نکالت کے
 پیٹے کو بھی خیرباد کہہ دیا ہے جو بڑا معزز اور NOBLE پیشہ
 سمجھا جاتا تھا“ ڈاکٹری اور صحافت کی طرح۔ تو میں سوچتا رہا کہ
 آخر اس کا گزارا کیسے ہو گا؟ کیا کرے گا وہ اس دنیا میں رہ
 کے؟ میں اس تو کوئی پروڈیشن ایسا نہیں رہا جس میں پیشہ ورانہ

پولیس اور تھانے سے قریبی تعلق میں گزارا تھا“ اس نے سچ
 اگھوانے کی ٹھیک میں مہارت کا مظاہرہ کیا۔
 استاد کو یہاں گلا بھاڑ کے چھیننے خدا کو یاد کرنے
 دھمکیاں اور گالیاں دینے کی پوری آزادی حاصل تھی۔ اس
 کی آواز زمین کے اوپر کسی کے کانوں تک پہنچ ہی نہیں سکتی
 تھی۔ رہیں نے اسے نکال کر کے لبا ڈالا اور پھر ایک چڑے
 کے بیٹل سے سچ سچ اس کی کھال اور میز دی۔ اس نے بہت
 شور مچایا ترنا اور بھلا۔ خدا رسول اور قرآن کی قسم کھا کے
 یقین دلائے کہ اس کو شش کی کہ اس کا نام تار علی ہے اور جو کچھ
 اس نے بتایا وہی سچ تھا مگر رہیں کا ہاتھ نہیں رکھا۔ یہ سنگدلی
 اور سفاکی کا مظاہرہ کمزور دل والا برداشت نہیں کر سکتا تھا
 لیکن اس کے بنا چاہہ نہ تھا۔
 استاد کی کھال جگہ جگہ سے پھٹ گئی اور اس میں سے
 خون رسنے لگا تو رہیں نے دو سراجبہ آزمایا۔ میں نے اور
 جیڑے نے استاد کو ہاتھوں اور پیروں کی طرف سے ایسے جکڑ
 رکھا تھا کہ وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا تھا۔ وہ اشتیاقاً قائل
 کھاتا تھا اور اچھلنے کی کوشش کرتا تھا مگر ابھی تک اس میں
 مزاحمت کی قوت باقی تھی۔ اس جیسے کچے بھرم آسانی سے کچھ
 نہیں بتا سکتے۔
 جب تمیں مارخان نے نمک ملا ہوا ابلتا ہوا اگر مہربانی
 استاد کے زخموں پر ڈالنا شروع کیا تو اس کی چیخوں سے کمرے
 کی دیواریں لرزنے لگیں۔ خود مجھے اس کو قابو میں رکھنے کے
 لیے سخت محنت کرنی پڑی تھی اور جیڑا بلڈ بھی ہانپنے لگا تھا۔
 چند منٹ میں ہی استاد کے لیے اذیت ناقابل برداشت ہو گئی
 اور وہ بے ہوش ہو گیا۔
 میں نے اسے چھوڑ کے ایک لمبی گہری سانس لی ”یار“
 بہت ہو گیا۔“
 ”کیا بہت ہو گیا۔ ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا“ جیڑا ہنسنا اور
 کرسی پر بیٹھ گیا۔
 ”کیا بتا اس نے سچ ہی کہا ہو؟“ میں نے کہا۔
 ”شرط لگاؤ۔ دوسری بار میں یہ آدھا سچ بتائے گا۔ باقی
 آدھے کے لیے پھر کوشش کرنی پڑے گی۔ اب اس میں زیادہ
 دم نہیں رہا۔ تم جاہو تو اور جا کے آرام کرو۔ صبح تک رہیں
 اور میں تعیش مکمل کر لیں گے“ جیڑے بلڈ نے کہا۔
 میں نے کہا ”کیا واقعی مجھے اجازت ہے۔“
 ”ہاں تو جا۔ تیرا دل اتنا سخت نہیں ہے“ رہیں بولا ”وہ
 دونوں بھی تشویش میں مبتلا جاگ رہی ہوں گی۔ انہیں بھی کچھ
 تسلی ہوگی۔ اگر چھوٹی بھی جاگ رہی ہو تو اسے کتنا چائے

منگواؤ افراد میں ایک ڈیوٹی افسر ہے ایک بیڑہ عمر اور ایک
 کافینیل۔ وہ سب انچارج صاحب کی آمد کا انتظار کر رہے
 تھے۔ استاد کو مزہ دہشت زدہ کرنے کے لیے رہیں نے ٹھیک
 وقت پر ایک نیپ ریکارڈ چلا دیا۔ اس میں جیڑا اور فریادوں
 فغان کی لمبی آوازیں بڑی محنت سے بھری گئی تھیں جن کو
 سن کر استاد اس کے سوا اور کچھ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ
 قریب ہی کہیں کسی مجرم سے روانہ انداز میں بڑے زور شور
 سے تعیش کی جارہی ہے۔ ظاہر ہے زور پولیس کا تھا اور
 شور مجرم کا۔ یہ سب مشکل سے دس پندرہ منٹ کا کیسٹ پر
 ریکارڈ کیا ہوا ڈراما تھا جس میں خواتین کی آہ و بکا اور منت
 زاری کا بھی کچھ حصہ تھا۔ وہ مجرم کو تشدد سے بچانے کے لیے
 رجم کی درخواست کر رہی تھیں اور اس کے بدلے میں سب
 کچھ کرنے اور دینے کو تیار تھیں۔ اس ریکارڈنگ کو ختم
 بڑی محنت سے ایڈٹ کیا تھا۔
 اچانک کسی نے کہا ”اے انچارج صاحب آجیے۔“
 پھر انچارج صاحب نے دھاڑ کے کہا ”اے“ یہ کیا شور
 شرابا ہے۔ یہ آواز جیڑے بلڈ کی تھی۔ ہم نے فرش پر
 ایدھیان مار کے سیلٹ کا تاڑ دیا۔
 ”اس بندے سے کچھ معلوم ہوا؟“ انچارج صاحب نے
 سوال کیا۔
 ”ابھی ہوش میں آیا ہے جناب۔ آپ کے سامنے دو
 منٹ میں سب پوچھ لیتے ہیں“ میں نے کہا۔
 دو منٹ کے بعد جیڑے بلڈ نے تھانے والوں والی
 چھڑی کی نوک استاد کی گردن کے نچلے حصے پر رکھی اور دباؤ
 ڈالا ”کیوں اوتے کیا نام ہے تیرا؟“
 استاد نے بڑی مشکل سے جواب دیا ”تار علی۔“
 جیڑے نے پے درپے کئی سوالات کیے۔ باپ کا نام ”پتا“
 بیوی بچوں کی تفصیلات۔ ماں باپ اور بھائی بہن کے بارے
 میں۔ وہ کہاں رہتے ہیں کیا کرتے ہیں۔ پندرہ منٹ کے بعد
 اس نے مین تھانے والوں کے اسٹائل میں اس پر بید
 برسانے شروع کئے۔ استاد نے ترنا اور چلا نا شروع کیا۔
 ”ڈرا اسے سچ بولنا سکھاؤ۔“ جیڑے نے بالآخر حکم دیا۔
 ایک عام آدمی کسی ثبوت کے بغیر نہیں کہہ سکتا تھا کہ استاد
 جی جوتے کھا کے بھی جھوٹ بول رہے ہوں گے مگر جیڑا بلڈ
 جعلی ہونے کے باوجود اصل تھانے دار سے کم سیانا نہیں تھا
 اور اس کا تجربہ کتنا تھا کہ ایسے مجرم تھانے میں سچ بولنے کے
 لیے نہیں آتے۔ سچ کون ان کے اندر سے ایسے نکالنا پڑتا ہے
 جیسے سچ سے تیل۔ رہیں نے بھی اپنی زندگی کا بیشتر حصہ

حق کما کر ایک مقدس فریضہ تھا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ میں ہر جگہ فحشے سرافحہ کے خود کو صفائی کتے ہوئے جھک محسوس کرتی ہوں کیونکہ اس پیشے میں آنے والے بہت لوگ واقعی بچ کو زندہ دفن کرنے اور جھوٹ کی تبلیغ کرنے والے بلیک میلر ہیں۔

میں نے کہا ”بھئی ڈاکٹر کیا تھا؟“ دیکھی انسانیت کی خدمت کرنے والا۔ صحت اور شفا دینے والا۔ مائتہ کی گود کو خالی ہونے اور سہاگ کو اجڑنے سے بچانے کی جدوجہد کرنے والا مگر آج وہ کیا ہے؟ دکھ، بیماری اور موت کے دھندے کو دولت مندی کا ذریعہ سمجھنے والا۔ دوا ساز اداروں کا کمیشن ایجنٹ۔ مرض کے علاج سے زیادہ مریض کی پریشانی کو EXPLOIT کرنے والا۔

”بے شک سب ایسے نہیں ہوتے مگر وہی پرانی بات کہ ایک مچھلی سارے جل کو گندہ کرتی ہے۔ غلط کام کر کے فائدہ کچھ لوگ اٹھاتے ہیں مگر بدنامی سب کے حصے میں آتی ہے۔ انتہا یہ ہے کہ استاد جو معاشرے میں سب سے زیادہ قابل احترام تھا کیونکہ وہ بچوں کو تعلیم دیتا تھا۔ جسے کالیقہ اور زندگی کے آداب سکھاتا تھا اور اسی لیے روحانی باپ کا درجہ رکھتا تھا وہ بھی آج تعلیم کو جس تجارت سمجھتا ہے علم کو اسی طرح بیچتا ہے جیسے پیواری مال بیچتا ہے۔ بے وقوف بٹاکے، جھوٹ بولی کے گامک کی لاطلی سے فائدہ اٹھا کے۔“

میں نے کہا ”اب ایسی دنیا میں فرید عباسی جیسے جذباتی لوگوں کا گزارا ہو تو کیسے؟“ میاں تو آپ کوئی بھی بزنس کریں بے ایمانی اور ضمیر فروشی کے بغیر ناممکن ہے۔ آپ برا بزنس کریں یا چھوٹا ایک ہی بات ہے۔ حکومتی سطح پر ملکی مفادات کے لیے کیے جانے والے سوڈوں میں بھی کمیشن اور کک بیک عام ہی بات ہے۔ آپ جو در آمد برآمد کریں تو ہر قدم پر کلیرکس کے لیے رشوت ہے۔ ٹیکے داری میں ٹیکے منگور کرنے والوں کا کمیشن ہے۔ ہر کاروبار کی جھوٹ اور بے ایمانی پر بنیاد ہے۔ کبھی تیل کی دکان ڈالو یا مرچ مسالے کی۔ نقلی اور ملاوٹ کا مال ضرور آئے گا اور آپ کو سب جانتے ہوئے گامک کے سامنے جھوٹ تو بولنا ہی پڑے گا کہ چیز اصلی ہے اور خالص ہے۔“

ختم نے کہا ”غلائی گراوٹ کی بھی کوئی انتہا نہیں۔ مارکیٹ میں دو گھبرال کی گھبراہٹ ہے۔ کلی علوں میں بننے والی چیز پر امپورٹ کا ٹیکہ لگایا جاتا ہے۔ بین الاقوامی طور پر اپنی ساتھ بنانے والی کمپنیوں کے نام بے خوبی سے استعمال کئے جا رہے ہیں۔ پلو الیکٹرونکس یا ایسی ہی دیگر مصنوعات میں تو

صرف گامک کا اعتبار جاتا ہے اور مالی نقصان بھی ہوتا ہے مگر نقلی دوا میں ”توبہ توبہ“ جعلی انکشن، سرکاری اسپتالوں کے اندر جو کیسٹ بیٹھے ہیں وہ خدا کا خوف کے بغیر گاؤں دیہات کے اور چھوٹے قصبوں سے آنے والے لوگوں کو لوٹتے ہیں۔ انہیں چوری کی دوا میں فروخت کر دیتے ہیں۔ وہ دوا میں دے دیتے ہیں جن کی معیاد ختم ہو چکی ہے۔ یہ کتنا بڑا جرم ہے انسانیت کے خلاف۔“

میں نے کہا ”مقبول شاعر۔ کس کس کی بات سمجھتے؟ کس کس کو روپے مسئلہ تھا اپنے مولانا فرید عباسی صاحب کا جو رزق حلال کے معاملے میں کسی طرح بھی اپنے ضمیر کے ساتھ منافقت پر تیار نہیں۔ سو فیصد ایمانداری تو ایک تصوراتی چیز ہو گئی ہے۔“

ختم نے کہا ”میں نہیں مانتی۔ دنیا میں ایسے کام ختم نہیں ہوئے۔“

”یو آر اسٹنڈ فرید عباسی ویسے تو صرف ایک نام ہے لیکن درحقیقت یہ ایک فلسفہ حیات ہے۔ مثبت سوچ کی ایک طاقت ہے۔ اسے ایمان بھی کہہ سکتے ہیں اور دنیا میں ایسے ایک نہیں لاکھوں ہیں جو اپنے ایمان کی رسی کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں اور صراطِ مستقیم پر ثابت قدمی سے چل رہے ہیں۔ وہ آزمائش کی بھی میں تب کر ایسا کندن بن گئے ہیں جس میں کھوٹ نہیں اور جسے زمانے کی ہوا متاثر نہیں کر سکتی۔ سونے کو زنگ نہیں لگتا اور وقت کے ساتھ اس کی قدر میں کمی نہیں آتی۔ توبہت سوچنے پر مجھے بالکل الہامی انداز میں ایک خیال آیا اور جب مجھے یہ خیال آیا تو مجھے جراتی بھی ہوئی اور افسوس بھی کہ آخر یہ خیال مجھے پہلے کیوں نہیں آیا لیکن بات وہی ہے کہ سب کچھ اپنے وقت پر ہوتا ہے۔ اتفاقات کے اُن گھٹ سلطے وقت کی مساتوں کو طے کرتے ہیں تو ایک واقعہ پیش آتا ہے۔ مثلاً اس وقت تمہارے ہاتھ کا میرے ہاتھ میں ہوا۔“

وہ مسکرائی ”ہاتھ کی لکیروں میں تقدیر ہوتی ہے۔ میری تقدیر تمہارے ہاتھ میں ہے۔“

میں نے کہا ”ہاتھ کی لکیریں زندگی کے راستے ہیں۔ ان پر کوئی نہ جانے کہاں سے سفر کا آغاز کرتا ہے اور گردشِ شاہد سحر میں بھٹکتا اپنی منزل سے بے خبر چلتا جاتا ہے۔ سولی کو دیکھو ہم سے وہ کیسے ملی تھی۔ اس سے پہلے کیا وہ سوچ بھی سکتی تھی کہ اس کی زندگی میں ایک ایسا موڑ آجائے گا جو اچھی لوگ اسے یوں اپنائیں۔ ہم سب کیسے ایک خانہ ان بن گئے ہیں۔ میں اور تم، ریمیں، سولی، رخصتی اور فرید عباسی۔ کیا

اس میں کسی کے ارادے یا تدبیر کو دخل تھا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ فرید عباسی کے پولیس سے نکالے جانے اور اس کے وکالت جیسے پیشے میں بھی کام کرنے سے ہرگز یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ ملائی ہے یا کام نہ کرنے کے بہانے تلاش کرتا ہے۔“

”وہ ایک بہت ذہین توانائی سے بھرپور اور کھرا آدمی ہے۔“

”بالکل صحیح تجزیہ ہے تمہارا۔ اب تم دیکھو کہ کب سے میں ایک مثالی قسم کے خیم خانے کا پلان لے بیٹھا ہوں۔“

”خیم خانے کا؟“ میں سمجھ گئی۔ اس کی ذمہ داری تم فرید کو سونپ دو گے۔“

”ہاں۔ اس سے زیادہ قابل اعتماد اور موزوں آدمی بھلا کون ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر کمال خوش قسمت ہے کہ اسے بیک وقت اتنے بہت سے اچھے لوگ مل گئے۔ اس کو پیو لی ٹی فیر جیسی پھر چند اس کے ساتھ شامل ہو گئی ورنہ صرف ایک ہے۔ پانچ افراد کی ایسی ٹیم کے ساتھ اس کا مشن کیسے کام ہو سکتا ہے۔ دنیا میں ایک ایسا شریک کار ضرور ہے سے نہیں ملتا جس پر آپ اتنا ہی بھروسہ کر سکتے ہوں جتنا خود اپنے آپ پر اور اس کے ساتھ ایک نہیں پانچ ایسے لوگ ہیں۔“

”اور تم سمجھتے ہو کہ تمہارے ساتھ میں ایک فرید عباسی ہو گا؟“ اس نے کہا ”اور کوئی نہیں ہے تمہارا ساتھ دینے والا۔ تم اتنے متصل کے اندر ہو۔“

میں نے ہنس کے کہا ”یہ کتنی نا بھیجی کی بات ہے۔ دراصل آدمی کی قریب کی نظر خوش قسمتی کے معاملے میں کمزور ہوتی ہے۔ وہ دور دور دیکھتا ہے کہ تقدیر کہاں کس پر مہمان ہوئی۔ خوش قسمتی نے کس کے دروازے پر دستک دی اور کامیابی کی لازمی کس کے نام لگی۔ جو مواقع قدرت نے اسے فراہم کئے، جو کامیابی اسے ملی، جتنے خوابوں کی تعبیر اسے عطا ہوئی۔ یہ سب اسے نظر نہیں آتا۔ جیسے پہاڑ کے دامن میں کوئی سرافحہ اس کی سرشت، برف پوش اور ناقابلِ تسخیر چوٹیوں کو دیکھتا رہے اور پہاڑ کے دوسری طرف کی دنیا کے بارے میں سوچتا رہے کہ وہاں قدرت کے حسن کی کتنی فراوانی ہوگی۔ یہ نہ دیکھے کہ اسی چوٹی پر چمکتی ہوئی دھوپ میں قطرہ قطرہ پھٹنے والی برف کے شفاف پانی کا چشمہ مین اس کے قدموں میں بہہ رہا ہے اور کائنات کے سارے رنگ اس کے چاروں طرف بکھرے ہوئے قدرت کے نقاروں میں بھر گئے ہیں۔ پہاڑ کے دوسری طرف کی دنیا تو محض ایک تصور ہے مگر

اس کے آس پاس کی دنیا ایک حقیقت۔ چنانچہ مجھے بھی اپنی کوئی نظریہ پر رونا آتا کہ میں نے وہ سب نہیں دیکھا جو میرے پاس ہے اور دست قدرت کی نیا مٹی اور اپنی نگہ دہانی کو نہیں دیکھا۔“

”آدمی اتنا خوشحال ہو تو ولی کھاتا ہے۔“

میں نے کان پکڑے ”میں تو بڑا گنہگار اور ناشکرا آدمی ہوں۔ تم دیکھو اس بحرِ عطا کی عنایت اور میری کمینگی جو شکوہ ہی کرتا رہا کہ۔ سمندر سے ملے پاس کو خیم خانے بجلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے۔ ایک بے نام و نسب لاوارث اور UNWANTED قسم کا بچہ۔ جس کے لیے شاید کوئی بھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ جیسے جو مرنے والی کسی کو اتنا افسوس بھی نہ ہوتا جتنا خزاں رسیدہ بچے کے تھمر جانے کا یا سب سے بڑا ایک بلبلے کے پھوٹ جانے کا ہوتا ہے۔ جس کے لیے کسی کے پاس ایک بھی دعا نہ تھی۔ اسے خدا نے بن مانگے کیا نہیں دیا۔ آج وہ کس مقام پر کھڑا ہے۔“

”رہیں خانے کی چھت پر“ ختم نے کہا۔

میں ہنس پڑا ”اچھا کیا یاد دلایا مجھے۔ دراصل قدرت کے فیصلوں کی مصلحت کو خدا کے سوا کون سمجھ سکتا ہے۔ میرا اس خیم خانے میں آنے کا کہنا جو مجھے اپنی بد قسمتی کی انتہا لگتا تھا درحقیقت میری خوش قسمتی کا سبب بنیاد تھا۔ میری تقدیر میں لکھ ڈالا تھا کہ انسانی فلاح کا ایک بہت بڑے کام کا اعزاز مجھے حاصل ہو گا۔ اس خیم خانے میں کتنے بچے تھے۔ سیکڑوں نہیں، ہزاروں اس عذاب خانے کی دیواروں سے نکلے تو دنیا کی بھیڑ میں اپنے احساسِ ذلت و محرومی کا بار اٹھائے پھرتے رہے اور گمناں گئے اندھیروں میں کھو گئے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ تیری کا احساسِ زبانی انہیں بھی ہوا۔ انہیں بھی خیال آیا ہو کہ بڑے ہو کے وہ تیسوں کی زندگی کو باعزت اور باعقد بنانے کے لیے کچھ کریں گے لیکن ان کا خیال محض خیال رہا اور پھر وہ بھی نہ رہا۔ تم گمراہ گانے سب بھلاؤ اور حالات نے مواقع فراہم نہیں کئے۔ مجھے خدا نے احساس کے ساتھ دساکل بھی دیے اور میرے ارادے کو استقامت دی۔ کیا یہ میرے لیے اعزاز کی بات نہیں ہے کہ خدا نے مجھے ایک بہت بڑے مقصد اور فلاح کے ایک کام کے لیے توفیق، استطاعت اور مواقع دیے۔ یہ کام خدا نے ان سے نہیں لیا جو جدی پستی، امیر تھ، دولت کما کے میں ملکِ رب نواز نہیں بنایا۔ بے شک سیاست کے کونے میں قدم رکھ کے میں وقتی طور پر صراطِ مستقیم سے ہٹ گیا تھا مگر کوئی نقصان ہونے سے پہلے مجھے واپسی کی توفیق بھی خدا نے دی۔“

”تمہاری زندگی کا یہ انقلاب واقعی ایک معجزہ لگتا ہے مجھے تو“ جنم بولی۔

میں نے کہا ”میرے دوست ڈاکٹر کمال نے زندگی میں بس ایک ہی کام کیا اور خود کو تن من دھن کے ساتھ اس کے لیے وقف کر دیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا ہی نہیں اور دنیا کے کسی کام کو اپنے مقصد سے زیادہ اہم نہیں سمجھا۔ اپنی زندگی ”عبت“ شادی اور ازدواجی زندگی۔ سب کی حیثیت ثانوی ہے اس کے لیے چنانچہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہے اور مطمئن بھی۔ خود خود اس کے لیے وسائل پیدا ہو گئے اور اسے مددگار لوگ مل گئے۔ اب وقت آگیا ہے کہ میں بھی اپنی ترجیحات کا تعین کروں۔ اپنے مشن کو سب سے اوپر رکھوں۔ دنیا کے کام اس کے بعد جس میں عبت بھی شامل ہے۔ تم کو یہ بات پڑی تو نہیں لگی؟“

”تمہاری کوئی بھی بات مجھے جری لگ سکتی ہے؟“ وہ بولی۔

میں نے کہا ”دیکھا جائے تو میرے پاس بھی سب کچھ ہے۔ اگر میں یتیم خانے کے قیام سے انتظام تک کی ساری ذمے داری فرید عباسی کو سونپ دیتا ہوں تو اسے رخصتی کا تعاون خود بخود حاصل ہو جائے گا۔ دولت کی رخصتی کے پاس بھی کوئی کمی نہیں اور میں سمجھتا ہوں فرید عباسی اس معاملے میں سب سے زیادہ خوش قسمت ہے۔ اس کی شریک حیات اس کی شریک کار بھی ہوگی۔ سب بیاہاں اس حد تک خوش قسمت نہیں ہوتیں جنہی قدرے یا رخصتی ہوگی کہ دن رات کے ہر لمحے میں رفاقت کا احساس پوری تسکین کے ساتھ ملے۔“

”تم نے بہت کچھ فرض کر لیا ہے۔“

”نہیں۔ مجھے پتا ہے فرید کی ای مجھ سے کس اہم مسئلے پر بات کریں گی۔ وہ مجھ سے ان دونوں کی شادی کے بندھن میں باندھنے کے معاملات پر بات کریں گی۔ یہ ایک اخلاقی تقاضا بھی ہے اور ضرورت بھی۔ وہ ایسے کب تک ساتھ ساتھ اور دور دور رہ سکتے ہیں۔ رہنا بھی نہیں چاہیے۔ دونوں نے زندگی میں بہت کچھ گنوا کے ایک دوسرے کو پایا ہے۔ دونوں نے محبت کے بغیر ادھوری زندگی گزار لی اور ازدواجی زندگی کی ناکامی کا الزام لیا۔ اب وہ ایک دوسرے کی تکمیل کر سکتے ہیں اور اس غلط کوپڑ کر سکتے ہیں جو ان کی شخصیت کو مسخ کر رہا تھا۔“

”اس خلا کا احساس تمہیں بھی نہیں ہوا؟“ جنم نے اچانک کہا۔

”ہوتا ہے۔ ہر وقت ہوتا ہے۔ اس معاملے میں شاید مجھے تقدیر نے بہت دھوکا دیا۔ مجھے شادی کی محبت دی اور پھر شادی کو ہی چین لیا پھر چندا نے مجھے بے اعتباری کی سزا دی۔“

”میں حیران ہوں کہ تم اسے کس طرح الزام دے سکتے ہو۔ اسے چھوڑ کے جانے والے تم خود تھے۔“

میں نے کہا ”دیکھو جنم! یہ بات چندا نے بھی نہیں سمجھی۔ میں ناصر عظیم شاہ عالم دنیا کے لیے بنا تھا اس کے لیے دی تھا جو میں ہوں۔ میں نے اسے ہزار بار تعین دلانے کی کوشش کی کہ نام پیشہ کا دبا دبا شریک ملک بدل جانے سے محبت نہیں بدلتی مگر اس نے اس دلیل کو قبول نہیں کیا۔ پروین شاکر کا شعر ہے۔ وہ جہاں بھی گیا لوٹا تو میرے پاس آیا۔ بس یہی بات ہے ابھی مرے ہر پائی کی۔“

”شاید ہر عورت اتنی فراخ دل نہیں ہو سکتی۔“

”بات فراخ دلی کی نہیں، تعین کی ہے۔ اس نے میرے جج کو جھوٹ سمجھا اور ذلت کی ساری کالک میرے منہ پر رکھ دی۔ اس سلوک کا میں ہرگز مستحق نہیں تھا۔ اس نے مجھ پر دایمی کے سب دروازے پڑی بے رحمی سے بند کر دیے۔ اس نے میرے اعتبار کا خون کر دیا۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔

”چند اکی نظریں تمہارے ساتھ شریک جرم اور کون ہے؟ رخصتی یا نہیں؟“ جنم نے پوچھا۔

”شاید کوئی نہیں۔ وہ مجھ سے کہ کوئی کنوئیں میں گرنے جائے تو راستے کو یا کنوئیں کو کنوئیں کی منڈیر کو یا کنوئیں کھونے والے کو الزام دینا غلط ہے۔ حالات کی آؤ لیتا محض خود کو الزام سے بچانے کی شرمناک کوشش ہوتی ہے۔ خیر کوئی فائدہ نہیں اب پرانی باتوں کو دہرائے گا۔ سب کے حق میں یہی بہتر ہے کہ اپنے اپنے ماضی کے دروازے بند رکھیں۔ میں اور تم، سونی اور رخصتی، فرید عباسی۔ ہم سب اپنے اپنے گناہوں کی سزا اپنے اپنے عذاب کے جنم میں کاٹ چکے ہیں۔“

”فرید عباسی تو بہت خوش ہوگا اگر یہ کام اس کو سونپ دیا گیا اور ظاہر ہے، رخصتی اس کا ساتھ دے گی مگر کیا ہم سب کچھ نہیں کر سکتے؟“

میں نے کہا ”یہ تم نے کیسے سوچ لیا۔ دیکھا جائے تو ہماری ٹیم میں بھی پانچ افراد تو ہیں۔“

”تم سونی کو شمار نہیں کر رہے ہو۔“

”ابھی میں اس کے بارے میں تعین سے کچھ نہیں کہہ

سکتا۔ اس نے ایک ظالم دلی زندگی گزار لی ہے۔ ممکن ہے اسے یہ ٹھہراؤ اچھا نہ لگے۔ اس کے برعکس یہ بھی ممکن ہے کہ یہی ٹھہراؤ اسے راس آجائے اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔ ابھی ہم اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ میں کچھ ایسے معاملات میں الجھ گیا ہوں کہ فوری طور پر اس کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتا کہ سارے معاملات فرید کے سپرد کروں۔ اسے تمام ضروری وسائل فراہم کروں مگر عملاً لا تعلق رہوں۔ بالکل اسی طرح جیسے میں نے ڈاکٹر کمال سے کہا ہے کہ وہ اپنے اسپتال میں لیبارٹری یا مشینوں کی تعصیب کا سارا کام کرائے۔ یہ میری طرف سے DONATION ہوگی لیکن نہ میں سامنے آؤں گا اور نہ اس کام میں ہاتھ بٹاؤں گا۔ اس سے کمال کا پورا پورا رجحان متاثر ہو سکتا ہے۔ فرید عباسی اور رخصتی سب سمجھائیں۔ جو فیصلہ چاہیں کریں! انہیں ہماری مکمل تائید اور حمایت حاصل ہوگی اور سامنے آئے بغیر ہم جو کر سکتے ہیں، ضرور کریں گے لیکن یہ مجھے منظور نہیں کہ میرے دشمن میرے مقصد حیات کے بھی دشمن ہو جائیں۔ اس کا خیال یہ ان دونوں کو یا جیم جوں کو بھگتنا پڑے۔ ایک نہ ایک دن ہم عملی طور پر بھی ان کا ساتھ دیں گے۔ ابھی تو مجھے تمہاری بھی اتنی ہی ضرورت ہے۔“

”تمہیں میری نہیں۔ ایک صفائی کی ضرورت ہے۔“ وہ بولی۔

”ایسا مت کہو۔ تمہارا جذباتی سارا میری سب سے بڑی طاقت ہے۔ جیسے رئیس کی دوستی۔“

”مجھے بعض اوقات ایسا لگتا ہے جیسے میری حیثیت انسان کے جسم میں ناکارہ ہو جانے والے گردے کی جگہ لگائے جانے والے گردے جیسی ہے۔ جو زندہ رہنے کے لیے جسم کی ضرورت ہے مگر قابل اعتبار نہیں۔ یہ خدشہ ہر وقت لاحق ہے کہ جسم اسے مسترد نہ کر دے۔“

”ایسا کیوں سوچتی ہو آخر تم؟“

”تمہیں محبت بھی شادی سے یا چندا سے۔ میں اس کی کو پورا کر رہی ہوں اور بس۔ جیسے باقی پاس کے دوران میں مصنوعی دل لگا دیا جاتا ہے۔ زندگی کو SUPPORT کرنے والے سارے سسٹم ایک جیسے ہوتے ہیں۔ وہ اصل کا تبادل نہیں ہو سکتے مگر مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا اگر تم پھر چندا کی طرف لوٹ جاؤ گے۔ میں نے تو کبھی رخصتی کے جائز حق کی پروا بھی نہیں کی تھی۔“

میں نے اس کا ہاتھ تمام کے اسے اپنی طرف اپنے سامنے کر لیا ”ادھر دیکھو“ میری طرف۔ میں شاہ عالم نہیں

ناصر عظیم ہوں۔ میں نے سب کچھ چھوڑ دیا ہے اور ایک تمہارا سارا لیا ہے۔ کیا تم مجھے احساس دلا رہی ہو کہ یہ مجبوری کا سارا ہے؟“

”نہیں۔ میں خود کو تعین دلانا چاہتی ہوں کہ اب میں تمہاری زندگی میں شامل ہوں۔ تمہارے وجود کا ایک حصہ ہوں۔ وہ جیسا بھی نہیں جسے تم ضرورت ختم ہوتے ہی چھوڑ دو گے۔ ایک طرف ڈال کے بھول جاؤ گے۔“

”آخر یہ کیسے تعین دلاؤں گی۔؟“ میں نے کہا لیکن اور کچھ کہنے سے پہلے مجھے خیال آیا کہ صرف باتیں نہیں، مجھے کچھ کرنا چاہیے اور اس وقت جنم کو اپنی محبت کا تعین دلانے کا سب سے آسان طریقہ مجھے یہ لگا کہ میں نے اسے اپنے بازوؤں میں بھر کے چوم لیا۔

باتوں میں رات گزر گئی تھی اور نہ مجھے وقت کے گزرنے کا احساس ہوا تھا اور نہ جنم کو۔ وہ ایک دیران رات تھی جس میں صرف ستارے روشن تھے اور بلندی افلاک سے ایک طرف کی زمین کو تاریکی اور دوسری طرف کی دنیا کو روشنی کی طرف بڑھتا دکھ رہے تھے۔

”جنم کانپنے لگی“ دیکھو۔ پہلے بھی ایسا نہیں ہوا تھا۔“

میں نے کہا ”کیا نہیں ہوا تھا؟“

”بھی کسی نے مجھے یوں اپنی محبت کا تعین نہیں دلایا تھا۔ تم نے بھی نہیں۔ یہ احساس بڑا انمول ہے میرے لیے۔ بڑا جان لیوا ہے۔“

”یہ زندگی میرے لیے ایک نئے جنم جیسی ہے جانم اور جس دن تمہارا میرا ساتھ ختم ہوا، یہ جنم ہی ختم ہو جائے گا۔“

”ایک اور جنم کی تمنا کرتے ہو تم؟“ وہ بولی۔

”ایک جنم کا عذاب ناصر عظیم نے شادی کے لیے کاٹا تھا۔ دوسرے جنم میں شاہ عالم بن کے اس نے چندا کو کھو دیا۔ اب یہ تیسرا جنم ہے یا میں پھر اپنے پہلے جنم کی طرف لوٹ آیا ہوں۔ اس پر تمہارا اختیار شادی سے زیادہ ہے۔ تم مجھے جیسے چاہو رکھو، اگر تم بھی شادی کی طرح۔“

”جنم نے میرے لبوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیے۔“ میں نے خود مڑوئی اور نہ تمہیں مرنے دوں گی۔ جب تک فرشتہ اجل ہمیں ایک ساتھ لے جانے پر راضی نہ ہو۔“

”اچھا؟ اس کے ساتھ بھی زبردستی۔“ میں نے ہنس کے کہا۔

”نہیں۔ زبردستی میں تمہارے یا اپنے ساتھ کروں گی۔ اگر میرا آخری وقت پہلے آیا تو ایک ریوالتور رکھوں گی اپنے پاس۔ شوٹ کروں گی مرنے سے پہلے تمہیں ورنہ اپنے آپ کے کہا۔“

کے۔ ”باہل بن کی بھی کوئی انتہا ہوتی ہے“ میں نے کہا۔
 ”ہاں۔ ہوتی تو چاہیے“ پیچھے سے رئیس نے کہا اور
 تقدیر مار کے ہنسا۔
 ”کب سے سن رہا ہے تو چھپ کے ہماری باتیں؟“ میں
 نے کہا۔
 ”ہمت دیر سے“ وہ بولا ”قسم اللہ کی بڑا مزہ آ رہا تھا۔“
 جہنم کے چرے پر حیا کی لالی میں مسکراہٹ کا اجالا شامل
 ہو گیا۔ اُتر پر صبح کا ستارہ بڑی خوشی سے جھلکانے لگا تھا۔
 میں نے گھڑی دیکھی تو صبح کے چار بجے تھے۔
 ”کچھ بتایا اس نے؟“ میں نے پوچھا اور جہنم کو ساتھ
 لے کر نیچے چل پڑا۔
 رئیس ہم سے ایک قدم آگے تھا ”ہاں لیکن ماننا پڑتا
 ہے کہ اپنا حیران بلینہ نہ ہوتا تو شاید ہماری معلومات ادھوری
 رہتیں۔“
 ”اس کے بارے میں کیا سوچا ہے۔ استاد کے بارے
 میں؟“
 ”رئیس نے کہا“ اس کی حالت خراب ہے لیکن مرے گا
 نہیں وہ جیرا بلینہ اسے گاڑی میں ڈال کے لے گیا ہے۔“
 ”کہاں چھوڑ کے آئے گا؟“
 ”رئیس نے کہا“ تھانے میں اور کہاں۔ یہاں اس نے
 بیٹے پر نور محمد کے نام کی پٹی لگا رکھی تھی۔ اس نے معلوم کر لیا
 تھا کہ علاقے میں نور محمد نام کا ایک نیا سب انسپکٹر آیا ہے
 کہیں سے تبدیل ہو سکے۔“
 میں نے کہا ”اور تھانے میں اسی سے ملاقات ہو گئی
 پھر؟“
 ”اے تو کیا سمجھتا ہے اسے۔ دوپکا کام کرتا ہے۔ نور محمد
 کے نام کی پٹی اس نے آج ہی بخالی تھی مگر تھانے جانے کا تو
 وہ نام کی پٹی بیل دے گا۔ اس وقت وہاں ایک ڈپٹی انسپری
 ہو گا۔ بالی مانت علی۔ وہ کندھے پر ایک پھول بڑھا کے
 تھانے جائے گا تو ڈپٹی انسپری اسے اٹھ کے سیلیوٹ کرے گا۔
 ایک دو بار اس نے پہلے بھی ڈراما کیا ہے۔ وہ ڈپٹی انسپری
 کے گا کہ اس بندے کوئی الحال حوالات میں ڈال کے رکھو۔
 اندراج کہیں مت کرنا ورنہ پانچے میں اور تھانے والے کوئی
 سوال کے بغیر قبیل کریں گے۔ استاد کو ہوش آئے گا تو وہ
 پوچھے گا کہ میں کہاں ہوں۔ یہاں بھی اس کو یقین آچکا تھا کہ
 وہ تھانے میں ہے اور آٹھ کھلے گی تو اسے صبح کا تھانہ نظر
 آئے گا پھر وہ شور کرے گا۔ پہلے تو اس کی کوئی نہیں سے گا

لیکن بالآخر ملک رب نواز کو اپنا بندہ مل جائے گا۔“
 میں نے کہا ”شامت آجائے گی اس بے گناہ سب انسپکٹر
 نور محمد کی۔“
 ”بے گناہ مت کہہ بار۔ اس نے تقدیر کیا کسی بندے پر
 اور وہ مر گیا اپنا جاکے نور محمد کچھ عرصہ مستقل رہا پھر وہی
 ڈراما ہوا تفتیشی افسر مقرر کرنے کا۔ پولیس نے انہی مرضی کی
 میڈیکل رپورٹ حاصل کر لی۔ والی وارث غریب لوگ تھے۔
 انہیں ڈرامہ کار کے خاموش کر دیا۔ گواہ کوئی سامنے نہیں
 آیا۔ کیس ختم استاد کے الزام سے وہ پھر پھنس جائے گا۔ وہ
 تو حلف اٹھانے کو تیار ہو گا کہ اس پر تھانے میں سب انسپکٹر
 نور محمد نے تقدیر کیا تھا اور ملک رب نواز نے اسے معاف نہ
 کیا تو اس بار وہ سزا سے نہیں بچ سکے گا۔“
 میں نے کہا ”سزا کیا۔ زیادہ سے زیادہ اس کا عہدہ گھٹا دیا
 جائے گا۔“
 جہنم نے کہا ”کیا جیرا بلینہ واپس آئے گا؟“
 ”نہیں۔ اس نے کہا ہے کہ اب وہ کچھ عرصہ روپوش
 رہے گا۔ اس کو اتنے پیسے مل گئے ہیں کہ کچھ دن کے لیے وہ
 پشاور جانا چاہتا ہے۔ وہاں باڑے میں بہت سستا روپی سامان
 اسمگل ہو کے آیا ہے۔ افغانستان کے راستے۔“
 میں نے کہا ”یہ دھند ابھی کرتا ہے وہ؟“
 ”باقاعدگی سے نہیں مگر ضرورت پڑنے پر جیرا ہر کام
 کر سکتا ہے۔ اس کے رابطے ہیں وہاں بھی۔ دراصل ملک
 رب نواز کی وجہ سے وہ بھی کچھ ڈرتا ہے اس کا امکان ایک
 فیصد بھی نہیں مگر وہ چانس لیتا نہیں چاہتا۔ ضرورت کے لیے
 وہ گواہ رکھنا چاہتا ہے جو یہ کہہ سکیں کہ ایک ہفتے سے وہ پشاور
 میں تھا۔“
 میں نے کہا ”سوئی کہاں ہے؟“
 ”رئیس خفا ہونے لگا“ تم نے بھی حد کر دی بار۔ خود پہلے
 گئے اور چوتھیں لڑائے اور اس سے کہہ دیا کہ چائے دے
 آؤ۔ وہ آگئی نیچے۔“
 میں نے کہا ”لاحول ولا قوۃ۔ التاہم نے منع کیا تھا
 اسے۔ میں نے کہا تھا کہ چائے تیس مارخان لے جائے گا
 لیکن اس نے ضد کی کہ میں خود جاؤں گی۔ کچھ نہیں
 ہوتا مجھے۔ دل بہت مضبوط ہے میرا۔“
 ”وہاں وہ سلاٹنگ دھڑنگ پڑا ہوا تھا۔ پیشاب پاخانہ
 سب فضا ہو چکا تھا اس کا اور تڑپ رہا تھا وہ چھپکی کی طرح۔
 میں تو سوئی کو دیکھ کے بھونکا رہ گیا پھر آیا مجھے طیش اور میں
 نے اچھی خاصی بے عزتی کر دی اس کی۔ وہ منہ پھٹا کے

واپس آئی اور سوئی۔ میں آیا تھا کچھ دیر بعد دیکھنے۔“
 ”معافی مانگتے؟“ جہنم بولی۔
 ”معافی کیسی۔ میں نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ وہ سامنے
 سے بک بک کرتے لگی کہ ایسی کیا بات ہے۔ میں نے سچ کے
 کہا کہ بکواس بند کرو اور دفعہ ہو جاؤ یہاں سے۔ وہ اور کچھ
 بولتی تو قسم اللہ کی میں جھانپ دیکھی مارتا۔“
 جہنم ہنسنے لگی ”اور اس کے بعد کیا ہوتا“ وہ اٹلیٹ
 بنا دیتی تمہارا۔“
 ”رئیس بھی ہنس پڑا“ وہ ایسے ہی کہتی ہے۔ اس وقت
 غصے میں تھی۔ اس میں اتنی ہمت نہیں کہ مجھ پر ہاتھ
 اٹھائے۔ خراب تم بھی جا کے سو جاؤ۔ میرا تو برا حال ہے نیند
 کی کی اور چٹکھن سے۔“
 میں نے کہا ”ابھی ساڑھے چار بجے ہیں۔ ہم سب
 سو سکتے ہیں چار باج گھنٹے کی نیند کافی ہوگی۔ تو بجے اٹھ جائیں
 گے۔“
 فوراً سو جانا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ رئیس تو گرتے
 ہی خراٹے لینے لگا مگر میں کچھ دیر خیالات کے گرداب میں
 تنگ کی طرح زبردور رہتا رہا۔ بالآخر نیند مجھ پر غالب آگئی پھر
 میری آنکھ دو دروازے پر دستک سے کھلی۔
 ”رئیس نے بڑبڑا کے کہا“ اے کون آگیا۔ ابھی تو آنکھ
 کھلی تھی۔“
 مگر میں نے گھڑی دیکھی تو ساڑھے نو بج رہے تھے۔ میں
 باہر نکلا تو جہنم اسنے بال سلجھا رہی تھی اور خوانین کی عادت
 کے مطابق برہادر کھجھی کو بالوں سے گزرنے کے بعد فوراً
 ٹوٹنے والے بالوں کی تقدیر دیکھتی جا رہی تھی۔
 میں نے کہا ”کیا جو کچھ چٹ گئی ہیں؟“
 ”وہ مسکراتی“ ایک جو تک چٹ گئی ہے خطرناک قسم
 کی۔“
 میں نے کہا ”اچھا! اور سچ سچ اس سے چٹنے کی کوشش
 کی مگر اس نے کنگھا میرے ہاتھ پر مارا۔“
 ”سچ اٹھتے ہی بد تمیزی۔ ابھی سوئی آگے ڈانٹ لگائے
 گی۔“
 میں نے بہن کی طرف سے آنے والی آوازوں پر غور کیا۔
 ”یہ کیا شور ہو رہا ہے کچن میں؟“
 ”جہنم نے کہا“ سوئی ہے۔ جلدی اٹھ گئی تھی۔ کچھ دیر
 اُدھر اُدھر پھرتی رہی۔ بھوک زیادہ لگی تو اس نے مجھے بجایا۔
 اسے عادت سے صبح جلدی جانے کی۔“
 شور بڑھ گیا تو میں نے کہا ”چل کے دیکھتے ہیں۔ فساد نہ

میں نے خود اخلت سے روک رکھا تھا۔

”میں نے جگا رہا ہے سب کو۔ ناشتے کا کچھ پچ نہیں آدھے گھنٹے میں لگ جانا چاہیے ناشتا میری۔“

ہم دیواری اوٹ میں اور پیچھے ہو گئے سونی بگولے کی طرح ہمارے پاس سے ہمیں دیکھے بغیر گزر گئی ”باقی سب کو بھی دیکھتی ہوں میں۔ کیا دوسرے کے کھانے کے تاہم پر ناشتا کریں گے سارے نواب ہیں۔“

میں نے پیچھے سے کہا ”نواب نہ سہی نہیں تو ہیں۔“ وہ ایک دم پلٹ کے جھپٹتی۔ ”اٹھ گئے آپ لوگ۔ دراصل مجھے بڑی بھوک لگ رہی تھی۔ دو گھنٹے ہو گئے مجھے اٹھ ہوئے۔“

”اور بھوک میں سونی سے کچھ برداشت نہیں ہوتا۔“

جینم ہنسی۔ ”آپ تماشا دیکھ رہی تھیں۔ میں تو جتنی تھی کہ ایک کپ چائے لے جائے وہاں عجیب سین تھا۔“

میں نے کہا ”ہم دیکھ چکے ہیں وہ سین کئی بار۔“

”مجھے غصہ آیا۔ میں نے کہا شرم نہیں آتی یہ کچن ہے یا تمہارا بیڈ روم؟“

میں نے کہا ”کیا تم نے ان سے پوچھا کہ ابھی تو شادی بھی نہیں کی انہوں نے؟“

سونی اچھل پڑی ”کیا۔ شادی نہیں ہوئی ان کی؟“

”ہم سب کا یہ خیال ہے کہ اب فوراً ہو جانی چاہیے“

میں نے کہا۔ ”نہیں نے ایک ٹھنڈی سانس لی“ ہم سب کی بوجانی چاہیے بارے ویسے تو۔“

”کمال کرتے ہیں آپ بھی؟“ سونی نے سخت ناراضی کا اظہار کیا ”کلی چھٹی دے رکھی ہے انہیں۔“

”جی ہاں ہم نے بہت ڈانٹ ڈپٹ کی۔ بہت سمجھایا ان کا کہتا ہے کہ سوتے ہم الگ الگ ہیں۔ اور ہمارے درمیان ہوتی ہے شرافت کی دیوار۔“

جینم نے ہنسنے کہنا ”چلو اب بس کرو۔“

”میں ٹھیک کروں گی انہیں“ سونی نے کہا۔

”نہیں خوش ہوا“ میری طرف سے پورا اختیار ہے تمہیں۔ چاہو تو سب کی شادی کرا دو اسی ہفتے میں۔“

میں نے کہا ”اب اگر کام کی بات ہو جائے۔“

”نہیں نے کہا“ استاد کا اصل نام تو حکم داد خان ہے۔ تصدیق کے لیے ہم نے سب کے نام پوچھے باپ کا نام ہے کرم داد خان۔ ایک چھوٹا بھائی خدا داد کے ساتھ رہتا ہے۔

ہم نے پتا پوچھا۔ وہ کہنے لگا کہ میرا ان سے کوئی تعلق نہیں کئی سال سے۔“

”عاق کردیا ہو گا باپ نے اس کے کرتوتوں کی وجہ سے۔“

میں نے کہا۔

”ہاں۔ اس نے پڑھا کھسا کچھ نہیں۔ شروع سے بڑی صحبت میں پڑ گیا تھا۔ ماں باپ کو چھوٹا بھائی سمجھتا ہے۔ وہ حکم داد سے ایک مہینے کی مدد لینے کے روادار نہیں۔ اس نے

ایک بہن کی شادی کے لیے ایک لاکھ بیجے تھے۔ وہ انہوں نے لوٹا دیے تھے باپ ظاہر ہے بوڑھا ہے اور اب کچھ نہیں کرتا۔ پہلے کئی مل میں دو ٹونگ ماسٹر تھا۔ اس کی جگہ چھوٹا بیٹا

خدا داد کام کر رہا ہے اچھی آمدنی ہے خوشحال نہ سہی مگر وہ کوئی محتاج کی زندگی بھی نہیں گزار رہے ہیں۔“

”سب اس نے تمہیں بتایا۔ تصدیق کیسے کی تم نے؟“ جینم بولی۔

”وہی گند سوال“ نہیں بولا ”حکم داد کو یہ فکر لاحق تھی کہ کہیں اس کی وجہ سے ماں باپ یا چھوٹے بھائی مشکل

میں نہ پڑ جائیں۔ چھوٹے بھائی کی بیوی ہے اور چار بچے ہیں۔ ہم نے اسے یقین دلایا کہ انہیں کچھ معلوم نہیں ہو گا لیکن وہ

سچ کہہ رہا ہے یا جھوٹ؟“ یہ جاننے کے لیے ان سے پوچھا تو پڑے گا پھر اس نے ایک ٹون نمبر دیا۔ جیسے بلڈ کی اس کے

بھائی سے بات ہوئی۔ اس نے کہا کہ ”ماں حکم داد میرا بھائی ہے مگر ہمیں نہیں معلوم وہ کہاں ہو گا۔ کبھی کبھی وہ مجھ سے

لے لے کر آتا ہے۔ اب تو اس کی صورت دیکھنا کیا اس کا نام بھی سننا نہیں چاہتا۔ آج کل بہت بیمار ہے۔ اگر آپ اس

سے پوچھتے تو دور دراز جانا اسے۔“ بس اتنا کافی تھا۔ خود حکم داد نے بتایا کہ بھائی مجبور ہے باپ کی وجہ سے۔ وہ چھوٹے بھائی

کو آٹے دن کچھ نہ کچھ دیتا رہتا ہے۔ اس کے بیوی بچوں کے لیے اور ماں باپ کے لیے ایک بار بہن کے لیے بھی

زہرات بھجوائے تھے۔ چھوٹے بھائی نے خاموشی سے اسے پتھا دیے۔ یہ کہا کہ انہیں میری طرف سے سمجھ لے۔“

”حکم داد کا تعلق کب سے ہے ملک رب نواز کے ساتھ؟“

”کئی سال سے۔“

میں نے کہا ”پھر تو وہ سب کچھ جانتا ہو گا اس کے کاروبار کے بارے میں؟“

”نہیں بولا“ ”ہاں“ اس نے مانا کہ ملک صاحب کا مال باہر جاتا ہے۔ وہی چیزیں جو ہم دیکھ چکے ہیں۔ تاریخی اشیاء

نوادرات، ایثار قدم۔“

میں نے کہا ”آپا قدم۔“ جاہل کی اولاد!“

اس نے سخت سے کہا ”ابے ہاں وہی۔ اسے یہ معلوم نہیں کہ مال کہاں سے آتا ہے اور کہاں جاتا ہے۔ باہر کے

خریدار کون ہیں اور کیا قیمت دیتے ہیں؟“

میں نے کہا ”ظاہر ہے سودا تو ملک رب نواز خود کرتا ہو گا۔ قیمت بھی خود ہی وصول کرتا ہو گا۔ استاد نے اس

معاملے میں کیا فرمایا۔ آخر وہ آدمی رات کے وقت چوروں کی طرح کیا لینے آئے تھے؟“

”ہاں“ اس نے پہلے تو ہیکر دینے کی کوشش کی مگر بالآخر بتادیا کہ ملک رب نواز نے انہیں کسی مشن پر بھیجا تھا۔ ہمارا

اندازہ بالکل ٹھیک تھا۔ جینم کی گاڑی۔“

”گاڑی نہیں، گھنٹا۔“ چلی کی چھوٹی بہن۔ عمر میں سال دو سال ہی کم ہوگی۔“

جینم نے برا نہیں مانا ”مجھے اس کی ملکیت پر فخر ہے کیونکہ وہ خالص حلال کی کمائی سے خریدی گئی تھی۔“

”اسے ملک رب نواز نے خود غائب کروایا اور پھر تمہیں وہ نئی گاڑی دے دی جس میں ایک شکل دینے والا

آلہ اس وقت لگا گیا تھا۔ حکم داد نے ملک صاحب کے حکم پر تمہارا تعاقب کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اس عورت کا پتا چلاؤ

یہ کہاں رہتی ہے۔ جب حکم داد نے ایک ٹیکسی میں تمہارا پیچھا کیا لیکن بد قسمتی یہ ہوئی کہ میاں بیچ کے ٹیکسی کا ایک

ٹائر فلیٹ ہو گیا ورنہ شک کی کوئی بات ہی نہ رہتی۔ وہ قلم خود گاڑی کو گیراج میں داخل ہو تا دیکھ لینے اور بتا دینے کہ بندے

بھی اندر ہی غائب ہو گئے تھے حکم داد کو یہ اندازہ بہر حال ہو گیا کہ جینم اس طرف آئی ہے اس نے دوسری ٹیکسی

پکڑ لی تھی فوراً مگر دس منٹ کا فرق پڑ گیا۔ وہ گاڑی اسے کہیں نظر نہ آئی جس کا تعاقب اس نے بڑی محنت اور احتیاط کے

ساتھ کیا تھا۔ ملک نے کہا تھا کہ خیال رکھنا وہ بہت چالاک اور خطرناک عورت ہے۔“

”ان کیسی ہنس۔۔۔۔۔۔ کے لیے میں ملک صاحب کا الگ شکرے ادا کروں گی۔“ جینم بولی۔

”حکم داد بعد میں دوسری گاڑی لے کر سراغ لگانے نکلا اور اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ گلیوں میں گھومتے پھرتے

اس کے ریسور نے شکل وصول کر لیا اور گاڑی کی نشاندہی کر دی۔ حکم داد نے اپنی رپورٹ ملک رب نواز کو دی اور

اس خیال کا اظہار کیا کہ اس گیراج کے اندر ہی کوئی راستہ ہو گا کیونکہ گھر میں داخل ہونے کے لیے اور کوئی دروازہ نظر نہیں آیا۔ جیسے لوگ کہتے ہیں کہ پہلے وہاں ایک دکان تھی۔

ملک رب نواز نے بڑی فحش کا اظہار کیا کہ یہ کیا آدمی اور عورتی بات ہے، کئی بات کہو کہ راستہ اندر سے یا نہیں

اور وہ عورت وہاں رہتی ہے یا بس گاڑی کھڑی ہے وہاں۔ ممکن ہے وہ ساتھ والے کسی گھر میں ہے ایک کیسٹ ہو۔

اگلی عورت ہے۔ اگلے دن حکم داد اپنے ساتھ دو بندے لے کر آیا تھا اور اس قفل ساز کو ساتھ لاکے اپنی طرف سے

انہوں نے بڑی عقلندی کا مظاہرہ کیا تھا۔ مقصد یہ ہو گا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو اور وہ تالا کھول کے دکان کے اندر

داخل ہو جائیں تو گاڑی کو بھی ہاتھ لگے اچھی طرح دیکھ لیں کہ موجود ہے اور وہی ہے جس کی انہیں تلاش تھی۔

تصدیق کر لیں کہ گیراج کے اندر سے واقعی گھر میں داخلے کا راستہ ہے اور پھر ملک رب نواز کو ایک جامع رپورٹ پیش

کر کے اپنی سراغ رسی کی لیاقت اور بہت ذہانت کی داد پائیں مگر اے بے آرزو کہ خاک شد۔“

میں بھونکا رہ گیا۔ ”ابے رہیں خان۔ تو فارسی بولنے لگا اور بالکل صحیح محاورہ بول گیا۔ اچانک انا عالم فاضل کیسے ہو گیا تو؟“

”نہیں کا چہ خوشی سے جھٹکے گا“ ”یار“ بس ڈگری تو کوئی ہے نہیں اپنے پاس۔ تیرے جیسے دوست ہیں۔ انہی کی محبت

میں سیکھا ہے جو بھی علم ہے اپنا۔“

میں نے سہلا کے کہا ”ویسے دیگر علوم میں زیادہ کمال حاصل کیا ہے آپ نے۔“

”نہیں ہنسنے لگا“ ”وہ سب زمانے نے سکھا دیے تھے خیر۔ مشن ناکام ہو گیا۔ گاڑی تو خاک نہیں لی۔ انہیں تو ایسا ہی لگا

ہو گا کہ قسمت خراب تھی۔ استاد کو خواہ مخواہ پولیس نے پکڑ لیا۔ جو جان بچا کے فرار ہونے میں کامیاب رہے“ انہوں

نے رات بھر تو انتظار کیا ہو گا کہ استاد اپنی استاد کی دکھا کے لوٹ آئے۔ ویسے یہ ناممکن تھا کہ آدمی رات کے بعد وہ

ملک صاحب کو یہ خوش خبری سنانے کے لیے خواب گاہ سے باہر آنے پر مجبور کر سکے کہ کیا کارنامہ سر انجام دیا ہے۔ ظاہر

ہے وہ بہت اگ بگولا ہو گا۔ ممکن ہے کر لے اور گھدو کی جو ناکاری ملک صاحب اپنے دست مبارک سے فرمائیں۔“

میں نے کہا ”وہی پاپوش مبارک سے ان کے سر کو سرفراز کریں۔“

”استاد نے کتنے سال وفاداری سے خدمت کی اور کیسے کیسے کام کیے“ اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ غلام اپنے آقا کی

فرمائیداری کرتا ہے تو کون سا اس پر احسان کرنا ہے اس کا یہ جرم ناقابل معافی ہے کہ اس نے ایک معمولی سا کام ٹھیک

سے نہیں کیا۔ پہلے تو نہ جانے اس کے کانوں نے سیکل کہاں سے سن لیا۔ گاڑی تو وہاں تھی نہیں اور ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کے بعد وہ ایک معمولی تھانے دار کے ہتھے چڑھ گیا۔ اتنا عرصہ ملک رب نواز کی جوتیاں اٹھاتے کھاتے اور چانتے ہو گیا۔ ابھی تک پولیس سے نمٹنا نہیں آیا۔ ایسا کون طرہ خاں آگیا ہے تھانے دارین کے جو ملک رب نواز کا نام سن کے بھی تھانے داری نہ بھولے اور نام سے کام نہ لے تو دام لگاؤ۔ اتنی سی بات نہیں جانتا وہ۔ استاد بنا ہے کھوٹے واچر۔ وہ کیسا شکاری جو ایک کتے کے غرائے سے دم دبا کے بھاگ لے۔ یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ کتے کا منہ بند کرنے کے لیے ہڈی چھینکی چاہیے پہلے پھر بھی وہ بھونکتا بند نہ کرے تو اسے لات مارو۔ ڈنڈا یا پھر مارو۔ اب یہی سزا ہے اس کی کہ بند رہے حوالات میں کچھ دن۔ میں خود کسوں گا پولیس سے کہ اس کی ابھی خاطر قاضی کرے۔ ہمارا خاص بندہ ہے۔

میں نے کہا "تھانے ایک بار کہا تھا کہ صدی حسن کے گلے میں بھگون بولتے ہیں۔ تھرے گلے میں اس وقت ملک رب نواز بول رہا ہے۔"

جینم نے کہا "بالکل صحیح تجزیہ ہے رہیں گا۔ اگر اس کے کاروباری راز افشا ہونے کا وزن ہو تا تو شاید ملک اس کی رہائی کی کوشش بھی نہ کرتا مگر اب شاید ایسا نہ ہو۔"

"ہاں اور جب استاد کی پیشی ہوگی ملک صاحب کے سامنے تو اس کے لیے دو سراسر مسئلہ ہو گا جو چھپانے کا۔ وہ ملک کے سامنے یہ اعتراف کرے کہ رات بھر تھانے والے اس سے تفتیش کرتے رہے اور مار مار کے اس سے سب اٹھو لیا تو یہ ملک رب نواز کے آئین غلامی کے تحت غداری کے جرم سے کم نہیں۔ غلام پر لازم ہے کہ جان دے دے مگر لب نہ کھولے اپنے آقا کے بارے میں ایسی کوئی بات کہنے سے پہلے مر جائے جس سے آقا کی رسوائی ہو یا اس کا نقصان ہو۔ ملک یہ ضرور پوچھے گا کہ تفتیش میں انہوں نے کیا پوچھا اور تو نے کیا کیا۔"

"اس نے کیا کیا؟" جینم نے سوال کیا۔

میں نے کہا "فرض کرو استاد کا مشن کامیاب ہو جاتا۔ اندر گاڑی مل جاتی اور وہ رہیں خانے کا چور دروازہ دریافت کر لیتے تو اس کے بعد کیا ہوتا؟"

"ہاں۔ اس سوال کے جواب میں پہلے تو استاد کے رویکار کی سوئی ایک ہی جگہ اڑی رہی کہ مجھے نہیں معلوم ملک صاحب جتنا حکم دیتے ہیں ہم اتنی قیل کرتے ہیں۔ وہ جیسا کہتے ہیں ہم دیا کرتے۔ جبرے بلینے لے گا کہ تو کس

کرتا ہے تجھے سب پتا ہے اگر اندر جائے گا کوئی راستہ ہوتا تو تم کیا کرتے؟ اس عورت کو اٹھا کر لے جاتے جس کو ملک صاحب نے خطرناک قرار دیا تھا؟ آخر کون تھی وہ عورت اور ملک صاحب کے لیے وہ خطرناک کیسے ہوئی؟ میرا تو خیال تھا کہ جبرے بلین کی محنت ضائع جانے کی فکر آ رہی تھی میں حکم داد خان نے تسلیم کر لیا کہ اسے اور بھی بہت کچھ معلوم ہے اسے ملک نے بتا دیا تھا کہ اس عورت کا نام جینم ہے اور وہ ایک اخبار میں کام کرتی ہے بڑی مشہور رپورٹر ہے مگر لگتا ہے وہ مل گئی ہے ملک صاحب کے دشمنوں سے۔ اس کے پاس ایک چیز ہے جو خفیہ نمک حرام ہے چوری کر کے اس کا سودا کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ خود ایسا کرتا تو مارا جاتا۔ اس نے جینم کو جینم میں ڈالا تو خود جینم پڑ گئی لالچ میں کہ کسی سے دس بیس لاکھ وصول کر لے۔ اب تو یہ کیا بھی نہیں رہا حصہ مانگنے والا۔"

میں نے خیرانی سے کہا "مگر دس بیس لاکھ۔" جینم بولی "اگر اس سو دے میں مجھے دس بیس لاکھ مل سکتے ہیں تو اس چیز کی مالیت کیا ایک کروڑ کی ہے؟"

سونی نے زیر لب کہا "ایک کروڑ؟" رہیں مسکرایا "اتنی تو نہیں مگر پچاس لاکھ کا نقصان ہوا ہے ملک رب نواز کو۔ حکم دار نے یہ بات ملک سے سنی تھی۔"

سونی نے کہا "یہی کیا چیز ہے آخر وہ؟ کیوں باقی؟" جینم نے کہا "یہ ایک چیز۔ دیکھ لوگی تم بھی۔" میں نے کہا "ابھی تک ہم نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔"

رہیں بولا "ملک رب نواز کو صرف شک ہے۔ یقین نہیں ہے۔ بس وہ چانس لینا نہیں چاہتا۔ دس لاکھ دے سکتا ہے وہ ورنہ اس کا نقصان ہو گا پورے پچاس لاکھ کا لیکن اس کے برعکس وہ چیز اس کے دشمنوں نے حاصل کر لی تو وہ میں بھی دے دیں گے انہیں تمہیں کا پھر بھی ناکہ ہو گا۔"

میں نے کہا "کیا استاد ان دشمنوں کو نہیں جانتا؟"

رہیں بولا "بہت مار کھانے کے باوجود اس نے کسی کا نام نہیں لیا۔ اس نے کہا کہ دشمن تو بڑے لوگوں کے ہوتے ہیں۔ ملک کے خاندانی دشمن ہیں۔ سیاسی دشمن ہیں۔ خفیہ جیسے ذاتی دشمن بھی کم نہیں مگر ان سے ملک صاحب کو خطرہ نہیں محسوس ہوتا۔ شیر جنگل کا بادشاہ ہوتا ہے۔ لومڑیاں گیدڑ اور خرگوش کیا بگاڑ سکتے ہیں اس کا۔ اپنی بھوک مٹانے کے لیے وہ جسے چاہے شکار کر لے۔ کاروباری دشمنوں کا اسے

واقعی علم نہیں تھا۔"

جینم نے سوچ کے کہا "وہی تو تمہاری بات ٹھیک ہے کہ استاد کے چچ راسے سزائے موت دی جاسکتی ہے مگر جب اس کو معلوم ہو گا کہ تھانے والوں نے اس سے کوئی تفتیش نہیں کی تھی اور اصل سب انفسز نور محمد بھی اس کے سامنے آئے ہاتھ جوڑے گا کہ یار میں نے کیا بگاڑا ہے کہ تم میرا نام لے رہے ہو۔ میری نوکری کیا زندگی کے بھی دشمن ہو جائیں گے ملک صاحب۔ تو حکم داد خان کا شک بھی یقین میں بدل جائے گا کہ وہ تھانے دار جعلی تھا۔ تھانے والے بھی یہ بات سمجھا دیں گے اسے اگر حکم داد نے قائل کر لیا ملک صاحب کو۔"

میں نے کہا "تو اس کا جرم زیادہ عظیم ہو جائے گا۔ جیسے اغوا کے بعد قتل کے مجرم کو عہدید اور سزائے موت دونوں دی جاسکتی ہیں ایسے ہی حکم داد پر دہری فرد جرم عائد ہو جائے گی یعنی ایک تو سب ہتا کے نمک حرامی کی اور بتایا بھی گئے ان کے دشمنوں کو۔ پولیس کو بتا تا تو اتنا برا نہ ہوتا۔ کسی حد تک وہ بھی اسے ہی بندے ہیں۔ ملک جیسے سب لوگوں کے دھندے انہی کے تھانوں سے چلتے ہیں اور وہ سب کا پردہ رکھتے ہیں۔ اپنا حصہ الگ رکھتے گئے بعد۔"

رہیں سرہلانے لگا "استاد تو مارا گیا۔ وہ کیا کہتے ہیں فارسی میں۔ گام مشکل اور نہ گام تو مشکل۔"

میں نے اپنا سر پیٹ لیا "اے جاہل کی اولاد۔ غلطی ہے ایک فارسی کا محاورہ یاد رہ گیا تھا تو فارسی دان نہیں بن گیا تو۔ گام نہیں گونم ہے۔"

"گوتم کیا بات ہوئی؟" رہیں نے احتجاج کیا "گاؤں تو مشکل نہ گاؤں تو مشکل۔ جسے گانا نہ آتا ہو۔"

میں نے اس کے ایک ہاتھ رسید کیا۔ "اس کا مطلب ہے بولوں تو مشکل اور نہ بولوں تو مشکل۔ حکم داد مشکل میں پڑ جائے گا کہ رات بھر مار کھائی۔ اب کسی سے فریاد کی تو پچاسی کا پچند اپنے ہی گلے میں پڑ جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ وہ خود ہی تھانے والوں کو معاف کر کے نکلے گی فکر کرے گا اور پہلے انہیں قتل دے گا کہ فکر مت کرو میں ملک صاحب سے تمہاری شکایت نہیں کروں گا۔ تمہارا تو کوئی قصور ہی نہیں اور ملک صاحب کے سامنے مسکراتا ہوا جائے گا کہ تھانے دار دنیا تھانے میں۔ آپ کا نام لیا تو معافیاں مانگنے لگا۔ میں نے پھر بھی اس کا منہ بند کرنے کے لیے کچھ دے دیا۔ میں واپس آیا تو جب وہاں نہیں تھی۔ میں سمجھ گیا کہ جو میرے ساتھ گئے تھے وہی لے گئے ہوں گے۔ رات کے وقت میں

بیدل آ کے کیا کرتا تھا۔ تھانے دار نے مجھے گھر چھوڑ دیا تھا۔ رات کو آرام سے سو کے صبح اٹھا اور ادھر آگیا۔" جینم ہنسنے لگی "اور جس کام سے گئے تھے اس کا کیا ہوا؟ یہ نہیں پوچھے گا ملک؟"

"اس کا جواب بہت آسان ہے۔ وہ گاڑی ادھر تھی مگر اب نہیں ہے۔"

جینم نے گھڑی دیکھی "میرا خیال ہے کہ گاڑی ملک صاحب کو واپس کر دی جائے۔ ویسے بھی کل شام سے انتظار کر رہا ہو گا سروس اسٹیشن والا۔ میں فون کر کے ملک صاحب کو بتا دیتی ہوں کہ میں ایک سیٹی کے گھر گئی تھی کسی تقریب میں۔ پتا اسی گلی کا دے دیتی ہوں۔ تاکہ استاد کی بات بھی رہ جائے اور کوئی مزید تفتیش نہ کرے۔"

میں نے کہا "وہ سیکل نذر کرنے والا آکر وہیں لگا دیا جہاں سے ہم نے نکالا تھا تاکہ شک کی کوئی بات نہ رہے۔" "وہ پوچھے گا نہیں کہ دو دن میں گاڑی کو سروس کرانے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی؟" رہیں نے کہا۔

جینم نے کہا "میں کہہ سکتی ہوں کہ گاڑی کچھ MISSING کر رہی تھی۔ سروس کرانے میں نے کیا برائی؟ وہ چاہیں تو کسی کو سروس اسٹیشن بھیج دیں۔ وہیں سے اپنی گاڑی منگوائیں۔ یہ ٹھیک ہے انہیں پتا چل جائے گا کہ گاڑی کل سے کہاں تھی؟"

میں نے کہا "تم فون ضرور کرو مگر میں بھی چلوں گا تمہارے ساتھ۔"

"مجھے سروس اسٹیشن سے کوئی اغوا کر کے نہیں لے جاسکتا۔"

میں نے کہا "دور ہو جائے گی کسی دن یہ غلط فہمی بھی لیکن اس وقت تمہاری حفاظت کے لیے ساتھ نہیں جا رہا ہوں میں۔ مجھے فریڈ کی ای سی ایک اہم مسئلے پر گفتگو کے لیے بلایا ہے۔ جیسا کہ تم نے بتایا مجھے۔"

وہ چرے بولی "میں نہیں جا رہی وہاں تم جاؤ۔" میں نے کہا "تم باہر انتظار کرنا یا دوسرے کمرے میں بیٹھنا۔"

"جب میں نے کہہ دیا۔" وہ غصے میں مل کھا کے اٹھی۔ سونی نے کہا "بابی۔ وہ چیز تو دکھائیں مجھے۔ پچاس لاکھ کی۔"

رہیں بڑی مستحی سے اٹھا "میں لانا ہوں۔ اس پر سنے سرے سے نور کرتے ہیں کہ آخر پچاس لاکھ والی کیا بات ہے؟"

مورتی کا سر دیکھ کر سونی کو کچھ مایوسی ہوئی "کیا اس کے اندر ہیرے جو اہرات ہیں؟"

رئیس اسے آثار قدیمہ اور نوادرات کے بارے میں سمجھانے لگا۔ میں مورتی کی ساخت پر غور کرتا رہا۔ اس میں مجھے پہلے بھی کوئی خاص بات نظر نہیں آتی تھی۔ نہ یہ سنگتراشی کا کوئی قدیم شکار تھی اور نہ اس کی کوئی تاریخی اہمیت تھی۔ ابھی تک حاصل کردہ معلومات کے مطابق یہ پلاسٹر آف پیرس سے بنا ہوا کسی ایسے انسان کا سر تھا جو چینی، جاپانی، تھائی لینڈ کا یا بری کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اس پر ختم نے بھی کچھ مدبر کی تھی لیکن ابھی تک چرے کے نقوش سے کسی زندہ یا مردہ شخصیت کی شناخت نہیں ہوئی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق مورتی کے سر کا وزن کچھ زیادہ تھا۔ پلاسٹر آف پیرس کے جیسے بھی بھاری ہوتے ہیں مگر خاص پتھر جتنے نہیں۔ غالباً یہ مورتی کا سر بھی اندر سے کھوکھلا نہیں تھا۔ "سونی کتنی ہے اسے توڑ کے دیکھنا چاہیے" رئیس نے کہا۔

میں نے چونک کے کہا "ہاں۔ بالکل ٹھیک کہتی ہے سونی۔ جب تک تیرے سر کو توڑ کے نہیں دیکھا جائے گا پتا کیسے چلے گا کہ اندر کتنا بھوسا ہے کتنی عقل اور کتنی جگہ خالی ہے۔"

رئیس کے کچھ کہنے سے پہلے میں مارخان اپنی سرخوں مونچھوں اور مظلوم صورت کے ساتھ ہاتھ باندھے نمودار ہوا۔

میں نے کہا "اب کیا ہو گیا۔ نقش فریادی کیوں بنے کھڑے ہو؟"

اس نے کپکپاتی آواز میں کہا "آپ بجا فرمائی۔ ام فریاد کے ساتھ حاضر ہوئی۔ آپ امارا دردناک گزارش پر غور خواہ فرمائی۔"

رئیس نے کہا "ابے جلدی سے کہہ دے جو کہتا ہے۔" "صاحب! آج صبح بڑا دلخراش واردات ہوئی" اس نے کہنا شروع کیا۔

"وہ سب معلوم ہے مجھے۔ تم لوگ پھوڑو یہ حرکتیں ورنہ میں نے کہہ دیا ہے سونی۔"

میں مارخان کا چہرہ غم اور مایوسی کی تصویر بن گیا "ام آپ کا خدمت کرتی اور کوئی گناہ کا خیال دل میں نہیں لاتی۔ سونی بیگم صاحب اس کو بیورو بازو ایک دم جھٹ کا پٹکنا بنا کے گردش دیتی۔ اس کا اندر ہر شے گردش فرماتی۔ دماغ گھوم جاتی۔ دل لٹو کا لٹو گھومتی۔ دل جگر سب جگر میں ہوتی۔"

سونی نے کہا "یہ کرتی ہوں میں۔ اس کو الٹا سمجھتی ہوں وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔"

میں مارخان کی آنکھیں اٹکھار ہو گئیں۔ "وہ ابلی تک پکر نوش فرماتی اور کچھ نوش نہیں فرماتی۔ ٹھیک بھائی اور داغ مفارقت کا خیال ظاہر فرماتی۔ خوراک ترک فرماتی تو ایک دن اس جان سے کوچ فرماتی۔"

رئیس کے ساتھ ہم سب ہنسنے لگے۔ سونی کے سلوک پر اس نے احتجاجاً بھوک بڑھال کر رکھی تھی اور میں مارخان کو مرنے کی دھمکی دے رہی تھی۔

سونی اٹھ کھڑی ہوئی "تو یہ بات ہے اس نے اسرائیل کی ہے۔ اس کا کیا خیال ہے کہ میں معالی مانگوں کی اس سے۔ میں انہی دو منٹ میں سب ٹھیک کر دوں گی۔ کوئی بائس ہے جو اندر سے کھوکھلا ہو؟ نہیں تو ایک فٹ کالوسے کا بائس بھی چلے گا۔ مجھے ایک رتنی چاہیے۔ ذرا مضبوط قسم کی اور ایک قیف۔"

میں مارخان کی آنکھوں کی پٹلیاں ساکت ہو گئیں۔ "ہائس سپاٹ" قیف ان سب کا ضرورت نہیں ہوتی جناب!"

"ضرورت ہوتی ہیں مارخان۔ میں اسے پہلے تو رسی سے باندھ کے فرش پر ڈالوں گی پھر اس کے منہ میں فٹ کون کی بائس پھر قیف لگا کے اوپر سے ڈالوں گی خاص خوراک پھر لینڈر میں یہ سب چیزیں ڈال کے کس کر لو۔ ایک کرلا، ایک کپ خالص کڑوا تیل، ایک بڑا چھوٹا نمک۔ ایک کچا انڈا۔ ایک چھپے کائی، چھوٹی پولاٹے کے لیے۔"

میں مارخان کے حلق سے ایک عجیب سی آواز نکلی۔ "یہ۔ آپ کیسا ظالمانہ قہر غضب اڑھائی۔ آپ اسے ہلاک فرمائی۔ وہ ایسا خاص خوراک نوش کرتی تو زخمی مرنے کا مانگ پھر کر جان دیتی۔"

سونی نے کہا "اے میں مارخان۔ تم خواہ خواہ پریشان ہو رہے ہو۔ یہ بڑا خاص علاج ہے۔ اس سے سارے جگر ختم ہو جاتے ہیں۔ اسے ابھی اور پھر رات کو سوتے وقت یہ خوراک دیں گے تو صبح بالکل ٹھیک ہوگی۔"

میں مارخان زور زور سے کھڑے ہوئے لگا۔ "یا اللہ صاحب! آپ انصاف فرمائی۔ مظلوم کا فریاد سنئے۔ یہ کیا ظلم ہوئی غریب پر۔ بخدا ام خود یہ خاص خوراک پی کے جان قربان کرتی۔ ام یہ ظلم نہیں دیکھ سکتی۔"

"تم مت دیکھنا" سونی نے کہا "مگر ایسے کہاں بھاگے جارہے ہو۔"

"ام اس کو حاضر کرتی۔ وہ آپ سے جان بخشی کی درخواست کرتی۔ آپ اس کا خطا معاف فرمائی بیگم صاحب ورنہ وہ ادھر نہیں رہتی۔"

سونی نے کہا "مگر وہ جانا چاہتی ہے تو اس کی مرضی اور تم بھی اس کے ساتھ رہنا چاہو تو تمہاری مرضی۔" سونی نے کہا "لیکن یہاں رہنا ہے تو شرافت سے رہنا ہو گا تمہیں۔ میرا حکم چلے گا اب یہاں۔"

رئیس کے لیے بھی ہنسی منہ کرنا مشکل ہو رہا تھا "سالے۔ جیسی کی اولاد سیدھے ہو جاؤ ورنہ بیگم صاحب ٹھیک کر دیں گی دو نوں کو۔ ہمارے قابو میں تو آتے نہیں تھے سالے۔"

"رئیس خان صاحب۔ ام بالکل شرافت سے رہتی۔ کوئی بد معاشری بھی نہیں کرتی۔ آپ یہ بات جانتی" ام اسے بھی سمجھائی۔ وہ بیگم صاحب کا حکم مانتی۔"

"اچھا تو ایک بات اچھی طرح کان کھول کے سن لو۔ آج کے بعد کچن میں تم اکیلے ہو سکتے ہو۔ چھوٹی کو یہاں میرے ساتھ رہنا ہو گا جب تک شادی نہیں ہوئی تمہاری۔" "خدا نے چاہا تو یہ نیک کام اگلے ہفتے میں کریں گے ہم" رئیس بولا۔

اس نے ایک چچ ماری "شادی۔ اگلے ہفتے۔ یہ آپ کیسا خوش خبری سنائی صاحبہ۔ امارا حرکت قلب بند ہوتی خوشی سے۔ ام یہ اطلاع چھوٹی کو دیتی فی الفور۔ وہ آپ کا قدم بوسی کرتی۔ ام آپ کا غلام وہ کنیز ہوتی آخری سالن تک۔ امارا اولاد کا اولاد بھی آپ کا نمک نوش کرتی۔ خدمت بجا لاتی۔"

ہنسنے ہنسنے ہم سب کا بڑا حال ہو گیا۔ پہلے وہ ٹھہرو غم کے جذبات سے مغلوب تھا۔ اب اچانک خوشی کے جذبات نے اسے پھل کر دیا تھا۔ وہ جیٹھا چلا آ بھاگ گیا۔

میں نے کہا "بہت اچھا فیصلہ کیا تم نے سونی!" رئیس بولا "ہم بس سوچتے رہتے تھے حالانکہ سوچنے کی کوئی بات تھی دو بول ہی تو پڑھانے تھے۔" جنم نے گھڑی دیکھی "شادی ایک ہفتے کیا ایک گھنٹے میں ہو جاتی ہے اگر نیت اور ارادہ ہو۔"

رئیس منہ بسورنے لگے "پنی تو عمر گزر گئی۔ ابھی تک نہ نیت کام آئی نہ ارادہ۔"

میں نے کہا "غالباً اس کے لیے ایک لڑکی کا ہونا بھی اتنا ہی ضروری ہے اپنے رئیس خان۔ جتنا ایک لڑکے کا ورنہ آدمی شادی تو میں ابھی کر دوں تمہاری۔ تم تین بار کہہ دیا

قبول ہے۔ کبھی اتفاق سے دلہن دستیاب ہوئی تو باقی کام ہو جائے گا۔"

جنم نے جھلا کے کہا "اب کیا یہی ہوتا رہے گا۔ تمہیں چلنا ہے میرے ساتھ تو چلو ورنہ میں جاری ہوں۔" میں نے دردناک لہجے میں کہا "ابھی سے اکیلا چھوڑ کے جانے کی بات کر رہی ہو بھول گئیں رات کی بات۔"

جب اس نے دروازے کی طرف مارچ شروع کیا تو میں اس کے پیچھے لپکا۔ پیچھے سے رئیس نے آواز دی "یار! یہ گاڑی لے جاؤ۔"

میں نے کہا "اس کی ضرورت نہیں۔ گاڑی ہے ہمارے پاس۔"

رئیس کی سفید سوز کی آلتو آزاد صاحب کے آفس میں چلی گئی کے ساتھ ہی کھڑی ہوئی تھی۔ چلی کی ظاہری حالت بتاتی تھی کہ وہ کافی عرصے سے ایک ہی جگہ کھڑی رہی ہے۔ اس پر گردوغبار جمع ہو گیا تھا اور ایک نازعاً بچہ پتھر تھا۔ دوسرے کی ہوا کم ہو رہی تھی۔

میں نے کہا "خدا کا شکر ہے کہ آزاد صاحب آفس میں موجود نہیں ورنہ میری شامت آجاتی۔ اس مڑے میں جان ڈالے بغیر گھولنا صحت مند ہوتی۔"

"خواہ خواہ کے غم سے مت دکھایا کرو۔ کر سکتے ہو کوئی کام تو ان کا دل رکھنے کے لیے ہی کر دینا چاہیے" جنم نے دوسری گاڑی کالا کھولا۔

"اٹا دل لاؤ تو۔ یہ تو اتفاق ہے کہ ہر بار کوئی معمولی سی خرابی سانس ہی نظر آتی مجھے ورنہ میں کیا سوز کھنک ہوں" میں ذرا نیچے سیٹ پر بیٹھ گیا "کچھ نہیں کر سکتا میں۔"

"میری خاطر بھی نہیں۔؟"

میں نے پیچھے دیکھا اور گاڑی کو باہر نکالا "بالکل نہیں۔ ایک بار جذباتی ہو کے ہاں کہہ دی تو تمہیں موقع مل جائے گا میرے جذباتی استحصال کا۔ آج گاڑی ٹھیک کر دی تو کل کوئی گھر کے ٹکے دیکھ لو ورنہ یہ بجلی کا سوج بجل دو۔ جوتے پالش کرو۔"

جنم مسکراتی "بیوی سب کرا لے گی دیکھ لیتا۔"

میں نے کہا "اسی لیے پالیسی بیان جاری کر دیا ہے میں نے پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔"

ملک صاحب کی گاڑی سروس اسٹیشن کے آخری حصے میں پھیل پھیل کے پیچھے کھڑی کر دی گئی تھی۔ منجھڑے شکایتاں کہا "آپ تو گڈی کو ایسے بھول گئے جیسے امریکا جانے والے

ایک قطار نظر آ رہی تھی جو میرے پاس سے گزرتی جا رہی تھی۔

میں نے انجن بند نہیں کیا تھا کیونکہ پمپ کے سامنے ایک جنٹم کی گاڑی تھی جو آگے تھی۔ دوسری گاڑی چند سیکنڈ کے وقفے سے پیچھے رہ گئی تھی۔ پیٹرول پمپ اور ادا کیلنگ کرنا صرف پانچ منٹ کا کام تھا۔ اگر ہزار کا نوٹ دے کر اسے باقی رقم واپس لینی ہوتی تو ایک منٹ اور لگ جاتا۔ ایسے کھڑے کھڑے ہم کتنا پیٹرول بچوٹک دیتے ہیں۔ میں نے سوچا۔ اس وقت بھی ملک میں جزاموں یا شاید لاکھوں گاڑیاں مصروف شاہراہوں کے ٹریفک جام میں شگل پر اور میری طرح چند منٹ کے انتظار میں ساکت کھڑی ہیں اور ان کے انجن چل رہے ہیں اور ہم سب پیٹرول نہیں ذرا بادل پھونک رہے ہیں۔ محض ایک لاکھ حاصل آسانی کے لیے کہ ہمیں پھر چانی گھرانے کی زحمت نہ کرنی پڑے۔

اب انجن بند کر کے حب الوطنی کا مظاہرہ کرنے سے کیا ہوگا۔ میں نے پلٹ کر پیٹرول پمپ کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا پھر میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا کیونکہ جنٹم کی سرخ آٹو وہاں موجود نہیں تھی۔ پمپ کے سامنے ایک ٹیکسی کھڑی ہوئی تھی اور اس کے پیچھے ایک شاہانہ قسم کی نئی گاڑی۔ میری نظر نے سرج لائٹ کی طرح محوم کے پورے علاقے کا سروے کیا مگر مجھے پیٹرول پمپ کے وسیع احاطے میں کہیں کوئی بھی لال رنگ کی گاڑی نظر نہیں آئی۔

کیا اتنی سی دیر میں ملک رب نواز کے آدمی نے جنٹم سے گاڑی لے لی اور نکل گیا؟ میں نے انجن کا سوچ آف کرتے ہوئے سوچا اور گاڑی سے باہر نکل آیا۔ اگر وہ پیٹرول پمپ پر پہلے سے موجود ہوتا تو گاڑی کے روانہ ہوتے ہی سامنے آجاتا لیکن پیٹرول ڈلو اتے وقت وہاں صرف ایک ملازم تھا جو پمپ کا پائپ پکڑے میٹر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ ناممکن نہیں تھا۔ کیا پتا وہ اسی وقت پہنچ گیا ہو جب میں نے جنٹم کو دیکھا تھا۔ جنٹم نے اتر کے کہا ہو کہ تم ملک کے آدمی ہو تو یہی لو۔ چاند سی بنو اب تیرے حوالے اس نے دیکھا ہو گا کہ فیول ٹینک کی سوئی بالکل خالی ظاہر کر رہی ہے تو مناسب نہیں سمجھا ہو گا کہ پیٹرول کا آخری قطرہ تک خرچ کر کے گاڑی لوٹاؤ۔ حالانکہ ملک رب نواز کی تازہ ترین خباثت کے مظاہرے کے بعد ایسی اخلاقیات کا خیال رکھنا بالکل ضروری نہیں تھا۔ اس نے شگل دینے والا آلہ نصب کیا تھا تو در جواب اس غزل یہ ضروری تھا کہ ہم اس میں ٹائم بم نصب کر کے گاڑی واپس کرتے۔

گھروالی کو بھول جاتے ہیں۔
میں نے کہا ”تم نے کبھی ایسا کیا ہے؟ کبھی دعوت میں چکن تو دہریا کی اور بھوسٹ چھوڑ کے گھر چلے گئے ہو۔ بیوی کے پکائے ہوئے کھانے؟“
جنٹم ہولی ”گاڑی نے آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں دی۔ آپ کون سے ڈھڑالے یہاں کھڑے رہے رات بھر۔“
”یہ بات نہیں جی۔ زمانہ بڑا خراب ہے۔ پتا نہیں کوئی ملکوک گڈی چھوڑ جائے۔ مصیبت میں ہم پڑ جائیں۔ گڈی چوری کی ہو۔ ہم لگا ہو گڈی میں۔ یا واردات میں استعمال ہوئی ہو۔“ اس نے یہ آواز بلند ناک صاف کی۔
جنٹم خفا ہو گئی ”ہم صورت سے ایسے نظر آتے ہیں تمہیں۔“

وہ اپنی بات پر قائم رہا ”ادنی صورت پر جائے بندہ تو کوڑا ہو جائے اس گٹ۔“
اس کے جانے کے بعد جنٹم نے شگل دینے والے چھوٹے سے آلے کو پھر وہیں نصب کر دیا جہاں سے ہم نے اسے دریافت کیا۔ اس کے دو ناموں میں سے ایک کو میں نے ایسے الگ کر کے چھوڑ دیا کہ کسی کو شک نہ ہو۔ اب ایسا لگتا تھا جیسے سروس کے دوران میں پانی کے پرشر سے کنکشن نوٹ گیا ہو گا۔

”تمہاری بات ہو گئی ملک رب نواز سے؟“ میں نے کہا۔
جنٹم نے سر ہلایا ”اس نے کہا تھا کہ میرا بندہ پہنچ جائے گا سروس اسیشن پر۔“
”وہ بندہ بچان لے گا تمہیں۔“ میں نے کہا۔
”وہ گاڑی کو بچان لے گا۔“ جنٹم ہولی ”میں نے بھی کہہ دیا تھا کہ گاڑی کوئی اور لے جائے مجھ سے تو میری ذمہ داری نہیں۔ وہ بولا کہ جناب ذمہ داری تو ویسے بھی کوئی نہیں آپ کی۔ آپ سے میں نے کون سی رسید لی تھی۔“

میں سفید گاڑی میں آگے چل پڑا۔ مجھے اپنے عقب نما آئینے میں لال رنگ کی چکن دھکی آٹو ہی نہیں کار والے کا چوہ بھی صاف نظر آ رہا تھا۔ پیٹرول پمپ سے نکلے ہوئے میرا دھیان سیدھے ہاتھ کی طرف سے آنے والی ٹریفک کی طرف ہو گیا۔ چند منٹ بعد میں نے دیکھا تو پیچھے کوئی گاڑی نہیں تھی۔ جنٹم پیٹرول پمپ کی طرف مڑ گئی تھی اور گاڑی میں پیٹرول ڈلو ادی تھی۔ میں نے اپنی گاڑی کو راستے سے آگے بڑھا کے فٹ ہاتھ کے متوازی کھڑا کیا اور جنٹم کا انتظار کرنے لگا۔ اب مجھے ٹیک دیو مرد میں سڑک پر آنے والی گاڑیوں کی

مٹی۔ آپ کو ادھر ہی چھوڑ گئی۔“
میں نے کہا ”ابھی ایک سرخ رنگ کی آٹو آئی تھی۔“
اس نے کہا ”وہ آٹو نہیں، ٹاکسی تھی۔ پتا ہے وہ کس کی گاڑی تھی؟“

ایم اے راحت

ایک خوبصورت تحریر

★

ایک ایسی داستان جو ایک
باد شروع کر کے مکمل کیے بغیر نہیں
چھوڑی جاسکتی۔ ایک نوجوان
جس کے انداز زندگی کا ہر ٹھنک
نرالا تھا۔ کیونکہ وہ ماں کی آغوش
کی بجائے سمندر کی گود میں
پیدا تھا

سمندر کا بیٹا

سمندر کے اندر کی داستان جو کہ اپنے سینے میں
ان گنت راز، داستانیں اور خزانے چھپائے ہوئے ہے

رقیب احمد میمن

قیمت ۱۸۰/-
ڈاک خرچ ۳۰/-

گاڑی دینے کے بعد جنٹم کہاں جاسکتی ہے؟ اسے سیدھا ادھر آنا چاہیے تھا جہاں میں اس کے انتظار میں ذرا بادل چلا رہا تھا۔ جنٹم نے کتنا پیٹرول ڈلوایا ہو گا؟ پچاس کا یا زیادہ سے زیادہ سو کا۔ کیشیئر کو نوٹ پکڑانے میں دیر لگنے کا کوئی سوال ہی نہیں۔ میرا خیال تھا کہ ہم پیٹرول پمپ کی حدود سے باہر آکے سڑک پر ملک صاحب کے بندے کا انتظار فرمائیں گے چنانچہ میں نے جہاں گاڑی کھڑی کی تھی وہ بہت مناسب جگہ تھی۔ گاڑی لینے کے لیے آنے والے کی نظر گاڑی کو مس نہیں کر سکتی تھی۔ وہ شاید پمپ کے آس پاس کہیں موجود تھا کہ اس نے گاڑی وہیں لے لی۔

لیکن سوال پھر وہی پیدا ہوتا ہے کہ اس کے بعد جنٹم کہاں گئی؟ میری نظر زاموں کو نہ دیکھے مگر یہ کیسے ممکن تھا کہ جنٹم پر نہ ٹھہرے۔ وہ پیٹرول پمپ کے گرد فواج میں کہیں بھی نہیں تھی۔ یہ امکانات نہ ہونے کے برابر تھے کہ اسے لیڈر واٹش روم جانے کی ضرورت پیش آگئی ہو یا وہ کوئی شکایت کرنے میجر کے آفس میں چلی گئی ہو۔ ہاں یہ ہو سکتا تھا۔ شکایت نہ سنی ”اس نے ضروری سمجھا ہو کہ ملک رب نواز کو ایک فون کر کے مطلع کر دے کہ اتنے بج کر اتنے منٹ پر آپ کی امانت آپ کے اس طے اور شگل والے بندے کے سپرد کر دی گئی ہے۔ اب میری ذمہ داری ختم۔“
جنٹم میجر کے آفس میں بھی نہیں تھی۔ وہ اپنی نزلے میں جتنا نظر آنے والے آدمی ہزار قسم کے فیچر نے مجھے دیکھ کر کہا ”آپ۔“ پھر چھینک نے اس کی ہلکی بند کر دی۔ اس نے ناک کی ساری برآمدات کو احتیاط سے رومال میں لپیٹ کے کہا ”حمد للہ۔“ اور پھر بولا ”ہاں جی حکم۔“
میں نے کہا ”میں ان خاتون۔ اپنی بیوی کو دیکھ رہا تھا۔“

اس نے ادھر ادھر دیکھا ”کس کی بیوی کہاں ہے؟“
”میرا خیال تھا کہ وہ شاید یہاں فون کرنے آئی ہو۔“
اس کے لیوں پر ایک عجیب سی ہر تسخار اور اشتعال دلانے والی مسکراہٹ نمودار ہوئی جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ پانچ منٹ پہلے تو بیوی تمہارے ساتھ تھی۔ اب مجھ سے پوچھنے آئے ہو کہ کہاں ہے۔ بھاگ گئی ہوگی کسی کے ساتھ۔ زمانہ بڑا خراب ہے۔

میں نے باہر آکے پیٹرول ڈالنے والے معصوم لڑکے کے فارغ ہونے کا انتظار کیا۔ پھر اس سے پوچھا ”یار، ابھی ایک لڑکی نے پیٹرول ڈلوایا تھا یہاں۔“
اس نے جانے والی کار کی طرف اشارہ کیا ”وہ تو چلی

میں نے ضبط سے کام لیا "دیکھو۔ اٹلو اور فاسکی میں کیا فرق ہوتا ہے یہ جانتے ہو تا تم جو کئے اور گدھے میں ہوتا ہے"

"آپ نہ کہے کہ رہے ہو اور گدھا کہے؟"

میں نے کہا "میری بات غور سے سنو۔ اس آٹلو میں ایک بہت خوبصورت لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔"

"میں سمجھ گیا۔ ملی آنکھوں والی۔ ادھر گال پر ایک قس تھا۔" اس نے ناک کے قریب انگلی سے نشانہ دی کی "میدھے ہاتھ کی بچ والی انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی تھی۔"

میں نے کہا "نہیں۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ہیں۔" شائون تک کئے ہوئے بال۔ گورا رنگ۔ دلی چلی اور ازند۔"

لیکن وہ اب ایک گاڑی میں بیٹھ کر بھرنے لگا تھا اور میری پریشانی میں ہرگز رتے لمبے کے ساتھ اضافہ ہو رہا تھا۔ آہستہ آہستہ وحشت انگیز خیالات کے کھلانے والے سنپولے سرخاٹکے مجھے ڈسنے کے لیے تیار تھے۔ وہ اندر کی آواز جو عام حالات میں خاموش رہتی ہے مگر خطرہ محسوس کرتے ہی چھٹی حس بن کے چلانے لگتی ہے مجھے جھنجھوڑنے لگی تھی اور یہ سمجھا لگی تھی کہ کوئی بات ضرور ہوئی ہے۔

جینم ایسے مجھے بتائے بغیر کہاں جا سکتی ہے۔ لیکن اسے لے جایا جا سکتا ہے۔ جو ہتھیاری سے منصوبہ بنانے کی سوچ کی ناک میں بیٹھے ہوئے اس کام کے ماہر لوگ ایسی صفائی سے انگو اکرتے ہیں کہ کسی کو بھی شک نہ ہو۔ خواہ دیکھنے والے سب دیکھ رہے ہوں۔

ملازم لڑکا پاپ کو دھک سے لٹکا کے میری طرف پلٹا۔ "دیکھو۔ ہم تو بس بیٹھول ڈالتے ہیں۔ گاڑیاں آتی جاتی رہتی ہیں۔"

میں نے کہا "بہت سیریس معاملہ ہے۔ اس لڑکی کو ابھی ابھی میاں سے انگو اکرایا گیا ہے۔ ذرا ذہن پر زور دو۔"

وہ ہلکا گیا "آپ کیسی باتیں کرتے ہو جی۔ انگو اسے میرا کیا قتل۔ میں نے کچھ نہیں دیکھا اور ایسی کوئی بات ہوئی بھی نہیں۔ بے شک دوسروں سے پوچھ لو۔"

میں نے اپنے آپ کو بہت بے بس اور محرا کے اس مسافر کی طرح محسوس کیا جو اپنی سست کھو بیٹھا ہو۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ کس سے پوچھوں کہ جینم کہاں گئی۔ کدھر جاؤں کسی نے کچھ نہیں دیکھا تھا۔ کچھ نہیں سنا تھا جیسے سب اچانک ایک لمحے کے لیے اندھے ہوئے اور پھر کے ہو گئے تھے اور اسی ایک لمحے میں جینم غائب ہو گئی تھی۔ اب اپنی بے وقوفی اور کوتاہی پر خود کو کوسنا

بھی لا حاصل تھا۔ اگر میں نے جینم کا خیال رکھا ہوتا، اگر میں اس کی گاڑی کو نظر سے اوجھل نہ ہونے دیتا۔ اگر میں ذرا مبالغہ پھونکنے کے قوی مسئلے پر سوچ بچار کی فکر میں غرق نہ ہوتا۔ اگر۔ اگر۔ اگر۔ نہ ہوتا تو کیا ہوتا جو ہوتا تو کیا کیا ہوتا؟ کیا ہے؟ یہ نہیں رہا کہ کیا ہوا۔ یہ ہے کہ اب کیا ہوگا؟ کیا ہوا چاہیے؟

میں وہاں کھڑا رہ کے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بیٹھول ڈالنے والا ملازم لڑکا اب دوسرے ساتھیوں کو میرے سوالات کے بارے میں کچھ بتا رہا تھا اور وہ سب مجھے حیرانی میں ڈال رہے تھے۔

ہر دوی اور پریشانی کے لیے جملہ جذبات کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ میں نے پیچھے سے فیکری خوفناک چینگ اور ناک صاف کرنے کی آواز سنی اور پلٹ کے دیکھا۔ وہ بیک وقت مجھے اور اس لڑکے کو بلاتا تھا۔

"اب کیا مسئلہ پڑ گیا ہے آپ کو؟" وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

ملازم لڑکے نے فریادی لہجے میں کہا "سری۔ یہ مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ ادھر لال رنگ کی آٹلوں کوئی لڑکی آئی تھی۔ اس کو کسی نے انگو اکرایا ہے۔ لوجی میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں دیکھی۔ رپ دی سول۔"

فیکری نظر مجھ پر جم گئی۔ اس کے ہونٹوں پر وہی سستی خیر مسکراہٹ آئی جس کا مفہوم بہت واضح تھا۔ ہم ایسے ہی تو نہیں کہتے تھے کہ زمانہ خراب ہے اور یہ بال تو خیر اس نامراد نزلے سے سفید ہوئے ہیں مگر دنیا دیکھتے ہیں ہم ادھر بیٹھ کے آنکھیں کھلی نہ رکھیں تو کوئی ہوجائے ایسا ہی ہوتا ہے بھائی۔ لڑکی خود نکل جاتی ہے، کیس بن جاتا ہے انگو اکا۔ اس نے پھر ایک زوردار چینگ مار کے کہا "الحمد للہ" اور آتے والی برآمدات کو روٹال میں بڑی صفائی سے غائب کر دیا "سوئی" میں نے ادھر اپنے آفس میں سے دیکھا تھا لیکن یہ بات میں کسی تھا نے پھری کے چکر میں پڑنے کے لیے نہیں بتا رہا ہوں۔ گواہی میں تو کوئی ہوجانا ہے بندے کا۔ زمانہ بڑا خراب ہے۔"

میں نے دھڑکتے دل کو سنبھال کے کہا "آپ نے کیا دیکھا تھا؟"

اس نے مجھے ساتھ آتے کا اشارہ کیا "مگر آپ پھر آؤ گے تو میں آپ کو پچاننے سے بھی انکار کر دوں گا۔ پولیس کو بیان کوئی نہیں دوں گا۔"

وہ مجھے اپنے آفس میں لے گیا۔

میں نے پُرسکون اور پُرجھل رہنے کی پوری کوشش کی۔ آپ مطمئن رہیں۔ اگر خدا آخواست پولیس میں بتا تب بھی آپ کا نام نہیں لوں گا۔"

"میرے نام کا نہیں اصل میں تو یہ کام کا مسئلہ ہے۔ جو میں ادھر بیٹھ کے کر رہا ہوں۔ بڑی ڈنٹے داری ہے میری۔ آپ بھی اسی لیے آتے تھے میرے پاس کہ ادھر کچھ بھی ہو۔ نیچر بتائے گا۔ آپ یہ تو کسوٹے تاکہ واردات بیٹھول پاپ پر ہوئی تھی۔"

میں نے کہا "دیکھئے" ابھی تک واردات کا لفظ صرف آپ نے استعمال کیا ہے۔ ممکن ہے کچھ بھی نہ ہوا ہو۔"

"آپ تو انگو کی بات کر رہے تھے۔"

"وہ میرے پریشان دماغ میں ایسے ہی خیال آیا ورنہ نہیں سے وہ کیس چلی گئی ہو۔ مجھے بتانا یاد نہیں رہا۔ خیال نہیں آیا اُسے۔"

وہ بھر ممتی خیر انداز میں مسکرایا۔ "معاف کرنا۔ کیا آپ کی بیوی۔ اتنی نادان اور غیر ذتے وار ہے۔ یا خدا آخواست۔"

میں نے کہا "نہیں" وہ بالکل بھی نہیں ہے۔ آپ تو مل پتے ہیں اس سے اور بات بھی کر چکے ہیں اس سے۔ دراصل پریشانی میں خود مجھے معلوم نہیں کہ میں کیا کہہ گیا۔ اب پلیز آپ بتادیں کیا دیکھا تھا آپ نے۔"

اس مختصر سے کہیں جیسے کمرے میں مجھے سانس لینا دوبارہ ہو رہا تھا۔ اس میں ڈیل بریک آئل اور مینٹر آئل کی ملی جلی بو تھی اور نزلے زکام کے وائرس بھرنے سے تھے لیکن اس سے زیادہ خطرناک۔ ذہنی اور اعصاب کو مفلوج و نافذ کرنے والے پریشان کن خیالات کے وائرس تھے جو میرے ذہن پر یلغار کر چکے تھے اور میرے تصور میں ایسے مناظر لارہے تھے جو انگو آہرور بڑی اور قتل کی لڑوہ خیر سرخیوں کو جنم دیتے ہیں۔ جو سوئی جیسی ہزاروں لڑکیوں کی کتاب زندگی کے ہر صفحے پر تصویر کی طرح دکھائی دیتے ہیں اور جن میں ملک رب نواز جیسے دلن کی شیطانیات کا حال چشم دید گواہ کی طرح بتانے والے بھی اس کا نام نہیں بتاتے۔ حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ نام لینے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

تھوڑے سوچ کے کہا "اس گاڑی میں بیٹھول ڈالوایا تھا آپ کی بیوی نے۔ پھر اس کے پیچھے ایک گاڑی آئی تھی۔"

میں نے کہا "ہاں سفید رنگ کی نوپوتا تھی۔"

"ایک چھوٹا ٹرک بھی ساتھ میں آئے کھڑا ہوا تھا۔"

جلدی میں ایسا کرتے ہیں لوگ۔ لائن سے آگے نکل کے ایک گاڑی کے ساتھ اپنی گاڑی لگالیتے ہیں۔ اب ملازم پاپ کو لپکا کھینچ کے ڈالے بیٹھول مگر۔" اس نے ایک اور چینگ کا دھماکا کر کے کہا "الحمد للہ۔"

"کیا تھا اس ٹرک میں؟"

"میں نے کہا نا" وہ غلط آگیا تھا۔ ڈیل کا پاپ دوسری طرف ہے۔ بہت دور ہے اس جگہ سے۔ کسی ٹرک میں پھر بیٹھول تو نہیں پڑتا پھر منڈے نے اسے اشارہ کیا اور ٹرک چلا گیا۔ اس نے ڈیل بھی نہیں ڈالوایا۔ اس پر خالی پیچھے لدے ہوئے تھے۔ مرغیاں لانے والے۔ آج کل تو پلاسٹک کے بے ہوئے استعمال ہوتے ہیں۔"

فیکری کی بات نے میرے ذہن میں امکانات کے بہت سے درختے کھول دیے تھے۔ یہ ہو سکتا تھا کہ پولیٹری فارم کے اس ٹرک کو سوچے مجھے منصوبے کے تحت لایا گیا ہو۔ ٹرک غلطی سے نہیں "اسی مقصد کے تحت جینم کی گاڑی کے بائیں جانب لاکے کھرا کیا گیا تھا۔ کوئی ٹرک ڈرائیور غیر شعوری طور پر بھی یہ غلطی نہیں کر سکتا کہ ڈیل پاپ کے بجائے سپر بیٹھول پاپ پر لے جائے۔ ٹرک نے جینم کی سوزکی کار کا راستہ ہلاک کیا اور اس سے پہلے کہ جینم متوجہ ہوئی، دائیں جانب سے ٹرک ڈرائیور اتر کے سوزکی کار کے بائیں ہاتھ والے دروازے سے اندر بیٹھ گیا۔ اس وقت تک جینم بھی ڈرائیور سیٹ پر بیٹھ چکی ہوگی۔ ٹرک وہاں کھڑا رہا تھا اور پاپ پر ملازم لڑکے نے اسے اشارے سے ڈیل پاپ کی طرف جانے کے لیے کہا۔ جیسا تھا مگر ٹرک ڈرائیور اس وقت کا ختم تھا جب بیٹھول کی قیمت ادا کرنے کے بعد جینم گاڑی کو آگے بڑھائے۔ پند سیکنڈ میں وہ ٹرک سے اترتا اور کار میں بیٹھ گیا۔ اس نے ریوالور نکال لیا اور جینم کو خاموشی سے چلنے رہنے پر مجبور کر دیا پھر ٹرک ڈرائیور کی جگہ اس کے ساتھ بیٹھا ہوا دوسرا شخص آیا اور ٹرک روانہ ہو گیا۔ اسے ڈیل ڈالوانے کی ضرورت ہی نہیں تھی چنانچہ وہ ایک طرف سے آیا اور دوسری طرف سے نکل گیا لیکن اس کی ایک معمولی غلطی کو شیشے کی شٹاف دیوار کے پیچھے بیٹھے فیکرے نوٹ کر لیا۔

میں وہاں موجود نہیں تھا۔ خود فیکرے نے بھی کچھ نہیں دیکھا تھا۔ اس کے باوجود مجھے یوں لگا جیسے یہ سب ایسے ہی ہوا ہوگا جیسا میں نے چشم تصور سے دیکھا۔ اگر جینم گاڑی میں بیٹھول ڈالوانے نہ جانی تو شاید بیٹھول پاپ کی حدود سے باہر آتے ہی ٹرک اس کا راستہ روکتا اور پھر کھینچتا ہوتا۔ میں جینم کے ساتھ مگر دوسری گاڑی میں تھا۔ میرے اور جینم کے

درمیان کسی تیسری گاڑی کا آجانا کوئی شک پیدا نہیں کر سکتا تھا۔ جس سڑک پر ٹریفک زیادہ ہو وہاں دو گاڑیوں کا مسلسل ساتھ ساتھ چلتے رہنا بعض اوقات ممکن نہیں رہتا۔ اسے جلد باز اور غلط سلط طریقے سے اوور ٹیک کرنے والے ڈرائیور ناممکن بنا دیتے ہیں۔ اگر میری اور شبنم کی گاڑی کے درمیان کوئی ٹرک حائل ہو جاتا تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہوتی۔ میں سامنے دیکھ کے اپنی گاڑی چلا تا رہتا اور کسی فرض کیے رہتا کہ ٹرک کے پیچھے شبنم کی گاڑی آ رہی ہے پھر شاید پیچھے والے ٹرک سے کوئی اتار اور شبنم کو اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کر دیتا۔ ریوالور کی ٹالی کا رخ اپنی طرف دیکھ کے بڑے بڑوں کی قسم کھاتی ہے۔ شبنم اپنے ردیوں میں کتنی ہی ہنڈ اور بے باک کیوں نہ سمی، مگر تو بہر حال ایک عام قسم کی ٹازک اور کمزور لڑکی۔ ڈرائیور ٹیک کرنے والا ویسے بھی زیادہ بے بس ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ چیر سب مصروف کار ہوتے ہیں۔ وہ کسی قسم کی مزاحمت کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوتا۔ شبنم کے انوکھا یقین کر لینے کے بعد میں ذہنی اور جسمانی طور پر بے حوصلہ اور مفلوج ہو گیا تھا۔ اسے میں اپنی کوتاہی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اس قسم کی صورت حال کا میں نے سوچا بھی نہیں تھا چنانچہ اس سے بچنے کے لیے میرے ذہن میں کوئی دفاعی STRATEGY نہیں تھی۔ اب اچانک بہت سے سوالیہ نشان میری قوت عمل کی راہ میں دیوار بن کے کھڑے ہو گئے تھے اور میرے پاس ایک کا جواب بھی نہیں تھا۔ مجھے کیا کرنا چاہیے یا کدھر جانا چاہیے؟ کس پر شک کیا جاسکتا ہے۔ ملک رب نواز کے علاوہ؟ مجھے پولیس کی مدد ملنی چاہیے یا نہیں کوہلا نا چاہیے۔ وہ شبنم کو کہاں لے گئے ہوں گے۔ اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟ اس سے کیا مطالبہ کریں گے۔ جس صفائی برادری کے مضبوط ساروں پر اسے تازہ تھا کیا وہ اسے برآمد کرانے میں کامیاب ہوگی؟

غیر نے بہ آواز بلند چیخ کر مار کے کہا "الحمد للہ" تو میں چونکا۔ میری نگاہ وال ٹھاک پر گئی۔ دس منٹ گزر چکے تھے۔ دس منٹ میں ایک کار کسی بھی سمت میں دس کلومیٹر جاسکتی ہے۔ شہر کے بھول بھلیوں جیسے راستوں پر۔ ٹریفک کے ازدحام میں۔ گلیوں اور بازاروں میں کہیں بھی گم ہو سکتی ہے۔ کسی کو غشی کے احاطے، گمراہی میں پھینک سکتی ہے۔ دس منٹ میں گاڑی بدلی جاسکتی ہے۔ دس منٹ وقت کی بہت لمبی مسافت ہے۔ جو وجود سے عدم تک بھی پھیل سکتی ہے پھر بھی کوشش کے دائرہ امکان سے باہر کچھ نہیں۔ مجھے اگلے ہر

لمحے پر اپنی گرفت کو مضبوط رکھنا چاہیے۔ میں سوچ بچار میں وقت کیوں ضائع کر رہا ہوں؟ یہ خیال ایک آنے والے کی طرح مجھے ہوش میں لانے کے لیے کافی تھا۔ میں نے غیرت پر پھنسا "وہ پولیسی فارم کا ٹرک۔ اس کا نمبر۔"

غیر نے افسوس سے نفی میں سر ہلایا "میری نظر اب اتنی تیز نہیں رہی۔ اس کے علاوہ درمیان میں پپ حائل تھا۔" میں نے کہا "آپ ڈرائیور ہونے والے والے لازم کو بلائیں۔ اس نے دیکھا تھا ٹرک اور اسے اشارے سے ذیل پپ کی طرف جانے کے لیے کہا تھا۔"

"چلو آپ پھر اپنی قسمی کرلو" غیر نے ٹاک کو رگڑتے ہوئے کہا "ویسے مجھے امید نہیں کہ وہ کچھ بتا سکے۔"

"غیر صاحب، ٹرک سے ایک آدمی اتر کے گاڑی میں بیٹھ جائے۔ یہ واقعہ بین بیٹریول پپ پر پیش آئے اور بیٹریول ڈالنے والی کی نظر نہ دیکھے۔ یہ کیسے ممکن ہے؟" بیٹریول ڈالنے والا اپنے موقف پر قائم رہا "وہ عرفی والا ٹرک ادھر آ گیا تھا غلطی سے۔"

"تم نے ڈرائیور سے کیا کہا تھا؟" میں نے کہا کہ ادھر جا یا۔ ڈریول پپ ادھر ہے۔" لازم نے ہاتھ کا اشارہ کر کے اپنا مفہوم واضح کیا۔

"ڈرائیور کو دیکھا تھا تم نے؟" غور سے نہیں دیکھا تھا۔

"کچھ تو یاد ہو گا تمہیں۔ وہ جوان تھا یا بوڑھا۔ کالا تھا یا گورا۔ داڑھی موچھ والا تھا یا گلین شیو۔"

"جوان تھا، کچھ موٹا۔ رنگ میرے جیسا ہو گا۔ داڑھی موچھ نہیں تھی۔" لازم نے ذہن پر زور دے کے بتایا۔

"کچھ یاد ہے کپڑے کیسے پہن رکھے تھے اس نے؟" لازم نے نفی میں سر ہلایا۔ "اتنا غور نہیں کیا میں نے

جناب میں بیٹریول ڈالنے میں مصروف تھا۔"

"پھر خبر کہاں دیکھا ہو گا تم نے؟" اس نے کہا "نہیں جی، لیکن ٹرک نیلے رنگ کا تھا۔"

"نیلے بھی دیکھا ہو گا تم نے؟ عام طور پر لوگ ایک ہی پپ سے بیٹریول یا ڈریول ڈالتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا حساب چلتا ہے۔ کچھ لوگوں کے لیے یہ آسانی ہوتی ہے کہ پپ ان کے راستے میں پڑتا ہے۔ کچھ ایک پپ کو دوسرے سے بہتر سمجھتے ہیں۔"

"کچھ گاڑیاں ہیں جو آتی رہتی ہیں۔" میں نے اچانک سب سے اہم سوال داغ دیا "کیا اس

ٹرک کا ڈرائیور نیچے اترتا تھا؟"

جواب اس نے پہلے جیسی روانی سے سوچے بغیر نہیں دیا۔ اس نے دیر نہیں کی مگر بہت معمولی سے تذبذب نے اس کے جواب کی حیثیت کو میری نظر میں مشکوک بنادیا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس نے بولنے سے پہلے نیچری طرف دیکھا تھا اور غالباً نیچر نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں خبردار کر دیا تھا کہ بس سچ کی یہی حد ہے جہاں تک تم قانونی طور پر محفوظ ہو۔ اس سے آگے والا سچ شمارے لیے قانونی اور معاشی مسائل پیدا کر سکتا ہے۔

اس نے کہا "نہیں جناب! ڈرائیور اسی وقت ٹرک موڑ کے لے گیا تھا۔"

"کہاں لے گیا تھا؟" مجھے نہیں معلوم۔ شاید ڈریول پپ کی طرف۔ میں اپنا کام کر رہا تھا اور ٹرک کو کیسے دیکھتا رہتا "اب میں جاؤں؟"

غیر نے مجھ سے پہلے کہا "جاؤ۔ دیکھو، ایک آدمی ہے پپ پر۔ کتنی گاڑیاں کھڑی ہیں۔"

میں نے کہا "غیر صاحب دیکھئے، مجھے اچانک اپنی پوی کے غائب ہو جانے سے کتنی پریشانی لاحق ہو گئی ہے۔ اس کا اندازہ نہیں کر رہے ہیں آپ۔ ایک منٹ پہلے وہ یہاں تھی۔ بیٹریول ڈالواری تھی، ایک منٹ بعد نہ اس کی گاڑی بھی اور نہ وہ خود۔"

غیر نے دراز میں سے زکام کی کوئی دوا نکال کے پانی کے ساتھ نگلی۔ اس کی ٹاک مسلسل بہہ رہی تھی اور وہ شوش شڑاپ کی آواز کے ساتھ ٹاک کی آخری حدود تک آجانے والی رطوبت کو واپس اور کھینچ رہا تھا۔ "ایک منٹ نہیں جناب۔ پانچ منٹ تو ضرور گئے ہوں گے۔ پہلے آپ انتظار کرتے رہے کہ وہ بیٹریول ڈالو کے اپنی گاڑی چلائی ہوگی، نمودار ہوگی اور آپ کی گاڑی کے پیچھے پیچ کے ٹھہر جائے گی مگر کچھ دیر بعد آپ کو احساس ہوا کہ کالی دیر ہو گئی ہے۔ اس کے بعد ہی آپ نے اتر کے دیکھا ہو گا ورنہ پپ اپنی گاڑی میں آرام سے بیٹھے تھے "ایم آئی رائٹ؟"

"اوکے پانچ منٹ۔ پانچ منٹ میں اتنی بڑی واردات ہو گئی۔"

"سنہرے کیا نام ہے آپ کا؟"

میں نے کہا "ناہر ظہیر۔"

"ناہر صاحب آپ پانچ منٹ کی بات کرتے ہیں۔ دنیا میں ہر ایک منٹ میں کتنے نیچے پیدا ہو رہے ہیں اور کتنے لوگ مر رہے ہیں۔ کسی کو ایک گولی مارنے میں کتنا وقت لگتا ہے

اور غلطی جہاز پانچ منٹ میں کتنی دور نکل جاتا ہے؟" میں نے کہا "یہ کون سا وقت ہے ایسی باتوں کے لیے؟" "میں بتانا چاہتا تھا کہ واردات کرنے والے ہلک چھپکتے ہیں بہت کچھ کر جاتے ہیں۔"

"اور ایسا ہی یہاں ہوا؟" وہ سر ہلانے لگا "آپ نکال رہے ہیں یہ مطلب میری بات کا۔ میں تو کہہ رہا ہوں کہ یہاں کچھ بھی نہیں ہوا۔ اگر کچھ ہوا تو یہاں سے دور ہوا مثلاً سڑک پر ہوا۔"

"سڑک پر کیا ہوا؟" اس نے دراز میں سے تولیے جیسا ایک صاف اور خشک ردیال برآمد کیا اور آنے والی چھینک کے لیے تیار ہو گیا۔

"سڑک پر؟ آپھیں۔ الحمد للہ۔" اس نے ٹاک کو رگڑ کے صاف کیا "سڑک پر یہ ہوا کہ وہ ٹرک تیزی سے نکلا اور دائیں طرف سے آنے والی ٹریفک میں گھس گیا۔ زبردستی گھس گیا۔

جیسے کہ ٹرک والے کہتے ہیں۔ ان کی ٹولی باڈی میں شوشا تو ہوتی نہیں۔ بسے بچانی ہے اپنی باری ہی خوبصورت ٹازک کا روہ خود بچائے ورنہ بے شک ٹھکرا جائے۔ تو وہ مجھے جس کے

بریک اچھے تھے اور جو گولی کی طرح نہیں آ رہے تھے لیکن ایک کار والا کوشش کے باوجود اپنی نیلے رنگ کی ٹویوٹا اسپرٹر مائل انیس سو چتر کو نہیں بچا سکا۔ یہاں بیٹھ کے ہم گاڑیوں کے تپانے مائل دیکھتے رہتے ہیں۔ سب کی بچان ہو جاتی ہے خود بخود۔ وہ سفید رنگ کی ٹویوٹا اسپرٹر ٹٹ ہاتھ سے ٹکرائی اور اس کا پیریز ہوا ہو گیا۔ ٹرک نکل گیا تھا مگر کار ڈرائیور کوئی نوجوان تھا۔ وہ اس کے تعاقب میں گیا۔ آگے جا کے کیا ہوا؟ یہ نہیں معلوم مجھے لیکن میرا خیال ہے کہ کار والے نے ٹرک کو پکڑ لیا ہو گا۔ اسپرٹر اچھی گاڑی ہے، چیتے جیسی تیز رفتار۔"

"وہ سفید رنگ کی ٹویوٹا اسپرٹر۔"

"مائل سن چوتھر؟ وہ بولا۔

"کس کی ہے وہ گاڑی؟ کیا آپ بچاتے ہیں؟"

غیر نے نفی میں سر ہلایا "بچاتا تو آپ کو پوچھنا نہ پڑتا لیکن آپ اس کار کو تلاش کریں تو اس سے یقیناً بہت کچھ

معلوم ہو جائے گا۔ ڈرائیور کے بارے میں ٹرک کا نمبر جھگڑا ضرور ہوا ہو گا۔ ٹرک والے کیا اپنی غلطی سے کسی کا نقصان کر کے سب بھاگنے والے پہلے تو جھگڑا کرتے ہیں۔

سامنے والا دب جائے تو ٹھیک ہے ورنہ خود دب جاتے ہیں۔" مجھے سخت مایوسی ہوئی "یہ تو بڑا لمبا پکڑ ہے۔ میں کیا

مونرر جسریشن ٹنگ کا ریکارڈ دیکھوں۔"

"ان کے پاس بھی گاڑی کے رنگ کا ریکارڈ نہیں ہوتا۔" وہ بولا۔

میں نے کہا "یعنی شرکی تمام ٹویٹا اسپر نٹر رکھنے والوں کے نام پتے حاصل کروں اور پھر سب سے مل کے گاڑی کا رنگ دیکھوں پھر ان سے پوچھوں کہ ایک مرغی والے نرک کا جھگڑا کس کے ساتھ ہوا تھا۔ اس کے لیے ایک ہفتہ بھی کم ہو گا۔"

"آئی ایم سوری۔ اس سے زیادہ آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا میں۔ آپ ٹائم مت ضائع کریں۔ فوراً چلے جائیں پولیس کے پاس۔"

"پولیس! میں نے طنز سے کہا "پولیس آپ سے بھی پوچھ گئی۔"

"مجھ سے؟" وہ سپاٹ لیجے میں بولا "مجھے تو کچھ بھی معلوم نہیں۔ میں جموٹا بیان ملٹی بھی دے سکتا ہوں نظریہ ضرورت کے تحت۔ اپنی نوکری اور اپنے بیوی بچوں کو محفوظ رکھنا میرے لیے زیادہ ضروری ہے "ایک منٹ۔"

میں جاتے جاتے رک گیا۔ "ایک مشورہ ہے میرا۔ آپ ادھر جائیں جدھر وہ نرک گیا تھا۔ اس راستے پر آگے کوئی مرغی فروش کی دکان ہو تو اس سے پوچھیں۔ شاید وہ نرک وہاں بھی سلائی دیتا ہو یا اس نے جھگڑا دیکھا ہو۔ نرک پر جمع تو فوراً لگ جاتا ہے۔"

میں نے کہا "تھینک یو۔ مجھے کچھ تو کرنا ہی ہو گا۔ کیا میں ایک فون کر سکتا ہوں؟"

اس نے فون میرے سامنے رکھ دیا۔ فون ڈیڈ تھا۔ میں نے کہا "یہ تو ڈیڈ ہے۔"

"ہاں لیکن میں کتنا تو آپ جھوٹا سمجھتا تھا۔ جب آپ یہ دیکھتے آئے تھے کہ آپ کی بیوی یہاں فون کرنے تو نہیں آئی، فون اس وقت بھی ڈیڈ تھا۔"

میں نے فون پر اس پیریول پسر پر اور پورے معاشرے کے اس خود غرضانہ بے حس والے روپے پر لعنت بھیجی جس کی وجہ سے کوئی بھی کسی کی مدد نہیں کرتا۔ اپنا قانونی فرض پورا نہیں کرتا اور انسانی ہمدردی کے پکر میں وقت ضائع نہیں کرتا کیونکہ رفتہ رفتہ تجربات نے لوگوں کو مست سمجھ دار بنا دیا ہے۔ وہ سنتے رہتے ہیں دیکھتے رہتے ہیں اور پڑھتے رہتے ہیں کہ جذباتی ہو کر اپنے پھڑے میں ٹانگ اڑانے والوں کا کیا عبرت آموز انجام ہوتا ہے۔ وہ تھانے پکھری میں اصل مجرم سے زیادہ خوار کیے جاتے ہیں اور بالآخر گواہی سے دستبرداری پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

غیر کا آخری مشورہ ڈوبتے کو تنکے کا سارا ملنے کے مترادف تھا۔ میں نے گاڑی کو یوٹرن دیا اور واپس جانے والی سڑک پر آگیا۔ میری نظر ٹریفک پر بھی مگردماغ خلا میں بھٹک رہا تھا۔ صرف ایک فلائنگ کے بعد ہی مجھے سڑک کے کنارے آٹھ فٹ اونچے کی منزل آہنی بنجرے میں متید مرغیاں نظر آئیں تو میرے قدم بریک پر جم گئے۔

مرغی فروش نے ابھی ابھی کسی مرغی کی گردن پر چھری پھیر کے اسے پھرنے کے لیے ایک ڈرم میں ڈالا تھا۔ "ڈوٹی" بولونگنی تو لوں؟" وہ خون آلود چھری کو صاف کرنے لگا۔ میں نے کہا "مجھے کچھ پوچھنا تھا تم سے۔"

وہ محتاط ہو گیا "نفیہ پولیس کے بندے ہو آپ یا اگم ٹیکس والے؟"

میں نے اسے قتل دی "نہیں۔ میں شریف آدمی ہوں تمہاری طرح۔ یہ بتاؤ ابھی دس منٹ پہلے یہاں کوئی نرک آیا تھا۔ کسی پولی فارم سے؟"

اس نے ڈرم کا ڈھکنا ہٹا کر پھر بند کر دیا "ہم تو مرغی لیتے ہیں راجپوت فارم والوں سے۔ آپ کا بھی فارم ہے کوئی؟"

میں نے کہا "جہاں یہاں کہیں تم نے کوئی جھگڑا ہوتے دیکھا۔ ایک سفید رنگ کی کار کے ڈرائیور کا اور نرک ڈرائیور کا؟"

اس نے ڈرم میں سے بے جان مرغی کی لاش نکالی "ادھر پیچھے ہوا تھا کوئی معاملہ۔ ایک پان والا ہے" اسے ضرور پتا ہو گا۔ وہ تجربے پر پولیس کا۔"

میں گاڑی کو ریورس میں چلا کے پان والے کی دکان تک لے گیا۔ اس وقت وہ اپنی چوکی پر بیٹھا بڑے خوش و خضوع کے ساتھ ابن صفی کا ایک جاسوسی ناول پڑھ رہا تھا۔ اس نے اچانک قہقہہ لگاکے کہا "کیسا حرای نمبروں ہے یہ کیپٹن حمید بھی۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "بالکل ہے اور ابن صفی کے ناول میں بھی شوق سے پڑھتا ہوں۔ یہ بتاؤ ابھی کچھ دیر پہلے یہاں بہت لوگ جمع تھے سفید رنگ کی گاڑی میں ایک نوجوان آیا تھا کسی نرک کا تھاپ کرتا ہوا۔"

"بالکل آیا تھا" اس نے مجھے غور سے دیکھا۔

عام لوگوں کے مقابلے میں زیادہ چلتا ہے۔ ان کی آنکھیں بھی زیادہ دیکھتی ہیں کیونکہ وہ کچھ زیادہ ذہین ہو جاتے ہیں۔" وہ خوش ہو گیا "ذہین تو میں ہوں۔ بیوی نہیں مانتی تو کیا ہوا۔ پان کے قوام کا ایک ایسا سالہ بتایا ہے میں نے کل قد۔ تیرو کے سچ لوگ اوب۔"

میں نے کہا "کسی دن میں یہ پان کھانے ضرور آؤں گا اپنی بیوی اور سالی اور پورے سسرال کے ساتھ۔ ابھی میں جلدی میں ہوں۔ مجھے اتنا بتا سکتے ہو تو بتا دو کہ اس نرک کا نمبر دیکھا تھا تم نے؟"

وہ سوچ میں پڑ گیا "دیکھا تو تھا۔ یاد نہیں۔"

میں نے کہا "کار کا نمبر یاد ہے؟"

"یہی تو بڑی خرابی ہو گئی ہے۔ کچھ یاد نہیں رہتا مجھے۔" اس نے اپنے سر پر کے مار کے کہا "ایک حکیم نے مجھ کو بتائے دی تھی کہ اس سے دماغ بھی تیز ہو گا۔ اسے استعمال کرنے کے بعد یہ ہو گیا کہ کبھی کبھار کھانا بھول جاتا تھا تو کبھی چرنا۔"

میں نے کہا "گولی مارو اس حکیم کو۔"

"ہاں۔ مل جائے تو ضرور مار دوں۔ دراصل اس کا اپنا دماغ کمزور تھا۔ وہ مجھ کو بتاتی تھی کسی عورت کے لیے۔ اس کے بچے نہیں ہوتے تھے دے دی تھے۔"

میں نے مزید وقت ضائع نہ کرنا بھرت سمجھا۔ جب گاڑی میں بیٹھنے لگا تو پان والے نے کہا "باؤ جی" ایک بات یاد آگئی مجھے۔"

میں رک گیا "کیا بات ہے جلدی سے بولو۔"

"وہ گاڑی ایس ڈی ایم صاحب کی تھی۔ ان کا لڑکا چلا رہا تھا" پان والے نے ایک گھابک کے لیے پان بتاتے ہوئے کہا۔

تم نے میری۔" کامیابی کی طرف یہ بہت بڑی پیش رفت تھی۔ امید کی ایک دم توڑنی کرن بکثرت ٹارچ لائٹ کی روشن لکیریں ملتی تھیں اور مایوسی کے اندھیرے میں میرا راستہ بالکل واضح ہو گیا تھا۔ میرے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے پان والے نے پھر پکارا "باؤ جی۔ ایک منٹ۔"

میں رک گیا "کچھ اور یاد آگیا ہے تمہیں؟"

اس نے ایک پان کا بیڑا میری طرف بڑھا دیا "آپ کے دانت بتاتے ہیں کہ آپ پان نہیں کھاتے ہو۔ سسرال کے ساتھ جب آؤ گے جب آؤ گے ابھی یہ ہماری طرف سے اپنی بیوی کو دے دینا پھر وہ آپ کو خود لے کر آئے گی۔"

میں نے پان لے لیا اور اسے پیسے دینے کی بہت کوشش کی مگر اس نے نہیں لے لیا پان کو میں نے احتیاط کے ساتھ گھوڑ کیا رنٹ میں رکھ دیا۔ میں اسے یہ کیسے بتانا کہ ابھی میری کوئی بیوی ہی نہیں تو سسرال کا کیا سوال۔ تاہم یہ پان کھانے والی ہے، بس وہ مل جائے مجھے۔

پاس سے میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ میں نے سڑک کے کنارے گئے کارس نکالنے والی ایک مشین کے پاس گاڑی روکی۔ اپنی بھاری بھر کم سفید رنگ کی موٹر سائیکل کی سیٹ پر بیٹھا ایک نرک سارنٹ مجھ سے پہلے اس سڑوب کو اپنی جا سے باہر ہونے والی توند میں اندھل رہا تھا۔

میں نے اس سے ایس ڈی ایم شجاعت شاہ کے بارے میں پوچھا "آپ کو ضرور معلوم ہو گا کہ وہ کہاں رہتے ہیں۔"

وہ کچھ محتاط ہو گیا "کیا آپ اخبار والے ہو؟"

میں نے اسے مزید مرعوب کیا "میرا تعلق فی وی نیوز سے ہے۔"

"اس وقت تو شاہ صاحب کورٹ میں ہوں گے۔" وہ بولا "رہتے ہیں وہ ادھر ہی کہیں۔ لہٰذا مارکیٹ کے پیچھے"

میں نے کہا "ان کا ایک شوقین مزاج لڑکا ہے شجاعت۔"

"وہ ابھی تو گزرا تھا ادھر سے" سارنٹ کے منہ سے بے اختیار نکل گیا پھر فوراً اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔

میں نے کہا "ہاں۔ سفید رنگ کی ٹویٹا اسپر نٹر کار ہے اس کی۔" ناول انیس سوچو۔

فی وی نیوز کے ایک نمائندے کی معلومات نے اسے متاثر کیا "شام کو وہ ملتا ہے ایک باؤی بلڈنگ کلب میں۔"

میں نے کہا "مجھے اس کا ایک نرک ڈرائیور سے جھگڑا ہوا تھا۔ اسی سڑک پر۔ مرغیاں لے جانے والے نرک کی ٹکر

سے اس کی کار کا اگلا پیر خراب ہو گیا تھا۔
سارجنٹ نے باورِ ناخواستہ اعتراف کیا "میں نے صلح
مضامی کرادی تھی۔"

"ایک ہزار کا نقصان تو نہیں ہوا تھا لیکن ایس ڈی ایم
کے بیٹے کو کسی بھی ٹرک ڈرائیور سے اتنی رقم دلوانی جاسکتی
ہے ورنہ ٹرک پر نہیں اسے مرغیوں کے بچے سے سر اٹھا کے
پنچانے پڑتے۔ خیر ٹرک کس پولیٹری فارم کا تھا؟"

"اس پر کچھ لکھا ہوا نہیں تھا۔"
"نمبر تو ہوگا۔ ڈرائیور سے کاغذات تم نے پہلے لیے
ہوں گے۔ ان پر کیا نام لکھا ہوا تھا؟" میں نے پوچھا۔
سارجنٹ کے لیے جواب نہ دینا مشکل سے مشکل تر
ہونے لگا تھا۔ "وہ تو اب یاد نہیں ہے لیکن آپ پوچھ لو
اتارکلی میں۔ نہیں چوری کی طرف "چرغا ان" والوں
سے حاجی صاحب ضرور جانتے ہوں گے۔"

لی وی نوڈ کے ایک نمائندے کے سامنے یہ کیسے ہو سکتا
تھا کہ کوئی ٹریفک سارجنٹ گئے کارس پلی کے ڈکارے اور
جیب کی طرف ہاتھ بڑھائے بغیر آگے بڑھ جائے۔ اس نے
طوعاً و کرہاً پانچ کا نوٹ نکال کے گئے والے کو دیا اور اس نے
بڑی عقیدت سے لے بھی لیا مگر مجھے معلوم تھا کہ آنکھوں ہی
آنکھوں میں ان کے درمیان کیا بات ہوئی ہوگی۔ تھانے دار
نے کہا ہو گا کہ پیر کسی مسئلے میں مت رہنا۔ میں ابھی آتا
ہوں پھر راولپنڈ لگانے۔ اس نوٹ کے بڑے بھائی کو تیار
رکھنا۔

مجھے اندازہ تھا کہ سارجنٹ اب میرے کسی اور سوال کا
جواب دینے کے موڈ میں نہیں ہے۔ اپنی جان بچانے کے
لیے اس نے موٹر سائیکل کو ٹک مار دی اور اپنی ڈیوٹی کے نام پر
جاری رہنے والی منافع بخش سرگشت کے لیے روانہ ہو گیا۔
تاہم اس نے مجھے ایک معمولی سی ٹپ دے کے بہت خوار
ہونے سے بچالیا تھا۔

"آج تو سارجنٹ بھی پیسے دے گیا تمہیں" میں نے گئے
والے سے مخاطب ہو کر کہا "ایسا تاریخی واقعہ پہلے بھی پیش
نہیں آیا ہوگا؟"

بنگالی گئے والے نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور منوں
کو دہرا کر کے اور پھر چوہرا کر کے موٹر سے ٹھونسنے والے
روڈ ریزس ڈانٹ رہا۔

میں نے کہا "ابھی تم نے ایک ایس ڈی ایم شجاعت کے
بیٹے شجاعت شاہ سے بھی پیسے مانگے ہیں؟"
بنگالی نے جواب میں کچھ کہنے سے پہلے سوچا اور پھر غائب

پہلے کیا کہ جواب جاہاں باشد خوشی۔ ہر شہر میں جنگل کے
قانون کی حکمرانی تھی۔ یہاں شیر، بچتے اور بھیڑیے جیسے
خونخوار، طاقتور جانوروں سے زیادہ خطرناک اور سفاک
انسانوں کا راج تھا جو رحم یا رعایت جیسے الفاظ کا مطلب ہی
نہیں سمجھتے تھے اور سمجھنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ وہ ہانڑتے
اور گرجتے تھے کہ لاؤ۔ اور لاؤ۔ پہلے اپنے نہیں ہمارے
پیٹ کی جھوک مٹاؤ۔ ہمیں کھانا دو ورنہ ہم تمہیں ہمارے گھر
بار کا دربار اور یو پی بچوں کو کھانا دیں گے۔

میں نے کہا "مجھے شرم کی بات ہے ہر شخص روتا ہے
فریاد کرتا ہے۔ آخر تم سب ایکایک نہیں کر لیتے کہ کسی کی
دھونس میں نہیں آئیں گے۔ کسی کو یہ چکا ٹیکس اور بھتا نہیں
دیں گے۔"

بنگالی کے ضبط کا حوصلہ جواب دے گیا۔ "شوب" اسی
ابھی آپ کوڑی میں بیٹھ کے بوت کو دتا ہے۔ ادھر آئے جے
کھوڑا ہو کر دیکھو۔"

میں نے کہا "کیا ہوگا؟ کسی مفت خور سے پیسے مانگے
تو کیا وہ مجھے پھانسی چڑھا دے گا۔ سارے بازار کو بند کر دے
گا؟"

اس نے میرے سامنے ہاتھ جوڑے "شوب زی۔ ابھی
آپ موف کو روک دو۔ ہم ایک دم گورب آوی۔ وہ ہمارا
موشین اڈھا کے لے جائے گا۔ ہم کو گھنے کی طرح موشین میں
ڈال دے گا پھر موٹے گا پھر ڈالے گا۔"

اسے پانچ کا نوٹ دیتے ہوئے میں نے ایک آہ بھر کے
علامہ اقبال صاحب کو یاد کیا جو ایسی ہی صورت حال پر مجھ
سے زیادہ دھکی ہوئے فرما گئے تھے کہ خدا نے آج تک اس
قوم کی حالت نہیں بدلے۔ نہ ہو احساس جس کو اپنی حالت کے
بدلنے کا پھر بھلا میری کون سے گا؟

"چرغا ان" کے حاجی میں حاجیوں والی کوئی بات نہیں
تھی۔ وہ چوبیس پچیس سال کا بد شکل، بد تمیز اور بد اطوار
فحش تھا جو داڑھی مونچھ کے ساتھ سر بھی اُستریے سے
صاف کرا کے لندن کے SKIN HEAD جیسا غنڈا نظر آتا
تھا۔ اس نے کالے رنگ کی ٹائٹ فٹ بنیان پن رکھی تھی
جس کی پشت پر ایک رقامہ قہر لباس سے آزادی کا جشن
منائی نظر آتی تھی۔ اس کے گلے میں ایک سونے کی زنجیر والا
اللہ کے نام کا طلائی لاکٹ جھول رہا تھا۔ اندر کرسیاں میزوں
پر رکھی ہوئی تھیں اور صفائی کا کام جاری تھا۔

مجھے دیکھتے ہی وہ چلا کے بولا "اگے ہو ٹنڈے لاٹ کی
اولاد۔"

میں نے پوچھا "کیا تمہیں انتظار تھا اس کا۔"
اس نے کھائی کی گھڑی میرے سامنے کی "دیکھو کیا
بجایا ہے۔ اب آ رہے ہو تم۔ بیزا کیوں نہیں ہوگی تم سے۔ چلو
پھنٹا اٹھائی میرے۔"

میں نے کاؤنٹر پر اپنی کھٹی ٹکا کے اور بہت آگے جھک
کے انگریزی میں کہا "کیا میں واقعی صورت سے بیزا اٹھائی
گیرا لگتا ہوں؟"

وہ کچھ چونکا "سوری!"
میں نے کہا "کبھی کسی کی صورت سے اندازہ نہیں کرنا
چاہیے کہ وہ کیا کر سکتا ہے اور کیا نہیں کر سکتا۔"

اس کی پریشانی بڑھ گئی "دیکھئے" میں کسی بندے کا انتظار
کر رہا تھا۔ اس نے فون کر کے مجھ سے کہا تھا کہ اسے نوکری
چاہیے اور میں نے بتا دیا تھا کہ تم ٹھیک ایک بجے پہنچ گئے تو
نوکری تمہاری۔ ایک منٹ بھی لیٹ نہیں ہونا چاہیے
تمہیں خیر یو لیا چاہیے۔"

میں نے کہا "چرغا چاہیے۔"
"چرغا" اس وقت؟ "وہ کاؤنٹر کے پیچھے جھک کر کچھ کرنا
رہا۔ شام کو آتا۔"

میں نے کہا "تم چکن کی سپلائی کس سے لیتے ہو؟"
"پول پولیٹری پروڈکٹ۔" وہ سیدھا کھڑا ہو گیا "مگر تم
کیوں پوچھ رہے ہو؟"

میں نے کہا "میں ایک "مرچی ان" کھول رہا ہوں۔
اصولاً تمہیں بھی نام بدل کے "چرچی ان" کر دینا چاہیے۔
مرغیاں استعمال کرتے ہو تاہم۔"

"مذاق کے لیے وقت تمہیں ہے میرے پاس اور نہ میں
مذاق پسند کرتا ہوں۔"

میں نے آہستہ سے کہا "صورت سے تو جو کر لگتے ہو۔"
وہ پھر سیدھا کھڑا ہو گیا "کیا کہا؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ تم نے وقت کی بات کی تو میں
نے ایسے ہی پوچھ لیا تھا کہ کیا تم واقعی حاجی ہو؟ حج کے لیے
وقت کیسے نکالا تھا تم نے؟"

"میں جدہ میں تھا۔ سات سال رہا۔ تین حج کیے وہاں
بہت آسان تھا۔ یہاں سے کیسے جاسکتا تھا۔"

میں نے کہا "مجھے یاد آیا تم ہمسی ہو مل میں ویٹر تھے۔"
اس کا رنگ تیزی سے بدلا "ویٹر نہیں۔ منیجر۔ خیر اب کوئی
کام کی بات نہیں ہے تو جاؤ۔ میں فارغ نہیں ہوں۔"

"پول پولیٹری والوں کا ایڈریس یا فون نمبر دے سکتے
ہو؟"

"خدا نے عقل دی ہے۔ آنکھیں دی ہیں۔ جاؤ دیکھو۔"
تلاش کرو۔ چلو نکلو یہاں سے۔ آجاتے ہیں پتا نہیں کہاں
کہاں سے۔"

میں نے کہا "جانتے جاتے ایک بات ضرور کہوں گا میں۔
نام سے زیادہ لوگ تمہیں حاجی صاحب کہتے ہیں۔ شاید تم خود
اپنے حاجی ہونے کی پہچانی پسند کرتے تھے مگر معاف کرنا
تمہارے ظاہر اور باطن میں ایسی کوئی بات نہیں۔ تم جیسے
لوگ حاجی بننے ہیں دنیا داری کے لیے اور حاجیوں کو بدنام
کرتے ہیں باقی۔"

وہ جھجکے بولا "تم نے پانچ کہا مجھے؟"
"نہیں بھائی۔ خواہ خواہ سچ بول کے جھگڑا کرنے کی
عادت نہیں مجھے" میں نے دروازے کا رخ کرتے ہوئے کہا۔

بعد میں مجھے خیال آیا کہ مجھے اس کے منہ تلکے کی کوئی
ضرورت نہیں تھی۔ وہ حاجی اگر حاجی سے تو مجھے کیا۔ اگر بات
بڑھ جاتی اور نوبت مار پیٹ تک پہنچ جاتی تو مجھے نئے نفلوں کا
ٹوٹا حاصل ہوتا۔ شاید یہ میری ذہنی پریشانی اور فرسٹریشن کا

نتیجہ تھا۔ میں کسی پر اپنا غصہ اتارنا چاہتا تھا کیونکہ میں اپنے
آپ سے خفا تھا۔ میری معمولی سی غفلت نے شہین کو مشکل
حالات سے دوچار کیا تھا۔ اگر میں اس کے ساتھ ہی رہتا
اس امکان کو نظر انداز نہ کرنا کہ ملک رب نواز سب کچھ
کر سکتا ہے تو کچھ بھی نہ ہوتا۔

اس نے شہین کا پتا چلانے کے لیے بڑی ہوشیاری سے
ایک پلان بنایا تھا۔ شاید اس میں بہت سے مفید مشیروں کا
مشورہ شامل ہوگا۔ شہین کی گاڑی کو غائب کر کے اس کی جگہ
استدوسی گاڑی پیش کرنا بظاہر اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ تھا اور
ملک صاحب کی دوستانہ فراخ دلی اور مسمان نوازی کا ثبوت
بھی۔ گاڑی میں سگنل نشر کرنے والے آلے کو لگانے کے بعد

اسے اپنی چالاکي پر ناز ہو گا کہ کتنی آسانی سے اس نے ایک
مشکل مسئلے کا آسان حل تلاش کر لیا۔ خود کو جھٹاوا کہنے
والی شہین روپوش ہو کے کہاں جائے گی۔ وہ جہاں جائے گی
اس کے نقش قدم کی طرح اس کی منزل کا سراغ مسلسل
پکارنے والی ایک آواز دے گی۔

ملک رب نواز کا منصوبہ سائنٹفک ہونے کے ساتھ
یقیناً بے عیب تھا اور اس کی ناکامی کا الزام کسی کو نہیں دیا
جاسکتا تھا۔ سوائے حالات کے۔ چھوٹی سے چھوٹی تفصیل اور
تمام غیر متوقع امکانات کو ذہن میں رکھتے ہوئے کوئی فول
پروف منصوبہ بنانے والے ذہین اور تجربہ کار مجرم بھی صرف
اندازوں کو بنیاد بنا سکتے ہیں۔ وہ آنے والے وقت کی کوئی فلم

☆ 195 ☆ ساتواں حصہ

☆ 194 ☆ ساتواں حصہ

☆ 195 ☆ ساتواں حصہ

☆ 194 ☆ ساتواں حصہ

چلا کے نہیں دیکھ سکتے پناچہ سو فیصد یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ سب کچھ وہی اور وہی ہوگا جیسا وہ سوچ رہے ہیں۔ ہر مجرم جو تارانتہ غلطی کرتا ہے اور جو بالآخر اسے پکڑا جاتا ہے وہ کسی معمولی سے اتفاق کا نتیجہ ہوتی ہے۔

ختم کے اغوا پر نامور افراد کے بارے میں میرا خیال یہی تھا کہ وہ صرف استاد نہیں بلکہ استادوں کے استاد تھے۔ ملک رب نواز کے پاس غلاموں، نمک خواروں اور مشیروں کی کمی نہیں تھی۔ اس کے باپ دادا کی زمینداری کو بوسے بھائی ملک حق نواز نے سنبھالا تھا۔ رب نواز شروع سے شر میں صنعت اور تجارت کے میدان کا کلہاڑی تھا اور خود مجھے ابھی تک صحیح اندازہ نہیں تھا کہ اس کی بوسے زرنے کس کس سمت میں کمان کمان تک اپنے بچے کاڑھتے ہیں۔ اس کے پاس اعلیٰ تعلیم یافتہ اور کوئی قائد انجینئرنگ اکاؤنٹس یا ایڈمنسٹریشن کے شعبے میں ماہر سمجھے جانے والے افراد سے ملے کر فنڈز، بد معاشرے تک سیکھوں افراد تھے جن کا وہ پاس اور ان دانا تھا۔ خانہ انی فرعونیت اس کے خون میں تھی اور دولت کے ساتھ سیاست کے اثر رسوخ نے اس کی طاقت کے غور کو ایک بے لگام وحشی درندے کی طرح سناک بنادیا تھا جسے نہ قانون لگام ڈال سکتا تھا نہ خوف طاقت۔

گزشتہ رات کی ناکامی نے اسے یقیناً آتش زیر پا کر دیا ہوگا۔ ناکامی اس کے نزدیک ایک جرم تھی جس کے لیے وہ کوئی عذر قبول نہیں کرتا تھا۔ اس نے غصے اور جھنجھلاہٹ میں یہ انتہائی خطرناک قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا ہوگا۔ ختم کا فون ملنے ہی اس نے احکامات صادر کر دیے ہوں گے کہ خواہ مخواہ کے چکروں میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ سیدھے جاؤ اور فلاں پیٹرول پمپ سے اس لڑکی کو اغوا لے لیکن یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ جو کچھ تم کرو گے، اپنی ذستہ داری پر کوہ گے۔ وہ کوئی عام لڑکی نہیں، مشہور صحافی اور ایک اخبار کی رپورٹر ہے۔ اس کیس میں بدنامی سے میرا سیاسی مستقبل تباہ ہو سکتا ہے اس لیے جانے سے پہلے یہ سمجھ لو کہ کامیابی کا انعام صرف تمہارے لیے ہوگا مگر ناکامی کی سزا تمہارا پورا خاندان بھٹکتے گا۔

بلاشبہ ملک رب نواز نے بہت بڑا رسک لیا تھا اور پکا کام کرنے کے باوجود اب اسے اپنی حماقت کا خیال ہر لمحہ تازہ دست قدرت نے ایک معمولی حادثے کا انتظام کرتے ہوئے ماہرین فن کے سارے پلان کا دھڑن تختہ کر دیا تھا۔ یہ حادثہ ایک بد عنوان جیسٹریٹ کے بد قماش بیٹے کی کار کو پیش آیا تھا اور اگرچہ اس میں نقصان ایک ہزار کچھ نہیں ہوا تھا مگر

اس سے کہیں زیادہ نقصان جائے واردات پر رہ جانے والے ثبوت اور سراغ سے ہو چکا تھا جس کی ابھی مجرموں کو خبر نہیں تھی۔

تھوڑا سا تلاش کرنے پر مجھے ایک پی سی او کا پورڈ نظر آیا۔ عام طور پر ایسے پی سی او جرائم پیشہ افراد کے ٹھکانے تھے جہاں بیٹھے گئے وہ ہر طرح کے غیر قانونی اور غیر اخلاقی کام بڑی بے خوفی کے ساتھ کرتے تھے کیونکہ انہیں بہت سے اوپر والوں نے تعاون کی حفاظتی چھتری فراہم کر رکھی تھی۔ وہ دوسروں کی لائن پر ٹرک کالیں کراتے تھے اور مال میں سے نیلی فون ڈیپارٹمنٹ کے بد عنوان آپریٹرز سے ڈیڑھ فی اعشاریہ تک سب کو حصہ بقتلہ جتنے فراہم کرتے تھے۔ وہ اخباروں میں ایسے مراسلے پڑھتے ہی نہیں تھے جن میں زیادہ مل پر فون منقطع ہونے کی شکایت کرنے والے روتے پختے تھے کہ انہوں نے تو کبھی کسی کو ٹرک کال نہیں کی اور دھاتی سوسے زیادہ مل کبھی نہیں دیا تو چاہا کہ ان کا بل دھاتی ہزار کیسے ہو گیا۔ یہ پی سی او طالب اور مطلب کے رابطے کا ذریعہ تھے پناچہ کیسٹن کی بنیاد پر سودے کراتے تھے خریدار کو مال تک اور مال کو خریدار تک پہنچانے کا وسیلہ بنے تھے۔

لیکن اس وقت میں یہ سب بھول گیا۔ مجھے وہ پی سی او اسی چور کی طرح لگا جو اپنی حرام کی کمائی میں سے ڈکھو بھی نکالتا ہو۔ وہاں ہر حال کچھ لوگوں کی ضرورت بھی پوری ہو رہی تھی۔ میں نے اندر "اپنی باری کا انتظار کریں" کے بورڈ کے پیچھے رکھی ہوئی بیچنے کے بیٹھے کے خستہ حال نیلی فون ڈائریکٹری اٹھائی جو دو سال پرانی تھی۔ کثرت استعمال سے اس کے اول و آخر کے صفحات نکل گئے تھے مگر مجھے اس میں پریل پولی پروڈکٹ کا نمبر مل گیا۔ اس کے سامنے ہی مکمل پتا بھی لکھا ہوا تھا۔ میں نے دونوں کو ذہن نشین کر لیا۔

پی سی او کا مالک میرے بائیں جانب ایک میز پر تین فون اور ایک رجسٹر لے بیٹھا تھا۔ اس کے پیچھے والی دیوار پر وہ شرانگاہ احکامات لکھے ہوئے تھے جن کی پابندی فون استعمال کرنے والوں کے لیے لازمی تھی۔ میرے سامنے والی دیوار کے ساتھ بہت کم فاصلے سے تین کرسیاں ایسے رکھی گئی تھیں کہ ان کا رخ دیوار کی طرف تھا۔ ہر کرسی کے سامنے دیوار میں نصب اسٹینڈر پر ایک فون تھا۔ پی سی او کا مالک مطلوبہ نمبر پوچھتا تھا۔ رقم وصول کرتا تھا اور نمبر مل جانے کے بعد کہتا تھا کہ لال والا فون اٹھا لیا سفید والے پر بات کرو۔ وہ بطور خاص بات کرنے والے کو وال کاک میں ٹانگ بھی ٹوٹ کر ادیتا تھا۔ ہر فون کرنے والے کو پرائیویسی فراہم کرنے کے

لیے درمیان میں ایک بار ڈیورڈی دیوار کھڑی کر دی گئی تھی جس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ اس سے ایک فون پر بات کرنے والا دوسرے کی شکل تو نہیں دیکھ سکتا تھا مگر ایک دوسرے کی گفتگو سے سب محفوظ ہو سکتے تھے۔

ایک فون پر کوئی منڈی کا بیوپاری اپنے کسی ایجنٹ کو گرم سالے کی خرید و فروخت سے متعلق تفصیلی ہدایات دیتے ہیں مصروف تھا۔ اوئے مرید کے دو بوری دار چینی پہنچا دے۔ اور ادھر اوکاڑے سے کالی مرچ پکڑ لے جتنی ملے بظاہر ایسا لگتا تھا کہ تمام سودے فائل ہونے میں دوپہر سے شام ہو گئی۔

دوسرے فون پر ایک جاہل قسم کی بھاری بھر کم عورت دینی میں اپنے خداوند مجازی سے ہم کلام تھی جو اس کے حکم کا ظالم تھا۔ "دیکھو رشید، جتنی چیزیں تو لایا تھا پچھلی بار وہ سب تو ہم قسم کرتی میری ساس۔ کتنی ہے اپنی بیٹی کے جینز میں رکھ دی ہیں۔ ہائے کیسی ماں ہے۔ اسے ذرا خیال نہیں تھا۔ تو گھر سے دور پڑا ہے اور ادھر بیٹہ کوئی درخت پر تو نہیں اکتا۔ دن رات ایک کر رہا ہے تو۔ اور ٹانگ کرتے کرتے تیری صحت کا تو بیز اعرق ہو گیا ہے۔ تیری ماں کو سوچنے کی کیا ضرورت ہے کہ کل جب تیری اپنی بیٹی جو ان ہو گئی تو اس کے لیے بھی تو کچھ ہونا چاہیے۔ اب تو تولد لے، ہاں کاغذ لے، آؤ نہ پھر بھول جائے گا پتھر۔ میں سب لکھا دیتی ہوں اور ہاں جیسے چار سونے کے کڑے تو نے مجھے پچھلی بار لاکے دیے تھے۔ ویسے ہی چار اور لے آ۔ ایک خالی ہاتھ دیکھ کے سب پوچھتے ہیں۔ نہیں شیدے، ابھی واپس آنے کا مت سوچ۔ حوصلہ رکھ، جیسے پندرہ سال گزرے ہیں، اللہ نے چاہا تو پندرہ اور گزر جائیں گے۔"

آزحتی نے ایک بار آہستہ سے اور دوسری بار چلا کے کہا "او نہیں جی، آہستہ اور بھی بندے بیٹھے ہیں ادھر۔" "چل بکواس نہ کر۔ نہیں شیدے، یہ تو میرے ساتھ بیٹھا ہے کوئی۔ میرے ساتھ گھر میں نہیں، ادھر پی سی او میں۔ نامزد ساری باتیں سن رہا ہے۔"

گرم سالے کے بیوپاری نے جھڑکے کہا "تمہاری آواز تو ایسے ہی دینی بیچ رہی ہوگی۔ فون استعمال کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

میرے فون پر ایک صابو شوکر قسم کا شخص خاموش بیٹھا سر مل رہا تھا اور شور شرابے سے بے نیاز تھا۔ صرف دو بار اس نے آہستہ سے کہا "او ٹیک، بیٹھے، میری بھی سن لے۔ دوسری طرف غالباً اس کی شرک حیات تھی جو سمجھتی

تھی کہ جہاں اس نے وقفہ دیا اس کے شوہر کی بات شروع ہو جائے گی اور اس کے دل کی بات تو دل میں ہی رہ جائے گی۔ بالآخر فون کرنے والے شوہر نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر ریسپورڈ رکھ دیا۔ اس کی حسرتوں کا مال مال جہرے سے عیاں تھا۔ اس کی جیب میں پیسے ختم ہو گئے تھے مگر اس کو اپنی کتنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس کے اٹھنے ہی میں نے کرسی پر قبضہ کر لیا۔

نمبر ملنے ہی میں نے کہا "یار نہیں۔ میں بول رہا ہوں ایک پی سی او سے۔ یہ تا اس وقت اور کون ہے تیرے اس پاس؟"

"کیا کوئی بہت راز کی بات کرتی ہے یا رہے؟" میں نے کہا "ہاں۔ کچھ ایسی ہی بات ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی اور سنے۔"

"اپنے سننے والا اور کون ہے سونی کے علاوہ تو کہتا ہے تو میں اسے بھی باہر نکال دیتا ہوں۔" میں نے کہا "اس کی ضرورت نہیں لیکن یار، بی بی گزیر ہو گئی ہے۔"

وہ پریشان ہو گیا "اب یار بات کر پوری، خیریت تو ہے میں نے کہا "نہیں، خیریت نہیں ہے۔ ختم نہیں ہے میرے ساتھ۔"

"ختم نہیں ہے؟ وہ کہاں ہے؟ خدا انخواستہ اسے ملک رب نواز تو نہیں لے گیا ہے اپنے ساتھ۔ اغوا وغیرہ کر کے؟"

"بس کچھ ایسی ہی بات ہے یار!" "مگر کہاں لے گئے؟ وہ ختم کو؟" "میں چلا کے بولا۔" مجھے نہیں معلوم۔ ایسا ہے تو میری بات سن ذرا دھیان سے۔ ادو شایہ لنگ روڈ پر باغیا پورے کی طرف آتے ہوئے ایک پیٹرول پمپ ہے۔"

"ہاں؟ دیکھا ہے میں نے؟" میں نے کہا "سپر پیٹرول ڈلوایا تھا ختم نے وہاں سے۔ پیٹرول ڈالنے والا ملازم ایک نوجوان ہے۔ میں بائیں برس کا۔"

"کیا اس کا کوئی تعلق ہے اس معاملے سے؟" "ہاں۔ مجھے اس کا نام تو معلوم نہیں مگر تو اسے پہچان سکتا ہے۔ دوسرا ملازم زیادہ عمر کا اور بار بارش ہے۔" "کیا پوچھتا ہے اس معاملے سے؟" میں نے کہا "وہ ہم بعد میں پوچھیں گے۔"

"اچھا تو کیا اسے لانا ہے اپنے ساتھ؟" رئیس بولا۔
 "ہاں لیکن ایسے کہ زبردستی بالکل محسوس نہ ہو" میں نے کہا۔

"یعنی وہ بھی خوشی نہیں آئے گا میرے ساتھ؟" رئیس بولا۔

میں نے کہا "بھئی نہیں۔ تو اسے دوستانہ طریقے پر ایک طرف بلا سکتا ہے۔ بات کرنے کے لیے یا کسی بہانے سے زبردستی اور ہنگامہ آرائی مت کرنا۔"
 "میں سمجھ گیا۔ یہ بتا کیا اپنے ساتھ انسپکٹر نذیر کو لے جاؤں؟"

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ پولیس کے جانے سے بھی معاملہ خراب ہو جائے گا۔"

"اوکے اب یہ بتا اسے کہاں لانا ہے؟"
 میں نے کہا "پرل پولیٹری پروڈکشن فون نمبر اور پتا لکھ لے۔ یہ میں نے بھی ڈائریکٹری میں دیکھا تھا۔"

"لکھ کر ہے؟" مرثی خانہ اورد۔
 "یار" میں نے کہا "وہ کون سا میرے سرکار مرثی خانہ ہے جس میں جا کے دیکھوں گا۔"

"اچھا دیکھ۔ میرا انتظار کرنا۔ میرے آنے سے پہلے ایکشن میں مت آجانا۔"
 میں نے کہا "یہ وعدہ نہیں کر سکتا میں۔ وہاں پتا نہیں کیا صورت حال ہو۔"

"ٹھیک ہے مگر تمہارا پتا نہیں یار۔ جنیم کو کچھ نہیں ہوگا۔ قسم اللہ کی بیٹہ بچاؤں کے ہم ملک رب نواز کی سات پشتوں کا۔"
 میں نے ریسیور رکھ دیا۔ لوکل کال کے دورانے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ اگر میں آدھے گھنٹے بات کرتا تب بھی ایک ہی لوکل کال چارج ہوتی مگر لی سی او کے مالک نے وہاں اپنے قوانین نافذ کر رکھے تھے جن کی رو سے ہر تین منٹ کے بعد دوسری کال شروع ہو جاتی تھی۔ میں نے پانچ منٹ گفتگو کی تھی۔ مجھے دس روپے ادا کرنے پڑے۔ میرے حساب سے اس نے ایک ہزار فیصد منافع حاصل کیا۔ یہ کاروبار ہر شرمیں کل عام ایسے ہی چل رہا تھا کیونکہ جو ضرورت مند یہاں آتا تھا وہ فرائدے کر لیں اور نہیں جاسکتا تھا۔ جب اخبار والے شور مچاتے تھے تو بی سی۔۔۔ وقتی طور پر "چھاپا مارکے" بند کر دیا جاتا تھا۔ لی سی او چلانے والے کو کوئی اور زیادہ منافع بخش سانس اور ٹیل فون کی دوسری لائن فراہم کر دی جاتی تھی۔ کتے بھونکتے رہتے ہیں، قاتلہ جلا رہتا ہے۔

مجھے یہ اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ میرا سفر کس سمت میں اور کتنا طویل ہوگا۔ مرثی خانے شہر سے باہر جانے والی ہر چھوٹی بڑی سڑک پر آبادی ختم ہو جانے کے بعد بھی کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد نظر آتے تھے۔ یہ نئی سڑک جیسی چھتوں والے نیم چنٹے عمارات حکومت کی انتہائی کم نرخوں پر دی جانے والی زمینوں پر بنائے گئے تھے۔ ان میں باہر کی طرف کھڑکیوں کی ایک قطار نظر آتی تھی مگر میں نے یہ کھڑکیاں بیش بند دیکھیں۔ ٹرین کے سفر میں باسڑک پر سے گزرتے ہوئے مجھے یہ بات بہت عجیب لگتی تھی کہ ان دیواروں کے پیچھے ایک فنکری ہے جہاں ہزاروں لاکھوں مرغیاں دن رات انڈے بناتے اور اپنا وزن بڑھانے کے لیے سخت کر رہی ہیں تاکہ ناشتے میں آلیٹ کی سہلائی جاری رہے اور ایک بچے دیں۔ چکن توڑے اور چنے چلتے رہیں۔

مجھے ایسی کسی فنکری میں جانے کا اشتیاق پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ میرے پاس ایک بہت اچھی کارکردگی کی حامل کار تھی جس پر مجھ کو سنا جاسکتا تھا کہ اگلے ایک گھنٹے میں مسلسل دوڑتے ہوئے وہ مجھے پرل پولیٹری فارم تک پہنچا دے گی۔ وہاں جنیم کا ملنا بالکل غیر ممکن تھا لیکن ابھی سارے سراغ اسی منزل کا نشان دیتے تھے۔ اس کے آگے "بیڈی عشق سلامت ہے تو ہم دیکھیں گے کہ کون سا راستہ قدم کھینچتا ہے۔ کس راہ پر ہوا میں بس جانے والی اور فحش کے انتظار کرنے والی اس کی خوشبو آواز دے کے بلاتی ہے۔ سارے راستے بند ہوں پھر بھی امید کا سفر جاری رہتا ہے کہ جہاں چاہ ہے وہاں راہ ہے۔

میں روڈ پر آبادی کو بہت پیچھے چھوڑنے کے بعد اب مجھے دونوں طرف کہیں کہیں کھلیاں، کچے ٹھونڈوں والی آبادیاں، اینٹوں کے بھٹوں کی دھواں اٹھتی دینار بھی چمنیاں اور چھوٹے بڑے کارخانے نظر آ رہے تھے۔ سڑک پر دونوں جانب سے ہر قسم کی ٹریفک بھی مسلسل جاری تھی پھر میں نے ایک بس کو بائیں طرف کی چھوٹی سڑک پر سے آنا دیکھا۔ یہ تیس چالیس سال پرانے بیڈ فورڈ مائل کی وہ بس تھی جو چھوٹے قصبوں اور دیہات سے انسانوں اور جانوروں کو ایک ہی طرح ڈھونڈنے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ چار لڑھکتے لڑکھڑاتے پیوں پر قائم گڈی اور ٹولڈ کے پٹے کھڑکھڑاتے ڈبے میں جب اللہ کی ساری مخلوق کو دیاربا کے اور ٹھونس ٹھونس کے ایسے بھرا جاتا ہے کہ واقعی مل دھرنے کی جگہ نہ رہے تو فرسٹ فلور یعنی چھت کی بنگ شروع ہوتی ہے اور اس میں جو مسافر کناروں پر رکے جاتے ہیں وہ اس

عقدے پر مضبوطی سے قائم رہتے ہیں کہ موت برحق ہے اور اگر ان کے لیے کسی جھٹکے سے لڑھک کر فوت ہونا لکھ دیا گیا ہے تو نوشہہ اللہ پر کیسے بدلا جاسکتا ہے۔
 بس سڑک کے مین روڈ کے متوازی ایک بوسٹل ڈی پوٹس کے سامنے رگ گئی۔ جہاں ایسی ہی دوسری بس روانگی کے لیے تیار تھی۔ وہاں مجھے ایک ساتھ بہت سے سائن بورڈ نظر آئے۔ کچھ اتنے پرانے کہ ان کی تحریر کو شاید آج کا قدرے والے بڑھ سکتے تھے۔ ایک نظر میں یہ بھی پتا نہیں چلتا تھا کہ حرف انگریزی کے ہیں یا کسی اور زبان کے۔ تاہم کچھ بورڈ بہت واضح تھے اور ان کے تیر ایک ہی سمت میں پولیٹری فارمز کی موجودگی کا پتا دیتے تھے۔

میں نے گاڑی روکی تو نوجوانی میں تو نہ نکال لینے والے ایک چچی داڑھی والے نے میری ٹاک کے سامنے ٹھین کے صندوق میں سے بھانے شروع کیے جس پر چند ابرائے تعبیر مسجد کے بعد لکھا ہوا تھا "جنت میں گھر بناؤ۔۔۔ ورنہ۔۔۔"
 میں نے کہا "صوفی" یہاں تو مجھے کوئی مسجد نظر نہیں آ رہی۔"

اس نے ڈھٹائی سے کہا "مسجد لہان روڈ پر بن رہی ہے۔"
 "اور چند اجمع کر رہے ہو تم لاہور، شیخوپورہ، روڈ پر۔"
 "ٹیک کام کہیں بھی کیا جاسکتا ہے" وہ تھکی سے بولا۔
 "ٹھیک ہے لیکن یہ جنت میں گھر بناؤ ورنہ۔۔۔ اس کا کیا مطلب ہے آخر؟"

"ورنہ جنیم میں جاؤ۔" اس نے ٹھن کا شور مچا بھیج لیا اور فوراً وہاں آ کے رکے والی بس کی طرف چلا گیا۔
 دوسری طرف کی کھڑکی میں سے ایک سٹیز میں نے کھوئے ملائی والی کسی کا گلاس اندر پہنچایا تھا۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ تقریباً شفاف دودھیا پانی کو میرے لبوں سے لگا دیتا جس میں مجھے کم سے کم ایک ٹھنکی کی لاش تیرتی ہوئی صاف نظر آ رہی تھی۔ اس کے باوجود میں نے اس سے گلاس لے لیا اور جب وہ مجھے لطف اندوز ہونے اور جان بٹانے کی سہلت عطا کر کے چلا گیا تو میں نے کسی کو باہر اندر لے دیا۔ شاید اپنے علاوہ ایک شخص کو میں نے یہ ٹاک بی کے اللہ کو پکارا ہونے سے بچا لیا تھا۔ یہ صرف میرا خیال تھا ورنہ پینے والے جوڑ کا پانی پی کے بھی جی رہے تھے۔

کسی کا خالی گلاس واپس کرنے سے پہلے میں نے سٹیز میں سے پوچھا کہ اس سڑک پر آگے کتنے مرثی خانے ہیں۔ اس نے قیاس کی بنیاد پر حساب لگا کے جواب دینے کی کوشش کی

مگر کام رہا "دراصل میں نے کبھی گئے نہیں۔ آتے جاتے روز دیکھتا ہوں۔"

میں نے کہا "یعنی ادھر ہی رہتے ہو تم ٹوری گڈ۔"
 لمبی کا موجد یعنی اس کا باپ کچھ فاصلے پر ایک درخت کے نیچے اپنا مکان لے آگیا تھا۔ میری بات پر وہ چونک کے مسکرائے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ میں نے کسی ٹوری گڈ کا ہے۔ اس نے دوسرا گلاس اٹھا کے میری طرف ترغیب کے انداز میں بڑھایا۔

"پرل پولیٹری پروڈکٹ ادھر ہی ہے" میں نے پانچ کا ٹوٹ ہاتھ میں رکھا۔
 نوجوان سٹیز میں نے فوراً سر ہلادیا "ہاں ہے" لاؤ پیسے دو جی۔"

مجھے اس کے جواب نے مطمئن نہیں کیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ہاں کہہ کے اس نے اپنی جان چھڑائی ہے۔ جہاں ابھی ابھی آنے والی بس کھڑی باب رہی تھی وہاں کچھ لوگ بس سے خارج کر دیے گئے تھے کیونکہ انہیں مخالف سمت میں فیصل آباد جانا تھا۔ ان میں ایک مرد قسم کا ٹیک والا شخص بھی تھا جو ایک چارپائی پر بیٹھ کے اپنی ڈائری میں کچھ لکھ رہا تھا۔ میرے پاس بلاوجہ خوار ہو کے واپس آنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ بچے کی تصدیق کر لینا بہتر تھا۔ میرے سوال پر وہ اٹھ کے کھڑا ہو گیا "رفع کو جی" پرل والوں کو۔ سب کو پتا ہے ان کا قول کیا ہے۔ بے ایمان چور، ہم کل میں دس گرام اوپر ہی رکھتے ہیں کانٹے کو۔ اور ریٹ کا بھی یہ ہے کہ۔۔۔ دو روپے کم لگائیں گے ریٹ سے۔"

میں نے کہا "اپنی شادی کے لیے چکن لینے میں ضرور آؤں گا کسی دن مگر ابھی تو مجھے صرف اتنا بتا دیں۔"
 اس نے ڈائری پھر کھول لی "آگے دیکھ لو۔ بورڈ نظر آجائے گا۔ انگریزی پر مبنی تو آتی ہے؟"

یہ بھی قطعی غیر دوستانہ تصدیق تھی مگر میں نے اللہ کا نام لے کر گاڑی کو چھوٹی سڑک پر ڈال دیا۔ سڑک کی چوڑائی مشرق کی کمر چھتی تھی۔ ہر چند کہیں کہیں نہیں ہے۔ سامنے سے نمودار ہونے والی ہر سواری کے ڈرائیور کی خودی اتنی بلند تھی کہ ہر بار مجھے ہی گاڑی کو دھول والے کچے راستے پر اتارنا پڑتا تھا۔ ایک بڑا گوار جن کے سر اور چہرے کے سارے بال سفید تھے، اپنی ہم عمر سائیکل پر مین درمیان میں پیڈل مارے نمودار ہوئے کچھ بجکوں سے سائیکل کا انجن خربل رہا تھا کچھ وہ خود غصے سے لڑوہ برانداز تھے میں نے بروقت اندازہ کر لیا کہ گاڑی انہیں شاید اس وقت نظر

آئے گی جب درمیانی فاصلہ دو گزر زمین کے برابر رہ جائے گا پھر ایک تیل گاڑی آئی جس کا پائلٹ اچن کو آٹو پریٹ کر کے بھوسے کے ڈھیر پر سو گیا تھا۔ خود کار تیل ٹانک کی سیدھ میں چلا تھا وہ کسی چمکتی دھنکی کا رستہ مٹا نہیں ہوتا تھا۔

ہر بار کچے راستے پر دھول کا ایک ویسا ہی غبار اٹھتا تھا جیسا کہ پہلے انیم بم کے دھماکے میں ہیرو شیماسے اٹھا تھا۔ شیشے بند کرنے کے بعد گرمی سے میرا بڑا حال تھا مگر ہوا کے ساتھ آنے والی گرد میرے پیچیدوں میں پہنچ جاتی تو شاید میرا سانس رک جاتا پھر ایک جگہ پانچ روز سے الگ ہو کے دوڑنے والی شوخ بکری گاڑی کے سامنے پہنچی۔ گاڑی کی بھینس جیسی الجھن مارنے سے اسے ڈھیلا کھینچ کے مارا "نی مرنا" اس نے پیچ کے کہا۔ بکری زقہ لگا کے نکل گئی۔ ڈھیلا ونڈا سکرین پر لگا اور بکھر گیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ معصوم جوانی کے ہاتھ میں پتھر نہیں تھا۔

کچھ آگے جا کے مجھے مرغیاں لے جانے والا ایک ٹرک نظر آیا اور سیلا پولیٹری فارم ملا۔ آگے ایک وسیع علاقے میں فارم تھے جو سیکڑوں ایکڑ رقبے پر پھیلے ہوئے تھے۔ یہاں پچی اور امروہ کے باغات بھی تھے جس سے ماحول کی قدرتی شان حالی میں کمی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ باغات اور فارم کے مالکوں نے یہاں ذاتی استعمال کے لیے چھوٹے بڑے مکان اور کونھیاں بھی بنوا رکھی تھیں۔ وہ یہاں رہتے نہیں تھے لیکن کبھی کبھار فیملی کے ساتھ آگے یہاں کلک ضرور منائی جاسکتی تھی۔ یہاں ٹیوب ویل تھے اور انیس چلانے کے لیے بجلی بھی فراہم کی گئی تھی جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سب فارم شہر کے بڑے پروڈر کرش، صنعتکاروں اور تاجروں کے تھے۔ شہری زندگی کی اعصاب پر اثر انداز ہونے والی شب و روز کی تنگ دود، پر شور اور ہنگامہ بردار مصروفیت اور آلودگی سے گھبرا کر بھاگنے والوں کے لیے حسن فطرت کا احساس دلانے والی یہ ٹرسکون اور خاموش جگہ بہترین پناہ گاہ تھی اور ایک محفوظ عشرت گاہ بھی۔

میلوں تک پھیلے ہوئے اس علاقے میں سڑکوں کا جال سا بچھا ہوا تھا جن پر جگہ جگہ "پرائیویٹ روڈ" یا "یہ شارع عام نہیں ہے" کے سائن بورڈ لگے نظر آتے تھے۔ بیشتر فارم چار دیواری کے اندر تھے اور ان کے گیٹ بند تھے کسی سڑک پر مجھے کوئی پتا نہ تھا۔ والا بھی نظر نہیں آ رہا تھا پھر ایک فٹ فارم کے باہر مجھے دو گاڑیاں نظر آئیں۔ ان کے ڈرائیور بونٹ سے ٹیک لگائے کھڑے تھے۔

میرے سوال پر ایک نے تو فنی میں سہلا کے لالعلی کا

اظہار کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی محروم مرا میرے لیے خضر راہ ثابت ہوا "آپ بہت آگے آگے ہو جناب۔ میں آپ کو راستہ سمجھاتا ہوں۔"

اس کے سمجھانے سے مجھ پر واضح ہوا کہ میں نے میں روز پر غلط جگہ گاڑی موڑی تھی۔ اگر میں دو کلومیٹر آگے جاتا تو مجھے ایک دائرے میں کئی میل کا چکر نہ لگانا پڑتا اور سارے فروٹ فارم فٹ فارم ملاحظہ کئے بغیر بھی میں براہ راست وہاں پہنچ جاتا جہاں صرف پولیٹری فارم تھے۔ اب واپس اسی راستے پر جانے سے بہتر ہو گا کہ میں ایک اڈر دائرے میں گھوم کے مخالف سمت میں تشریف لے جاؤں۔ یوں انگریزی میں آٹھ کا بندہ بناتے ہوئے اصل سے چار گنا مسافت طے کرنے کے بعد میں منزل مقصود پر پہنچ جاؤں گا جہاں میں صراط مستقیم پر چل کے ایک گھنٹا پہلے پہنچ سکتا تھا۔

مجھے سخت کوفت ہوئی۔ اس وقت میرے لیے ہر لمحہ اہم تھا اور میں نے اپنی حماقت سے پورے ساٹھ منٹ یا تھیں سو سیکڑ خالص کروٹے تھے۔ سڑک کے اگلے مرحلے میں ہی میرے بھٹک جانے کے امکانات خامے روشن تھے مگر نقطہ آغاز سے سڑک کو پھر شروع کرنے کا خیال زیادہ حوصلہ شکن لگتا تھا چنانچہ میں نے خضر راہ سے پتا دوبار سمجھا اور ان ہدایات کو اپنے دماغ کے کمپیوٹر میں بڑی احتیاط سے ڈال دیا۔

اگلے میں منٹ تک میں راستے کی ساری نشانیاں غور سے دیکھتا گیا۔ ویسے تو اپنے علامہ اقبال صاحب فرما گئے ہیں کہ "کیا کیا خضر نے سکندر سے۔" اب کسے راہنما کرے کوئی مگر میرے لیے خضر کو الزام نہ تھا بھی مشکل تھا کیونکہ خضر اپنے کو سمجھنے میں اپنی لیاقت کا مجھے بخوبی اندازہ تھا۔ خضر اپنے نے تو کولبس کو بھی دھوکا دیا تھا۔ اسے جانا تھا اندازاً مگر پہنچ گیا امریکا چنانچہ پرل پولیٹری پروڈکٹ کے بجائے میں بھی کسی پھر مار کو اٹل بنانے کی فیکٹری پہنچ جاتا تو مجھے تعجب نہ ہوتا۔

گاڑی کے فیول میٹر کی سوئی مجھے الگ ڈرائی تھی۔ راستے میں پیٹرول نہ ڈلوانے کی غلطی مجھے بہت مسئلہ پڑ سکتی تھی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ منزل مقصود سے پہلے ہی گاڑی جواب دے جائے اور مجھے باقی سفر جوتیاں چٹائے طے کرنا پڑے اور ایسا ہو جاتا تو یہ میری بد قسمتی کی انتہا ہوتی۔ بے شک آغاز بہت حوصلہ افزا تھا مگر اب آثار کچھ اچھے نہیں تھے۔ آگے آگے دیکھے ہوتا ہے کیا۔ ہونے کو بہت کچھ ہو سکتا ہے مثلاً یہ کہ ایک ٹائر فلیٹ ہو جائے اور جب میں اسے بدلنے کے لیے گاڑی کو بڑی محنت سے جبکہ پر اٹھالوں تو یہ لرزہ خیز انکشاف ہو کہ اسپیرو ویل تو ہے ہی نہیں یا ہے تو پہلے سے پتھر رکھا ہوا

جہنم کو غائب ہوئے پورے دو گھنٹے بیت چکے تھے۔ میں اتفاقات کی راہنمائی پر بھروسہ کرتے ہوئے یہاں تک گیا تھا لیکن کسی کامیابی کے یقین سے دل کو ہلانا خود فریبی کے مترادف ہوتا۔ میرے اندازے اور ان اندازوں کی بنیاد پر اخذ کردہ نتائج غلط بھی ہو سکتے تھے کوئی ملک رب نواز جیسا مجرم ایسا اناڑی نہیں ہوتا کہ اپنے جرم کے واضح اور آسان سراغ چھوڑ جائے۔ غلطی اس سے غور میں سرزد ہو سکتی ہے۔ اسے اپنی دولت اور اثر و سرور کی طاقت کے ناقابل تخیل قلعہ پر ناز ہے کہ کس میں بہت ہے اتنی کہ اس کی حفاظتی تفصیل کے دروازے تک بھی پہنچ سکے۔

میرے لیے جہنم کی بے بسی کا تصور بھی ایک پُر ازیت تجربہ تھا۔ عورت ذہنی سطح پر جینٹل اور دانشور ہونا کسی ملک کی وزیر اعظم جسمانی طور پر وہی عورت ہوتی ہے جس کی مضبوط نظر آنے والی شخصیت کے حصار کا سب سے نازک اور گزور پہلو اس کی سوانحیت ہوتی ہے۔ مرد کا جسم تشدد سے مجروح ہوتا ہے۔ بے آبرو نہیں ہوتا، جہنم اپنے قلم کی طاقت سے انسانوں کے خلاف اپنے دفاع پر بھروسہ کر سکتی ہے۔ بھوکے ہوسناک بھینڑوں کے غول کی بریرت کے سامنے نہیں۔

میرے ان ڈپریشن میں جلا کرنے والے خیالوں کا سلسلہ اچانک ایک موڑ پر نظر آنے والے ”پول پولی پروڈکٹ“ کے سامنے پورے ختم ہو گیا۔ اس کے ٹیڑھ مارک گواہ ایک دائرے میں تین بی لکھ کے واضح کیا گیا تھا۔ اس سے دونوں مطلب نکالے جاسکتے تھے۔ پولی فارم کا مالک جینلز پارٹی کا حامی اور لیڈر یا کارکن تھا یا اس نے پاکستان جینلز پارٹی کی تشکیل کے لیے پول پولی پروڈکٹ کا نام اختیار کیا تھا کہ وہ پارٹی کہاں ایک مرغی خانہ ہے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ پولی فارم ۱۹۷۷ء سے پہلے بھی موجود ہو جب جینلز پارٹی کا وجود ہی نہیں تھا۔

پولی فارم کے وسیع رقبے کے گرد تقریباً آٹھ فٹ اونچی چار دیواری تھی۔ حفاظتی انتظامات کو مزید مؤثر بنانے کے لیے اسی تفصیل کے اوپر کانٹے دار تار لگائے گئے تھے۔ چار فٹ اونچی باڑھ کے آٹھ تاروں کو باہر کی طرف جھکے ہوئے ایک سنگل آئرن کے جھبے سارا دیے تھے۔ ہر کھمبا شاید دس بارہ فٹ کی دوری پر تھا اور اوپر سے ایسے مڑا ہوا تھا جیسے اسٹریٹ لائٹ کا حصہ پول سے الگ نظر آتا ہے۔ کسی مرغی خانے میں یہ انتظامات یقیناً شک پیدا کرنے کے لیے کافی

تھے۔ میں نے نہ جانے کتنے مرغی خانے دیکھے تھے جن کے گرد کچھ بھی نہیں تھا۔ صرف کھلی زمین تھی۔ زمین کی حد بندی مقصد ہو تو ایک عام سی دیوار یا باڑھ بھی کافی ہوتی ہے۔ آخر کسی مرغی خانے کو چوروں ڈاکوؤں سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔ مرغی خانے کا فولادی گیٹ بھی کسی آرمی انٹیلیجنس یا ورکشاپ کے گیٹ جیسا تھا۔ آٹھ فٹ اونچا اور ٹھوس۔ اس میں آمد و رفت کے لیے ایک چھوٹا گیٹ تھا مگر وہ بھی اندر سے بند تھا۔ باہر کی طرف کرسی پر ایک شخص لینٹیا کی شلوار لٹیس پہنے اپنی گود میں ایک ”ری پیئر“ رکھے بیٹھا ہوا تھا۔ میں اس کے سامنے سے گزرنے لگا تو اس نے مجھ پر ایک اپنی سی نگاہ ڈالی۔ وہ چوڑے چہرے والا چٹان اپنی چھلی ہوتی گھنی سیاہ داڑھی اور کانوں سے نیچے تک آنے والے بالوں، اپنے مضبوط تن و قوت اور عقابانی آنکھوں سے خطرناک اور سفاک لگتا تھا۔

اچانک گیٹ پورا کھل گیا۔ اس کے دونوں پٹ سلائیڈ تک تھے اور کھٹک کر اندر کی دیوار کے پیچھے غائب ہو جاتے تھے۔ مجھے پٹ کو دھکیلنے والا کوئی دکھائی نہ دیا۔ اس سے میں نے اندازہ کیا کہ انیس سوچ دبا کے کھولا اور بند کیا جاتا ہو گا اور اس کا کنٹرول شاید اندر کسی ڈتے دار شخص کے پاس ہو گا۔ ایک نظر میں اندر کا پورا منظر میرے سامنے آ گیا۔

گیٹ کے ذریعہ دو سو فٹ تک سینٹ تک پچھتے راستہ تھا جو مرغی خانے بھی ایک ہیکر پر ختم ہوتا تھا۔ اس راستے پر مرغیوں کے جڑوں سے لدا ہوا ایک ٹرک آہستہ آہستہ گیٹ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ٹرک نیلے رنگ کا تھا اور چھوٹا والا ٹرک تھا۔

اچانک میری گاڑی نے ایک جھٹکا لیا۔ پیٹرول کے آخری گھونٹ کو قلعے سے اتارتے ہی اس کے انجن کو آخری چٹکی آئی اور گاڑی نے دم توڑ دیا۔ جس بات کا ڈر تھا وہ ہو گئی۔ میری دعاؤں میں اس حد تک قبول ہو گئی تھیں کہ میں منزل تک پہنچ گیا تھا بلکہ اٹا فائدہ یہ ہوا تھا کہ مجھے یہاں رکنے کا سو فیصد جینون بمانہ حاصل ہو گیا تھا۔ شک کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔

سے میری طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ بہت عرصہ رہتے ہوئے میں نے گیٹ کے اندر ایسے دیکھا جیسے کوئی اور دیکھتا۔ مرغی خانے کی تعمیر دو اپنی انداز میں ہوئی تھی۔ اس کی چھت مخروطی یعنی درمیان سے اونچی ہوتی اور دونوں طرف ڈھلوان بھی مگر اس چھت کو موسمی حالات کی ضرورت کے مطابق نہیں بنایا گیا تھا۔ عام مرغی خانوں کی چھت پختہ نہیں بنائی جاتی تھی۔ اس پر گھاس پھوس سرکنڈے وغیرہ بچھا کے گارے بھرتے تھے۔ گیٹ ڈالنے کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ چھت کے نیچے گرمی اور سردی کا اثر کم سے کم پہنچے لیکن یہاں مجھے پورا اسٹریکچر آری سی کا نظر آ رہا تھا۔

کھلے گیٹ کے اندر ہی رک جانے والے ٹرک کے ڈرائیور اور گیٹ کھینچنے میں نہ جانے کس بات پر تھکا رہا جاتی تھی۔ میں گیٹ سے چھوٹا سا رک کے انتظار کرتا رہا اور سرسری نگاہ سے اندر کا جائزہ بھی لیتا رہا۔ مجھے رکھیں کے ابھی تک نہ پہنچنے پر حیرانی نہیں تھی۔ اس کے ذمے میں نے ایک مشکل کام لگا دیا تھا۔ اسے پیٹرول پمپ کے ملازم کو اپنے ساتھ لے کر آنا تھا اور یہ تو صاف ظاہر تھا کہ طاقت کا استعمال ناگزیر ہو گا لیکن دن رات اسے ایک جوان آدمی کو پیٹرول پمپ سے گن پوائنٹ پر انگوٹھیں کیا جاسکتا تھا۔ وہاں دو چار گاڑیاں ہر وقت موجود رہتی ہیں ”ان میں سے کوئی بھی انگوٹھ کرنے والوں کا حنا بک کر سکتی ہے اور کسی مصروف سڑک پر فرار کا راستہ اچانک ٹریک جام یا سنگل بند ہو جانے سے مسدود ہو تو سارا اعلان چوبھٹ ہو جاتا ہے۔ مجھے رکھیں کی معاملہ فہمی اور اس کے تجربے پر پورا بھروسہ تھا۔ اس نے زندگی میں ایسے کام بہت کیے تھے۔ اسے کچھ بتانے یا سمجھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ کام اکیلے آدمی کے بس کا بہر حال نہیں تھا۔ اب رکھیں اپنے بار چیرے بلید اور سابق قلعے دار فرید عباسی میں سے کس کو اپنے پلان میں شامل کرنا ہے۔ پیٹرول پمپ کے نوجوان ملازم کو کس بھانے سے دور بلانا ہے جہاں کوئی دیکھنے سننے والا نہ ہو اور کسی کی مداخلت کا اندیشہ نہ ہو۔ یہ سب میں نے رکھیں پر چھوڑ دیا تھا۔ اسے کچھ دیر ہو گئی تھی مگر مجھے اس کی کامیابی کا یقین تھا۔ وہ کسی وقت بھی ایک فاتحانہ شان کے ساتھ گاڑی چلاتا ہوا نمودار ہو سکتا تھا اور اپنی مسکراہٹ سے بھی اعلان کر سکتا تھا کہ کام ہو گیا یا رہا۔

گیٹ کھیرا اور ٹرک ڈرائیور کے درمیان جھگڑا گیٹ پاس کے کسی غلط اندراج کا تھا ”تاریخ بابو نے لکھی ہے۔“

”خوبار! اس نے غلط تاریخ لکھا ہے۔ ہائیں تاریخ کل ہو گا۔ آج اکیس ہے۔ تم جھٹکیوں نہیں اسے۔“

”خان! تم مال چیک کرو۔ کرٹ تم زیادہ تو نہیں ہیں۔ تاریخ تمہیں کیا؟“ ڈرائیور بولا۔

”خو سراج دین کیسا بات کرتا ہے تم“ گیٹ کھینچنے میری طرف دیکھا تو میں نے اس کی تائید میں سر ہلایا۔ ”بلی مالک ام کو پکارتے گا کہ مال کیسے نکل گیا آج؟“

”ایا میرے مولا۔ اس چٹان کے مغز میں تو جیج دیا ہے۔“ ڈرائیور نے سر پر ہاتھ مارا ”تاریخ ٹھیک کرلو تم خود اکیس کرلو۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا ”ام کچھ نہیں کرے گا۔ ام بابو فیروز کو بتائے گا۔ تم واپس جاؤ ٹرک اور چھوڑو۔ دوسرا پاس لاؤ۔“ چٹان چوکیدار نے گیٹ پر لگا ہوا انٹر کام اٹھایا۔

میں نے ڈرائیور سے کہا ”یار! اتنی دیر میں تو تم تاریخ بدلوا لائے۔ کیا خواہ خود بخود کر رہے ہو اس سے۔ یہ سمجھتے والا نہیں ہے۔“

یہ بات میں نے ڈرائیور سے بڑے دوستانہ انداز میں ایسے کہی تھی کہ ڈرائیور کچھ نہ سمجھا۔ وہ اب انٹر کام پر بابو فیروز سے لڑ رہا تھا کہ ہائیں کا مال اکیس تاریخ کو باہر نہیں جاسکتا اور وہ نہ خود تاریخ بدلے گا نہ ڈرائیور کو بدلنے دے گا۔ یہ تو جلساڑی ہوگی۔ اگر کل کو ڈرائیور نے خود چالیس کی جگہ چھیالیس کرٹ کر دیے۔ ذرا کا چھ بتاؤ پھر؟

گیٹ پھر بند ہو گیا۔ ڈرائیور ٹرک کو وہیں چھوڑ کے دو سرا گیٹ پاس ہوائے گیا تو میں نے چٹان چوکیدار کے اصولی موقف کی تائید کی۔ وہ خوش ہو گیا۔

”خو تمہارا گاڑی خراب ہو گیا“ چٹان ڈرائیور نے مجھ سے پوچھا ”ادھر کوئی مستری نہیں اسے۔“

میں نے کہا ”خان صاحب! پیٹرول ختم ہو گیا ہے گاڑی میں۔“

اس نے افسوس سے سر ہلایا ”یہ تو برا خانہ خرابی کا بات ہے۔ ابھی تم کیا کرے گا؟“

میں نے کہا ”کیا یہاں سے مجھے توڑا بہت پیٹرول نہیں مل سکتا۔“

اس نے مجھے حیرانی سے دیکھا ”خوبار! ادھر مرغی ملتا ہے۔ اندالما ہے۔“

میں نے کہا ”میرا مطلب تھا کسی گاڑی میں سے۔ ایک دو لیٹر پیٹرول کاٹنا ممکن ہو تو میں مین روڈ تک پہنچ جاؤں۔“

اس نے کہا ”ادھر یہ ایک ہی گاڑی ہے یہ ڈیل سے

دینی چلا گیا۔ ہمیں اپنے اپنے گھر میں ہیں۔“
 میں نے کہا: ”اس کا مطلب ہے کہ تم سب سے چھوٹے
 ہو اور بڑھاپے میں ماں باپ کا اصل سارا تم ہی ہو۔ انہوں
 نے اب ساری توقعات تم سے وابستہ کر لی ہیں جو تم سے
 بڑے بیٹوں نے پوری نہیں کیں۔ شاید ماں بڑے ارمانوں
 سے تمہارے لیے بھی کوئی لڑکی دیکھ رہی ہوگی۔ یا کہیں رشتہ
 چکا کر چکی ہوگی تمہارا اور کہیں کوئی لڑکی تمہیں اپنے خیالوں
 میں بسائے اس دن کا انتظار کر رہی ہوگی جب تم ٹھہرے یہ
 سہرا ڈالے رات لے کر آؤ گے اور اسے لے جاؤ گے۔“
 خواب بھی دیکھتی ہوگی۔ اپنے گھر کے اور بچوں کے۔“
 میں نے کئی انہیوں سے اس کی صورت پر جذبات کے
 بدلتے رنگوں کو دیکھا۔ شادی کے نام پر اس کے منتظر اور ستے
 ہوئے چہرے پر ذرا سی دیر کے لیے پرامید مسکراہٹ کی شفق
 نمودار ہو گئی تھی اور آنکھوں میں کسی کے خیال سے خواب
 اتر آئے تھے کہیں ڈی بیونس کا ویرا ایک ہاتھ میں سلور کی
 پد رنگ اور موہن جو دھو کے زمانے کی قدیم نرے سنبھالے
 اور دو سرے ہاتھ سے دھوئی کے پلو کو رد مال کی طرح استعمال
 کرتا ہوا نمودار ہوا۔ نرے میں دھاتے ہی پرانے..... اور
 میلے کپ رکھے ہوئے تھے اور ایک کانڈیر دو خاصی بڑی مل
 والی نکلیاں نظر آ رہی تھیں۔ وہ اتنی سخت تھیں کہ انہیں کیرم
 کھیلنے کے لیے اسٹرائیکر کے طور پر بھی استعمال کیا جاسکتا تھا۔
 اچھی بات یہ تھی کہ ایک کپ میں کافی جیسا سیاہ توہ تھا۔
 ”یہ تم ہو گے؟“ دینر نے توہ میری طرف بڑھایا۔ ”یہی
 چاہئے بندے کے جگر کو سوا کر دیتی ہے۔“
 میں نے کہا: ”سب کچھ تو جل کے راکھ ہو گیا ہے۔ آگ
 ایسی لگی ہے میرے دل میں کہ جی چاہتا ہے سارے جہاں کو
 اس آگ میں جھونک دوں۔“
 وہ ڈر کے پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے ایک نکلیا کو چائے میں
 ڈبو کے رکھا مگر اس کی تختی پر قرار رہی۔ ”آج تک کسی کا قتل
 نہیں کیا میں نے لیکن ہر کام کرنا پڑتا ہے بندے کو کبھی نہ
 کبھی۔ پہلی بار جیسے پچھلی بار اسکول جاتا ہے اور بڑا
 ہو جائے تو شادی کرتا ہے پہلی بار پھر مرتا بھی پڑتا ہے پہلی
 بار۔“ اپنے اس فلسفیانہ مذاق پر میں مسکرایا۔
 ”آخر آپ کیا چاہتے ہو مجھ سے؟“ اس کے اعصاب پر
 دباؤ بڑھ گیا۔
 میں نے کہا: ”ابھی دو دھائی گھنٹے پہلے کون تھا تمہارے
 ساتھ جسے تم نے ایک پیٹرول پمپ پر آنا تھا۔“
 ”میرے ساتھ۔ کوئی۔ کوئی نہیں۔ آج تو پیٹرول بھی

نہیں ڈلوایا میں نے۔ میں قرآن اٹھا سکتا ہوں اس بات پر۔“
 میں نے گرم سیاہ توہ اس کے منہ پر چھینک دیا کیونکہ
 بے تحاشا جتنی ڈالتے سے وہ شیرہ بن گیا تھا اور سینے کے قاتل
 بھی نہیں رہا تھا۔ سراج تکلیف سے چلایا۔ توہ ابلتا ہوا نہیں
 تھا کہ اس کا چہرہ جھک جاتا مگر اچھا خاصا گرم تھا۔ اس کا ہاتھ
 بے اختیار اپنی آنکھوں پر گیا۔ اس کے نیچے میں وہ چائے بھی
 اس کے کپڑوں پر گر گئی جو اس نے ابھی تک چھٹی تک نہیں
 تھی۔
 میں نے کہا: ”میں نے یہ پوچھا تھا کہ تم نے آج پیٹرول
 ڈلوایا تھا یا نہیں۔ تم کے اپنے ساتھ بھٹاکے لے گئے تھے؟
 تمہارا ٹرک وہی چلا رہا تھا۔ پیٹرول پمپ پر اس نے ٹرک کو
 سرخ رنگ کی ایک چھوٹی سی تقریباً نئی سوزکی آٹو کے ساتھ
 کھڑا کیا تھا۔ اس میں ایک لڑکی پیٹرول ڈوا کے بیٹھ رہی
 تھی۔ یا بیٹھ چکی تھی بہت خوبصورت لڑکی تھی۔ تم نے بھی
 دیکھا ہوگا اسے۔ جو ٹرک چلا رہا تھا وہ اترا تو تم ٹھک کے
 فوراً اس کی جگہ بیٹھ گئے تھے اور ٹرک کو بھاگنے لے گئے
 تھے۔ کون تھا وہ شخص؟“
 اس کے حلق سے چھٹی چھٹی آواز نکلی ”میں۔ میں
 نہیں جانتا اسے جناب!“
 ”بہت اچھی طرح جانتے ہو تم اسے اور وہ تمہیں جانتا
 تھا۔ اس شخص نے دس ہزار دیے تھے تمہیں۔ کس بات
 کے؟ کوئی سڑک پر ہاتھ کے اشارے سے کسی بھی ٹرک کو
 روک کے ڈرائیور سے یہ نہیں کہتا کہ اگر تم مجھے فلاں جگہ
 اتار دو جو تمہارے راستے میں ہے تو میں تمہیں اس کام کے
 دس ہزار نقد دوں گا۔ تم نے دس ہزار لے لیے تھے اس سے یا
 نہیں؟“ میں نے اچانک سخت لہجے میں غرا کے کہا۔
 ”لے لیے تھے۔“
 ”کس کام کے یقیناً وہ کوئی خطرناک کام تھا۔ اس کے
 بعد تم پیٹرول پمپ سے فرار ہوئے۔ بڑی گھبراہٹ اور
 افزائش میں۔ تمہیں سیدھے ہاتھ کی طرف سے آنے والی
 ٹریفک کے لیے رکنا بھی یاد نہیں رہا۔ نتیجہ یہ کہ نیلے رنگ کی
 ایک کار جس کو ایس ڈی ایم شفاعت کا بددماغ سیوت
 شفاعت چلا رہا تھا اس نے اپنی گاڑی کو بہت پھلپھلا کر گاڑی
 پھر بھی فٹ ہاتھ سے ٹکرائی اور اس کا آگے والا بھر ٹیڑھا
 ہو گیا مگر تم نکل گئے اور پوٹرن لے کر اگلے ہاتھ کی ٹریفک میں
 گھس گئے۔ شفاعت نے تمہارا پیچھا کیا اور تمہیں پکڑ لیا۔
 ایک ٹرک کیسے مقابلہ کر سکتا ہے ایک نیوٹا اسپرٹر کا۔
 تمہارے جرائم کے گواہ بہت ہیں سراج دین۔ پیٹرول پمپ کا

یقین ہوگا کہ اس ایک لمحے میں میرا دھیان اس کی طرف
 نہیں ہوگا۔ وہ مجھ سے ریوالتور جھین لے گا اور بازی پلٹ
 جائے گی مگر خود مجھے بہت دیر سے اسی لمحے کا انتظار تھا جب وہ
 مجھے غافل سمجھے کی غلطی کرے۔ شدید اعصابی دباؤ میں وہ
 اپنی طاقت اور پھر تیلے پن پر بھروسہ کر کے ہوئے جان کی بازی
 لگانے کا خطرہ مول لے۔ اس کے لیے نجات کی اس کے سوا
 کوئی صورت نہیں رہی تھی۔
 میں نے پیچھے ہٹے ہوئے اپنی کھٹی موڑ کے اس کے
 نرخرے پر ماری۔ اس وقت وہ آگے میری طرف جھکا ہوا
 تھا۔ اس وار سے سراج کی آواز ہی نہیں سانس بھی رک
 گئی۔ کھٹی کے ساتھ ہی میرا دھرا ہاتھ بھی حرکت میں آیا اور
 ریوالتور اس کے سر کے پچھلے حصے پر لگا۔ وہ بے حس ہو کے
 اسٹیرنگ پر کرا اور پھر میری طرف سرکتے لگا۔ میں اطمینان
 سے اتر کے اور ٹرک کے آگے سے گھوم کے دوسری طرف
 آیا۔ میں نے سراج کو آگے اپنی جگہ دھکیلا اور خود اس کی
 جگہ بیٹھ گیا۔ مخالف سمت میں منہ کیے اور بیٹھے والے کلینر کو
 اقتدار کی اس تبدیلی کا بالکل پتا نہیں چلا کہ ٹرک کی باگ ڈور
 کسی اور نے سنبھال لی ہے۔ جب میں نے ٹرک کا انجنی
 اشارت کر کے اس کو واپسی کے لیے موڑا تو وہ حیران ہوا۔
 اس نے آگے ڈرائیور کی طرف جھک کے اور چلا کے کوئی
 سوال کیا جو میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے جواب میں
 چلا کے کہا: ”اوسے حامد کی پکڑی محمود کے سر پر رہ گئی ہے چپ
 کر کے بیٹھ۔“
 ظاہر ہے کلینر کی سمجھ میں بھی کچھ نہیں آیا ہوگا۔ اس
 نے سمجھا ہوگا کہ کوئی چیز رہ گئی ہے۔ الفاظ کو سننے میں شاید
 اس کے کان دھوکا کھا گئے۔ ٹرک کو ڈرائیور بے شک لے
 جائے اپنے سرسرا۔ اس کی کوئی ڈسے داری نہیں۔ کلینر نے
 واپسی کے اسباب جاننے کے لیے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔
 واپسی کا راستہ دہی تھا۔ تقریباً دو کلومیٹر کے بعد میں نے ایک
 اجڑے ہوئے پولی فادرم کی شلٹ اور کھنڈر ہو جانے والی
 بیرک دیکھی اس کے پیچھے لے جا کے میں نے ٹرک روک لیا۔
 ایک منٹ کے بعد میں نے ڈرائیور کو سیٹ پر سیدھا لٹا دیا اور
 خود نیچے اتر آیا۔ کلینر نے اوپر سے جھانک کے پوچھا: ”کیا ہوا
 جی!“
 میں نے کہا: ”نیچے آ کے دیکھو۔ ڈرائیور کو کچھ ہو گیا
 ہے۔“
 وہ ٹرک کی سائڈ پر سے بندر کی طرح زمین پر اتر گیا۔
 اگلے حصے کے دونوں کھلے دروازوں کے درمیان اس نے

پھر کوئی جھوٹا ہزار میں مان جائے تو اسے رکھو پانچ سو اور

مگر یہی مجبوری اور استعمال کا سلسلہ آدمی کو اتنا کمزور کر دیتا ہے کہ رزق حلال اور حرام کی کمانی کے درمیان حائل فرق کو غیر اہم سمجھنے لگتا ہے اور جب اسے موقع ملتا ہے تو اخلاقی اصولوں مذہبی تعلیم اور قانون کے خوف کی دیوار بھی اسے غلط کام کرنے سے نہیں روک سکتی۔

ایک ہزار کی رقم کچھ لوگوں کے لیے اتنی ہی بے وقعت ہوتی ہے جتنا شکاری کے لیے وہ دانہ جو شکار کو کھینچتا ہے یا وہ چار اچھے لنگے کے لیے پھٹی خود آتی ہے۔ ایک ہزار روپیے خبثت کو اغوا کر کے لے جانے والوں کے لیے بہت حقیر رقم تھی مگر وہ جانتے تھے کہ پورے سینے میں ہزار ڈیڑھ ہزار پائے والے کے لیے کچھ بے بغیر ایک منٹ میں مل جانے والی یہ رقم کتنی پرکشش ثابت ہو سکتی ہے۔ اسے بس خاموش ہی تو رہتا تھا اور گرمی سردی میں رات دن کھڑے رہ کر گاڑیوں میں بیٹھول ڈالنے کے کام کے مقابلے میں خاموش رہتا تھا۔ آسان کام ہے۔

بیٹھول پپ کے ملازم لڑکے نے ٹرک میں سیٹ پر بے سدھ پڑے ہوئے ڈرائیور کو ایک نظر دیکھا اور اپنا سر تانے لگا "یہ وہی ہے۔"

میں نے کہا "تم نے کہا کہ دوسرے شخص کو نہیں جانتے کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں اس نے ہزار روپے دیے تھے۔"

"ہاں جی۔ یہ آدھے گھنٹے پہلے آیا تھا۔"

میں نے کہا "کیا تمہیں اندازہ ہے کہ صرف ایک ہزار لے کر تم اغوا جیسے سنگین جرم میں شریک ہو گئے تھے؟"

وہ نے کہا "سات سال کے لیے جیل کی سزا ہو جاتی تو پتا چلتا۔"

میں نے کہا "مجھے بتاؤ کہ آخر تمہیں پولیس کے حوالے کیوں نہ کیا جائے؟"

وہ رونے لگا "مجھے معاف کر دیں جناب!۔"

سوئی نے اس کے ایک جھانپڑ مارا "ابے ہم کیسے معاف کر دیں۔ ہم ہوتے کون ہیں معاف کرنے والے۔ کیا ضرورت تھی ایک ہزار لینے کی حرام کے جتن۔"

وہ نیچے گر کے پھر اٹھا اور ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہو گیا "جناب۔ مجھے فیس بھرتا بھی میزک کے امتحان کی۔"

سوئی نے اس کے دوسرا جھانپڑ مارا "یہ بکواس نہیں چلے گی۔ ایسا تھا تو تیل ہو جاتا۔ ایک عورت کے اغوا کی

اہمیت کیا تیرے امتحان سے بھی کم تھی بکجری اولاد۔"

"سب سالے ایسا ہی کہتے ہیں۔ بہن کی شادی کتنی تھی اس لیے ڈاکا ڈالا۔" مان کا علاج کرنا تھا اس لیے چوری کی۔

وہ زور زور سے رونے لگا "جناب مجھے پولیس کے حوالے مت کرو۔ وہ بہت دانتے ہیں تمہارے میں۔"

"یہ کیا پتلے معلوم نہیں تھا؟" سوئی نے کہا "جیل میں کیا ہوتا ہے اس کا پتا نہیں تھا۔ اب رونے سے کیا ہو گا؟"

اس جیل کے آخر میں آنے والی گلی نے مجھے اور رئیس کو چونکا دیا۔ اس سے پہلے جو گالیاں سوئی نے دی تھیں وہ کسی حد تک قابل برداشت تھیں مگر غصے میں وہ اپنی حد سے بڑھ گئی تھی۔ وہ بہت مشتعل تھی اور اس لڑکے پر اپنا سارا غصہ نکالنے کے موذ میں تھی۔

رئیس نے سخت لہجے میں کہا "سوئی۔ چل تو جا کے بیٹھ گاڑی میں۔"

سوئی کچھ خفیف سی ہو کے چلی گئی اور لڑکے کو بھی اپنے ساتھ لے گئی تو رئیس بولا "اس سال کی زبان بھی قابو میں نہیں۔"

میں نے کہا "کافی کنٹرول کر لیا ہے اس نے۔ بس کبھی کبھی پرانی عادت سے مجبور ہو جاتی ہے۔"

رئیس بولا "یہ لڑکا جھوٹ نہیں بول رہا ہے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے اب؟" میں نے کہا "صرف ایک ہزار کی خاطر اس نے کیا کر دیا۔ اس کا اندازہ اسے تب ہوتا جب اغوا ہونے والی اس کی بہن ہوتی اور اسے اغوا کرنے والے پیش کر دیتے ملک رب نواز جیسے کسی شیطان کی خدمت میں۔"

"یار وہ تو کتا ہے کہ۔" رئیس سوچ میں پڑ گیا۔

"کیا کہتا ہے وہ؟"

"اس نے فون کیا تھا آزاد صاحب کو۔ یہ بتانے کے لیے کہ خبثت کی گاڑی مل گئی ہے۔" رئیس بولا۔

"یہ کب کی بات ہے؟"

"جب تیرا فون مجھے ملا۔" اس کے کچھ دیر بعد ہی آزاد صاحب کا فون آیا تھا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ خبثت کہاں ہے؟ میں نے کہا کہ مجھے تو معلوم نہیں پھر انہوں نے تیرے بارے میں پوچھا۔ میں نے بہتر سمجھا کہ انہیں فی الحال کچھ نہ بتاؤں۔ میں نے کہا کہ دیا کہ اس کا بھی مجھے کچھ پتا نہیں۔ وہ خفا ہونے لگا کہ تمہیں کچھ اپنا پتا ہے کہ نہیں۔ آخر یہ کیا قصہ ہے گاڑیوں کے ادھر سے اُدھر آنے جانے کا۔ تجھے تو پتا ہے

وہ کیسے بات کرتے ہیں۔ گویا اور چنانچہ والی زبان میں۔ میری سمجھ میں یہ آیا کہ خبثت کی چوری ہو جانے والی گاڑی مل گئی ہے۔ ملک رب نواز چاہتا تھا کہ وہ گاڑی خبثت خود آکے لے جائے یا تباہ کرے کہ اسے کہاں پہنچایا جائے۔

"یعنی وہ بالکل انجان بن رہا تھا سو رکاوٹ!۔"

"ہاں۔ اس نے آزاد صاحب کو خبثت کی گاڑی کے چوری ہو جانے کا واقعہ بتایا پھر یہ کہا کہ میں نے اپنی ایک گاڑی دے دی تھی مس خبثت کو استعمال کرنے کے لیے۔ وہ انہوں نے واپس کر دی ہے آج۔"

میں چونک پڑا "کیا؟ اس نے کہا کہ گاڑی مل گئی ہے؟"

"ہاں۔ اس نے آزاد صاحب کو بتایا کہ مس خبثت نے کسی بیٹھول پپ پر گاڑی سروس کے لیے دی تھی۔ وہ گاڑی لے کر خود آجائیں تو اپنی گاڑی بھی واپس لے جاسکتی تھیں مگر انہوں نے فون کر کے کہا کہ وہ مصروف ہیں۔ ان کے کتنے سے میں نے ایک ڈرائیور کو بھیج دیا تھا۔ وہ مس خبثت سے گاڑی لے کر آیا۔ میں شکر یہ ادا کرنا چاہتا تھا کہ انہوں نے سروس کرا دی اور یہ خوش خبری بھی دینا چاہتا تھا کہ ان کی گاڑی تھانے والوں نے میرے گھر پہنچا دی ہے۔ وہ جب چاہیں لے جاسکیں یا منگوالیں۔"

میں نے ملک رب نواز کو اور گولیاں دیں۔ "ڈراما کرنا ہے حرام زادہ۔ یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ خبثت نے خود اس کی گاڑی بیٹھول پپ پر اس کے پیچھے ہوئے ڈرائیور کے حوالے کی۔ تاکہ اس پر اغوا کا الزام نہ آئے حالانکہ خبثت کو اسی گاڑی میں گھس پناخت پر لے گئے اس کے بندے۔"

"یہ کس نے دیکھا۔ ان دو بندوں کے علاوہ۔ ایک یہ بیٹھول پپ پر کام کرنے والا لڑکا اور دوسرا یہ ٹرک ڈرائیور۔"

"کیا ان کی گواہی کافی نہیں؟"

رئیس بولا "اپنی بے گناہی کے ایک نہیں دس گواہ پیش کر دے گا ملک رب نواز۔ جو حلفہ کہیں گے کہ گاڑی میں ڈرائیور کے سوا کوئی نہیں تھا۔ خود اس بیٹھول پپ کا بیجریہ کتنے پر مجبور ہو سکتا ہے کہ مس خبثت نے وہ گاڑی میرے سامنے کسی کو دی تھی۔ مس خبثت کو میں جانتا ہوں۔ وہ مشہور صحافی ہیں۔ لال گاڑی ایک ڈرائیور لے گیا تھا اور مس خبثت نیکی میں بیٹھ کے چلی گئی تھیں۔"

میں نے کہا "ڈیکھو رئیس۔ ہم نے پولیس کے پاس جا رہے ہیں کوئی رپورٹ لکھوانے اور نہ کسی قانونی چکر میں پڑنے

کے لیے دقت ہے ہمارے پاس۔ ملک رب نواز تو خیر جھوٹ بول رہا ہے لیکن یہ ٹرک ڈرائیور بھی جھوٹا ہے۔ یہ کسی نہ کسی حوالے سے اغوا کرنے والوں میں شامل تھا اور اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ خبثت کو کہاں لے جایا گیا ہے؟"

"پھر کیا اسے بھی بتائیں؟ یہ ریکارڈ بھی من لیں؟"

"نہیں۔ اس دقت بجے ہیں پانچ۔ تھوڑی دیر میں رات ہو جائے گی۔ ہمیں اس سے پہلے ہی کچھ کرنا ہو گا۔ میں بہت پریشان ہوں۔"

رئیس نے کہا "تو بتا کیا کرنا ہے پیارے۔ اپن حاضر ہیں تو من دھن کے ساتھ۔"

میں نے کہا "دیکھو یار۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ خبثت یا تو ہوئی ملک کی کوٹھی میں۔"

"اور وہاں نہ ہوئی تو کہاں ہو گی؟"

"شاہ پریل پولیٹری پروڈکٹ کے مرئی خانے میں۔"

"یہ خیال کیسے آیا مجھے؟" رئیس کچھ حیران ہوا۔

"مرئی خانے کو دیکھ کر۔ وہ مرئی خانہ نہیں ایک قلعہ ہے یار جس کے حفاظتی انتظامات بہت سخت ہیں۔ مرئی خانے ایسے نہیں ہوتے" میں نے کہا۔

رئیس نے کہا "کیا یہ اپنے ملک صاحب ہی کا کوئی بزنس ہے؟"

"مجھے ایسا ہی لگتا ہے۔ اگر کسی طرح تصدیق ہو جائے کہ خبثت وہاں نہیں ہے ملک رب نواز کی کوٹھی میں۔" میں نے کہا۔

رئیس بولا "یہ کون بتائے گا ہمیں؟"

"یہ فون کر کے معلوم کیا جاسکتا ہے۔ میرا مطلب ہے کو شش کی جاسکتی ہے کم سے کم" میں نے کہا۔

رئیس بولا "یعنی ملک رب نواز کو فون کر کے ہم اسے کہیں کہ خدا کو حاضر و ناظر جان کے بتاؤ کیا خبثت کو اغوا کر کے تم نے اپنی کوٹھی میں رکھا ہے؟"

میں نے برہمی سے کہا "انکو کے ٹھیک میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں اور دماغ خراب نہیں ہے میرا اس حد تک۔"

"ابے یار۔ یہ بالکل بن کی بات نہیں ہے تو پھر کیا ہے۔ فون پر کون بتا سکتا ہے خبثت کے بارے میں؟"

میں نے پورے دھوکے کے ساتھ کہا "مکانی۔ ملک رب نواز کی دوسری بیوی۔ اس کے گھر میں اور خبثت مکانی کے ساتھ ایک ہی ٹیبل پر بیٹھ کے لچ کر کھتے ہیں۔"

رئیس نے سخت سے سر کھچایا "ہاں۔ بتایا تھا تم نے۔" مکانی نے ہمیں اپنا فون نمبر دیا تھا۔ خبثت نے پوچھا تھا

اس سے کہ کبھی کوئی کام ہو، آپ سے تو کیا میں آپ سے بات کر سکتی ہوں؟ اور اس نے بالآخر اپنا فون نمبر دے دیا تھا۔ وہ فون نمبر ختم کے پاس تھا۔

”اور ختم کہاں ہے وہ کیا کہتے ہیں فارسی میں کہ قافل کو گمانے لے کھالیا۔ گمانے کو قصاب لے گیا تھا اور قصاب تو مر گیا۔“

میں نے کہا ”ایسی بات نہیں۔ اس کا بیگ میری گاڑی میں تھا جب اس نے ملک کی گاڑی پینرول پست لی تھی۔ یہ خیال تھا کہ ملک کا کوئی آدمی گاڑی لینے آتا ہی ہوگا۔ گاڑی کی چابی اس کو دے کر ختم کو واپس آنا تھا۔“

”لیکن شامت اعمال لے گئی اسے پینرول پست پر۔ خواہ مخواہ ٹکی کا سوچا۔ خالی تھا نیل ٹنگ تو رہتا۔“

میں نے کہا ”دیکھ جو لوگ یہ ملے کر کے آئے تھے کہ اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ وہ اسے ہرجال لے کر جاتے وہاں نہ سہی کہیں اور اس کا راستہ روکتے۔ انہیں یہ علم نہیں تھا کہ ختم کے ساتھ میں بھی ہوں۔ اب جو ہوتا تھا وہ ہو گیا۔ مسئلہ ہے ملک کی فون کرنے کا۔ اس کا فون نمبر مل جائے گا ختم کے بیگ سے۔“

”تجھے یقین ہے کہ وہ ہماری مدد کرے گی؟“

”میں نے کہا تاکہ کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس کے اور ملک کے درمیان ذاتی ہم آہنگی نہیں ہے۔ اس کا اندازہ ہو گیا تھا ملک کی باتوں سے۔“

”اب یہ ملک ٹائپ کے لوگ ایسی باتوں کا مطلب بھی نہیں سمجھتے۔ یوں بھی ذاتی۔ وہ کیا لفظ استعمال کیا تھا تو نے‘ نارنگی یا سارنگی۔“

”ہم آہنگی جاہل کی اولاد۔ اس کا مطلب ہوتا ہے خیالات کا ملنا۔“

”ابے ہاں وہی۔ تو وہ کہاں ہوتی ہے پیارے۔ یہاں تو بس شادی ہوتی ہے۔“

میں نے کہا ”ملک کی پروفیسر تھی اور ختم سے خاصی ستاڑ معلوم ہوتی تھی۔ اگر سوئی اسے فون کرے۔ اسے بتائے کہ میں ختم کی چھوٹی بہن ہوں۔“

”ابے وہ اچھی طرح جانتی ہے سوئی کو۔ اس کی بڑی بہن پہلے بڑے ملک کی داشتہ تھی۔ جب اس نے بیٹے پر زور سے ڈالنے چاہے تو ملک نے خود اسے قتل کر کے لاش ٹھیکے کے گھر میں چھوادی تھی۔ اس کے بے غیرت شوہر کے گھر میں۔ سوئی کے کڑو توں سے بھی واقف ہے وہ۔“

میں نے کہا ”سوئی فون کرے گی ختم کی بہن بن کے اور

فون پر آواز بدل جاتی ہے۔ ملک کی شک نہیں کر سکتی کہ بولنے والی سوئی ہے۔ سوئی اسے کہے کہ ملک کی ’میری بہن کو اغوا کر لیا گیا ہے اور مجھے شک ہے کہ یہ کام آپ کے شوہر نامدار کا ہے۔“

”ملک اپنے شوہر کے خلاف یہ الزام سن لے گی اور شاید یقین بھی کر لے گی مگر وہ عملی طور پر کوئی قدم ہماری مرضی کے مطابق نہیں اٹھائے گی۔“

میں نے کہا ”یہ تو ٹھیک ہے لیکن سوئی اسے ردو کر کے قاتل کر سکتی ہے کہ ختم کی زندگی خطرے میں ہے۔ وہ کہہ سکتی ہے کہ بہت عرصے سے ختم روپوشی کی زندگی گزار رہی تھی۔ اس نے دفتر باجی چھوڑا تھا۔ کوئی ایسی بات تھی کہ وہ باہر نکلے ہوئے ڈرتی تھی اور اس نے ایک بار مجھ سے کہا

”بھی تھا کہ اگر خدا خواست میرے ساتھ کوئی ایسی دیکھی بات ہو جائے، مجھے کوئی حادثہ پیش آجائے اچانک تو سمجھ لینا کہ اس میں ملک رب نواز کے سوا کسی کا ہاتھ نہیں ہو سکتا۔“

”اوکے فرض کرو ملک نے یقین کر لیا لیکن وہ سوئی سے کہے گی کہ بی بی میں کیا مدد کر سکتی ہوں اس سلسلے میں تمہاری۔ ملک رب نواز میرا شوہر ہے۔ مجھے بتانے سے کیا فائدہ۔ تم جاؤ پولیس کے پاس۔“

میں نے کہا ”ہاں۔ یہی وہ خاص نکتہ ہے جس پر ہماری کاسیانی کا دارومدار ہے۔ سوئی اس سے کہے گی کہ کسی ثبوت کے بغیر پولیس کوئی بات نہیں مانتی اور میں بھی بہت نہیں کر سکتی کہ ملک رب نواز جیسے بااثر شخص کے خلاف اغوا کی رپورٹ کھواڑاؤں چاہیں تو ایک کام کر سکتی ہیں آپ۔ یہ دیکھ لیں کہ ختم کو اسی کو بھی میں تو قید کر کے نہیں رکھا کیا ہے جہاں آپ رہتی ہیں۔ آپ کے لیے تعیناتی کرنا کیا مشکل ہے۔ اگر اسے اغوا کرنے والے وہاں لے آئے ہیں تو آپ اس کو وہاں سے نکال بھی سکتی ہیں۔“

”اور تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ ملان جائے گی؟“ رئیس بولا۔

میں نے کہا ”ہاں۔ اگر اسے بتایا جائے کہ ملک رب نواز نے ختم جیسی مشہور صحافی کو اغوا کر کے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ یہ بات اخبار والوں کو معلوم ہوگی تو کتنی بدنامی ہوگی خود آپ کی۔ اخبار والے خاموش تماشائی بن کے نہیں بیٹھیں گے۔ وہ حکومت کی ساری مشینری کو اوپر سے نیچے تک ہلادیں گے سوچئے اگر پولیس نے مجبور ہو گئے آپ کی کوئی کامیاب مصروف کر لیا اور غائب تلاشی میں ختم پر آمد کر لی تھی تو ملک صاحب کا سیاسی مستقبل ختم ہو جائے گا۔ ملک کی سمجھ دار

ہے۔ وہ ایسا کر سکتی ہے کہ ختم کو واقعی نکال دے۔ ایک بہت بڑے مسئلے کا آسان حل سمجھ کے اور اگر ختم وہاں نہ ہوتی تو وہ بتا دے گی۔“

”کس کو؟ کہاں بتا دے گی؟“ رئیس بولا۔

میں نے کہا ”سوئی پھر فون کر سکتی ہے اسے۔ آدھے گھنٹے بعد۔ ملک کو اس کو بھی کہہ سکتی ہے جسے میں جانے سے کون روک سکتا ہے اور اس معاملے میں وہ شوہر سے لڑ بھی سکتی ہے کہ تم باطل ہو گئے ہو؟ اس لڑکی کو اٹھو الیا تھا تم نے؟ وہ کیا عام لڑکی ہے کوئی؟“

رئیس نے کہا ”چل مجھ دیر کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔“

میں نے کہا ”تمہاری اس بے جرو میں اضافی پینرول کے لیے ایک جبری کین ہوتا ہے۔“

”ہاں ہے۔ پیچھے لگا ہوا ہے۔“

میں نے کہا ”پینرول بھی ہے اس میں؟“

”تیس مارخان آدھا اور کام نہیں کرتا۔ گاڑی جتنا عرصہ کھڑی رہی کھڑی رہی۔ اب ریڈی ہے تو بالکل ریڈی ہے۔“

”مجھ تو کام بن گیا۔ ہم چلے ہیں اور گاڑی لے آتے ہیں۔ میں نے چھان گاڑتے کہا تھا کہ مجھے پینرول لانا ہے۔ اس کی اجازت سے اور ڈرائیور صاحب کی مرضی سے مجھے

ٹرک میں لفٹ مل گئی تھی۔ وہ تجھے کوئی بہت شریف آدمی سمجھے گا جو مجھے پینرول پست سے یہاں تک چھوڑنے آگیا۔ تو بس ایک نظر ڈال لینا اس مرغی خالے پر۔ مجھے تو وہاں معاملہ کچھ اور ہی لگتا ہے۔“

رئیس میرے ساتھ چل پڑا۔ ”ہم سب ساتھ کیسے جا سکتے ہیں؟“

میں نے کہا ”چھا تو سراج دین ڈرائیور اور اس کے کلینر کو سنبھال میں سوئی کے ساتھ جانا ہوں فون کرنے۔“

”فون ہوگا یہاں؟“

میں نے کہا ”یہ دی آئی بی سمجھے جانے والے بڑے لوگوں کے پرائیویٹ فارم ہیں۔ جو ٹیلی فون کیا ٹیلی فون ایکسیس لگوا سکتے ہیں لیکن فون کرنے کی اجازت حاصل کرنا مشکل ہوگا۔ اس وقت یہاں صرف ملازم ملیں گے، اچھا میں چلتا ہوں۔“

”ابے یاد رہت کرنا۔“

میں نے کہا ”تو خیال رکھنا ان دونوں کا۔ ایسا نہ ہو کہ اٹنے لینے کے دینے پڑ جائیں۔ ہوش میں آتے ہی وہ تجھے

لٹاریں اپنی جگہ۔“

رئیس نے کہا ”ان کی قوت۔“

سوئی نے کھڑکی سے جھانک کے کہا ”اب کس نے دی ہے گال۔ صرف مجھ پر زور چلتا ہے سب کا۔“

میں سوئی کے ساتھ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا ”ہم تو سدھار نہیں سکے اسے۔ اب تم کو کرنا ہے یہ کام لیکن خود تمہیں سدھرنے پر کون مجبور کر سکتا ہے۔ یہ بھی ایک غور طلب مسئلہ ہے۔“

”خدا جب توفیق دیتا ہے تو سب سدھر جاتے ہیں“ وہ بولی۔

میں نے کہا ”بھلا ارشاد لیکن خدا نیت اور ارادے کو بھی دیکھتا ہے۔ خدا شراب کے نشے میں بے سدھ پڑے ہوئے آدمی کو بچا کے نہیں لےتا کہ چل بھی اٹھ۔ میں تجھے توفیق دے رہا ہوں نیکی کی۔ پرائیویٹ کا انعام بھی اسی کا لگتا ہے جو پہلے ایک بوڑھے تو خرید لے۔“

پینرول پست کے ملازم لڑکے نے منہ لے کر کہا ”اب ہم کہاں جا رہے ہیں جی؟“

میں نے گاڑی کو اشارت کر کے کہا ”تمہاری سسرال!“

سوئی نے ریوالتور سے اس کی ٹاک کو چھوڑا ”زندہ رہنا چاہتا ہے تو بیٹھا رہ چپ کر کے ورنہ ہم تمہاری لاش پھینک جائیں گے بیس۔“

وہ رونے لگا ”مجھے جانے دیں جی۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔ میری ماں بہت پریشان ہوگی۔ پینرول پست والے اسے گھر جا کے بتا دیں گے کہ تمہارا لڑکا کچھ بتائے بغیر چلا گیا ہے نہیں۔“

میں نے گاڑی کو آگے بڑھایا ”پنپے لیے یہ پریشانی تم نے ایک ہزار میں خود خریدی ہے بیٹے۔ کچھ سبق تو ملنا چاہیے تمہیں۔“

سوئی نے مجھ سے پوچھا ”ختم باجی مل جائیں گی؟“

سوئی کو مایوسی کی گرداب سے نکالنے کے لیے میں نے اپنی پریشانی پر جموئے اطمینان کی مسکراہٹ سجائی ”تا مایوس ہونے کی اور روتی فصل بنانے کی کیا ضرورت ہے فارسی میں کہتے ہیں جو زندہ پابند۔ یعنی جو تلاش کرتا ہے وہ پالیتا ہے۔ لوگ زمین میں دفن تلاش کرتے ہیں۔ سائنس دان کائنات کے سرشت رازوں کی حقیقت تلاش کرتے ہیں۔ صوفی خدا کو تلاش کرتا ہے۔ سب کو اپنی منزل مل جاتی ہے پھر ختم کیوں نہیں ملے گی؟ اچھا اب میری بات دھیان سے سنو ایک کام کرنا ہے تمہیں۔“

”میں سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں“ آپ بتائیں۔“
میں نے کہا ”تمہیں ہلکانی کو فون کرنا ہے۔ ملک رب
نوازی کی بیوی کو۔“

”ہلکانی کو فون کرنا ہے؟“
میں نے کہا ”نہیں“ تم اسے یہ نہیں بتاؤ گی کہ تم
سونی ہو۔ تم اسے کوئی کہیں جس کی بہن بول رہی ہو۔
ہلکانی کو کچھ بتائیں کہ اس کے گھٹے بھائی بہن ہیں۔“
مرنی خانے کے گیٹ تک پہنچنے میں مجھے دس منٹ ہی
لگے ہوں گے۔ اگر میں بے جیرو کو دوڑاتا تو یہی فاصلہ اس سے
آدھے وقت میں بھی طے کیا جاسکتا تھا مگر میں نے اس کی
رفقار عموماً رکھی تاکہ مجھے سونی کو یہ سمجھانے کی سہولت مل
جائے کہ اسے کیا کرنا ہے اور کیا کرنا ہے۔ اب شام دھڑلے لگی
تھی اور درختوں کے نیچے سامنے میں تاریکی سی محسوس ہوتی
تھی۔ سڑک پر سامنے سے ایک شاہانہ انداز رکھنے والی سیاہ
رنگ کی لینڈ کروزر نمودار ہوئی۔ اس کے سیاہ شیشوں کے
پیچھے میں نے کسی پردہ دار فیملی کی ایک جھلک سی دیکھی۔

مرنی خانے کے بند دروازے کے باہر چھان چوکیدار
بیزاری کے انداز میں اپنی ڈیوٹی دے رہا تھا۔ اس نے بے جیرو
کو پھر مجھے اور اس کے بعد سونی کو دیکھا۔ ایک دوسرے سے
لا تعلق رہتے کے باوجود خاموشی کی زبان میں اس کے اور
میرے درمیان کچھ سوال جواب ہوئے۔ اس نے مجھ سے
پوچھا کہ کون ہے یہ لڑکی؟ تمہاری کوئی جاننے والی ہے؟ میں
نے کہا کہ نہیں ”اسے تم فرشتہ غیب سمجھ لو جسے خدا نے میری
مدد کے لیے بھیج دیا تھا۔ اس نے جیرائی سے کہا کہ عجیب بات
ہے“ تم اس کی گاڑی بھی چلا رہے تھے اور اس کی گاڑی میں
لگے ہوئے دس لٹیر کے جری کین کو کھول کے تم پیٹرول اپنی
گاڑی میں ایسے ڈال رہے ہو جیسے یہ بھی تمہاری اپنی گاڑی
ہے اور میں نے جواب میں زچ ہوئے کہ کہا کہ خاں صاحب
اس میں عجیب بات کیا ہے ”کیا دنیا میں ایسے لوگ نہیں ہوتے
جو کسی اجنبی کی مدد کرتے ہوں۔“

مجھے اندازہ تھا کہ چھان چوکیدار زبان سے کچھ نہ کہنے
کے باوجود کیا سوچ سکتا ہے لیکن پیٹرول کے کین کو اپنی گاڑی
کے فیول ٹینک میں خالی کرتے ہوئے میں نے ساری توجہ مرنی
خانے کا جائزہ لینے پر مرکوز رکھی۔ مجھے دیوار پر تاروں کی باڑھ
کے علاوہ سرج لائٹس بھی نظر آئیں جو ہر پچاس گز کے فاصلے
پر ایسے نصب کی گئی تھیں کہ ایک کار رخ اندر کی طرف تھا تو
دوسری کا باہر کی طرف۔ سرج لائٹس کا سامنا بھی اتنا برا تھا کہ
ان کے روشن ہونے سے دیوار کے دونوں طرف رات کے

وقت دن نکل آتا ہوگا اور اس کی خبر کو دینے والی روشنی میں
ایک چوٹی کو بھی حرکت کرتے دیکھا جاسکتا ہوگا۔

میرا ٹھک اب یقین میں بدل گیا تھا کہ مرنی خانے کی آڑ
میں یقیناً یہاں کوئی غیر قانونی کاروبار جاری ہے۔ ممکن ہے
خفاقی انتظامات اس سے کہیں زیادہ سخت ہوں جتنے نظر
آ رہے ہیں۔ راستوں پر انفرارڈ لائٹ کیمرے اور الارم
نصب ہوں۔ خفیہ مقامات پر گلوڑ سرکٹ کی وی کیمرے
لگا دیے گئے ہوں اور اندر کسی مانیٹر پر کوئی شخص چومیں گھٹنے
پر کمرے کی تصویر کو گھور رہا ہو۔ جدید سائنسی آلات نے
کسی غیر متعلقہ شخص کے داخلے کو روکنے کے لیے ایسی غیر
مرئی دیواریں کھڑی کرنا ممکن بنا دیا ہے جن کے مقابلے میں کوہ
ہمالیہ کی فسیل کو عبور کرنا آسان ہوگا لیکن انڈوں اور
مرغیوں کی حفاظت کے لیے یہ اہتمام ناگھدہ سرنگرہاں کہ
اسے کیا کہیں۔

پیٹرول ڈالنے کے بعد گاڑی اشارت کرنے میں دیر
نہیں لگی۔ میں نے پروگرام کے مطابق واپسی کے لیے وہی
راستہ اختیار کیا جو اصولاً تو غلط تھا اور مختلف فارم ہاؤسز کے
درمیان سے لہذا آہل کھانا کھوتا پھر آٹا اصل سے کئی گنا فاصلہ
طے کر کے سڑک تک پہنچا تھا۔ میں اس جلیبی جیسے راستے پر
بھٹکتا ہوا پیل پولٹری فارم پہنچا تھا۔ چھان چوکیدار نے میری
عقل پر یقیناً افسوس کیا ہوگا۔ کچھ لوگ بھی راہ راست پر
نہیں آتے۔

پروگرام کے مطابق پیٹرول ڈالنے کے بعد میں نے سونی
سے ہاتھ ملا کے اس کا شکریہ ادا کیا تھا اور وہ اپنی ریسرسانہ
گاڑی کو نوبو جیٹ کی طرح ہر سائیک اسپڈ سے دوڑاتی ہوئی
میرے روانہ ہونے سے پہلے ہی غائب ہو گئی تھی۔ میں چند
منٹ بعد اپنی بیک خرام اور منکسر الزرائج چھوٹی سی گاڑی میں
بڑی شرافت سے روانہ ہوا۔ مجھے امید تھی کہ ہمارے ایسے
الگ الگ روانہ ہوجانے کے بعد چوکیدار بھی یہ مانتے پر مجبور
ہوگا کہ دنیا میں شرافت کا رشتہ بھی کوئی چیز ہے۔

مشکل سے آدھے کلومیٹر کے فاصلے پر اگلے موڑ کے
ساتھ ہی سونی بے جیرو کی کڑکی سے باہر جھانک رہی تھی۔ میں
نے کار کو اس کے ساتھ ہی روک لیا ”آگے چلو۔“

”میں تو پہلے بھی نہیں آئی اس طرف۔ آپ قیادت
فرمائیں“ وہ بولی۔

میں نے کہا ”جو حال اس قوم کا لہڑوں پر بھروسہ کر کے
ہوا“ وہی تمہارا بھی ہوگا۔ اور انجام کے بارے میں شاعر نے
فرمایا ہے کہ ہم تو اوسے ہیں جسے تم کو بھی لے دوں گے۔“

”یعنی آپ کو بھی ڈر ہے بھٹک جانے کا؟“
میں نے کہا ”کمال کرتی ہو تم بھی۔ میرا کون سا روڈ کا آنا
جانا ہے اور پھر یہ راستے تم دیکھ رہی ہو۔ بھول بھلیوں سے کم
نہیں ہیں۔“
سونی نے کچھ فخریہ انداز میں بتایا ”میں جس راستے سے
ایک بار گزر جاؤں وہ مجھے کبھی نہیں بھولتا۔“

”چھاپا یہ دعویٰ ہے گویا آپ کو؟“
اس نے کہا ”جب میں ڈاکوؤں کے ساتھ تھی تو وہ لوگ
جنگل میں بھٹک جاتے تھے۔“

”پھر تم راستہ دکھاتی تھیں انہیں؟“ میں نے کہا۔
”پندرہ سال بعد میں اپنی بہن کے ساتھ اپنا آبائی گھر
دیکھنے گئی تھی۔ وہ شاید پانچ سال کی تھی اور میں تین سال کی
جب ہم نے وہ شہر پہنچا تو وہاں تھا۔ اس کے باوجود ہمیں کسی
سے راستہ معلوم کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ میں اپنی
بہن کو گھٹیوں سے گزرا کہ سیدھا اس گھر تک لے گئی۔ اس
نے تو گھر کو بھی نہیں پہچانا تھا“ وہ ہنسی۔

میں نے کہا ”دیر کی گزشتہ۔“
وہ بولی ”میں نہیں چہرے اور نام بھی ایسے ہی یاد رہتے

ہیں۔ کوئی کتاب میں ایک بار پڑھا لوں اور دوسری بار مجھے پڑھ
کے سنائی جائے تو مجھے تقریباً یاد ہو جاتی ہے۔ میری بار میں
اسے پھر خود پڑھ لوں تو شک کی کوئی بات نہیں رہتی۔“

میں نے حیران ہو کر کہا ”یہ تو بڑی غیر معمولی صلاحیت
ہے۔ لوگ تو ایک قرآن کو حفظ کرنے کے لیے مہینوں دن
رات ایک کوشش کرتے ہیں۔“

”میں آٹھ سال کی تھی جب میں نے قرآن حفظ کیا“ وہ
بولی ”رمضان کا مہینہ تھا۔ ہم دونوں بہنوں کو ایک مولوی
صاحب قرآن کی تعلیم دینے آتے تھے۔ عربی پڑھنا مجھے آگیا
تھا۔ میں ان کے ساتھ بیٹھ کے پورا سپارہ ختم کرتی تھی۔ وہ
میری بہن کے ساتھ دماغ سوزی کرتے رہتے تھے جو مہینے میں
ایک سپارہ بھی بڑی مشکل سے پڑھتی تھی۔ مسجد ہمارے گھر
کے سامنے ہی تھی۔ رات کو نماز تراویح میں وہی مولانا بڑی
اجنبی قرات کرتے تھے اور میں بستر لیٹی بڑے دھیان سے
سنی رہتی تھی۔ پہلی رات ہی مجھے ایسا لگا کہ میں سپارے کو
زیر لب دہرا سکتی ہوں۔ میں نے صبح دی سپارہ پھر پڑھا تو
بست خوش ہوئی۔ مجھے واقعی سپارہ یاد تھا۔ یہ بات میں نے
اپنی ماں کو بتائی تو اسے یقین نہیں آیا۔ میں نے شام کو دوسرا
سپارہ پڑھا۔ رات کو تراویح کی پوری قرات سنی۔ لاؤڈ اسپیکر
پر آواز بہت صاف اور اونچی سنائی دیتی تھی۔ صبح ماں کو سنانے

سے پہلے میں نے سپارے پر ایک نظر اور ڈالی۔ ماں تو دم بخود
رہ گئی۔ تیسرے دن میں نے تیسرا سپارہ پڑھا اور سنا۔
ستائیسویں شب کی صبح ہوئی تو میں حافظہ ہو گئی تھی۔ میں نے
پورے تیس سپارے یاد کر لیے تھے۔ اس بات کی شہرت دور
دور تک ہو گئی۔ مسجد کے پیش امام صاحب نے نماز عید کے
اجتماع میں اس کا تذکرہ بطور خاص کیا اور اسے معجزہ
خداوندی قرار دیا۔“

میں نے کہا ”یہ واقعی ناقابل یقین سی بات ہے۔“
”رات کو سونے سے پہلے میں ایک سپارہ دل ہی دل
میں دہرا لیتی ہوں۔ ہر مہینے ختم ہونے والے قرآن کا ثواب
میں اپنے باپ کو باقاعدگی سے ایصال کرتی ہوں۔“

میں نے کہا ”صرف باپ کو؟“
”ہاں۔ وہ بہت اچھا آدمی تھا۔ میری ماں نے بڑا ظلم کیا
کہ اسے چھوڑ آئی۔ وہ بہت محبت کرنے والا شوہر تھا اور اتنا
ہی اچھا باپ بھی ثابت ہوا۔ اس کی موت کا سب سے زیادہ
دکھ مجھے ہوا تھا۔ اب اس کی مغفرت کی دعا کے سوا میں کیا
کر سکتی ہوں اس کے لیے۔ زندگی میں تو کچھ بھی کرنے کا موقع
ہی نہیں ملا تھا۔“

میری نظر سڑک کے ان تاروں پر جمی جو ٹیلی فون اور
جلی کے کھمبوں سے ہر فارم ہاؤس تک جا رہے تھے۔ ایک
فارم ہاؤس سے دوسرے فارم کا فاصلہ کہیں ایک کلومیٹر تھا تو
کہیں اس سے بھی زیادہ۔ بیشتر فارم ہاؤس بند پڑے ہوئے
تھے اور ان پر کام کرنے والے بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔
تقریباً پندرہ بیس منٹ تک میں لوہے کے رنگ خوردہ
بند پڑا تک دیکھ کے آگے بڑھتا رہا۔ بالآخر ایک جگہ میں نے
ایک شخص کو چارپائی پر نیم دراز وصاتی وضع کا پرانا حقہ
گزر گزرتے دیکھا۔

میری آدمی بات سن کے ہی وہ سہلانے لگا ”ناتی“ اور
کوئی حکم کو۔ فون کی اجازت نہیں۔“
میں نے کہا ”یار یہ کسی کی زندگی اور موت کا سوال
ہے۔“

”ہو گا گی۔ رب خیر کرے گا۔ دوسرے میری ساس بھی
مر جائے تو میں فون کر کے اپنی بیوی کو نہ بتاؤں۔ میری نوکری
کا معاملہ ہے۔ مالک ایسے لے لیں کہ ایک ایک کال کا
حساب رکھتے ہیں۔“

میں نے ابوبی سے مراجعت اختیار کی ”خدا کرے ایسا
وقت بھی نہ آئے تم پر۔ تمہاری ساس سو سال اور جیجے۔“
اس نے پیچھے سے کہا ”بد دعا کیوں دیتے ہو۔ میری

مجبوری بھی دیکھو جناب!

دوسری جگہ چونکہ ارغدا کی قدرت کا نرالا نمونہ تھا۔ وہ سرخ ریشم کی زرد پھولوں والی قمیض پہنے ہوئے تھا۔ اس کے کانوں میں سونے کی بالیاں تھیں اور آنکھوں میں سرمے کی نگیر۔ اس کے گولنہ برائوں بال شانوں تک تھے اور بوٹوں پر لپ اسٹک کی لالی تھی۔ اپنے انداز و اطوار کی نسوانیت سے وہ صاف تیسری جنس کا نمائندہ نظر آتا تھا۔

اس نے کمر پر ہاتھ رکھ کے مجھے ترجمیں نظروں سے دیکھا "ہائے فون تو خراب ہے۔"

میں نے اس کے لہجے میں کہا "ہائے کیا خرابی ہے فون میں آخر؟ کان سے لگاؤ تو ڈاکٹر فون سنائی دیتی ہے؟ کسی کا فون آئے تو پہلے کھنٹی بجنے لگتی ہے؟ نمبر ملاؤ تو دوسری طرف سے کوئی پوچھتا ہے؟" "اوہ؟"

اس نے خرابے کے اور بل کھا کے کہا "ہائے جی۔ آپ تو مذاق کرتے ہو۔"

میں نے واپس آتے ہوئے کہا "مذاق تو قدرت نے کیا ہے تمہارے ساتھ۔"

سونی نے ہنستے ہنستے کہا "ذرا پیار کی نظر سے دیکھتے اور اپنائیت سے بات کرتے تو وہ مان جاتا یا مان جاتی۔"

میں نے ہنسا کے کہا "اب تم بات کر کے دکھانا۔"

"ٹھیک ہے۔ تم دیکھنا میرا کمال" اس نے میرا چہنچہ قبول کر لیا۔

تیسری جگہ میں نے سونی کو چانس دیا۔ اس کے کہنے پر میں نے اپنی کار کچھ فاصلے پر روک لی اور خود پیٹرول پمپ والے ملازم کے ساتھ بے جیرو... کی پیچھے والی سیٹ پر دیک کے بیٹھ گیا۔ میں نے گیٹ کبیر کو باہر ایک بیچ پر بٹھا ہوا دیکھ لیا تھا مگر اس نے صرف سونی کو گاڑی سے اترتے دیکھا۔

"میں نے کہا جی 'ملاواں لیکم!' سونی نے بڑے میٹھے لہجے میں کہا۔

"آؤ جی بسم اللہ! لیکم سلام۔"

"آپ ہی ہوتے ہو جی ادھر۔ یا ادھر بھی ہے کوئی۔ ایک کام تھا مجھے۔"

چونکہ ارغدا نے کہا "آپ حکم کو جناب۔ ہم حاضر ہیں۔"

"وہ۔ ایک فون کرنا تھا مجھے۔ بہت ضروری۔" سونی نے کہا۔

سونی کے انداز دلیری اور اس کی ہوش اڑا دینے والی مسکراہٹ نے یقیناً گیٹ کبیر کے دل کا قہر کھڑا ہوگا۔ "ٹوٹی" یہ بھی مسئلہ ہے کوئی۔ آپ اندر آؤ میرے ساتھ۔ ایک نہیں

سوئی فون کو جناب شوق ہے۔"

تھوڑا سا سراسر اٹھا کے دیکھنے پر مجھے ایک دراز قد گھوڑا جوان نظر آیا جس کے چلنے میں کوئی ایسی بات نہیں تھی مگر وہ مجھے پنجابی فلوں میں ولن کے کسی ہاں میں ہاں ملانے والے جیسے کی طرح نظر آیا۔ اس کی مونچھیں اس کے چہرے کی گہری میں سوا تو بجا رہی تھیں اور اچانک اس ویرانے میں وہ اپنے سامنے ایک شاندار گاڑی سے ہیروئن جیسی حسین اور کافر ادا لڑکی کو اترتا دیکھ کے ہسوت رہ گیا تھا۔ شاید پہلی بار اسے یقین آنے لگا تھا کہ فلوں میں جو خواب نظر آتے ہیں ان کی تعبیر حقیقی زندگی میں بھی مل جاتی ہے۔

میں نے پیٹرول پمپ کے ملازم لڑکے سے کہا "آجاؤ میرے ساتھ مگر۔"

"میں۔ میں ایسی کوئی بات نہیں کروں گا جی۔" اس نے میرا جملہ کھل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔

گیٹ کبیر اندر برآمدے میں شیشمی کی لکڑی کے مضبوط دروازے کو ایک چابی لگا کے کھول چکا تھا جب اس کی نظر مجھ پر پڑی "تم۔ کون ہو تم؟"

سونی نے کچھ شرما کے اداکاری کی "یہ۔ میرے ساتھ ہیں۔ میرے شو بہر۔"

میں نے کہا "اور یہ ہمارا ملازم ہے۔ چل پڑ تو جینہ جا ادھر برآمدے میں۔"

چونکہ ارغدا کی سوانو بھانے والی مونچھیں لٹک کے آٹھ بیس کے ٹائم پر آگئیں۔ خوش گمانی کے سارے تصورات ایک نفٹ آمیز جھنجھلاہٹ میں بدل گئے مگر اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ سونی نے دروازے کے سامنے ہی میز پر رکھے ہوئے فون کا ریسیور اٹھالیا تھا اور نمبر ملانے میں مصروف تھی۔

مکانی سے بات کرتے ہوئے بھی سونی نے اپنی آواز اور لہجے سے بہترین جذباتی صداکاری کا مظاہرہ کیا۔ "مکانی جی۔ میرا نام نسیم بانو ہے۔ نہیں جی۔ آپ مجھے کیسے جان سکتی ہیں لیکن جینم کو ضرور جانتی ہیں آپ۔ ہاں جی ویسی میں اس کی پھولی بہن ہوں۔ میں بڑی مصیبت میں پڑ گئی ہوں مکانی جی۔ کسی نے آج صبح میری بہن کو اغوا کر لیا ہے۔ پتا نہیں جی کون لوگ تھے۔ لال رنگ کی ایک گاڑی تھی۔ سوڈی کالو۔ اس میں ڈال کے لے گئے وہ میری بہن کو۔ نہیں جی اس کے پاس تو ایک پرانی سی سوڈی ایف ایس تھی۔ وہ آئی تھی شاید آپ کی گودھی پر۔ ملک رب نواز صاحب نے بلایا تھا۔ ہاں جی، نہیں جناب گاڑی کہاں لی۔ ملک رب نواز صاحب

نے گزارے کے لیے یہ گاڑی دے دی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ جب تک اپنی گاڑی نہ ملے اسے رکھو۔ ہاں جی، آپ کو معلوم ہے؟ وہی گاڑی لے کر میری بہن گئی تھی کسی پیٹرول پمپ پر۔ گاڑی سروس کرانے کے لیے دی گئی تھی کل رات۔ صبح اس نے کہا کہ میں گاڑی لے کر آتی ہوں ایک گھنٹے میں واپس۔ وہ دوسرا تک نہیں آئی تو مجھے بڑی پریشانی ہو گئی۔ میں نے ادھر ادھر پٹا کیا۔ ابھی شام کو پتا نہیں کس نے فون کیا مجھے اور کہا کہ بھول جاؤ اپنی بہن کو۔ ہم نے اس بے وقوف لڑکی کو سمجھایا تھا کہ اپنے کام سے کام رکھے۔ ہر ایک سے پکا لینے کی عادت تھی اسے۔ اس کی لاش بھی نہیں ملے گی کہیں۔ میں بہت روٹی چلائی لیکن اس نے فون بند کر دیا۔ میں بتاتی ہوں مکانی جی، پولیس کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ میری مدد صرف آپ کر سکتی ہیں۔ ہاں جی، پہلے میری عرض سن لیں۔ ناراض مت ہوں، میری بات پر۔ دراصل مجھے شک ہے کہ اسے ملک صاحب کے بندے لے گئے ہیں۔ آپ میری پوری گزارش سن لیں۔"

سونی نے اس کے بعد وہ سب کہہ دیا جو میں نے اسے سمجھایا تھا۔ اس نے مکانی سے کہا کہ پہلے تو وہ کوٹھی میں دیکھے کہ کیا وہ لال رنگ کی گاڑی موجود ہے۔ اگر ہے تو پتا کریں وہاں کیسے پہنچی پھر کوٹھی میں دیکھیں۔ آپ کو کیس بھی جانے سے کون روک سکتا ہے۔ جینم اگر کوٹھی میں ہی ہے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا۔"

آواز میں دکھ کا تاثر اور رقت پیدا کرتے ہوئے سونی کی آنکھیں بھی آنسو بہانے لگی تھیں۔ ولن ٹائپ نظر آنے والے گیٹ کبیر کے سینے میں ایک سوم کی طرح نرم پڑ جانے والا دل تھا۔ سونی کی یکطرفہ گفتگو سے بھی اس نے صورت حال کی سنگینی کا اندازہ کر لیا تھا اور مجھ سے زیادہ اواس ہو گیا تھا۔

سونی نے دس منٹ تک مسلسل روتے ہوئے بات کی تھی۔ اس نے ریسیور رکھا تو میں نے چونکہ ارغدا سے کہا "یار! تھوڑا سا پانی پی سکتا ہے؟"

"کیوں نہیں جناب! اس نے قریب ہی رکھے ہوئے فریج میں سے ایک ٹھنڈی بوتل نکالی اور گھاس بھر کے سونی کے سامنے کھڑا ہو گیا "ٹوٹی پانی پیو آپ اور حوصلہ کرو۔"

میں نے کہا "حوصلہ کیسے کرے بے چاری۔ ایک ہی تو بہن تھی اس کی۔"

سونی نے پانی پی کے کہا "وہ کہتی ہے کہ میں ابھی دیکھ کے بتاتی ہوں۔ تم آؤ مجھے بند پھر فون کرو۔"

میں نے اس کے ہاتھ پر چھبکی دی "دیکھو، روتے سے کچھ نہیں ہوتا۔ بس دعا کرو۔ اللہ نے چاہا تو تمہاری باجی واپس آجائے گی۔"

چونکہ ارغدا نے دوسرا گھاس بھر کے مجھے پیش کیا "دنیا بڑی غلام ہو چکی ہے۔ کسی کی عزت سڑک پر بھی محفوظ نہیں رہی۔ تو یہ کون ہے جی یہ ملک رب نواز آخر۔ آپ میرے کو بتاؤ؟ میں اپنے جیسے صاحب سے کہتا ہوں ان کے بڑے تعلقات ہیں پولیس میں۔"

میں نے کہا "کون جیسے۔ کرل غلام سرور جیسے؟" وہ بولا "مجھ کو۔ انہی کے رشتے دار ہیں۔"

میں نے اپنے تصور میں مکانی کو ملا زمین اور غلاموں کی فوج کے ساتھ اپنے ہی گھر کی تلاش لیتے دیکھا۔ وہ کوٹھی کے ہر کمرے پر خواب گاہ، ہر خیمہ اسٹور اور تھانے کے دروازے کھلوائی جا رہی تھی اور کسی خوں خوار آدم خورائیں ایچ او سے زیادہ رعب اور اختیار کے ساتھ پوچھ پچھ کر رہی تھی جو اپنے ہی علاقے کے غریب غرا کے بچے گھروں میں چادر اور چادر دیواری کے تقدس کو پاہل کرنے کے لیے کسی قانونی جواز یا وارنٹ کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

آدھا گھنٹہ گزارنے کے لیے میں نے چونکہ ارغدا کو اغوا کی اس واردات کی لرزہ خیز تفصیلات سے آگاہ کرنے کے لیے ایک ایسی کہانی سنائی جس میں سب کچھ فرضی تھا۔ سوائے ایک جینم کے نام کے۔

چونکہ ارغدا نے بالآخر وہ سوال کر لیا جس کا مجھے بہت دیر سے انتظار تھا۔ "آپ کو یہ سب کیسے معلوم ہوا جی؟"

میں نے کہا "وہاں کچھ لوگوں نے دیکھا تھا مگر گواہ بننے پر کوئی راضی نہیں۔"

"آپ کو پہلے پولیس کے پاس جانا چاہیے تھا" وہ بولا "آپ ادھر کیسے آ گئے؟"

میں نے اس سوال کا جواب سوچ رکھا تھا۔ "پتا چلا تھا کہ ملک رب نواز کا ادھر کوئی فارم ہے۔ اس کی بہن کو اغوا کر کے وہیں لے جایا گیا ہے۔"

"ملک رب نواز کا تو ادھر کوئی فارم نہیں" اس نے سوچتے ہوئے بتانا شروع کیا کہ یہاں کس کس کے فارم ہیں۔ میں نے کہا "ہاں ہمیں بھی دو گھنٹے ہو گئے بھٹکتے ہوئے۔"

وقت کی رفتار جیسے ختم سی گئی تھی۔ کئی بار میں نے گھڑی کی طرف نہ دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے دل ہی دل میں گھڑی کے موجود کو کو سا جس نے انتظار کی ساعتیں شمار کرنے

کارہ آگے آجیاد کر کے ساری انسانیت کو عذاب میں ڈال دیا۔ ہرگز مرتے لمحے کے ساتھ میرے اضطراب میں اضافہ ہوتا ایک فطری بات تھی۔ مجھے اچانک ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے آٹھ گھنٹے بعد میری ہڈی کا کوئی انتہائی اہم فیصلہ سنایا جائے والا ہے جس پر میرے مستقبل اور میری زندگی یا موت کا انحصار ہے۔

لیکن معلوم نہیں کیوں اب میرے انتظار کی بے چینی میں یہ خوف شامل نہیں رہا تھا کہ خدا غواست مجھے جہنم کے بارے میں کوئی جان لیوا خبر مل سکتی ہے۔ اسے ملک رب نواز کوئی ناقابل حتمی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ وہ جہنم کو ازست دے کر ہلاک کر سکتا ہے یا قتل کر کے اس کی لاش بھی عائب کر سکتا ہے یا اس کے ساتھ وہی انسانیت سوز سلوک کر سکتا ہے جو اس کے آباؤ اجداد اپنے غلاموں کی بھونٹوں کے ساتھ دوارکتے آئے تھے۔

میرے احساس میں دو نما ہونے والی یہ تبدیلی شاید نامیدی اور پست بھی کے خلاف ایک لاشعوری مزاحمت تھی۔ میں نے ذہن کے دروازوں پر دستک دینے والے تمام شاک خیالوں کے لیے اپنے کان بند کر لیے تھے سوچ کو پابند کر دیا تھا اور تصور کے لی دی کو آف کر دیا تھا۔ جیسے جوان بیٹا لوٹ کے گھر نہ آئے تو جاگ کر رات آنکھوں میں کاٹ دینے والے ماں باپ خود اپنے آپ کو انکار سے تسلی دینے میں ہی عافیت سمجھتے ہیں کہ اس کو کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہ کسی خانے اپتال یا مردہ خانے میں نہیں ہو سکتا۔ وہ کسی دوست کے ساتھ ہو گا یا کسی ضروری کام میں پھنس گیا ہو گا۔

مجھے ایک یقین کا کھوکھلا سہارا بھی حاصل تھا کہ ملک رب نواز کتنا بھی کینہ، منتقم المزاج اور بے ضمیر کیوں نہ ہو۔ وہ بے وقوف بہر حال نہیں ہے۔ وہ اس بات کو سمجھتا ہے کہ شر اس کی جاگیر نہیں ہے اور سب شر اس کی رعایا نہیں ہیں جو اس کے حکم کو قانون مانیں اور کسی ظلم کے خلاف سراٹھا کے بات نہ کریں۔ جہنم اس شر کی کوئی عام لادارت لڑکی نہیں ہے۔ ملک رب نواز کے پاس اپنا نفع نقصان سمجھنے کی عقل ہے۔ وہ اپنے بیروں پر خود گھماڑی کیسے مار سکتا ہے وہ جہنم کو صرف اپنی لاقانونیت کی طاقت سے مرعوب اور دبشت زدہ کرنا چاہتا ہے۔ ایسا وہ ایک بار پہلے بھی کر چکا ہے اس نے جہنم کو اغوا کر کے پروفیسر باقم رضا کی کوٹھی میں چھوڑ دیا تھا۔ جہاں سے ہم اسے کسی دشواری کے بغیر صحیح سلامت نکال لائے تھے۔

اب سورج غروب ہونے کو تھا لیکن فارم ہاؤس کے اس

کمرے میں چوکیدار نے ایک ایک کر کے ساری وال ٹائٹس روشن کر دی تھیں۔ کمرہ بھی اچھا خاصا بڑا ہال تھا۔ اس کی آرائش بالکل غیر روایتی انداز میں کی گئی تھی۔ ہال کے دروازے کے قریب ٹیلی فون کی میز اور دو کرسیوں کے سوا یہاں فرنیچر بالکل نہیں تھا۔ سولہ فٹ کے قریب چوڑے اور چوبیس فٹ لمبے ہال کے فرش پر وال ٹو وال کارپٹ تھا اور اس پر مختلف رنگ کے غلافوں والے چھ سات گاؤں کیے کچھ بڑے تھے۔ دیوار کے ساتھ ساتھ فرش نشست کے لیے کچن موجود تھے۔ تین دیواروں میں شفاف شیشوں والی بڑی بڑی کھڑکیاں تھیں جن سے باہر کا منظر صاف نظر آتا ہو گا۔ ابھی ان پر جھار کے ڈیزائن والے رنگی پردے پھیلے ہوئے تھے۔

آخری دیوار کے ساتھ دو بند دروازے نظر آ رہے تھے۔ شاید ان میں سے ایک ایک باٹھ دو م کا دروازہ ہو گا اور دوسرا کسی ایسی خواب گاہ کا جہاں سکون اور خلوت کے متلاشی دھل اندازی کے خوف سے بے نیاز ہو کے رات گزار سکتے ہوں۔ دونوں دروازوں کے درمیانی حصے میں ایک خاصا بڑا اہل ذور فرج رکھا ہوا تھا اور دیوار میں نصب اسٹینڈ پر لی دی رکھا ہوا تھا۔ شاید پچھلی طرف کبھی کچھ ہو گا اور باغ کے رخ بنا ہوا پر آئینہ اس میں چند کرسیاں بڑی ہوں گی۔ سامنے ایک وسیع سرسبز لان ہو گا۔ پھلوں کے درخت اور ایک سو ٹینک پول۔ عام طور پر ان پرائیویٹ فارم ہاؤسوں میں یہی سب کچھ ہوتا تھا۔

سونی نے جیکبس منٹ بعد ہی ریموور اٹھالیا "پوچھوں ملکائی سے؟"

میں نے کہا "پانچ منٹ ہیں ابھی۔ خیرات کو تم۔" سونی نے تیرہ لاکھ کے کڑیل دبا دیا "بیچ چل رہا ہے۔" فون کے کیبل کو دیکھ کے میں نے چوکیدار سے پوچھا "اس فون کی اندر بھی کوئی ایکس مینشن ہے۔ اگر میں بھی فون پر ہونے والی گفتگو سننا چاہوں۔؟"

اس نے دروازے کی طرف اشارہ کیا "آپ اندر چلے جاؤ۔"

اندروالا کمرہ کچھ چھوٹا تھا اور اس میں ایک ڈبل بیڈ اضافی تھا ورنہ پردے اور قالین کا ڈیزائن بھی دونوں کمروں میں ایک ہی تھا۔ بیڈ سائڈ ٹیبل پر ایک طرف ٹائٹ لپ رکھا ہوا تھا اور دوسری طرف فون۔ جس نے ریموور اٹھا کے سناتو مجھے ملکائی کے فون کی گفتگو سنائی دی۔ تیسری یا چوتھی تیل پر کسی نے کہا "ملک ہاؤس!"

سونی نے کہا "مجھے چھوٹی ملکائی سے بات کرنی ہے، میرا نام حیم بانو ہے۔"

ایک منٹ کے خاموش وقفے کے بعد ملکائی نے کہا "ہیلو۔ ہاں حیم، ابھی میں نے کوٹھی میں دیکھ لیا۔"

سونی نے پوچھا "میری بہن وہاں نہیں ہے؟"

وہ بولی "نہیں لیکن وہ لال گاڑی ہے اور جہنم کی اپنی گاڑی بھی کھڑی ہے۔"

"کیا؟ وہ جو چوری ہو گئی تھی کیا وہ گاڑی مل گئی ہے؟"

ملکائی نے کہا "ہاں۔ وہ کل شام تھانے سے آگئی تھی۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ ملک صاحب نے تمہاری بہن کو یہ بات بتادی تھی۔ کیا تم اس کے ساتھ رہتی ہو؟"

سونی نے بڑی ہوشیاری سے کہا "وہ ایک ہفتے سے میرے گھر میں تھی۔ رہنے کے لیے آگئی تھی۔ میں نے بتایا تھا کہ وہ مدد پوٹھی کی زندگی گزار رہی تھی۔ اخبار کے دفتر جانا بھی چھوڑ رکھا تھا اس نے۔ ایک مہینے میں تین بار اپنا ٹھکانا تبدیل کیا تھا۔"

"تمہارے پاس آنے سے پہلے وہ کہاں تھی؟"

"کسی سہیلی کے گھر میں تھی۔ وہ بھی کوئی مکانی میاں پوری ہیں، نام نہیں معلوم تھے۔"

ملکائی کوئی جاہل عورت نہیں تھی کہ کوئی کچھ بھی کہے وہ سننے اور یقین کر لے۔ اس کے شوہر پر ایک سنگین مجرمانہ الزام عائد کیا گیا تھا اور اس سلسلے میں کوئی عملی قدم اٹھانے یا ملک رب نواز سے بات کرنے سے پہلے وہ الزام عائد کرنے والے کے متعلق بھی جاننا چاہتی تھی۔ "کیا وہ اکثر آتی تھی تمہارے پاس؟"

"لگنے آتی تھی۔ رہنے کبھی نہیں آئی تھی" سونی نے کہا۔

"تم خود کہاں رہتی ہو؟"

"منٹ گھر میں" سونی نے اسے مکان نمبر اور گلی نمبر بھی بتا دیا۔

"کیلی۔ میرا مطلب ہے والدین کے گھر میں یا شوہر کے ساتھ۔"

سونی نے کہا "جی اپنے شوہر کے ساتھ۔ ان کو اکثر باہر جانا پڑتا ہے۔ وہ سبکزمین ہیں ایک دو سازدارے میں۔"

"دیکھو حیم، تمہاری بات نے مجھے بڑی تشویش اور پریشانی میں مبتلا کر دیا ہے۔ ابھی تک میں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا لیکن اپنی کوٹھی میں ہر جگہ دیکھ لیا ہے۔ ایک ملازم نے مجھے بتایا کہ لال گاڑی بارہ بجے کے بعد آئی تھی اور اسے لے

کر آیا تھا ملک صاحب کا ڈرائیور۔"

"آپ نے اس سے پوچھا؟"

"اس وقت وہ ملک صاحب کے ساتھ ہے۔ انہیں لے کر آفس گیا ہے۔ وہاں میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔ آئے گا تو پوچھ لوں گی مگر کچھ۔ تم نے صرف شک کی بنیاد پر مجھے فون کیا تھا۔ خود تمہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ جہنم کے اور ملک صاحب کے درمیان ایسی کیا بات تھی کہ وہ ملک صاحب سے اتنی خوف زدہ تھی۔ ممکن ہے یہ وہم ہو اس کا یا کسی نے ملک صاحب کو بدنام کرنے کے لیے جہنم سے غلط بیانی کی ہو۔ میں یہ نہیں سمجھتی کہ ملک صاحب کوئی فرشتہ ہیں لیکن ہمارے دشمن بہت ہیں۔ یہ ہوتا ہے سیاست میں اور ان جاگیرداروں کے طبقے کی خاندانی عداوتوں میں کاروبار میں۔"

سونی نے کہا "جی ملکائی صاحبہ!"

ملکائی نے اپنی بات جاری رکھی "میرا مشورہ ہے کہ تم اب بلا تاخیر جلی جاؤ پولیس کے پاس رپورٹ کھوانے کوئی مسئلہ ہو تو بتانا مجھے۔ ویسے تمہاری بہن بہت مشہور صحافی ہے۔ ہم سے زیادہ اثر رسوخ والے دوست اور ساتھی ہوں گے اس کے۔"

"آپ نے اچھی طرح قلمی کر لی ہے اپنی؟"

"بہن! یہی باتیں کرتی ہو تم۔ تمہاری بہن کوئی انگوٹھی تو ہے نہیں کہ چرانے والے نے دنیا میں بند کر کے دنیا کسی صندوق یا الماری میں رکھ دی ہو۔ ویسے تو الماریوں میں بھی جھانک کے دیکھا تھا میں نے۔ میں بتاؤں گی ملک صاحب کو تمہارے بارے میں اور پوچھوں گی ان کے ڈرائیور سے بھی۔ مجھے اپنا فون نمبر بتاؤ۔"

سونی نے کہا "ہیلو۔ ملکائی صاحبہ، ہیلو!"

ملکائی نے کہا "ہیلو۔ میں نے فون نمبر پوچھا تھا تمہارا۔"

سونی نے چلا کے کہا "ہیلو۔ مجھے آواز نہیں آرہی ہے آپ کی۔"

ملکائی نے کہا "ہاں کیا بتانا تھا تم نے۔ ہیلو۔"

سونی نے ریموور رکھ دیا۔ میں نے اس کی ہوشیاری کو دل ہی دل میں سراہا۔ ملکائی نے ایک بات کی تصدیق کر دی تھی کہ سونی کو کچھ میں کہیں نہیں ہے۔ بالی باتیں غیر اہم اور غیر ضروری تھیں۔ ملکائی اب موقع مل دیکھ کے اپنے شوہر سے بات کرے گی اور جب ملک رب نواز اسے بتائے گا کہ جہنم کا تو دنیا میں آگے پیچھے کوئی بھی نہیں ہے۔ یہ حیم بانو کہاں سے بہن بن کے آگئی۔ جہنم کی پرورش کی ہے ایک اخبار کے ایڈیٹر اور مالک ایویر آزاد نے چاہو تو اس سے

پوچھ لو۔ ظاہر ہے اس کے بعد خود لکائی کے لیے فون پر ہونے والی ساری گفتگو بے معنی ہو جائے گی۔ وہ عورت جھوٹی تھی جس نے کسی کے کہنے پر ایک پومس کال کی۔ ایک نٹل ضرور پاتی رہے گی لکائی کے دل میں کہ وہ عورت جھوٹ پول رہی تھی تو کیا اس کا رونا دھونا بھی ذرا تھا؟ اتنی اچھی ایکٹریس تھی کہ سیم بانو۔ فون نمبر ایس لیے نہیں بتایا تھا اس نے بڑی چالاکي سے لائن کاٹ دی تھی لیکن اس نے سنت مگر کچا بتایا تھا۔ وہاں سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔

ملک رب نواز اپنی ذہانت اور عیاری سے کام لیتے ہوئے بیوی کے سامنے بالکل معصوم بن جائے گا۔ سیم بانو کو فراڈ ثابت کرنے کے لیے وہ اس کی بات آزاد صاحب سے خود کرائے گا اور پھر بیوی سے ہتھ پٹے سب پوچھ لے گا۔ اچھا اور کیا کہا اس سیم بانو نے؟ مجھے ذرا تفصیل سے بتاؤ اور تم نے اس کے کہنے میں آگے کو بھی کو کھنکھال ڈالا؟ شکر ہے کسی ملازم سے کچھ کہا نہیں تم نے۔ اب معلوم نہیں یہ عورت کون تھی۔ کسی نے صرف شرارت کی تھی یا کسی دشمن کا مقصد میرے اور تمہارے درمیان بدگمانی پیدا کرنا تھا۔ تم آئندہ کے لیے محتاط ہو جاؤ۔ میرے اور خلیفہ کے درمیان ایسی کوئی بھی بات نہیں۔ نہ کوئی اختلاف ہے نہ جھگڑا پھر وہ یہ بات کیسے کہہ سکتی ہے کہ اس کو مجھ سے کوئی خطرہ محسوس ہوتا ہے۔ بے شک کچھ صفاتی ہم جیسے لوگوں کی نئی زندگی میں جھانک کے کچھ ایسی باتیں معلوم کر لیتے ہیں جن سے ہمیں ہلک میل کیا جاسکے اور ایسے لوگ ہم سے ڈرتے بھی ہیں مگر خلیفہ ایسی صفاتی نہیں ہے۔ میرا بھی دماغ خراب نہیں ہے کہ اسے انکار کر کے سارے پولیس کو اپنا دشمن بنالوں جبکہ خلیفہ سے مجھے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا اور اس کو انکار کرنے میں میرا کوئی فائدہ نہیں۔ نقصان ہی نقصان ہے۔

جب چوکیدار نے کمرے کو لاک کیا تو مجھے پیشورل پپ کے ملازم لڑکے کا خیال آیا۔ میں اسے برآمدے میں بٹھا کے مطمئن ہو گیا تھا کہ وہ میری نظر کے سامنے سے غائب ہو کے کہیں بھی نہیں جاسکتا لیکن اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا تھا۔ جب میں دوسرے کمرے میں فون پر سوئی کی اور لکائی کی گفتگو سن رہا تھا تو وہ خاموشی سے نکل گیا۔ ہمارے سامنے وہ اتنا مسکین، مظلوم اور خوف زدہ نظر آتا تھا کہ غیر شعوری طور پر ہم اس کی طرف سے مطمئن ہو گئے تھے۔

میں نے اور سوئی نے ایک ساتھ اس کی عدم موجودگی کو محسوس کیا۔ میں نے پہلے کہا ”وہ کدھر گیا؟“

سوئی نے کہا ”وہ لڑکا۔ ہمارا ملازم؟“

”میں نے دیکھا تھا اسے گیٹ کے پاس۔ دیکھ لیں شاید باہر ہو۔ گاڑی میں بیٹھ گیا ہو۔“ چوکیدار بولا۔

لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ بھاگ گیا ہے۔ دس پندرہ منٹ میں وہ نہ جانے کس طرف نکل گیا ہو گا۔ ہماری قید سے اٹھاتے ہوئے کہیں بھی چھپ کر ہمارے جانے کا انتظار کر سکتا تھا اور پھر اطمینان سے مخالف سمت میں روانہ ہو سکتا تھا۔ ہمارے پاس فرصت کہاں تھی کہ ہم اسے تلاش کرتے اور یہ بات وہ لڑکا بھی سمجھتا تھا۔

چوکیدار کی نظر میں ہم بھی مشکوک ہو گئے تھے۔ ایسی بہت سی باتیں تھیں جن پر غور کرنے کا خیال اسے بعد میں آیا ہو گا۔ سوئی جب اس سے ایک فون کی اجازت مانگنے لگی تھی تو اکیلی تھی۔ میں سوئی کے ساتھ گاڑی میں بھی نہیں تھا۔ مزید یہ کہ سوئی کے لیول پر بڑی شوخ مسکراہٹ تھی۔ جس عورت کی بہن انوار کی مٹی ہو وہ ایسے مسکرا سکتی ہے؟ پھر وہ لڑکا جسے ہم نے اپنا ملازم قرار دیا تھا، فرار کیوں ہو گیا۔ نوکر کو قیدی نہیں ہوتے۔ اگر وہ جانا چاہیں تو انہیں کون روک سکتا ہے۔ باہر ایک کے بجائے دو گاڑیاں دیکھ کے چوکیدار کا شک نہیں میں بدل گیا ہو گا کہ معاملہ کچھ اور ہے۔ میں بھی شاید اس لڑکی کا شہر نہیں تھا ورنہ الگ گاڑی میں اور بعد میں کیوں آتا؟

مجھے اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ چوکیدار کیا سمجھتا ہے۔ پیشورل پپ کے ملازم لڑکے کے فرار ہو جانے سے بھی میں پریشان نہیں تھا۔ اس سے میرے لیے کسی قسم کے مسائل پیدا نہیں ہو سکتے تھے۔ ہمیں جو کچھ پوچھنا تھا، وہ ہم پوچھ چکے تھے۔ ہمارا اسے کوئی سزا دینے یا پولیس کے حوالے کرنے کا ارادہ بھی نہیں تھا۔ اسے گھر جانے کی اجازت دینے سے پہلے میں اس نادان اور نا سمجھ لڑکے کو یہ ضرور سمجھا دیتا کہ اپنے بارے میں کیا کہا اس کے حق میں ہتر ہو گا۔ اب وہ سچ بولے گا اور مشکل میں پڑ جائے گا۔

اپنی گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے سوئی نے پھر مسکرا کے چوکیدار کا شکریہ ادا کرنا کافی سمجھا کہ چوکیدار کی شک بھری نظروں کو دیکھتے ہوئے میں نے اپنی جب میں سے ایک ہزار روپے نکالے ”دیکھو چوکیدار۔ تم نے ہماری مدد کی۔ ہم پر احسان کیا۔ ہم اس کا قرض رکھنا نہیں چاہتے۔“

وہ ہزار کے نوٹوں کو دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ ”قرض کوئی نہیں جناب!“

میں نے ہزار اسے زبردستی تھما دیے۔ وہ بھی ایسا ہی

چاہتا تھا ”کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو آسانی سے سمجھ میں نہیں آتیں۔ آدمی جتنا سوچے اتنا ہی الجھن میں پڑنا جاتا ہے پھر کیا ضرورت ہے دماغ کو بلاوجہ تھکانے کی۔“

اس نے ایک ہزار روپے جیب میں رکھ لیے ”ج کما آپ نے۔“

”سچ تو یہ بھی ہے کہ آج یہاں نہ کوئی آیا نہ کسی نے یہاں سے کوئی فون کیا۔“

وہ مسکرائے گا ”میں تو شام کو چلا گیا تھا سرور اور بخار کی دوا لی تھیں۔ لوٹ کے آیا رات کو عشا کی اذان کے بعد کھانا کھا کے۔“

سوئی نے کہا ”یہ بیکور تم چلاؤ۔ بہت بھاری ہے۔“

میں نے اسے آٹو کی چابی دی ”مگر اس میں تو پاور اسٹیرنگ ہے۔“

میں نے گاڑی کو لیولز دے کر موڑا اور عقب نما آئینے میں سوئی کی گاڑی کو پیچھے آتے دیکھا۔ رات کے وقت اندھیری سڑک کے موڑ مجھے کشمکش زد کر رہے تھے۔ میں نے ہاتھ باہر نکال کے سوئی کو آگے چلنے کا اشارہ دیا۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس نے دعویٰ کیا تھا کہ جس راستے پر وہ ایک بار گزر جائے وہ کبھی نہیں بھولتی۔

سوئی اس آزمائش میں پوری اتاری۔ اس نے خاصی تیز رفتاری اور پورے اعتماد کے ساتھ ہر موڑ کاٹا۔ کوئی موڑ آنے سے پہلے ہی وہ انداز کیلٹر سے مجھے بتاتی رہی کہ آگے دائیں طرف جانا ہے یا بائیں طرف۔ شاید یہ سب میرے لیے اتنا آسان نہ ہو کہ رات کے وقت بہت سی نشانیاں او بھل ہو گئی تھیں جو دن کے اجالے میں مددگار تھیں۔

چند منٹ میں ہم رئیس کے سامنے کھڑے تھے جو ایک گھٹام اور سنسان مقام پر گھب اندھیرے میں انتظار کی گھڑیاں اکیلے کانٹے پر مجبور تھا۔ اس کی تحویل میں دو قیدی تھے جو اسے ذرا بھی غافل بناتے تو اپنی جگہ لٹا کے بہت خوش ہوتے چنانچہ وہ پوری طرح جکس تھا۔

وہ ہم پر تھا ہونے لگا۔ ”کہاں نکل گئے تھے تم دونوں آخر۔“ ریٹائی میں مجھے سختی دیر سے ہول اٹھ رہے ہیں قسم اللہ کی۔ کچھ اندازہ ہے۔“

میں نے گھڑی دیکھ کے بتایا ”بالکل صحیح اندازہ ہے۔ ایک گھنٹا دس منٹ سے حکمران وقت تو لگتا ہے لاہور آنے جانے میں۔“

وہ چلایا ”لاہور۔ تم لاہور کیوں گئے تھے کیوں؟“

میں نے کہا ”بس ایسے ہی۔ یہ سوئی کہنے لگی کہ چائے کی

طلب ہو رہی ہے۔ میں نے بھی سوچا کہ ایک کپ کافی پی لوں گا۔“

سوئی کی ہنسی نے رئیس کو کچھ ٹھنڈا کر دیا ”بے وقوف بنانے کے لیے ہم ہی تو رہ گئے ہیں پیارے۔ اب مذاق چھوڑو۔“

میں نے کہا ”خلیفہ نہیں ہے ملک رب نواز کے گھر میں۔ لکائی نے بتایا سوئی کو۔“

”کیا لکائی کی بات پر یقین کیا جاسکتا ہے؟“ وہ بولا۔

”ہاں۔ اسے کوئی ضرورت نہیں تھی جھوٹ بولنے کی۔ اس نے کو بھی میں اچھی طرح دیکھا اور پھر یہ مشورہ دیا کہ ہمیں پولیس کے پاس جانا چاہیے۔ جو ذرا بیوروہ لال گاڑی واپس لے گیا تھا وہ ملک رب نواز کا شو فر ہے اور اسی کے ساتھ تھا۔ لکائی نے کہا کہ وہ واپسی پر اس سے معلوم کرے گی۔ سوئی نے کہا۔“

اچانک رئیس کو کچھ یاد آیا ”اب وہ بھی تو تھا تمہارے ساتھ۔“

میں سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ پیشورل پپ کے ملازم لڑکے کی طرف ہے ”ہاں یار عمر وہ بھاگ گیا۔“

”بھاگ گیا۔ کیسے؟“

میں نے کہا ”ہم ذرا سی دیر کے لیے اس کی طرف سے غافل ہوئے تھے کہ وہ نکل گیا۔“

سوئی نے کہا ”میں ایک کمرے میں فون پر لکائی سے بات کر رہی تھی۔ تاہم اسے اسے سامنے ہی برآمدے میں بٹھا دیا تھا اور بالکل آرام سے بیٹھا ہوا تھا وہ پھر یہ اندر والے کمرے میں دوسرے فون پر ہماری گفتگو سننے لگے اور اسے موقع مل گیا۔ میری نظر جو کج گئی ذرا سی دیر کے لیے اور وہ پانچ نہیں کیسے غائب ہو گیا۔ میں نے پھر دیکھا تو وہ نہیں تھا۔“

”بالکل کالج۔ بھاگ کے کہاں جائے گا آخر۔“ رئیس بولا ”کل پھر وہ ہو گا۔“

میں نے کہا ”یہاں سے لاہور پہنچنے کے لیے بھی اسے کافی چٹا پڑے گا۔“

سوئی نے کہا ”اسے سب معلوم ہے۔ وہ کوئی پریشانی کھڑی نہ کرے ہمارے لیے۔“

میں نے کہا ”پریشانی اس نے خود اپنے لیے پیدا کر لی ہے۔ صرف ایک ہزار لے کر مجھے اس کی سلامتی میری جینی نظر آتی ہے۔“

”پھر اب کیا کرنا چاہیے۔“ رئیس نے کہا ”یہ دونوں لاتوں کے بھوت لگتے ہیں مجھے۔ شرافت سے کچھ بتانے پر

راضی نہیں۔

ڈرائیور سراج دین اور اس کا کلینر ہوش میں آنے کے بعد ایک مٹھکے خیز انداز میں دیوار کی طرف منہ کیے ساتھ ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ شہر میں اسپتالوں اور گرگرو اسکول کی دیوار پر جہاں لکھا ہوتا ہے ”دیکھو کتنے کاچے پیشاب کر رہا ہے“ لوگ اسی پوز میں مصروف کار نظر آتے ہیں۔

میں نے کہا ”رہیں۔ ہم مرنے والے ہیں جاکے دیکھیں گے۔“

رہیں نے دیوار والے ہاتھ کو نیچے جھٹک کے دوران خون کو بحال کیا ”پیارے“ یہ بات اپنی سمجھ میں نہیں آتی۔

میں نے کہا ”مگر میزائل گواہی دیتا ہے۔“

رہیں ہنسا ”اے مکلفے مت بول۔ دل تو پاگل ہے۔“

تیرا بھی اور میرا بھی۔

”نہیں رہیں۔ کچھ ایسی باتیں ہوتی ہیں جن میں عقل واقعی کام نہیں کرتی مگر دل اپنی ضد پر قائم رہتا ہے۔ کیا یہ سب تیری سمجھ میں آتا ہے۔ یہ اتفاقات کا سلسلہ۔ کسی دست خف کی راہنمائی نہ ہی ہمیں یہاں اکٹھا کر دیا ہے آخر میں ایک غلط راستے پر کیوں چلا گیا اور ادھر آنے سے پہلے پیٹرول ڈلوانا مجھے کیوں یاد نہیں رہا۔ ادھر ادھر جھٹکتے ہوئے میری گاڑی میں پیٹرول کا آخری قطرہ میں اسی مرنے والے کے گیت پر پہنچ کے کیوں ختم ہوا۔ ایسا نہ ہوتا تو میں مرنے والے کے گیت پر ایک سرسری نظر ڈال کے سیدھا گزر جاتا۔ پیٹرول ایک دو گلو میٹر پہلے ختم ہوتا تب بھی یہی ہوتا۔ مجھے اس ٹرک پر سوار ہونے کا موقع ہی نہ ملا اور وہ سب کیسے معلوم ہوتا جو مجھے سراج دین نے بتایا تھا۔“

”چل ٹھیک ہے۔ ہم مرنے والے ہیں جاکے بھی دیکھ لیتے ہیں۔“ رہیں بولا ”لیکن تو نے بتایا تھا کہ ایک قلعے جیسے حفاظتی انتظامات ہیں وہاں۔“

میں نے کہا ”ہم سیدھے اندر جائیں گے کسی رکاوٹ کے بغیر۔“

سونی نے مجھے حیرانی سے دیکھا ”وہ کیسے؟“

میں نے ڈرائیور اور کلینر کی طرف دیکھا۔ ”جیسے یہ جاتے ہیں۔ گیت کبیر خود ٹرک کے لیے گیت کھول کے راستے دے گا۔ سراج کی جگہ میں بیٹھوں گا۔ رات کے وقت کہیں میں اندھیرا ہوتا ہے۔ گیت کبیر اتنے غور سے شکل دیکھے گا بھی نہیں۔ کلینر کی جگہ ہو گا رہیں۔ مرنے کے بیچوں کے اوپر۔“

”اور میرے ہاتھ میں ہو گا ساٹھ سو والا دیوالہ۔ اس سالے گیت کبیر نے ڈرائیور کی تو اوپر سے سوراخ کھدوں گا کھوپڑی میں۔“

”ناگال ہو تم لوگ۔ سب مارے جاؤ گے۔“ ڈرائیور نے پلٹ کے کہا ”اندھرا پہنچ گئے تو تمہاری لاشیں ہی باہر آئیں گی۔“

رہیں نے کہا ”کیوں“ مرنے والے کی حدود میں کافی جگہ ہے ہمیں دفنانے کے لیے۔ جہاں تمہیں بھی گاڑا جاسکا ہے۔“

سونی نے کہا۔ ”بھی میرا کیا ہو گا۔ میں کیا باہر رہوں گی اکیلی اس ورانے میں؟“

”تم جنگل میں کیسے رہتی تھیں ڈاکوؤں کے ساتھ۔“ رہیں بولا۔

”یہ بت پرانی بات ہے۔ دیے بھی مجھے اکیلا نہیں چھوڑتے تھے وہ۔ ساتھ نہیں لے جاتے تھے تو کسی کو میری حفاظت پر مامور کر جاتے تھے۔“

میں نے اسے تسلی دی ”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ٹرک میں بہت جگہ ہے سب کے لیے۔“

ایکشن بیان میرے ذہن میں بہت واضح تھا اور اس میں کوئی پیچیدگی نہیں تھی۔ ڈرائیور سراج دین اور اس کے کلینر نے واقعی سی مزاحمت کے بعد ہتھیار ڈال دیے ٹرک ڈرائیور کی غامض زمین کی وردی زیادہ پرانی نہیں تھی مگر میلی وردی تھی۔ اس نے ٹرک کی آڑ میں رہتے ہوئے وردی اتار کے میرے حوالے کی۔ وردی کی پتلون کمر سے دوڑھکی تھی۔ اس کی لمبائی مجھے کم رہی لیکن مجھے یہ پتلون پن کے ٹرک ڈرائیور کی جگہ بیٹھنا تھا۔ کسی پارٹی میں نہیں جانا تھا۔ ڈرائیور کی آدمی آستین اور دو جیبوں والی شرٹ مجھے فٹ آئی۔ میں نے ٹوپی سر پر جما کے اس سے پوچھا ”تم نہاتے نہیں ہو؟ یا ایک سینے سے دھوا نہیں ہے وردی کو۔ اتنی بو آ رہی ہے اس میں سے۔“

اس نے ناگواری سے کہا ”تم نے تو وردی چڑھال۔ اب مجھے بھی اپنے کپڑے دے دو۔“

میں نے کہا ”کیا تمہارے درمیان ایسا کوئی معاہدہ ہوا تھا؟ اور تم نے میرے کپڑے پن لے تو ایک جذباتی مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔ عورتیں دوپٹہ بدل کے بس بن جاتی ہیں۔ کہیں ہم پتلون بدل بھائی نہ ہو جائیں۔“

”مجھے سڑی لگ رہی ہے“ وہ بولا۔

”اس کا مطلب ہے شرم نہیں آ رہی ہے۔“

ٹرک کے دوسری طرف سے کلینر چلانے لگا ”یہ تو بڑی غلط بات ہے جی۔“

رہیں نے کہا ”اے غلط بات کے گھوڑے۔ صبح کیا ہے یہاں۔ تیری تو پیدائش ہی غلط تھی۔“

سونی اس کارروائی سے لاقطع کچھ دور شعلی رہی۔ جب میں نے ایک رہی سے استاد شاگرد کو ایک ساتھ باندھنے کی کوشش کی تو اس نے سخت احتجاج کیا۔

”یہ کوئی شرافت نہیں ہے۔ ہم اتنا تعاون کر رہے ہیں۔“

میں نے کہا ”تعاون تو تمہارا باب بھی کرنا۔ رہی شرافت کی بات تو ہم کیا صورت سے شریف نظر آتے ہیں۔“

”اگر ایسا ہے تو بہت افسوس کی بات ہے ہمارے لیے آج کل صرف ہنڈل اور بے وقوف ہی شریف کہلاتے ہیں۔“ رہیں بولا۔

”کیا تم یہ چاہو گے کہ میں تمہارے اسپیکر بند کر دوں؟ اور غصہ مت دلاؤ مجھے۔ غصے میں ہاتھ مارنا تو پھر اللہ ہی اٹھائے گا تمہیں۔“ میں نے ان کو مخالف سمتوں میں منہ کر کے اور کمرے سے کمرے کے کھڑا کر دیا۔ اندھیرا ہونے کے باوجود میں ان کے چہروں پر عداوت اور نفرت کے جذبات کی تحریر بڑھ سکتا تھا اور ان کی آنکھوں کی شعلہ فشاں کو محسوس کر سکتا تھا۔ وہ اچانک اور غیر متوقع طور پر ٹکست کھائے تھے انہیں اپنے دفاع کا موقع ہی نہیں ملا تھا ورنہ ان کے پاس اپنی حفاظت کے لیے بہترین خود کار دیوالہ بھی تھا۔ یہ اسلحہ انہوں نے اپنے کپڑوں میں ایسے چھپا رکھا تھا کہ اس کی موجودگی محسوس بھی نہیں ہوتی تھی۔ وہ اسی اسلحہ کی طاقت پر بھروسہ کر کے کسی مددگار لمحے کے انتظار میں تھے جب وہ پلک جھپکتے میں بازی پلٹ دیں اور ہماری لاشوں کو حرارت سے ٹھوک مار کے نکل جائیں۔ کسی نے جاہ تلاشی میں یہ اسلحہ برآمد نہیں کیا تھا چنانچہ وہ بہت پر امید تھے۔

ہم نے ان کے کپڑے ہی اتروا لیے تو ان کی امیدوں پر اوس پڑھائی۔ غیر ملکی ساخت کے سنے اور قابل اعتماد دیوالہ اب ہمارے قبضے میں تھے۔ پہلے سونی نے انہیں گاڑی کے گھوکپار ٹنٹ میں ڈال دیا تھا پھر وہ انہیں دونوں ہاتھوں میں اٹھا کے کھڑی ہو گئی۔ ”میرا دل چاہتا ہے کہ اپنا نشانہ آزمائوں“ ان دونوں پر۔

رہیں نے کہا ”مارے جائیں گے میں اور ناصر بے گناہ۔“

وہ ہنسی ”تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں دائیں ہاتھ

سے بھی تمہارے سر پر رکھے ہوئے سیب کو اڑا سکتی ہوں اور بائیں ہاتھ سے بھی۔“

”کوئی چلائے بغیر بھی تم قتل کر سکتی ہو مجھے بلکہ کر سکتی ہو۔“

”ماننے کیوں نہیں کہ ڈرتے ہو۔“ وہ بولی ”بھوسا نہیں ہے تمہیں میرے نشانے پر۔“

رہیں نے کہا ”بھروسے میں خواہ مخواہ بار بار اس میں نہیں لی بی، مجھے تو صاف ہی رکھو۔ ابھی تک میں نے خود کشی کے بارے میں نہیں سوچا۔“

میں نے کہا ”یار“ میرے سامنے تو جھوٹ مت بول۔ وہ تو قسمت اچھی تھی تیری کہ شادی نہیں ہوئی۔ سوچا تو پتا نہیں کتنی بار تو نے اچھا“ اب فالو باتیں بند۔“

ڈرائیور اور کلینر کے مشترکہ ہنڈل کو ٹرک میں ڈالنے کے لیے میں نے مرنے والے کے جگرے ہٹا کے جگہ بنائی۔ انہیں خالی جگہ میں فٹ کرنے سے پہلے میں نے ان کے منہ بھی کپڑا ٹھوس کے بند کر دیے۔ بیچوں کے درمیان وہ دل بھی نہیں دیکھتے تھے مگر ان کے لیے سانس لینے میں کوئی دشواری نہیں تھی۔

”اب تو چڑھ جا اور پھر میں سونی کو چڑھاتا ہوں۔“

”تھیک ہے۔ مجھے کسی کی مدد نہیں چاہیے؟“ سونی ٹرک کی سائڈ سے کھانچوں میں قدم جتاتی ہاتھوں کے بل خود کو اوپر کھینچتی چند سینکڑوں میٹر اونچے پہنچ گئی۔

”ہے نا بندر کی بیٹی!“ رہیں میری طرف دیکھ کے بولا۔ اور پھر اوپر چڑھنے لگا۔

”کیا تم نے؟“ سونی نے جگو کے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔ تمہاری بھرتی کی تعریف کر رہا تھا۔“ رہیں نے اوپر سر نکال کے کہا۔

سونی نے اس کا راست روک لیا ”نہیں میں نے سنا تم نے کہا تھا۔“

”ارے سونی۔ کیا مجھے کراؤ کی سانس سے بچو۔“

”معافی مانگو نہیں تو گرا دوں گی“ سونی اڑ گئی۔

رہیں اوپر کنارے پر انگلیاں جمائے کھڑا تھا ”پار ناصر۔ اسے سمجھا۔ یہ کیا بلا جھٹکتی ہے میری جان کو۔“

سونی نے اس کے ہاتھ ایک جھٹکے سے چھڑا دیے۔ اب بلا بھی کر رہے ہو۔“

رہیں ایسے گرا جیسے دیوار پر مٹنے والی چھبکی فرش پر اترتی ہے۔ میں نے اسے پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ کوئی کرکٹ کی بال نہیں تھا کہ کچھ ہو جاتا۔ اس کے ساتھ میں بھی

مرگیا۔ اگر وہ سیدھا کر کے مل گیا تو شاید اسے زیادہ چوٹ آتی۔ ٹرک کے اوپر والا کنارہ زمین سے شاید آٹھ فوٹ اوپر ہوگا۔ اس بلندی سے کوئی خود چھلانگ مارے تو کچھ نہیں ہوتا مگر نہیں کرنے کے لیے تیار نہیں تھا پھر زمین بھی سخت اور پتھری تھی۔

رئیس کپڑے جھاڑتا تھا۔ اسے طیش بھی آ رہا تھا اور سخت بھی تھی "لو کی پتھی۔ ابھی درست کرتا ہوں تیرا دماغ۔"

سونی نے اسے اوپر آنے کا اشارہ کیا "آؤ۔ تمہیں چلتے ٹرک سے نہ پھیکا تو نام سونی نہیں۔ مجھے پھر گالی دی ہے تم نے۔"

میں نے کہا "سونی۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟" "مجھے کیوں ڈانٹ رہے ہو۔ اس نے مجھے بندر کی بجی کہا 'اما کما اور پھر لو کی پتھی۔ یہ خود لو کا چٹھا' حرای۔" میں نے رئیس کو در جواب اس غزل کچھ اور کہنے سے روک دیا۔ "اس کی بات کا برا امت مان۔ یہ کوئی جگہ نہیں ہے لڑنے کی۔"

"میں اسے جھوڑوں کا نہیں۔" رئیس بولا مگر اس کے لیے میں اعتماد نہیں تھا۔ میں نے سونی کو سمجھایا "دیکھو تم نے بھی گالیاں دے کر حساب برابر کر لیا۔ اب آرام سے بیٹھو ورنہ مجھے اوپر آنا پڑے گا۔"

"تیس باس" سونی نے مسکراتے ہوئے مجھے سیلوٹ کیا۔ رئیس کچھ جھینپا ہوا تھا۔ وہ مڑتا اور اسے بد معاش مانا جاتا تھا مگر ایک کمزور نظر آنے والی نازک اندام لڑکی کی دست درازی سے بچانے کے لیے مجھے اس کو محفوظ فرام کرنا پڑا تھا۔ وہ اس لڑکی کا کچھ بھی نہیں گاڑ سکتا تھا چنانچہ بے عزتی کو کڑوے گھونٹ کی طرح پی جانے پر مجبور تھا۔ رئیس کی بد معاشی کی ساری طاقت اسٹے کے بل بوتے پر تھی۔ ریوالتور سے کلا شکوف تک ہر آنکھیں اسٹے کے لیے کھلنے کی حیثیت رکھتا تھا اور ان کھلونوں سے وہ اس لیے بے خوفی کے ساتھ کھیلتا تھا کہ اس کے پیچھے کمر ہچکچا دینے والے ہاتھ تھے جو اسے شاباش دیتے تھے اور قانون کے لیے ہاتھوں کو اس کی گردن تک نہیں پہنچتے دیتے تھے اس کے برعکس سونی کی تربیت کرنے والے ایسے خطرناک مجرم تھے جو رات دن قانون کے ساتھ آنکھ پھولی کھیلتے تھے جان لینے سے زیادہ سونی کو جان بچانے کے طریقے آتے تھے کسی حد تک جنگوں میں دوش پوش رہنے والے ڈاکو بھی کامنڈز ہوتے ہیں۔

وہ گورلا وار کرتے ہیں۔ سامنے آکے مقابلہ نہیں کرتے۔ چھپ کر اچانک حملہ آور ہوتے ہیں۔ کہیں محصور ہو جائیں اور مقابلہ ممکن نہ رہے تو پسپا ہونا جانتے ہیں اور فرار کے متبادل راستے کھلے رکھتے ہیں۔ انہیں کھنچے جنگوں کی ہر تباہی کا علم ہوتا ہے۔ وہ ہندی نالوں کو تیر کر عبور کر سکتے ہیں۔

غاروں میں دوش پوش ہوجاتے ہیں۔ زیر زمین چھپ جاتے ہیں۔ کھنچے جھاڑیوں میں گم ہوجاتے ہیں اور درختوں کی بلندی پر شاخوں اور پتوں میں غائب ہو سکتے ہیں۔ اسلحہ ختم ہوجائے تو دفاع کی جنگ کیسے جاری رکھی جائے ڈاکو یہ سب جانتے ہیں اور ان کے ساتھ رہ کے سولی نے بھی جان لیا تھا۔

جب رئیس اوپر چڑھ کے آرام سے بیٹھ گیا تو سونی نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور ہنسنے لگی "چلو آج کی لڑائی ختم۔ گستاخی معاف دل صاف۔"

رئیس نے اس کا ہاتھ تھام لیا "غلطی میری تھی۔" "نہیں۔ غلطی میری تھی۔ تمہیں چوٹ لگ جاتی پھر؟" "تم میری بات کا برا امت مانا کرو۔ مجھے تو تیار میں بھی گالی دینے کی عادت ہے۔"

میں نے ہاتھ اوپر کر کے چٹکی بھائی۔ "خواتین و حضرات! ذرا اس ناچ کی طرف بھی توجہ فرمائیے۔ یہاں سے مرئی خانے تک پہنچنے میں چھ سات منٹ لگتے ہیں۔ صرف کلینر کو اوپر بھیجا ہوا نظر آتا ہے۔"

"کلینر حاضر ہے استاد" رئیس بولا۔ "کلینر کے ساتھ کوئی اور بھی نظر آ رہا ہے مجھے؟" "یہ کون ہے؟" میں نے پوچھا۔ "اوپر تو کوئی بھی نہیں ہے باس" سونی فوراً لیٹ کے غائب ہو گئی۔

میں نے ٹرک آگے بڑھایا اور گھڑی دیکھی "اگر چوکیدار نے گیٹ پر روکا تو تم کچھ نہیں کرو گے اسے میں سنبھال لوں گا لیکن مقابلے کے لیے تیار رہنا۔ ہو سکتا ہے چوکیدار چلانے لگے یا الارم آن کر دے۔"

رئیس نے کلا شکوف بلندی کی "اپن ایک دم ریڈی ہے استاد۔"

سونی نے ہاتھ اوپر اٹھا کے دوسری کلا شکوف لہرائی "تھر ناٹ باس۔" "یہ کیا استاد اور باس کی گردان شروع کر دی ہے" میں نے ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھ کے ٹرک کا انجن اسٹارٹ کیا۔ گرد و پیش کی دیران خاموشی میں اس کی آواز کسی جناز کے انجن کی طرح گونجنے لگی۔ میں بیٹھ لائیں چلائے بغیر ٹرک کو

سڑک پر لے آیا اور پل پولی فٹ فارم کی طرف چل پڑا۔ کچھ دیر پہلے تک میرے پیش کی جو کیفیت تھی وہ کچھ تبدیل ہو رہی تھی۔ میں نے رئیس سے دل کی آواز کی بات کی تھی۔ اب اس آواز میں دوسری آواز میرے دماغ کی شامل ہو گئی تھی جسے میں نے پہلے نظر انداز کر دیا تھا۔ اب میں بھی یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ میں نے اپنے طور پر جو فیصلہ کیا تھا وہ کسی حد تک ایک جوا تھا اور اگر یہ جوا بھی تھا تو اس میں بازی بیٹنے یا بارنے کے امکانات کا تناسب کیا تھا۔ جیت خود اپنا انعام ہوتی ہے لیکن ہار کی قیمت کون ادا کرے گا؟

میں نے صرف اپنی زندگی کو ہی نہیں سونی اور رئیس کے ساتھ ختم کی زندگی کو بھی داؤ پر لگا دیا تھا۔ یہ ان کا میری قوت فیصلہ پر اعتماد تھا کہ انہوں نے میری بات مان لی تھی اور ان کے غلوں کی انتہا تھی کہ وہ دوستی میں بے غرض تھے۔ کچھ ایسے ساروں کو ایسی جگہ میں کیے گئے فیصلے پر قربان کرنا عقلمندی کہلاتا ہے؟ نتیجہ میری توقعات کے برعکس نکلا تو میرے پاس کیا باقی رہے گا؟ فقط لاکھلا حاصل پشیمانی اور احساس جرم و ندامت کی بے سود غلج کا آزار پھر کیا مجھے رک جانا چاہیے لوٹ جانا چاہیے؟

میں نے ہر دہائی کو عشق مسترد کر دیا تھا۔ عشق کا یہی مشورہ ہے۔ وہ بے خطر آتش نمود میں کود پڑتا ہے تو آگ کدو پی ہے انداز گشتاں پیدا۔ عقل یونی کو تاشا لپ پام رہ جاتی ہے۔ اپنے جنوں پر میرا یقین مجھے کھینچ گیا۔ اچانک میں نے خود کو پل پولی فٹ پر ڈنک کے فولادی گیٹ سے چند قدم کی مسافت پر پایا۔ میں نے ایک گہری سانس لے کر اپنے آپ کو پرسکون کیا اور اپنے خدا سے کہا۔ "اے میرے رب! میں تب تک ہوں جب تک تو چاہے ورنہ میری کوشش کیا اور میری تدبیر کیا؟"

فولادی گیٹ کی بارہنٹ چوڑائی سے تارکول کی سڑک تک پچاس ساٹھ فٹ تک سینٹ کا معمولی سا ڈھلوان فرش تھا۔ میں نے ٹرک کو تھوڑا سا دائیں طرف لاکے بائیں جانب موڑ کاٹا تو بیڈ لائٹس کی چکا چوند کرنے والی روشنی گیٹ پر پڑی۔ اس سے دونوں طرف اجالا پھیل گیا۔ میری نظریاں ہاتھ پر گئی جہاں میں نے چوکیدار کو اپنے اسٹے کے ساتھ کرسی پر بیٹھا دیکھا تھا۔ کرسی خالی پڑی تھی پھر میں نے اسے دائیں طرف سر ہجود دیکھ لیا۔ وہ صاف فرش پر چادر بچھائے عشا کی نماز ادا کر رہا تھا۔ مجھ سے اسٹے کے اس نے دوسری رکعت کے لیے ہاتھ باندھ لیے۔

میں نے ٹرک کو گیٹ سے دس فٹ دور ہی روک لیا۔

میرا خیال تھا کہ جب تک چوکیدار نماز سے فارغ ہو کے آخر کام پر اندر کسی سے رابطہ نہیں کرے گا گیٹ بند ہی رہے گا مگر سلائیڈ تک گیٹ معمولی سی رگڑ کی آواز کے ساتھ پورا کھل گیا۔ شاید یہ کسی خود کار سختی نظام کا کام تھا۔ آٹومٹک ڈور اب عام نظر آنے لگے ہیں جو کسی کے ایک خاص قاصلے پر آنے کے بعد خاموشی سے کھل جاتے ہیں اور پھر خود ہی بند بھی ہو جاتے ہیں۔ دروازے کی حرکت کو فرش کے نیچے چھپے ہوئے کسی اسپرنگ یا لیور سے بھی کنٹرول کیا جاتا ہے اور حساس الیکٹرانک SENSORS کی مدد سے بھی۔

میں ٹرک کو اندر لے گیا۔ ٹرک کے گزرتے ہی گیٹ پھر بند ہو گیا۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اپنی دانست میں فول پروف سیکورٹی سسٹم لگانے والے اتنے بے وقوف نہیں ہو سکتے کہ گیٹ کے پاس پہنچنے والی ہر گاڑی کے بلا روک ٹوک گزر جانے کا رسک ان کی نظر میں نہ ہو۔ یقیناً گیٹ کے آس پاس کہیں کوئی کلوز سرکٹ ٹی وی کیمرہ تھا جس نے ٹرک کو ٹریس کیا اور تصویر اندر کسی اسکرین پر پچھلادی۔ مانیٹر کی مدد سے سیکورٹی کلیرنس دینے والے کسی ڈسٹے دار شخص نے کوئی جمن دبا کے گیٹ کھول دیا۔ اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جاسکتا تھا کہ گیٹ کھولنے والے نے صرف ٹرک دیکھا۔ ٹرک ڈرائیور کو نہیں دیکھا ورنہ وہ گیٹ بند رکھتا اور ہنگامی صورت حال کا اعلان کر دیتا۔ ہر طرف الارم چلانے لگتے اور محافظ الارٹ ہو جاتے۔

اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ہنگامی صورت حال کا اعلان خاموشی سے کر دیا گیا ہو اور ہمارے استقبال کرنے والے خطرناک اسٹے سے لیس محافظ کسی کے اترنے سے پہلے ہی ٹرک کو گھیرے میں لے لیں۔

ٹرک سینٹ کی سڑک جیسے راستے پر بڑھتا ہوا ایک مین کے شیڈ میں پہنچ گیا۔ میرے اندازے کے مطابق ٹرک اسی جگہ کھڑا کیا جاتا تھا۔ وہاں فرش پر تیل کے بڑے بڑے دھبے اور ٹائروں کے پرنٹ صاف نظر آ رہے تھے۔ میری نظر نے اندر آتے ہوئے سینٹ اور کنکریٹ کی پختہ پیرک کا نقشہ ذہن نشین کر لیا تھا۔ عمارت دائیں سے بائیں پھیلی ہوئی تھی۔ سامنے والے حصے کی طوالت سگز کے قریب بھی اور اس میں کم دیش میں کھڑکیاں ایک ہی قطار میں نظر آتی تھیں۔ سب کھڑکیاں باہر کی طرف دھکیلتے سے کھلتی تھیں کیونکہ لوہے کی سلاخوں کا عکس اندر کی طرف سے شیشوں پر نظر آ رہا تھا۔

داغے کا ایک راستہ بائیں ہاتھ پر تھا۔ یہ عام دروازہ تھا

اور ساڑھے چھ سات فٹ اونچا اور چار فٹ چوڑا۔ اس کے فولادی پٹ بند تھے۔ لمبائی کے مقابلے میں بھرک کی چوڑائی آدمی تھی۔ زیادہ سے زیادہ بلندی عین درمیان میں اگر بندہ فٹ بھی تو آئے سانسے کی لمبی دیواروں تک دھلون کی شکل میں پیچنے کے بعد پھٹ کی اونچائی آٹھ فٹ رہ جاتی تھی۔ پچاس فٹ چوڑی اور بندہ فٹ اوپر ٹکون بنانے والی دیوار میں ساڑھے چھ فٹ کا دروازہ بہت چھوٹا لگتا تھا۔ دروازے کے دائیں بائیں ایک بھی کھڑکی نہیں چھوڑی تھی۔ شاید کچھ ایسا ہی نقشہ بھرک کی دوسری سائڈ کا ہو گا جو میری نظر سے اوجھل تھی۔

ٹرک ڈرائیور کے معمول کی مجھے کوئی خبر نہیں تھی۔ ٹرک اندر لانے کے بعد وہ کیا کرتا تھا۔ کسے رپورٹ کرتا تھا اور اندر داخلے کی اجازت کیسے حاصل کرتا تھا۔ خلاف معمول پہلی بات تو یہی تھی کہ ٹرک جتنی مرغیاں شہر میں ڈیور کرنے گیا تھا وہ سب ٹرک پر لہدی ہوئی تھیں اور شاید اپنی جنم بھومی کی خوشبو کو پہچان کے ٹرک کو اڑانے لگی تھیں۔

میں نے نیچے اتر کے چند سیکنڈ توقف کیا اور کسی بھی سمت سے آنے والی کوئی آواز سننے کی کوشش کی مگر بھرک کے اندر سے مرغیوں کے کڑکڑانے اور چوڑوں کی چوں چوں کے سوا مجھے کچھ بھی سنائی نہ دیا۔ سرائیگر دیکھنے پر مجھے دوسرے نظر آئے۔ ان میں ایک رہیں کا تھا اور دوسرا سونلی کا۔ دونوں سر مرغی کے پنجروں پر رکھے ہوئے لگتے تھے۔ ان کا بانی دھڑکاٹا تھا۔ میں نے انہیں ہاتھ ہلا کے نیچے آجانے کے لیے کہا۔

پہلے سونلی کسی بلی کی طرح بے آواز قدموں سے کودی۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ آخر اسے دس فٹ کی بلندی سے یوں اترنے کی کیا ضرورت تھی۔ موقع مل دیکھتے بغیر اپنی پھرتی اور صارت کا مظاہرہ سائل بھی کھڑے کر سکتا ہے۔ چلاٹک لگانے میں معمولی سی بے احتیاطی کا نتیجہ سوچ کی صورت میں نکل سکتا ہے۔ زمین پر پڑنے والے قدموں کا معمولی سا ارتعاش اس وقت دھماکا دے کر سکتا ہے۔

لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ زمین کو چھوتے ہی سونلی کے قدم جیسے اسپرنگ پر لگ کے اوپر اٹھے پھر وہ توازن میں آگئی۔ میرے کانوں نے خفیف سی آہٹ بھی نہیں سنی۔ اس نے اپنے بازو اوپر پھیلائے اور رہیں نے ایک کے بعد دوسری کھٹکھٹک دیکھی۔ سونلی نے دونوں کچھ چڑکے۔ یہ حرکت بھی قطعی غیر ضروری تھی۔ رہیں آرام سے کلاٹکھٹک کو پیچے لٹکا تو سونلی ہاتھ بڑھا کے آسانی سے

پکڑ لیتی۔ سونلی کچھ نہ کہتی تو کلاٹکھٹک کے گرنے کی آواز ہم کے دھماکے کی طرح سنائی دیتی۔

میں نے آہستہ سے کہا ”زیادہ شور مٹ دکھاؤ سونلی۔ چلو تم جاؤ سیدھے ہاتھ کی طرف سے۔ کھڑکی سے نیچے روکے بھرک کا راز ڈنڈ لگاؤ۔ کھڑکی میں سے اندر بھاگ کے دیکھو لیکن یہ خیال رکھو کہ باہر سے تو کوئی تمہیں نہیں دیکھ رہا ہے۔ رہیں تو جانے ہاتھ کی طرف سے۔“

”اور تو کیا پھٹتے جا کے دیکھے گا؟“ رہیں بولا۔
”میں اندر جا رہا ہوں۔“ میں نے کہا اور آگے بڑھ کے فولادی دروازے پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ مجھے خفیف سا الیکٹرک شاک لگا۔ یہ شاید بارہ ولٹ سے آریٹ ہونے والا ڈور لاک تھا۔ اندر کہیں میوزک بیل بجنے لگی۔ اوپر کسی اسپیکر سے ایک کرخت آواز آئی ”کون ہے؟“

میں نے کھانٹ کے اور زکام زدہ آواز بنا کے کہا ”سراج دین۔“
دروازے پر ایک کھٹکا سا ہوا۔ میں نے اسے ہلش کیا تو دروازہ کھل گیا۔ اندر قدم رکھتے ہی میں نے اس دروازہ اور کسرتی بدن والے بدن سے چپکی ہوئی سرخی شرت اور جینز میں ملبوس شخص کو دیکھا جو کرسی پر میری طرف رخ کیے بیٹھا تھا۔ اس کے پیچھے دیوار کے ساتھ لی ہوئی میز پر ایک لی دی کا اسکرین روشن تھا۔ اس میں مجھے بیرونی دیوار کے باہر گیٹ کے سامنے کا منظر دکھائی دیا۔ لی دی بائیں کے ساتھ ہی اس شخص کا ریوالبو بھی پڑا تھا۔

مجھے دیکھتے ہی اس کا منہ کھل گیا اور وہ اچھل کے کھڑا ہوا مگر اسے پلٹ کے ریوالبو اٹھانے کی مہلت نہیں ملی۔
”بالکل آرام سے کھڑے رہو“ میں نے اپنی لات سے دروازے کو پٹے بغیر بند کر دیا۔ میرے ریوالبو کا رخ اس کی پیشانی کی طرف رہا۔
”کون ہو تم؟“ وہ پلک جھپکاتے بغیر مجھے گھورتا رہا۔ ”ہیا چاہتے ہو؟“

میں نے کہا ”کل میرے ماموں کا دلہہ ہے۔ چکن قورمہ اور چکن بریانی کے لیے مرغی لینے بیچا تھا ممانی نے۔ کیا ظلم ہے۔ ابھی ایک دن ہوا ہے شادی کو اور سارے اخراجات کا کنٹرول ممانی نے لے لیا ہے۔“

وہ مجھے ایسے دیکھتا رہا جیسے میرا دماغ چل گیا ہے ”تم یہاں مرغی لینے آئے ہو؟“ اتنی دودھ۔ یہ ریوالبو نے کر کے؟“
میں نے کہا ”بجوری تھی۔ ماموں دس ہزار روپے دے رہے تھے۔ ممانی نے نو ہزار روک لیے اور ایک ہزار مجھے

دے کے کہا کہ یہ بہت ہیں۔ اب تم ہی بناؤ پانچ سو آدمی آئیں گے سو روپے فی کس میں انہیں چکن بریانی اور چکن قورمہ کون کھلا سکتا ہے؟“

”تمہارا دماغ خراب ہے۔“
میں نے نفی میں سر ہلایا ”دماغ سے کام لیا تو مسئلہ حل ہوا۔ ایک افغانی سے پانچ سو روپے میں ریوالبو خریدا میں نے پانچ سو بیچا لیے۔“

”تو مرغی خانہ کون سے آئے ہو تم؟“
میں نے کہا ”توبہ۔ توبہ۔ میں کیا زکوٰۃ نظر آتا ہوں شکل سے۔ میں پورے پانچ سو روپے دوں گا تمہیں“ جتنی مرغی چاہیے۔“

اس نے دانت پس کے کہا ”مرغی کے بچے!“ اور غوطہ مار کے میری ٹانگوں میں ٹھنسنے کی کوشش کی۔

اپنی بے سروا باتوں سے میں نے دو متبادل حاصل کیے تھے۔ میں نے اس کمرے کے حفاظتی انتظامات کو سمجھ لیا تھا۔ ایک دیوار پر انٹر کام جیسے چار ٹیلی فون ریسیور رکھے ہوئے تھے اور ان کا کنکشن ایک ایسے ٹیلی فون سیٹ سے ملا ہوا تھا جو ساز میں پڑا تھا اور جس میں بہت سے بٹن لگے ہوئے تھے۔ ان سے کچھ قاصلے پر الیکٹرک سوچ بورڈ تھا۔ اس پر مرغی خانے کے اندر باہر کی ساری لائنیں کے سوچ تھے۔ ان کے اوپر تین یا دو سوچ تھے شاید ان میں سے ایک باہر کی سرخ لائنیں آن کر سکتا تھا۔ دوسرا الارم کے لیے ہو سکتا تھا اور تیسرا سارے سیکورٹی سسٹم کے آلات کو کنٹرول کرنے کے لیے۔ ان میں سے ایک ہی آن کی پوزیشن میں تھا چنانچہ میں نے فرض کیا کہ یہ گیٹ پر نصب کلوز سرکٹ لی دی کھیرا اور انفراریڈ لائٹ وغیرہ کا سوچ ہو گا۔ سب سے اوپر تھری فیز پاور سپلائی کا مین سوچ تھا اور اس کے نیچے سرخ سبز اور زرد رنگ کے تین چھوٹے چھوٹے روشن بلب یہ ظاہر کرتے تھے کہ اس وقت بجلی کے تینوں فیز آ رہے تھے۔

سیکورٹی سسٹم کو سمجھنے کے دوران میں میں آہستہ آہستہ کھٹکا ہوا بورڈ کے سامنے آ گیا تھا۔ تدریجی طور پر میرے ساتھ ساتھ میرے سامنے کھڑا ہوا شخص بھی کھوتا گیا تھا۔ دوسرا مقصد رہیں اور سونلی کو اتنی مہلت فراہم کرنا تھا کہ وہ پورے مرغی خانے کا راز ڈنڈ لگالیں۔

بائیں کرتے ہوئے میں ایک لمبے کے لیے بھی اپنے حریف کی طرف سے غافل نہیں تھا اور مجھے اندازہ تھا کہ اس کے اعصاب اس صورت حال کو زیادہ دیر برداشت نہیں کیا کریں گے۔ وہ ہر صورت میں مجھے اپنے راستے سے ہٹا کے

سوچ بورڈ تک پہنچنے کی کوشش کرے گا۔
جب اس نے یہ کوشش کی تو ایک خود کار دفاعی رد عمل کے لیے میرا جسم پوری طرح تیار تھا۔ میں نے اس سے زیادہ پھرتی دکھائی اور اس کے اوپر سے ایک جست میں اس کے پیچھے پہنچ گیا۔ اسے MOMENTUM یا اپنی حرکت کی قوت کو کنٹرول کرنے کے لیے نہ اسے مہلت ملی اور نہ جگہ۔ وہ کسی بریک لیٹل ٹرک کی طرح سیدھا دیوار میں ٹکس گیا اور جب میں نے پلٹ کے قدم بنائے تو وہ ہم بے ہوشی کی کیفیت میں اوندھا پڑا ہوا تھا۔

میں نے اسے اٹھا کے کرسی پر ڈالا اور پیچھے سے اس کی گردن کو بائیں ہاتھ کے مٹھے میں جکڑ لیا۔ دائیں ہاتھ سے میں نے اس کی جامد تھلائی لی مگر اس کے پاس تھوڑی سی نقد رقم اور شاخ سی دستاویزات کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے مجھے اندازہ ہوا کہ اس کا نام مختار تھا اور اس کا عہدہ چیف سیکورٹی سپروائزر کا تھا۔

اس کا سانس میری سخت گرفت میں رکنے لگا تھا۔ اس نے ہورامت کھول کے ہاتھ پاؤں ہلائے تو میں نے بازو کا ٹکچہ ڈھیلو کر دیا۔ وہ دسے کے مریض کی طرح ہانپنے لگا۔

میں نے کہا ”دیکھو۔ میں کسی کی جان لینا نہیں چاہتا لیکن میرے یہاں آنے کا ایک مقصد ہے جس کے لیے میں جان دینے کے لیے بھی تیار ہوں اور اس مقصد کی راہ میں حائل ہونے والے ہر شخص کو قتل کر سکتا ہوں۔“

اس نے پھولی ہوئی سانس پر کچھ قابو پایا تھا مگر اس کے چہرے پر پسینہ بنے لگا تھا ”جو“ جو مقصد تم نے بتایا تھا۔“

میں نے کہا ”میں کام کی بات کرنے سے پہلے کچھ بجلی بجھکی گھنٹو کرنا پسند کرتا ہوں۔ تمہیں حیرانی ہوئی کہ اتنے سخت حفاظتی انتظامات کے باوجود میں اندر کیسے پہنچ گیا۔ دراصل یہ سب خوش گمانی کا فریب ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ حفاظت کس کی ہوتی ہے؟ امریکی صدر کی۔ کمرڈوں ڈالر اس کی سیکورٹی پر خرچ ہوتے ہیں مگر ہو گیا ہے؟ امریکا کے سب سے مقبول صدر جان ایف کینیڈی کو ایک آدمی اپنی رائفل کی ایک گولی کا نشانہ بنایا ہے۔ وہ بھی اس وقت جب صدر اپنی گاڑی میں جلوس کی شکل میں جا رہا تھا اور قاتل بہت دور ایک بلند عمارت کی چھت پر بیٹھا تھا۔ صرف ایک گولی سارے حفاظتی انتظامات کی دھوم دھام پر خندہ زن اچل کی نامہ برین کے آنی اور روئے زمین پر سب سے زیادہ طاقتور سمجھے جانے والے شخص کو مرنا پڑا۔“

میں نے دل ہی دل میں رہیں کو اور سونلی کو دیر کرنے پر

کوسا۔ آخر تک میں اس شخص سے فضول باتوں میں وقت ضائع کروں؟ ایک آدمی کی حد تک ٹھیک ہے کہ صورت حال میرے قابو میں ہے مگر یہاں کوئی اور بھی آسکتا ہے۔ مگر میرے ذہن میں اس خیال کے آنے سے پہلے ہی وہ اندر آچکا تھا۔ یوں جیسے وہ منتظر تھا کہ میں اس کے بارے میں سوچوں اور وہ شیطان کی طرح نمودار ہو سکے کہے کہ لو میں آگیا۔

اندرا قدم رکھتے ہی اس نے ایک نظر میں ساری صورت حال کو سمجھ لیا اور اس نے خود کو ذہنی و جسمانی طور پر یکساں مستعد پھر تیار اور عمل کی فوری قوت اور صلاحیت رکھنے والا ثابت کرنے میں ذرا دیر نہیں لگائی۔ وہ درمیانے تہ کا دبلا پتلا شخص تھا جس کے سر کے بال اڑ چکے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ چالیس سال سے کم عمر کا نہیں ہو سکتا۔ اس کی عمر کے کسی شخص کے لیے ایسی برق رفتاری اور اتنی بھرپور متحرک توانائی کا مظاہرہ یقیناً ایک غیر معمولی بات تھی۔ اس کی آنکھیں الو جیسی گول اور ناک طوطے کی چونچ جیسی تھی۔ جامد تلاشی کے لیے میں نے اپنے ریوالور کو جیب میں ڈال لیا تھا کیونکہ میں نے بائیں ہاتھ سے گری پر بیٹھے ہوئے شخص کو قابو کر رکھا تھا۔ میں ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں اپنا ریوالور نکال سکتا تھا مگر جس وقت الو کی آنکھوں اور طوطے کی ناک والا شخص ایک دروازے کو خاموشی سے کھول کے اندر آیا اس وقت میں نے اپنا سیدھا ہاتھ اپنے قیدی کی وائسٹ والی جیب میں ڈالا ہی تھا۔

مجھے کوئی شک نہیں تھا کہ اچانک کوئی نازل ہو جائے تو میں اس سے نمٹ سکتا ہوں۔ مجھے جیب سے ریوالور نکالنے میں دیر لگنے کا کیا سوال مگر میرے اس اعتماد کو پلک جھپکتے میں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

ایک ریوالور مانیٹر کے پاس پڑا تھا۔ مجھ پر لازم تھا کہ اسے میں اپنی دوسری جیب میں ڈال لیتا۔ شاید کچھ دیر بعد میں ایسا کرنا مگر الو کی آنکھوں اور طوطے کی ناک والے نے اندر آتے ہی اسے دیکھ لیا اس نے یہ بھی دیکھ لیا کہ میرے دونوں ہاتھ فری نہیں ہیں۔ وہ ریوالور کی طرف جھپٹا اور میں اس وقت جیب میں نے اپنی جیب سے ریوالور کو نکالنا چاہا تو مجھے ایک سیکنڈ کی دیر ہو گئی کیونکہ میرے ہاتھ کو میرے قیدی نے بڑی حاضر دماغی کا ثبوت دیتے ہوئے وائسٹ کے اوپر سے ہی پکڑ لیا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ میرے ہاتھ پر جم گئے تھے۔ بے شک مجھے ایک جھکاؤ سے گرا پڑا ہاتھ وائسٹ سے نکالنے میں ایک سیکنڈ ہی لگا لیکن ایک سیکنڈ بعض اوقات زندگی اور

موت کے درمیان حائل وقفہ بن جاتا ہے۔ الو کی آنکھوں اور طوطے کی ناک والے نے ریوالور اٹھالیا اور اس کا رخ میری طرف کر دیا۔ اس وقت مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ اب میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میرے دونوں حریفوں نے بہترین ٹیم ورک کا مظاہرہ کیا تھا۔ ایک نے میز تک پہنچنے میں دیر نہیں لگائی تھی اور دوسرے نے اسے ریوالور سے مجھ پر فائر کرنے کی مہلت فراہم کر دی تھی۔

اچانک مجھے مسلح دشمن کی آنکھوں میں ایک سفاک چمک نظر آئی۔ اس چمک میں خون کی پیاس بولنی ہے اور موت کی وحشت جھلکتی ہے۔ جب میں نے اس چمک کو محسوس کیا تو مجھے کوئی شک نہیں رہا کہ وہ کیا کرنے والا ہے۔ اس نے سوال جواب میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا تھا۔ یہ نہیں پوچھا تھا کہ میں کون ہوں اور یہاں کیا ہو رہا ہے۔ اس نے مجھے روکنے اور خبردار کرنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ مجھ سے چند زاپ کرنے کے لیے نہیں کہا تھا اور مجھے گولی مارنے کی دھمکی نہیں دی تھی۔ اس نے دیکھتے ہی مجھے گولی مارنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس نے مجھے گولی ماری۔

لیکن مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ ایسا ہی کرے گا چنانچہ میں نے اپنا ہاتھ جھڑپتے ہی گولی کو ڈاج کرنے کی کوشش کی مگر گولی کی تیز رفتاری کا مقابلہ ناممکن تھا۔ مجھے اچانک یوں لگا جیسے میرے بائیں بازو میں آگ بھڑکی ہے۔ نیچے جھکے ہوئے میرا ہی بازو چند انچ اوپر رہ گیا تھا اور گولی کے راستے میں آگیا۔ اس وقت تک میرا دایاں ہاتھ جب سے ریوالور بھی نکال چکا تھا اور نیچے کرتے کرتے میں نے اپنے اندازے کے مطابق سمت مقرر کر کے زبردست دباؤ۔

فائر کی آواز کے ساتھ ہی ایک بھیاک چبچاہری۔ وہ شخص جس نے میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے موت کے مقابل کر دیا تھا دونوں طرف سے چلائی جانے والی دو گولیوں میں سے کسی کا بھی نشانہ بن سکتا تھا مگر دوسری گولی چلنے سے پہلے وہ سوچ بوز کی طرف جست مار چکا تھا۔ الو کی آنکھوں اور طوطے کی ناک والے کی چیخ کے ساتھ ہی ایک سائزن چلانے لگا اور ہر طرف جیسے روشنی کا سیلاب سا آگیا۔

میں نے زخمی بازو کی طرف دیکھا بھی نہیں لیکن مجھے معلوم ہو گیا کہ شانے کے چیمے سے کلائی تک بر کر جانے والا گرم سیال میرا اپنا ہوس ہے۔ میری نظر نے ٹی وی مانیٹر کے اوپر اور پھر بائیں سمت نیچے کر جانے والے شخص کو دیکھا۔ ٹی وی مانیٹر ایک دھماکے سے پھٹ گیا تھا اور اس کا بے جان ہو جانے والا کھوکا اب مرنے والے کے پیروں کی ٹھوکروں

سے اُدھر اُدھر ہوا تھا۔ میری گولی نے خود ہی صحیح نشانہ منتخب کیا تھا اور اپنی مرضی سے اس راستے پر مگنی تھی۔ مجھے نشانہ لینے کی نہ مہلت ملی تھی اور نہ ہی اتنا ہوش تھا۔ الو جیسی آنکھوں اور طوطے جیسی ناک والے شخص کا چہرہ سامنے سے اڑ گیا تھا۔ گولی ناک کی طرف سے اس کے دماغ میں گھسی اور اب وہ بھیاک آوازوں کے ساتھ مر رہا تھا۔

جو ریوالور مرنے والے کے ہاتھ میں تھا وہ اب نظر بھی نہیں آ رہا تھا مگر الارم اور سرچ لائٹس آن کرنے والا جانتا تھا کہ ریوالور کہاں گرا ہے اس نے مجھے اٹھنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ وہ سوچ بوز سے میز کی طرف لگا۔ اس نے میرے اوپر سے لاگ جب لگائی اور تقریباً اڑنا ہوا مجھ سے تین چار فٹ کے فاصلے سے گزرا۔ میں نے بازو میں اٹھنے والی پیس کو برداشت کرتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اس کی ٹانگ پکڑنے کی ناکام کوشش کی۔ وہ سیدھا اس شخص پر گرا جو اب ایک لاش تھا۔ وہاں ٹی وی اسکرین کا شیشہ ٹکرا ہوا تھا اور مرنے والے کا خون پھیلا ہوا تھا۔ وہ مجھ سے چند قدم دور تھا اور میں دیکھ رہا تھا کہ اس کا ہاتھ میز کے نیچے پہنچ گیا ہے۔ ریوالور یقیناً وہاں کیس پڑا ہوگا۔

میں نے تھوڑا سا اوپر اٹھ کے ناز کیا۔ اس نے پلٹ کے دیکھا تو مجھے فوراً پتا چل گیا کہ گولی نے اسے چھوا بھی نہیں۔ اچانک اس نے درمیان میں حائل کرسی کو لات ماری۔ کرسی کا ایک بازو میرے سر لگا اور ایک لمبے کے لیے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا پھیل گیا۔ اس لمبے میں وہ آسمانی ریوالور اٹھا کے مجھے نشانہ بنا سکتا تھا۔ مجھے مایوسی نے گھیر لیا۔ خود کو بچانے کی آخری کوشش کے طور پر میں نے اپنے آپ کو آنے والی گولی کے راستے سے ہٹالیا۔ میں نے سر کے بل رول ہو کے ایک فلا بازی کھائی۔

فائر کی آواز بھی اسی وقت سنائی دی۔ میں نے اس شخص کو ایک جھٹکے سے اچھلتا ہوا دیکھا۔ اس کے حلق سے ایک کراہ نکلی اور وہ بیٹے پر ہاتھ رکھ کے جھکا اور فرش پر لوٹنے لگا پھر میں نے سوتی کو دروازے میں کھڑا دیکھا۔

مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف لپکی "نامرہ تم ٹھیک تو ہو؟"

میں نے ہاتھ بڑھا کے الارم اور سرچ لائٹس کے سوچ آف کر دیے۔ مگر ایک دم خاموشی ہو گئی "میں ٹھیک ہوں۔" سوتی نے میرے بازو کو دیکھا۔ "یہ سہیہ کیا ہوا ہے گولی لگی ہے نہیں؟"

میں نے کہا "ہاں خراش ہے معمولی!"

اسیب

اسیب، خوف، دہشت اور امرار میں
ڈوبی ایک خوفناک داستان۔
اسیب، ایک سرگرم بدروح کا قصہ۔
نیکی اور بدی کی اس کشمکش کی داستان
سحر طراز جو ازل سے جاری ہے اور اب
تک جاری ہے گی۔

قیمت: ۳۰۰ روپے

براہ راست منگوانے کا پتہ

ناشر: علی میاں پبلیکیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔

فون: ۳۲۴۴۲۴

اسٹاکسٹ: علی بکسٹال

نسبت: روڈ، چوک میوہسپتال، لاہور۔

اپنے ہاگرباقریبی بکسٹال سٹال فنانس

”وہ چلائی“ اسے خراش کہتے ہو تھ اپنا خون بس رہا ہے۔ ”میں نے بھوکے کہا“ بنے دو۔ مجھے بتاؤ باہر کیا ہو رہا ہے؟
 فائرنگ کون کر رہا ہے؟“
 ”مجھے مجھے نہیں معلوم۔ ایک میرے سامنے آگیا تھا۔ اسے میں نے ختم کر دیا تھا“ سونی نے کہا۔
 ”رہیں کہاں ہے؟“
 ”وہ دوسری طرف سے گھوم کے آ رہا تھا۔ تمہی نے تو

کہا تھا۔“
 میں نے سونی کا ہاتھ پکڑا اور اسے کھینچ کے مرغی خانے کے اندر لے گیا۔ ”تم یہاں گھومو۔ رہیں اکیلا ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔“

اس نے میرا ہاتھ پکڑا ”نہیں۔ تم زخمی ہو۔ تم باہر مت جاؤ۔ میں نے اس کا ہاتھ جھٹکنے کی کوشش کی“ ”بے وقوفی کی بات مت کرو“ معمولی زخم ہے۔“

وہ میرے ہاتھ سے لٹک گئی ”ابھی ایک منٹ گھر جاؤ۔ میں دیکھ لوں۔“

پچھلی طرف کی کھڑکی کا ایک شیشہ غازی آواز کے ساتھ ہی بکھر گیا پھر میں نے چلا کے کہا ”استاد۔ کلینر نے سب کو کلین کر دیا ہے باہر۔“

رہیں کی آواز مرغی خانے کی طویل ہیرک میں گونج بن کے پچھلی اندر سے کسی نے اسے جچ کے ایک ٹکڑا گالی دی پھر کلا شکوف کے برست کا دھماکا سنائی دیا۔ کئی کھڑکیوں کے شیشے ایک ساتھ ٹوٹ گئے مرغی خانے کے اندر مرغیوں نے آسمان سر اٹھالیا۔ مرغی اذان دینے لگے شاید ان کے لیے قیامت آگئی تھی۔ ہیرک کے اندر مرغیوں کے بچرے پانچ طویل قطاروں میں بے ہوئے تھے۔ ہر قطار کئی منزلہ بچروں پر مشتمل تھی۔ اس سے مرغی خانے کے اندر گھیاں کی بن گئی تھیں۔

رہیں پر فائر کرنے والے کے اور میرے درمیان شاید دو گھنٹاں حائل تھیں۔ اس کی فائرنگ سے رہیں یقیناً محفوظ رہا تھا۔ اس نے جواب میں فائر نہیں کیا تھا مگر میں نے اس کے چلانے کی آواز بھی نہیں سنی تھی۔ میں اندازہ کر سکتا تھا کہ اسے بھی میری سلامتی کی قسمی فکر ہوگی۔ فائرنگ کی آوازیں رہیں نے اندر سے سنی ہوں گی اور سمجھ گیا ہوگا کہ مسلح محافظ مرغی خانے کی عمارت میں بھی موجود ہیں پھر الارم کی کڑت منہوس آواز نے اور سرچ لائنیں نے اسے یقین دلا دیا ہوگا کہ صورت حال میرے کنٹرول میں نہیں ہے۔

شاید الارم بند کرنے کے بعد میں نے سونی کے ساتھ

اندر آ کے غلطی کی تھی۔ مجھے رہیں کی بات کے جواب میں یہ کہنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا کہ سب ٹھیک ہے ابھی تک۔ اس سے پہلے ہی کلا شکوف کا برست چل گیا تھا۔

میں نے سونی سے اس کی کلا شکوف لے لی ”تم ملنا نہیں طرف سے گھوم کے جاؤ اور کارنر سے فائر کرو۔“ ”اور تم؟“

میں نے کہا ”میں بچروں کے اوپر چڑھتا ہوں۔ اوپر سے وہ صاف نظر آئے گا لیکن اتنا ہی صاف اسے میں نظر آؤں گا۔ اور لائن ہے۔ تم اس کی توجہ نیچے اپنی طرف رکھنے کی کوشش کرنا۔“

ہم سرگوشی میں بات کر رہے تھے لیکن اب یہ احتیاط بے سود تھی۔ کلا شکوف کے برست سے پہلے ہم نے یہ احتیاط نہیں کی تھی۔ اس وقت تک مرغیاں بھی ڈسٹرب نہیں ہوئی تھیں۔ رہیں پر فائر جھونکنے والے نے یقیناً سمجھ لیا ہوگا کہ کم سے کم ایک مرد اور عورت اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔

فولادی بچرہ دو فٹ اونچا تھا اور ایک طرح سے مرغیاں پانچ منزلہ فلیٹ جیسی عمارت میں تھیں۔ ان کے والے اور پانی کے برتن بڑی ترتیب سے ایسے لگائے گئے تھے کہ مرغیاں کچھ بھی ضائع نہ کریں۔ چوڑے گراؤنڈ فلور پر تھے اور ہزاروں کی تعداد میں ایک ساتھ بول رہے تھے۔ ان کی تیز آوازیں بڑی صراخ تھیں۔

بچرے کی چھت پر چڑھنا بہت آسان تھا۔ اس پر سیدھا کھڑا ہو کے چلنا اپنی موت کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا۔ روشنی کے پس منظر میں میرا جسم نیچے سے دیکھنے والے کو بہترین مارگٹ فراہم کرتا۔ میں لوہے کی جالیوں پر گھنٹوں کے بل چلتا ہوا آگے بڑھا۔ پہلے میں کلا شکوف کو اپنے سامنے رکھتا تھا پھر دونوں ہاتھ جما کے پیر آگے لاتا تھا۔ بچرے کی چھت کے خانے چار اچھ مریخ تھے اور ایک اچھ چوڑی فولادی

چوڑی کو ویلڈ کر کے بنائے گئے تھے۔ ان کے کنارے میرے گھنٹوں میں گڑ رہے تھے لیکن اس سے زیادہ اذیت میرے زخمی بازو سے رسنے والے خون کی وجہ سے ہو رہی تھی۔ دباؤ بڑھنے سے خون کا بہاؤ بڑھ گیا تھا۔ میرے بائیں ہاتھ کی پچھلی میرے ہی خون سے تر ہو رہی تھی اور میرے پورے بازو میں درد کی شدت بڑھتی جا رہی تھی۔

تقریباً تیس فٹ رینگنے کے بعد میں نے سر جھکا کے نیچے دیکھا۔ مجھے سونی بچروں کی دو دیواروں کے آخری کونے میں نظر آئی۔ وہ موڑ سے سر نکال کے جھانکتے ہوئے بہت چوکتی اور چوکس نظر آتی تھی۔ اس رجسٹ کے سپاہی کی طرح جس

نے کسی محاذ پر ایک مورچہ جانچ کر لیا ہو اور پیش قدمی کرتے ہوئے وہ جتنا پر اعتماد ہوتا ہی چھپے ہوئے دشمن سے محتاط بھی ہو کر یہ بھول جائے کہ شکست خوردہ فوج کا کوئی بچ جانے والا سپاہی پیچھے سے بھی حملہ کر سکتا ہے۔

جب میں نے دوسری طرف کی گلی میں دیکھا تو میرا خون میری رگوں میں جم جاتا تھا۔ ایک شخص ہاتھ میں مشین گن لے کر کچھ سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ کیا پتا اس کے کانوں نے سونی کے قدموں کی آہٹ یا کوئی آواز سن لی تھی جس نے اسے شک میں ڈال دیا تھا پھر وہ دے پاؤں آگے بڑھنے لگا۔

سونی اپنے سامنے دو سرگی گلی میں جھانک رہی تھی اور پیچھے سے آنے والے دشمن کی طرف سے بالکل بے خبر تھی۔

میرے سامنے دو ہی راستے تھے۔ یا میں احتیاط سے نشانہ لے کر اس شخص کی گھوڑی اڑا دوں یا چلا کے سونی کو خبردار کر دوں۔ دونوں راستے خود میرے حق میں ایک سے خطرناک تھے۔ اس کے بعد میں چھپ کر اوپر نہیں رہ سکتا تھا۔ مخالف سمت میں اگر کہیں کوئی دوسرا دشمن بھی تھا تو وہ چڑھ کے میری پوزیشن دیکھ سکتا تھا اور مجھے نشانہ بنا سکتا تھا۔ اگر وہ شخص میرے قریب ہوتا تو میں اوپر سے چھلانگ لگا کے اسے ایسے دو چکا کہ اسے آواز نکالنے کی صلت بھی نہ ملتی مگر وہ مجھ سے پس ہٹا نہیں فٹ کے فاصلے پر اور سونی سے صرف چند قدم دور تھا۔ چانک مجھے اپنے سامنے فولادی جال جیسی چھت پر

ایک ڈنڈا نظر آیا۔ اس کے ایک کنارے پر سخت بالوں والا گول برش تھا جو بچروں کے اوپر والے حصے سے گزری کے جالے وغیرہ صاف کرنے میں استعمال ہوتا ہوگا۔ میں نے اسے اٹھایا اور پوری طاقت سے آگے بائیں ہاتھ کی گلی میں پھینک دیا۔ چھ فٹ لمبے ڈنڈے والا برش پہلے سامنے بچرے سے ٹکرایا اور پھر خاص آواز کے ساتھ مرغی خانے کے فرش پر گر آیا۔ شخص جو سونی کی طرف بڑھ رہا تھا ”ایک دم چوک کے پلٹا اور اپنی مشین گن کا رخ سامنے رکھتے ہوئے چند قدم آگے بڑھا۔ اب سونی کی طرف اس کی پینچہ تھی۔ وہ اپنے سامنے فرش پر پڑے ہوئے چھ فٹ لمبے ڈنڈے کو دیکھ رہا تھا اور یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ اس ڈنڈے والے برش کو وہاں کس نے پینچا؟“ ابھی کچھ دیر پہلے وہ اسی سمت سے کھلی آنکھوں کے ساتھ گزرا تھا۔ اس وقت برش یقیناً وہاں نہیں تھا۔ مرغیاں اب کچھ پرسکون ہو گئی تھیں یا ہمارے کان ان کی آوازوں کے عادی ہو گئے تھے کہ ڈنڈا کرنے کی آواز خود میرے کانوں نے ایسے سنی جیسے وہاں اور کوئی آواز نہیں تھی۔ خود سونی اسی آواز پر چوک کے پیچھے دیکھنے پر مجبور ہو گئی

تھی۔ اس نے آٹھ فٹ چوڑے بچرے کی دیوار کی اوٹ سے پیچھے والی گلی میں جھانکا اور اس شخص کو دیکھ لیا جو مشین گن اٹھائے اپنے سامنے رکھ رہا تھا۔

سونی اسے دیواروں کی ایک گولی سے منہ کے بل مگر اسکتی تھی یا پیچھے سے چند قدم کا فاصلہ دے پاؤں ملے کر کے اس پر ایک جھٹکا سکتی تھی اور اسے گولی چلائے بغیر بھی جان سے مار سکتی تھی۔ سونی کا دعویٰ تھا کہ اسے ایک نازک اور کمزور عورت سمجھا غلطی ہوگا۔ اپنے ہاتھوں کے ہتھیار سے بیک وقت چار مردوں کی طاقت کا غور اور ان کی اکڑی ہوئی گردن توڑ سکتی ہے۔ تاہم وہ جوڑو کرانے کی سند یافتہ فائٹر نہیں تھی۔ اس نے جو بھی سیکھا تھا ڈاکوؤں کے گردہ میں رو کے سیکھا تھا اور اس میں نہیں جانتا تھا کہ اسے تربیت دینے والے خود کتنی مہارت رکھتے تھے۔ مجھے ابھی تک سونی کی اس صلاحیت کا عملی مظاہرہ دیکھنے کا کوئی موقع بھی نہیں ملا تھا۔

چنانچہ میں نے سکون کا سانس لیا جب سونی نے جسم کے بجائے اپنی عقل کو استعمال کیا۔ اس نے دیوار کو آہستہ سے فولادی بچرے پر ایک بار مارا۔ اسے دیکھنے والا دشمن ایک بار پھر اچھل کے پلٹا اور اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا ”کون ہے؟“ مجھے اس کی آواز سے اندازہ ہوا کہ وہ کچھ خوف زدہ اور نروس ہے۔ اس کے پیچھے ایک طویل خالی گلی تھی۔ شاید اس نے چند قدم دور موڑ کو اپنے لیے زیادہ محفوظ خیال کیا۔ وہ ایک دم آگے بڑھا۔

پھر وہی ہوا جو دار گیم کے قواعد اور اصولوں کے مطابق تھا۔ سونی اس کے استقبال کے لیے دیوار اٹھائے بالکل تیار تھی۔ اس نے موڑ کا ٹوٹا سے کچھ دیکھنے یا سننے کی صلت ہی نہیں لی۔ سونی کا دیواروں والا ہاتھ پوری قوت سے نیچے آیا۔ اس کے سر پر دیوار دہری قوت کے ساتھ لگا کیونکہ سر بھی تیزی سے دیوار کی طرف بڑھا تھا۔ اس شدید ضرب کے بعد وہ اپنے بیروں پر کھڑا نہیں رہ سکتا تھا مگر گرنے سے پہلے اس نے قلعے سے بڑی مکروہ آواز نکال کے کہا ”ہائے“

اُسے پیچھے سے کسی نے اس پر درد فریاد سے متاثر ہو کے اور احتیاط کے سارے تقاضے بھول کے کہا ”اُسے کی ہو گیا؟“

اس کے ساتھ ہی میں نے رہیں کے چلانے کی آواز سنی۔ اسے شاید یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ وہ میری آواز تھی۔ وہ پیچھے ہیرک کے دوسرے کنارے والے دروازے کو کھول کے اندر آ گیا تھا۔ ہاتھ میں کلا شکوف ہونے کے باوجود وہ دروازے کے فریم میں کھڑا ہوا استثنائی آسان مارگٹ بن گیا تھا۔

رہیں نے آگے قدم بڑھانے سے پہلے گرد و پیش کا

جائزہ لیا۔ شاید اسے اپنے سامنے کوئی دوست یا دشمن نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے پھر مجھے آواز دی "اے بے یوں کیوں نہیں۔ زندہ ہے کہ مر گیا؟"

میں نے ذرا تھکے ہوئے اس کے اوپر سے گالی دی "تو کیوں اندر آ گیا مرنے کے لیے؟"

مجھے معلوم تھا کہ ہمارا ایک دشمن ابھی بیک کے اندر موجود ہے۔ اس نے اپنے ساتھی کی پیچ پر ایک منٹ پہلے پوچھا تھا "اوسنے کی ہو گیا؟" پھر اس کے بعد نہ وہ نظر آیا اور نہ اس کی آواز سنائی دی تھی۔ شاید وہ ہمیں چھپ کے انتظار کر رہا تھا۔ اسے اب تک یقیناً معلوم ہو گیا تھا کہ بیک میں کم سے کم دو مرد اور ایک عورت موجود ہیں۔ وہ سب مسلح ہیں اور خطرناک عزائم رکھتے ہیں۔

میرے پیچھے سے سونی نے چلا کے کہا "رہیں۔ آگے مت آؤ۔ کوئی اور بھی ہے یہاں۔"

رہیں اسی بے روانی سے کھڑا رہا "تم ٹھیک ہو نا۔"

"ہاں مگر تم کیوں گھڑے ہو ایسے؟"

رہیں نے اس کی بات کے جواب میں غیر سنجیدگی سے کہا "پھر کیا کروں؟ بیٹھ جاؤں؟ وہ کہاں ہے تمہارا باس۔ اس کی آواز کیسے اوپر سے آئی تھی۔"

میں نے اوپر سے کہا "میں عالم بالا میں ہوں۔"

ہمارا وہ دشمن جو مرئی خانے کے اندر ہی کہیں دیکھ گیا تھا آسانی سے رہیں کو عالم بالا کے سفر روانہ کر سکتا تھا مگر ایسا لگتا تھا کہ اس نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ اکیلا رہ جانے کے بعد اس میں جنگ جاری رکھنے کا حوصلہ نہیں رہا تھا۔ وہ اس کو لا حاصل سمجھتا تھا۔

میں نے اوپر رہتے ہوئے آگے جانے کا فیصلہ کیا۔ بازو کے سارے پر اپنے جسم کے بوجھ کو گھسیٹنا اب ممکن نہیں رہا تھا۔ میرے پورے ہاتھ میں دردنا قابل برداشت ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے مجھے کبھی گولی کا زخم نہیں آیا تھا اور میں نے ابھی تک آئینہ بنا کے دیکھا بھی نہیں تھا۔ زخم کھرا بیٹھا تھا۔ مگر مجھے یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ کہیں گولی اندر ہی نہ اٹک گئی ہو۔ کبھی بات صرف یہ تھی کہ گولی نے بازو کی ہڈی کو نہیں توڑا تھا اور ہمیں ہاتھ میں کلا شکوف اٹھانے میں نے مرئی خانے کی چھت پر چلنا شروع کیا تو پیچھے سے سونی نے چلا کے کہا "تم کہاں جا رہے ہو ایسے؟"

میں نے پلٹ کے دیکھا "رہیں سے ملنے، تم بھی آ جاؤ۔ بیٹھا مر اور کوئی بھی ہے اندر۔؟" وہ بولی۔

میں نے کہا "وہ بھی مارا جائے گا کتنے کی موت۔ جیسے

دوسرے مارے گئے۔ بہتر ہے کہ وہ سامنے آ جائے۔"

یہ بات میں نے اس شخص کو سامنے کے لیے کہی تھی۔ چند قدم آگے جا کے میں نے اعلان کرنے کے انداز میں کہا "ہیلو، تم جہاں بھی ہو سامنے آ جاؤ۔ تم میری آواز سن رہے ہو نا؟ اب تم کچھ نہیں کر سکتے۔ تم یہاں سے باہر بھی نہیں جا سکتے۔ خود کو ہمارے حوالے کر دو۔"

سونی نے پیچھے سے رہیں کو آواز دی "تم روانہ ہو رہو اور ہمیں ہوں۔"

رہیں نے چلا کے جواب دیا "مگر مت کرو۔ وہ جو بالکل نہیں سکتا کچھ کرے۔"

میں نے احتیاط سے اپنی پیش قدمی جاری رکھی۔ میری نظر مرئی خانے کے اندر ہر گوشے کا جائزہ لے رہی تھی اور میرے کان کوئی آہٹ سننے کے لیے تیار تھا۔ مجھے کچھ اندازہ تھا کہ ہمارا دشمن کس علاقے میں ہو سکتا ہے۔ اس کی آواز کس سمت سے آئی تھی اور وہ کہاں جا سکتا ہے؟

پتھروں کی دیواروں کے درمیان اس گئے جھننے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ صرف ایک جگہ چھپ سکتا تھا۔ کسی بچرے کے اندر۔ مرغیوں کے درمیان۔ اس امید میں کہ کسی کی نظر مرغیوں کے ساتھ بچرے میں ایک انسان کو نہیں دیکھے گی۔ وہ بالکل سامنے آ جائے والے کو شٹ کر کے ایک طرف سے فرار ہونے کا راستہ صاف کر سکتا تھا۔

میں نے ہاتھ کے اشارے سے رہیں کو اور سونی کو سمجھایا۔ "سونی، تم یہ دروازہ بند کر دو۔ اس طرف سے آگے بڑھو۔ رہیں تو بھی ادھر والا گیت بند کر کے آ جا۔ میں اوپر سے دیکھ رہا ہوں۔ کسی نے بھی گیت تک پہنچنے کی کوشش کی تو مارا جائے گا۔ وہ ادھر ہے۔ تو دوسری طرف سے آگے آ جا اور دیکھو پتھروں کے اندر بھی دیکھتے رہو۔ وہ کسی بچرے میں گھس گیا ہو گا۔ مرغیوں کے پیچ میں چھپا بیٹھا ہو گا۔"

سونی نے اور رہیں نے گیت بند کر دیے۔ اب ہمارا دشمن محصور ہو چکا تھا اور اس کے زندہ بچ نکلنے کا امکان باقی نہیں رہا تھا۔ وہ سب کو مار کے جا سکتا تھا یا پھر جاں بخشی کی درخواست کے ساتھ ہتھیار ڈال سکتا تھا لیکن وہ میری توقع سے زیادہ جالاگ ثابت ہوا۔

میں نے اچانک اسے سونی کے پیچھے کھڑا دیکھا۔ سونی کو بالکل علم نہیں تھا کہ دشمن پیچھے سے وار کرنے والا ہے۔ اس پوزیشن میں خود میرے لیے اس کو نشانہ بنانا مشکل تھا۔ فائزنگ کی زد میں سونی بھی آ سکتی تھی پھر ایک دم ساری دونوںیاں گھل ہو گئیں۔ مرئی خانے کے اندر گھپ اندھیرا پھیل گیا۔

اس شخص نے ایک دست لگا کے سونی کو پیچھے سے دبوچ لیا۔ خبردار! خبردار! میں اسے جان سے مار دوں گا۔ خبردار! آگے مت بڑھنا۔ خبردار! مجھ پر گولی چلائی تو یہ پہلے مرے گی، خبردار۔"

صاف ظاہر تھا کہ حملہ کرنے والا مسلح اور ایک طاقتور مرد ہونے کے باوجود نرموس تھا۔ اس نے چند سینکڑے کے فاصلے میں پانچ بار ہمیں خبردار کیا تھا۔

سونی نے ایک جج ماری۔ وہ اس آفت ناگمانی کے لیے بالکل تیار نہیں تھی۔ اسے دشمن کا خطرہ سامنے سے تھا۔ "بھوڑو۔ بھوڑو۔ بھوڑو۔"

رہیں نے بدحواسی میں میری طرف دیکھا "اے یار! گولی مت چلاتا۔"

ایک لمحے کے لیے میں نے خود کو بے بس اور شکست خوردہ محسوس کیا۔ سونی اس مضبوط ہاتھ پاؤں اور ٹھوس کسرتی بدن والے جوان مرد کی گرفت میں ایسے لگ رہی تھی جیسے شکاری باز کے پنجے میں پھر پھرانے والی پھونسی سی چڑیا۔ "چل نیچے پیٹنگ دے یہ توپ۔" اس نے سونی کو ایک ہتھکڑا دیا۔

سونی نے کلا شکوف دور پیٹنگ دی اور مدد کے لیے چلانے لگی "مجھے بچاؤ۔"

"زیادہ شور مت کرو۔ اپنے یاروں سے کہہ ہتھیار ڈال دیں ورنہ۔" ورنہ کے ساتھ ہی اس نے اپنا ریوالور سونی کی گردن پر دبا دیا۔

سونی نے سر آگے جھکا دیا "خدا کے لیے۔"

میں نے اپنی کلا شکوف نیچے ڈال دی "دیکھو۔ تم کو باہر جانا ہے نا جاؤ۔ کوئی تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔"

رہیں نے بھی میری تقلید کی "لیکن دیکھو! اسے کچھ نہیں ہونا چاہیے۔"

اس شخص نے ایک فاتحانہ برحقہ انداز میں سر ہلایا "کچھ نہیں ہو گا ایسے لیکن جالا کی مت کرنا میرے ساتھ۔ باہر جو تمہارے ساتھی ہیں ان سے بھی کہہ دو۔"

میں نے کہا "باہر کوئی نہیں ہے۔"

"بھوت بولتے ہو تب خبر دیکھ لوں گا میں" وہ سونی کو پیچھے کھینچتا ہوا اپنے پاؤں دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ مجھے بہت مایوسی ہوئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ سونی خود کچھ کرے گی۔ اس نے کئی بار دھمکے کے تھے کہ وہ مارشل آرٹ میں سند نہیں رکھتی اور کوئی ٹیک جیٹ تو نہیں مگر اسے خالی ہاتھوں سے لڑنا آتا ہے۔ وہ اپنا دفاع جانتی ہے اور مقابلے پر

چار مرد بھی ہوں تو وہ انہیں خاک چاٹنے پر مجبور کر سکتی ہے لیکن وقت آنے پر اس کے سب دھمکے جھوٹے ثابت ہوئے تھے۔ وہ عام بزدل اور احمق لڑکیوں کی طرح چلا رہی تھی اور بے تحاشہ انداز میں ہاتھ پیر چلا کے خود کو چھڑانے کی ناکام کوشش میں مصروف تھی۔

یہ اندازہ میں کیسے کر سکتا تھا کہ سونی اپنے حریف کو فریب میں مبتلا کر کے فائدہ اٹھانا چاہتی ہے۔ اچانک میں نے اسے آگے جھٹکا دیکھا پھر جو شخص اس کے پیچھے تھا وہ ایک دم اوپر اٹھا اور اس کے اوپر سے گزر کے فرش پر گر کر ٹل گرا۔ دسکی زبان میں اسے دھونکی پٹخا کہا جاتا ہے۔

ریوالور اس کے ہاتھ سے ایسے نکل کے اڑ گیا کہ ہاتھوں کے طرے اڑ گئے کا محاورہ بچ ہو گیا۔ ابھی اسے کچھ سمجھنے یا سمجھنے کا خیال بھی نہ آیا ہو گا کہ سونی نے اسے ٹھڈے مار مار کے بے حال کر دیا۔ پسیلیوں میں پڑنے والی ہر ہر ہر ٹھوکر کے ساتھ وہ ادھر سے ادھر ہوتا جا رہا تھا اور اس کے حلق سے ہائے ہائے کی درد بھری صدا اٹھیں بلند ہو رہی تھیں لیکن اس سے زیادہ واضح وہ گالیاں نہیں دے سونی غیظ و غضب سے مغلوب ہو کے دے رہی تھی۔ یہ ایسی گالیاں تھیں جو سو فیصد مروانہ کبھی جاتی ہیں اور پھر بھی مرد عام طور پر نہیں دیتے۔

جب اس نے لپک کے کلا شکوف اٹھائی تو میں سمجھ گیا کہ اب سونی کیا کرے گی "رک جاؤ سونی!" میں نے چلا کے کہا ورنہ وہ دشمن کا سر ہٹا دیتی۔

آہستہ آہستہ سونی کا اور اٹھا ہوا ہاتھ نیچے آ گیا۔ "یہ مجھے جان سے مارنا چاہتا تھا۔ اس کی تو۔" وہ زخم خوردہ میری کی طرح غرائے لگی۔

رہیں نے فحشی کا اظہار کیا "اب بس بھی کرو۔ ہم نشت لیں گے اس سے۔"

مرئی خانے کے اندر کی صورت حال اب پوری طرح ہمارے قابو میں تھی۔ مسلح محافظوں میں سے دو کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ مر چکے ہیں۔ ایک ناک آؤٹ ہونے کے بعد مردوں کی طرح التاریا ہوا تھا اور اس کے بارے میں کچھ بھی کہنا مشکل تھا کہ وہ اٹھنے کے قابل ہونے سے پہلے ہی دنیا سے نہیں اٹھ جائے گا۔ صرف ایک شخص بھاگتی ہوش و خواس فرش پر پت لپٹا سونی کو دہشت اور بے یقینی کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ شاید اس نے کبھی سوچا بھی نہ ہو گا کہ موت اتنی حسین ہوتی ہے۔

کلا شکوف میں نے پہلے ہی نیچے پیٹنگ دی تھی۔ میرے

لے دو نوں ہاتھوں کے سارے پر جسم کا بوجھ سنبھال کے کھٹا مشکل تھا۔ احتیاط کے ساتھ چھلانگ مارنا مجھے زیادہ آسان لگا۔ اس وقت تک میرا دیکھنا غائب ہونے پر ایسے اترنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا جیسے بعض تاریکی میں درحقیقت مزاحیہ فلموں میں کوئی مجاہد تھوڑا لڑتا ہوا اللہ اکبر کا نعروں لگا کے قلعے کی فصیل سے سیدھا اپنے گھوڑے کی پیٹھ پر اترتا ہے اور پھر سائیکل کھڑے ہوئے گھوڑے کو اڑانے کے سہیت دوڑاتا ہوا ایسے نکل جاتا ہے کہ قلعے کے محافظ یا دشمن کے سپاہی منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

ایسا صرف ٹانگ غلط ہوجانے کی وجہ سے ہوا ہوا یوں کہنا چاہیے کہ صحیح ٹانگ کی وجہ سے ہوا۔ اوہر میں نے چھلانگ لگائی، اوہر میں جس بھی کا مشکوف اٹھا کے دوڑا۔ وہ جہنم کے انداز میں سوئی سے کچھ کہہ رہا تھا اور بد قسمتی سے وہ ٹھیک وقت پر میری اس جگہ پہنچ گیا جو میں نے فضا سے زمین پر اترنے کے لیے منتخب کی تھی۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے۔ میں رہیں پر ایسے ہی اترتا جیسے ہیرو اپنے گھوڑے پر اترتا ہے مگر میں کوئی فلمی گھوڑا نہیں تھا چنانچہ میں اور وہ ایک ساتھ فرش پر لٹ گئے۔

میں نے مجھے گالیاں بکنا ہوا اٹھا "نظر نہیں آتا الو کے پنچے۔"

میں نے اپنے زخمی بازو کو سنبھالا "یہی سوال میں تجھ سے کرتا ہوں۔ دکھائی نہیں دیتا کہ اوپر سے ایک شریف آدمی اتر رہا ہے۔"

"شریف آدمی ایسے کودتے ہیں راہ چلنے لوگوں پر اور اوپر سے اترنے کا یہ کون سا طریقہ ہے؟"

میں نے دردناک لہجے میں کہا "دوست۔ میں ایک بر شکست شاہین ہوں۔ ایک ایسا جاز ہوں جس کا ایک بازو کام نہیں کرتا۔"

"قسم اللہ کی ایک پہلی تو بالکل چورا ہو گئی ہے۔" اس نے ایک سائڈ کو دبا کے کہا "ہائے اس سائڈ کی پٹلیاں سب نیڑھی ہو گئی ہیں۔"

میں نے کہا "میں بھی سخت لہو لہا ہوں۔ چلتے ہیں پہلے اسپتال۔ خود ہی اپنا پوسٹ مارٹم کرائیں۔"

سوئی نے برہمی سے کہا "یہ کیا فضول بک بک لگا رکھی ہے تم دونوں نے۔"

میں نے اچانک میرے بازو کو دیکھا "اے یہ کیا ہے؟"

سوئی نے چلائے جواب دیا "گولی تھی ہے اور کیا؟"

میں نے میرا بازو تھام لیا "یاد رکھو گھر ہے۔"

سوئی اور خفا ہوئی "افوہ تم اوہر آؤ خدا کے لیے اور اسے سنبھالو۔ میں زخم صاف کر کے پی باندھتی ہوں۔"

میں نے کہا "میرے لیے بھی کچھ کرو۔ مجھے اندرونی چوٹ آئی ہے۔"

میں نے کہا "بقول شاعر۔ جگر کی چوٹ اوپر سے کہیں معلوم ہوتی ہے۔ جگر کی چوٹ اوپر سے نہیں معلوم ہوتی ہے۔"

مگر رفتار ہونے والا تیس تیس سال کا جوان اور صحت مند آدمی تھا مگر سوئی سے مار کھا کے وہ جسمانی انداز سے زیادہ شرمندگی کے عذاب میں مبتلا تھا۔ اس کی مردانہ غیرت اور غور کا جنازہ نکل گیا تھا۔ اسے یہاں محافظ مقرر کرنے والوں نے کچھ دیکھ کر ہی اسے یہ ذمے داری سونپی ہوگی۔ اس کا جسم کسی تیل کی طرح مضبوط تھا۔ غذا گر دی اور بد معاشی میں بھی اس کا نام ہوگا اور ممکن ہے اس کا شاندار پولیس ریکارڈ بھی اس کی سند اور سفارش بن گیا ہو۔

میں نے اسے ایک لٹ رسید کی "شرم نہیں آتی ایسے رہا ہے جیسے کارپوریشن کا زہر کھالینے والا کتا۔ ابے ذوب کے مرجا کر نہیں۔ ایک لڑکی سے مار کھا گیا۔"

"کون۔ کون ہے یہ لڑکی۔ آہ۔" وہ اندر کی کسی تکلیف سے دہرا ہو گیا۔

"اس کا نام تانا ہوگا تم نے" میں نے کہا۔

اس نے تھوڑا سا سر اٹھایا "نام۔ کیا نام ہے اس کا؟"

"شامت اعمال۔ کیسا ہے؟" میں نے کہا۔

سوئی مسکراتے لگی "اب ذرا آپ سیدھے کھڑے ہو جائیں شرافت سے تو میں زخم کا معائنہ کروں۔"

"چھا تو خیر سے آپ ڈاکٹر بھی ہیں" میں نے اپنا بازو اس کی طرف کر دیا۔

"میں بہت کچھ ہوں۔ بہت بہت معلوم ہو جائے گا۔"

اس نے میری آستین اٹھا کے دیکھا اور پھر بلا ارادہ ایک پیچ ماری۔

میں نے کہا "کیا ہوا؟ بہت ملک زخم ہے؟ میرے نیچے کی کوئی امید نہیں؟"

اس نے دانت سے کپڑے کو کاٹ کے قہقہے کی آستین اٹک کر دی۔ "خدا کا شکر ادا کرو کہ گولی گوشت میں پیوست نہیں ہوئی۔ بڑی کو نقصان نہیں پہنچا۔"

"میں نے کہا تھا کہ معمولی خراش ہے۔"

میں نے اعتراض کیا "پھر اتنا خون کیسے بہہ رہا تھا۔"

"ایک دم کٹ گئی تھی۔" سوئی نے اوہر اوہر دیکھا

"بانی چاہیے زخم صاف کرنے کے لیے۔"

"مرغیوں کے ہر رتن میں پانی ہوگا۔" میں نے بولا۔

سوئی نے اسے ڈانٹا "جابلوں والی بات مت کرو۔ زخم خراب ہو جائے گا۔ صاف پانی کہاں لے گا؟"

نیچے پڑے ہوئے شخص نے گردن ہلاتی "اوہر۔ آفس میں پانی ہوگا۔"

آفس میں سخت افزا تقری کا ساں تھا۔ ایک کے اوپر دوسری لاش پڑی ہوئی تھی۔ ان دونوں کی کھلی آنکھیں ایک ہی سمت میں دیکھ رہی تھیں اور ان آنکھوں میں جیسے زندگی کا آخری لمحہ ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ لمحہ جس میں اپنی ساری زندگی کی بد اعمالی پر ندامت تھی اور دکھ تھا۔ وقت کے منصف کی دی ہوئی سزائے موت پر ایک جھپکتے میں عمل درآمد ہو جانے پر حیرانی تھی اور بے یقینی تھی اور شاید ایک آسف کا بعد از وقت ہونے والا احساس تھا کہ انہوں نے اپنی ہی زندگی کو مال حرام کی طرح قبل از وقت جوئے میں ہار دیا۔ حلال کی کمائی کی طرح سنبھال کے خرچ نہیں کیا۔

گڈی کے ایک اسٹول پر وائر کوکر میں صاف پانی موجود تھا۔ سوئی نے الٹی پڑی ہوئی کرسی کو سیدھا کر کے مجھے اس پر بٹھایا پھر وہ فرش پر پھیل جانے والے خون پر قدم رکھتے سے گھر پر کرتے ہوئے گورنگ تھی۔ پانی کے ایک ٹکڑا اس سے اس نے میرے بازو کے زخم کو دھو کر صاف کیا۔ یہ سرفی مائل پانی بہہ کر اس خون میں شامل ہو گیا جو اب ہم کر چکے تھے۔

میں نے کہا "سوئی۔ تمہیں خون دیکھ کے ڈر نہیں لگتا۔"

"پہلے تو میں خون کی بو سے بے ہوش ہو جاتی تھی۔"

اس نے اپنے دوپٹے کے ایک کنارے کو پھاڑ کے دو گز سے زائد لمبی پٹی نکالی "مگر ان ڈاکوؤں کے ساتھ رہ کے میں نے اس نفسیاتی خوف پر قابو پایا۔ ڈاکوؤں کے سردار نے مجھ سے کہا کہ لڑکی، دل مضبوط رکھو۔ آدمی کو بعض اوقات اپنے ہی پیاروں کے خون کو بہتا ہوا دیکھنا پڑتا ہے اور اسے اپنے ہاتھوں سے صاف کرنا پڑتا ہے۔ روکنا پڑتا ہے پھر ایسا ہوا۔"

ایک ڈاکو مقابلے میں شدید زخمی ہوا۔ اسے ہم اٹھا کے لے گئے اور رات بھر ایک چٹان کے پیچھے چھپے رہے۔ اس کے خون سے میرے ہاتھ ہی نہیں کپڑے بھی تر ہو گئے۔ صبح ہوئے وہ مر گیا اور ہم اس کی لاش کو وہیں چھوڑ کے نکل گئے۔

بعد جب میرا دل مضبوط ہو گیا تو میں سب کے زخموں کی زینت کرنے لگی۔ مزہم بنی کا سارا سامان وہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ ان کے پاس درد کا احساس مٹانے والی اور اینٹی

بائیوٹک دوائیں بھی تھیں۔ وہ اپنے گولی کے زخموں کا علاج کرانے کے لیے کسی ڈاکٹر کے پاس جانے کا خدوہ مول نہیں لے سکتے تھے۔

میں نے کہا "ڈاکٹر صاحب۔ یہ رسک تو میں بھی نہیں لے سکتا۔"

"یہاں سے نکلے ہی نہیں دوا کھاتی ہے سب سے پہلے۔"

اس نے بی باندھ کے کہا۔

"مگر گولی اندر ہی رہ جاتی تو بد اسلئے ہو جاتا۔" میں نے کہا۔

"کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ ایک تیز دھار والا چاقو ہو تو میں خود کر سکتی ہوں آپریشن۔ تین آپریشن کیے تھے میں نے سب کامیاب رہے۔"

میں نے اس کے کندھے پر جھکی دی "تشریف اس خدا کی جس نے تمہیں بتایا۔ پو آرو غدر فل۔"

اس نے گورنگی ٹوٹی سے اپنے ہاتھ دھوئے "چاکل کیسی خاموشی ہو گئی ہے یہاں۔"

"مجھے حیرانی ہے کہ باہر سے اس پھان چوکیدار نے کچھ نہیں کیا۔ اس نے سائزن کی آواز ضرور سنی ہوگی۔ سرج لائن بھی آن ہوئی تھیں پھر اندر اتنی فائرنگ ہوتی رہی۔ وہ وہیں کھڑا رہا۔ ذہن جہنم جہنم۔"

"ہمیں اب نکل جانا چاہیے یہاں سے۔ دیر کی تو بڑی مصیبت میں پھنس جائیں گے۔" وہ اندر والے دروازے کی طرف بڑھی۔

میں نے کہا "بی بی، مصیبت میں تو ہم پھنس چکے ہیں لیکن سب ہم نے کس کے لیے کیا تھا سوچو۔"

"مگر جہنم تو یہاں نہیں ہے۔"

میں نے کہا "میں ابھی مایوس نہیں ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ لے نہ لے اس کا سراغ ضرور ملے گا یہاں۔"

ہماری غیر حاضری کے مختصر وقفے میں رہیں نے قیدی سے جو تفتیش کی تھی وہ لاحقہ نہیں رہی تھی۔ اس نے تشدد کے خوف سے خود ہی بتا دیا تھا کہ اس پولیزی فارم کے نیچے اتنی ہی بڑی جگہ میں کچھ اور کام ہوتا ہے لیکن اس کام کی نوعیت کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا کیونکہ اسے نیچے جانے کی اجازت نہیں۔ اوپر والے حصے کی حفاظت پر چار افراد مامور تھے جو شام سات بجے سے صبح سات بجے تک ڈیوٹی دیتے تھے۔ ان کا کام تھا کہ کسی غیر متعلقہ شخص کو اندر داخل نہ ہونے دیں۔ کوئی اس کی کوشش کرے تو اسے بے دریغ کوئی ماریں اور تاج کی بالکل ٹکڑے کریں۔ قانون ان کا

بال بھی بیا نہیں کر سکتا۔ وہ کسی ملک رب نواز کے نام سے واقف نہیں تھا اور نہ اسے یہ علم تھا کہ مرغی خانے کا مالک کون ہے؟ عام قسم کی برائے مرغیوں کے لیے اتنے سخت حفاظتی انتظامات نے اسے بھی حیران کیا تھا مگر یہ بات اس پر شروع میں ہی واضح کر دی گئی تھی کہ اسے سوالات کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ وہ دوران ملازمت جو کچھ بھی دیکھے گا یا سنے گا اس کے بارے میں اپنی زبان بند رکھے گا ورنہ نوکری ہی نہیں اس کی زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔

ابھی اس سے بہت کچھ پوچھنا ہی تھا مگر ہم یہاں سوال جواب میں ساری رات نہیں گزار سکتے تھے مجھے اندر سے زیادہ باہر کی فکر تھی۔ گیٹ پر متعین چوکیدار کے اندر آکے صورت حالات کا جائزہ نہ لینے کی وجہ وہ ہو سکتی تھیں۔ ایک یہ کہ اندر کچھ بھی ہو اسے اپنی جگہ سے ہلنے کی اجازت نہیں تھی۔ دوسری یہ کہ گیٹ اندر سے بند تھا اور وہ خود اسے کھول کے اندر نہیں آ سکتا تھا۔ تاہم یہ بات قرن قیاس نہیں تھی کہ سائرن اور فائرنگ کی آواز سن کر وہ ہڑا ہو جائے اور قطعی لاشعری کے ساتھ ششیں گھٹنے باہر بیٹھا رہے۔ وہ دوڑ کے کسی قریبی فارم ہاؤس تک جا سکتا تھا اور فون کر کے پولیس کو طلب کر سکتا تھا یا مرغی خانے کے مالکوں کو اطلاع دے سکتا تھا کہ اندر سخت گڑبڑ ہے اور فائرنگ بھی بہت ہو رہی ہے۔ معلوم نہیں کون لوگ اندر کھس گئے ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟

ظاہر ہے یہ اطلاع ملنے کے بعد مالکان بھی ہاتھ پر ہاتھ رکھے نہیں بیٹھے رہ سکتے۔ ممکن ہے وہ گھر سے باہر کسی کاروباری یا جذباتی مینگ میں مصروف ہوں۔ یا پہلی کے ساتھ ذریعہ خاندانی تقریب میں شریک ہوں مگر یہ خبر سننے ہی وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے سیدھے ادھر آئیں گے۔ لاہور سے اس مرغی خانے تک پہنچنے میں انہیں آدھا ہون گھنٹا ہی لگے گا۔ اگلے دس پندرہ منٹ میں ان کا پوری تیاری کے ساتھ یہاں آکے جوانی کا دروائی کرنا بالکل یقینی تھا خواہ اس کے لیے وہ پولیس فورس کو استعمال کریں یا اپنی ذاتی فوج کو۔

میں نے اپنے خدشات کا اظہار کرنا ضروری سمجھا "یار رئیس! ہم یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتے۔"

"پھر کیا کریں؟ کام ادھر اور چھوڑ کے بھاگ جائیں؟"

رئیس جھکے بولا۔

"یار! یہ میں نے کب کہا ہے۔"

"نیچے جا کے دیکھنا تو چاہیے؟" رئیس بولا۔

"پہلے میں باہر دیکھ لوں۔ آخر وہ چوکیدار کہاں ہے؟"

میں نے کہا "ہم نے اس ڈرائیور سراج دین اور اس کے کلینر کو بھی باندھ کے ٹرک میں ڈال دیا تھا۔"

"وہ اتنی جلدی نہیں کر سکتے۔" رئیس بولا "اور بھاگ کے بھی کیس نہیں جاسکتے۔ بہت مضبوطی سے باندھا تھا میں نے۔"

"خطرے کے الارم کی آواز بہت دور تک سنی گئی ہوگی۔" سونی نے کہا "پھر بھی ادھر کوئی نہیں آیا؟"

رئیس نے کہا "کون آئے گا؟ ہر جگہ صرف چوکیدار محافظ بیٹھے ہیں۔ وہ اپنی ذیولٹی چھوڑ کے اتنی دور صرف یہ معلوم کرنے نہیں آ سکتے کہ سائرن خطرے کا ہے یا الگ گئے گا اور آواز کہاں سے آ رہی ہے؟ قریب ترین فارم ہاؤس بھی اس جگہ سے آدھا کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔"

"اس کا مطلب ہے فائرنگ کی آواز تو کسی نے نہیں سنی ہوگی" مجھے کچھ اطمینان ہوا۔

"فائرنگ ہیرک کے اندر ہوئی تھی۔ اس کی گھڑکیوں میں شیشے ہیں اور ہیرک ہر طرف سے بند ہے۔" رئیس بولا "پھر بھی تو ایک نظر دیکھ کے آجا۔"

سونی نے کلا شکوف اٹھائی میں بھی چلتی ہوں تمہارے ساتھ۔"

"ساتھ مت چلو۔ پیچھے رہ کے مجھے کور فراہم کرو" میں نے کہا "اور آپ رئیس خان صاحب 'مزید تحقیقات جاری رکھیں لیکن یہ مت بھولیں کہ اندر ایک اور شخص ہے جو بے ہوش ہوا تھا۔ کس اسے ہوش نہ آجائے۔"

میں نے باہر والے کمرے کا دروازہ کھول کے جھانکا۔ باہر روشنی میں گیٹ تک جانے والا راستہ صاف نظر آ رہا تھا۔ پلاٹاک مجھے گیٹ کے دونوں پت پورے کھلے ہوئے دیکھ کے لگا۔ باہر مجھے کوئی چوکیدار نظر نہیں آ رہا تھا۔ میری نظر خود بخود مخالف سمت میں گھوم گئی پھر مجھے دوسرا شاک لگا جو پہلے والے شاک کے مقابلے میں زیادہ سخت تھا۔ مرغیوں کا وہ ٹرک وہاں نہیں تھا۔ جس کو ہم نے اندر آنے کے لیے استعمال کیا تھا۔

"کیا ہوا؟" سونی نے پیچھے سے مجھے تھوڑا سا جش کیا۔

"رک کیوں گئے؟"

میں باہر آگیا "سونی۔ معاملہ گڑبڑ ہو گیا۔"

"اوہ!" اس نے بھی باہر قدم رکھتے ہی صورت حال کا اندازہ کر لیا۔ "کیسے بھاگ گئے ٹرک پہلے کمرے کیسے؟"

میں نے کہا "چوکیدار کی مدد سے اور کیسے؟"

واپس جا کے میں نے فوراً یہ خبر رئیس کو دی۔ اس کا

چہرہ ایک سوالیہ نشان بن گیا "یہ کیا کہہ رہا ہے تو؟ وہ ٹرک لے کر بھاگ گئے؟"

میں نے چڑ کے کہا "نہیں۔ ٹرک انہیں لے کر بھاگ گیا۔"

"لیکن یہاں سے میں نے تو ایسے باندھا تھا انہیں۔"

"خود جائے دیکھ لو" سونی نے کہا "گیٹ پورا کھلا ہوا ہے اور باہر کوئی بھی نہیں ہے۔"

رئیس سوچ میں پڑ گیا "مگر یار۔ تو نے کہا تھا کہ گیٹ اندر سے ہی کھولا جاسکتا ہے۔"

میں نے کہا "یہ میرے اندازے کی بات تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ ٹرک کے گزر جانے کے بعد پٹھان چوکیدار کو کسی بات نے شک میں مبتلا کر دیا۔ یا پھر جب پلاٹاک ہوا۔ سائرن بج کے بند ہو گیا اور سرچ لائٹس بھی آن ہوتے ہی پھر آف ہو گئیں تو وہ سمجھ گیا کہ ٹرک میں چھپ کے کچھ لوگ اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ جب ٹرک گیٹ سے گزرا تو وہ نماز پڑھ رہا تھا۔ اس نے ٹرک ڈرائیور یا کلینر کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی۔ غلطی اندر والے کی تھی جس نے فائرنگ کے اسکرین پر ٹرک کو آتا دیکھا اور ڈرائیور کی صورت پر دھیان دینے بغیر گیٹ کھول دیا۔"

رئیس نے سر ہلایا "لیکن اس کو نامی کا ڈے دار گیٹ کیپر کو ہی سمجھا جاتا۔ مالک نماز کے عذر کو کہاں سنتے ہیں۔"

سونی نے کہا "گیٹ کھولنے کا سسٹم اگر یہاں سے کنٹرول ہوتا ہے تو پھر ٹرک کے باہر جانے کے لیے گیٹ کس نے کھولا؟"

میں نے کہا "دیکھو کچھ اپنی عقل بھی استعمال کرو۔ چوکیدار گیٹ کے اوپر چڑھ کے اندر آگیا ہوگا اور گیٹ کے کھولنے بند کرنے کا نظام بے شک الیکٹرونک تھا مگر فرض کرو بجلی کا بریک ڈاؤن ہو جائے؟ ایسے دفاتر یا کارخانوں میں جہاں ہر کام بجلی سے ہوتا ہے عارضی سہائی بجال کرنے کے لیے جزیئر لگائے جاتے ہیں جو بجلی بند ہونے کے بعد خود بخود آن ہو جاتے ہیں لیکن یہاں نہ بجلی سے چلنے والی مشینیں ہیں اور نہ ایسے آلات چنانچہ کوئی آؤٹینک جزیئر بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔ ممکن ہے کس کوئی چھوٹا سا جزیئر رکھا ہو جسے ڈوری کھینچ کے خود ہی چلانا پڑتا ہے اور اس سے اندر باہر کی کچھ لائٹس جل جاتی ہیں۔"

"ابھی! زمین پر بیٹھے ہوئے غصے نے سر ہلایا۔ وہ پیچھے ایک جزیئر ہے۔"

رئیس نے اس کی گدی پر ایک ہاتھ مارا "تھو سے پوچھا

ہے کسی نے؟"

سونی نے اس کے دوسرا ہاتھ رسید کیا "مگر معلوم تھا تو اتنی دیر تک چپ کیوں بیٹھا رہا؟"

وہ مسکراتے لگا "پلو جی مارلو غریب مسکین کو ہانے ہانے۔ پلو تو تو جرم نہ پلو تو تو جرم۔"

سونی نے جھک کر اس کے بال اپنی مٹھی میں پکڑ لیے۔ "اتنی مسکراہٹ کیوں آ رہی ہے تیری مٹھی میں شکل پر۔"

وہ جھٹکوں میں وہ چلانے لگا "اب مسکراتا بھی جرم ہو گیا۔"

میں نے کہا "سونی۔ چھوڑ دو۔ اسے مجھے معلوم ہے یہ کیوں مسکرا رہا تھا۔ اس کو بڑی خوشی ہوئی ہے کہ ڈرائیور بھاگ گیا۔ اب آجائے کی پولیس اور ہم جائے واردات پر ہی پولیس مقابلے میں ہلاک ہو جائیں گے۔"

رئیس بولا "ہاں۔ ورنہ انعام ذمکتی اور قتل کے جرم میں چھائی چھٹا تو لازمی ہے ہمارا لیکن بیٹا تو یہ سب دیکھنے کے لیے کہاں زندہ رہے گا۔ چل اٹھ کھڑا ہو جا۔ سیدھی طرح اور آگے چل۔"

اس کی مٹھی بندھ گئی "مجھے مت مارو۔ تم جو کمرے میں کدوں گا۔"

رئیس نے اسے کھینچ کے کھڑا کر دیا "نیچے جانے کا راستہ کدھر ہے؟"

"میں۔ میں بتاتا ہوں۔" وہ لڑکھاتا ہوا آگے چلنے لگا مگر خوف سے اس کا پشیمان خطا ہو رہا تھا۔ وہ بار بار پلٹ کے دیکھتا تھا کہ کس ہم اسے پیچھے سے گولی نہ مار دیں۔

سونی میرے ساتھ ہو گئی۔ "تم کیا کہہ رہے تھے۔ گیٹ کسی نے اندر سے کھولا ہوگا۔"

میں نے کہا "ہاں۔ چوکیدار نے یہی کیا ہوگا۔ بجلی نہ ہونے کی وجہ سے یا کسی خرابی کے باعث الیکٹرونک کنٹرول کام نہ کرے تو کوئی خود گیٹ تک جا کے لاک کھول دیتا ہوگا۔ اور یہ بات چوکیدار یقیناً جانتا ہوگا۔ گیٹ کے اوپر سے اندر آنے کے بعد شاید اس نے مرغی خانے کی گھڑکیوں سے جھانک کے بھی دیکھا ہوگا اور اسے شیشوں سے اندر کا پورا نقشہ سمجھ میں آگیا ہوگا۔ وہ عقل سے کام نہ لیتا تو خود بھی میدان جنگ میں کود پڑتا اور مارا جاتا۔ اس نے جان بچا کے نکل جانا بہتر سمجھا۔"

"یعنی وہ خود ٹرک لے کر بھاگ گیا؟"

"اس امکان کو مسترد نہیں کیا جاسکتا" میں نے کہا۔

رئیس پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر بولا "پتا نہیں انہیں گئے

ہوئے کتنی دیر ہوئی؟

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ ہمارے پاس دس پندرہ منٹ ہیں۔"

سونی نے مجھ سے اتفاق کیا "دس منٹ میں ہمیں بھی نکل جانا چاہیے۔"

آگے چلتے والا بائیں جانب مڑ کے ایک دروازے پر رک گیا۔ دروازے میں کوئی قفل نہیں تھا۔ ہمیں کے اشارے پر اس نے کنڈی کھول کے دروازے کو باہر کھینچا۔ اس کے ساتھ ہی پولی فیلڈ یعنی مرغیوں کو دی جانے والی خوراک کی سواند کا ایک جھوٹا آباہر انٹری یعنی خوراک میں کام آنے والی مرغیوں کا وزن تیزی سے بڑھانے کے لیے انہیں پانی پر زمین غذا دی جاتی ہے جس کا ایک جزو سوکھی سڑی پھلیاں ہوتی ہیں۔ میں نے یہ بھی سنا تھا کہ ذریعہ خلیجی قربان کئے جانے والے جانوروں کا خون اور آلائش بھی اس میں مخصوص طریقے سے ملائے جاتے ہیں۔

ہمیں نے برا سادہ بتایا "پہلے ہی کیا کم ہو تھی یہاں۔" "میرے تو دماغ میں بس کئی ہے یہ ہو۔" سونی نے کہا۔ باہر والے کنڈی کے گیٹ کے پیچھے لوہے کی سٹ جانے والی مضبوط گرل تھی اور اس میں بہت بڑا تالا نظر آ رہا تھا۔ "اس کی چابی نہیں ہے میرے پاس! کسی کی جیب میں ہوگی" قیدی نے ادھر اشارہ کیا جہاں اس کے تین ساتھی چپ چپے تھے۔

ہمیں نے جال سے اندر جھانکا۔ "اے یہاں تو بوریاں رکھی ہیں نیچے سے اوپر تک۔ یہ پولی فیلڈ کا گودام ہے۔" اس نے سر ہلایا "ان بوریوں کے بیچ میں سے گزرنے کا راستہ ہے۔ آگے زینہ آجائے گا۔ اس کا دروازہ بھی ایسا ہی ہے۔"

"یعنی اس میں بھی تالا ہوگا؟" "ہاں۔ میں اندر بھی نہیں گیا مگر مجھے معلوم ہے۔" ہمیں نے میری طرف دیکھا "پاس کیا خیال ہے؟ چابی لے کر آؤں یا ایسے ہی آؤں آئے گا۔"

میں نے کہا "اڑاؤ۔" ہرک میں ایک فائر کی آواز گونجی اور تالا نیچے گر گیا۔ گولی نے تالے کا کچھ نہیں بگاڑا تھا مگر اس کب کو توڑا تھا جس میں تالا بڑا ہوا تھا۔

"چمک کنڈی کھول اور آگے ہوجا۔" ہمیں ہولا "نام کیا ہے تیرا؟"

"اسلم" اس نے کنڈی کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور

پھر ایک بیچ ماری۔

"اب کیا ہو گیا؟" ہمیں نے پوچھا۔

"ادھی ہاتھ جل گیا" وہ زور زور سے ہتھیلی پر پھونک مارنے لگا۔

سونی نے پیچھے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا "تم سب کا ایک ساتھ اندر جانا ٹھیک ہے؟" میں نے پلٹ کے تعریفی انداز میں سر ہلایا "بالکل ٹھیک نہیں ہے۔"

"ایسا نہ ہو باہر سے پولیس ہمیں گھرے۔ ہم سب اندر ایسے پکڑے جائیں جیسے چوہے دان میں چوہے پھنس جاتے ہیں" وہ بولی "میں باہر جاتی ہوں۔"

"نہیں" میں جانتا ہوں "ہمیں پیچھے ہٹ گیا" تم کیا کرو گی باہر جاکے؟

"وہی جو تم کرو گے" سونی نے جڑ کے کہا۔ "کچھ سمجھا کہ سونی" تم ایک لڑکی ہو" ہمیں نے اسے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

سونی بگڑی "تو اس مت کرو۔ آخر کیا کہنا چاہتے ہو تم لڑکی ہوں تو میں بے وقوف ہوں۔ کنڈی ہوں" جو تم کر سکتے ہو" میں وہ نہیں کر سکتی۔

ہمیں سر جھکانے لگا "یار یہ مطلب نہیں تھا میرا۔" "سب سمجھتی ہوں تمہارا مطلب۔ یہ بات آئندہ مت کرنا میرے سامنے۔ تمہارے جیسے دس کے لیے کافی ہوں میں ایک۔"

ہمیں کھیانا ہو گیا "مجھے معلوم ہے سونی!" میں نے سونی کا غصہ ٹھنڈا کیا "ٹھیک ہے" تم جاؤ۔ لیکن ذرا مجھے بتاؤ کہ تمہارے ذہن میں کیا ہے کیا کوئی تم؟

"میں گیٹ سے کسی کو اندر نہیں آنے دوں گی۔ بھون کے رکھ دوں گی سب کو" اس نے کھا شکوف اٹھا گے اپنے عزائم کا اعلان کیا۔

ہمیں افسوس سے سر ہلانے لگا "شریف خواتین کچن میں مسالا بھرتی ہوئی اچھی لگتی ہیں۔ ہانڈی میں نیچہ چلاتی ہیں کھا شکوف نہیں۔"

"وہ بھی کرتی ہوں میں مگر وہ جو تمہاری نام نہاد شریف خواتین ہیں نا چور کا سایہ دیکھ کے کانپنے لگتی ہیں اور ریو اور دیکھ کے بے ہوش ہو جاتی ہیں۔"

ہمیں ہولا "نام نہاد پر میں شریف خواتین کی طرف سے احتجاج کرتا ہوں۔"

"سونی تم جاؤ۔ یہ فضول باتوں کا کون سا موقع ہے۔" میں نے اسے ڈانٹ کے کہا "اور دیکھو" بلاوجہ کا خون خرابا مجھے پسند نہیں۔ خود کو ہمارا ثابت کرنے کے جوش میں حد سے مت بڑھ جانا۔ ہم جانتے ہیں تم ہمارا ہو۔"

"نہیں باس!" اس نے مجھے شرارت سے سیلوٹ کیا اور اباؤٹ ٹرن ہو گئی۔ ہمیں اسے دیکھتا رہا "قسم اللہ کی پیارے! یہ بھی اللہ میاں نے اپنی قسم کی ایک ہی چیز بنائی ہوگی۔"

اسلم کے آگے پیچھے ہم فرش سے چھت تک اوپر تلے رکھی ہوئی چوٹی کی بوریوں کے درمیان سے گزرے۔ یہ ایک تپا سی گلی تھی جس میں سے ایک وقت میں ایک ہی شخص کا گزر ممکن تھا۔ تقریباً دس فٹ کے بعد سامنے ہی بوریوں کی دیوار پگھلی اور انگریزی حرف ت کی شکل میں راستہ دامن بائیں تقسیم ہو گیا۔ سیدھے ہاتھ کی گلی آگے سے بند نظر آ رہی تھی۔ اسلم بائیں جانب چلنے لگا۔ یہ گلی دوسرے دروازے پر پہنچ کے ختم ہو گئی۔

گودام کے اندر کی چھت ہرک جیسی نہیں تھی۔ اس کی دیواریں سپاٹ تھیں۔ چھت دس فٹ کی بلندی پر بالکل سیدھی تھی اور نیچے بولی لگتی تھی۔ میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ ہم مرغی خانے کے پہلے حصے میں لیکن اس کی حدود سے باہر ہیں۔ گودام کا آدرا سی اسٹرکچر مرغی خانے کے مقابلے میں نیا لگتا تھا اور یہ حصہ کسی خاص مقصد کے تحت بعد میں بنایا گیا تھا۔ اس کا راستہ بھی مرغی خانے سے ہو کر گزرتا تھا اور اس دہرے حلقہ میں نظام کے باعث کسی غیر متعلقہ شخص کا بلا اجازت اندر پہنچنا عملی طور پر ناممکن تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے خیال آیا کہ اس زمین دوز حصے کی تعمیر میں بھی ایک بحرمانہ رازداری سے کام لیا گیا ہوگا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی ہوگی کہ مرغی خانے کے اصل نقشے میں اضافی دو ڈبوں کا عمل جاری ہے۔ شاید اصل نقشے میں کسی خانے کا وجود نہیں تھا۔ جب اس کی ضرورت محسوس ہوئی تو تعمیراتی ماہرین نے اوپر کی عمارت کو ہٹائے اور ہالے بنائے۔

بغیر نیچے ایک پوری منزل ایسے بنادی جیسے گراؤنڈ فلور پر فرسٹ فلور کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ تعمیر کا یہ عمل اٹا تھا اور بظاہر بہت مشکل۔ فرش کے نیچے کسی عمارت کے لیے جگہ نکالتے ہوئے خیال ضرور آتا ہے کہ کہیں اوپر کی پوری عمارت ہی نہ جینے جائے مگر آج کل وہ سب ممکن ہے جو کل تک ناممکن تھا۔ زمین کے نیچے ریلوے اسٹیشن ہیں اور ریل گاڑیاں دوڑ رہی ہیں۔ برطانیہ اور فرانس کے درمیان حامل

انگلش چیمبل میں اوپر بحری جہاز جو سفر ہیں اور پانی کے نیچے کی سرنگ میں زمین کی آمد رفت جاری ہے۔

ہمیں نے ایک اور فائر کر کے خانے کے فولادی گیٹ کا تالا توڑا تو میں چونکا۔ گیٹ کے پیچھے اندر تھا۔ اسلم نے ایک ہاتھ بڑھا کے کوئی سوچ کھانٹا۔ بلب روشن ہونے ہی ایک زینہ ہمارے سامنے آ گیا۔ یہ سینٹ کے رنگ کی دیواروں والا زینہ تھا۔ سوڈا کے ایک بلب کی روشنی بھی یہاں ناکافی محسوس ہوتی تھی۔

آدھے میں زینہ کھوم گیا اور مجھے آخر میں ایک اور دروازہ نظر آیا۔ کسی بینک کے اسٹراکٹ روم جیسے انتظامات جہاں کیش رکھا جاتا ہے میری سمجھ سے باہر تھے۔ یوں لگتا تھا کہ خانے میں سوئے کی انٹیں یا ہیبرے جو اہرات کے ذخیرہ ہیں۔ بلاشبہ کچھ نوادرات کی قیمت بھی لاکھوں کروڑوں سے کم نہیں ہوتی مگر اس میں عام چوروں ڈاکوؤں کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔

ہمیں نے آخری دروازے کا قفل کھولا تو دروازے کے پیچھے ایک ہال نمودار ہوا۔ اس کی چھت مشکل سے نو فٹ اوپر ہوگی۔ ہال شاید ساٹھ فٹ لمبا اور چالیس فٹ چوڑا ہوگا۔ اس کے اوپر مرغی خانے کی عمارت کو سارا اپنے کے لیے دس دس فٹ کے فاصلے پر سینٹ، کنکریٹ اور سرسے کے ستون اٹھائے گئے تھے جو اتنے مضبوط اور موٹے تھے کہ شاید دس منزل عمارت کا بوجھ اٹھا سکتے تھے۔ ان ستون کو ملانے والی BEAMS بھی ایسی ہی تھیں۔

ہال کی دیواروں پر چوٹے کا سفید رنگ تھا اور اس میں دس دس فٹ کے فاصلے سے کوئی دو درجن نیوب لائٹس لگا دی گئی تھیں۔ اتنی ہی تعداد میں نیوب لائٹس چھت میں نصب تھیں۔ ہال میں قدم رکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں کیا کام ہوتا ہے۔ اس وقت صرف ایک نیوب لائٹ روشن تھی مگر اس کی روشنی میں سب کچھ صاف دکھائی دے رہا تھا۔

ہال میں پوس نوادرات بنائے جاتے تھے اور جلسہ بازی کے اس ہنر میں مہارت رکھنے والوں کو بہت زیادہ روشنی درکار تھی۔ ذہن سے کچھ فاصلے پر اٹنے ہاتھ والی دیوار پر ایک بہت بڑا سوچ بورڈ نصب تھا۔ اس پر تمام لائٹس کے ہتھکڑوں کے اور انکوارسٹ فین کے سوچ قطاروں میں لگے ہوئے تھے۔ یہ خانے کی ہوا کو باہر پھینکنے والے اور تازہ ہوا اندر پھینکنے والے تھے الگ الگ تھے۔ یہ تھے یوں لگائے گئے تھے کہ ہال کے اندر دکھائی نہیں دیتے تھے۔ ہر کونے میں

جہاں دیواریں چھت سے ملتی تھیں، جستی چادر کی دو فٹ چوڑی سرنگ سی تھی جو چھت کی پوری لمبائی کے ساتھ چلتی تھی۔ ایک سرنگ کے آخر میں کوئی پتھکا ہو گا جس کا رخ زمین کی سطح کے اوپر کسی روشنی ان کی طرف ہو گا۔ یہ اندر کی محسوس ہو گا کہ ہر نکال ہو گا۔ دوسری دیوار کی سرنگ روپاسی پتھکا اگلے رخ پر لگایا گیا ہو گا اور وہ مسلسل تازہ ہو گا اور دھکیلا ہو گا۔ ہوا کے ایک طرف سے باہر جانے اور دوسری طرف سے اندر آنے کا یہ عمل CYCLE پورے ہال میں ہوا کی CIRCULATION کا ضامن تھا چنانچہ یہ خانے میں کسی قسم کے جس "نمی یا بو کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

رہیں نے ایک ایک کر کے سارے سوچ دباے مگر کوئی لائٹ نہیں جلی اور کوئی چھت کا پتھکا حرکت میں نہیں آیا "کیا بجلی نہیں ہے؟"

"ہاں۔ میں نے مین سوچ جو آف کر دیا تھا" میں نے کہا۔ "پھر وہ ایک ٹیوب لائٹ کیسے جل رہی ہے؟"

میں نے کہا "وہ ایمر جی لائٹ ہو گی۔ ان کے اندر ہی بیٹری ہوتی ہے بجلی جاتے ہی اس سے لائٹ جل جاتی ہے ورنہ بیٹری چارج ہوتی رہتی ہے۔"

"میں مین سوچ آن کر کے آتا ہوں" میں نے کہا۔ "رہیں بولا "یار مرنے والے کی لائٹ کیسے روشن تھیں؟"

میں نے کہا "اوپر تین مین سوچ تھے۔ میرا خیال تھا کہ ان میں سے ایک باہر کی سرنگ لائٹس کا ہو گا اور دوسرا ساڑن کا۔"

"تو نے دونوں آف کر دیے تھے۔"

"ہاں۔ شاید اندازہ غلط تھا میرا۔ یہاں قہری فیر بجلی ہے۔ ایک فیر ہو گا مرنے والے کے لیے۔ ایک فیر کا کنکشن نیچے دیا گیا ہو گا اور تیسرے فیر پر سرنگ لائٹس الارم اور سیکورٹی کا نظام کام کرنا ہو گا۔"

اوپر آ کے میں پھر مرنے والے سے گزرا۔ سامنے والا دروازہ ساتھ فٹ کے فاصلے پر تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ اس دروازے کو سونی نے بند کر دیا تھا لیکن اب مجھے اس کے دونوں پٹ کھلے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ میں نے اپنی جیب سے دیوار نکال لیا اور مرنے والے کے بچوں کی ایک دیوار کے ساتھ ساتھ چلے لگا۔ اندر حفاظت کے ذمے دار چار افراد ہیں

سے دو یقیناً مرنے کے ایک نے مقابلے سے دستبرداری اختیار کر کے اپنی جان بچائی تھی مگر تیسرا بے ہوش پڑا رہ گیا تھا۔ شاید وہ اتنا بے ہوش نہیں تھا جتنا نظر آتا تھا۔ ہم نے

ہے۔ اچھا ہوا تو کیا۔ نمبر لایا۔" میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ "کس کا نمبر لانا ہے؟" وہ چونکا اور پلکیں جھپکاکے مجھے پچانے کی کوشش کرنے لگا۔ "تم۔"

میں نے کہا "میں اسلم نہیں ہوں۔ تم پولیس کو بلانا چاہتے تھے نا۔"

اس نے اپنا سر پھر فرش پر رکھ دیا۔ شاید مایوسی اس کا حوصلہ ختم کر دیا تھا۔ "میری۔ میری۔ بات کرادو۔"

میں نے کہا "کس سے بات کرو گے؟"

اس نے سر کو جست سے اوپر اٹھایا "تمہاری۔ مہر۔۔۔ مہرالی۔ ہو گی۔"

میں نے کہا "نمبر بتاؤ مجھے۔"

اس نے رک رک کر کے سوچ سوچ کے نمبر بتایا۔ میں نے بیزیر رکھے ہوئے کان پر بال پوائنٹ سے نمبر لکھ لیا۔ "یہ کس کا نمبر ہے؟"

"میرے۔ میرے گھر کا۔" وہ بولا "میری۔ بیوی۔"

اس کے خلاف میرا غصہ اب بھر ددی اور دکھ کے جذبات میں ڈھل گیا تھا۔ ہمارے درمیان اب دشمنی کا رشتہ باقی نہیں رہا تھا۔ ہم محاذ جنگ پر اتفاق سے سامنے آجائے

والے دو سپاہی تھے۔ میں فتح مند فوج کا سپاہی تھا اور وہ شکست خوردہ فوج کا مرنے والا سپاہی۔ وہ مجھ سے اپنی آخری خواہش بیان کر رہا تھا اور میں انسانیت کے باقی رہ جانے والے قتل کی نفی نہیں کر سکتا تھا۔ میں اسے ایک اور گولی مار کے دشمنی کے سفاک و دشنام جذبے کی تسکین کرنے سے قاصر تھا۔

میں نے فون اٹھا کے نمبر لایا اور دوسری طرف سے جواب ملنے کا انتظار کرتے لگا۔ میرے کان گھنٹی کی آواز سن رہے تھے اور میری آنکھیں اس شخص پر لگی ہوئی تھیں۔ اس وقت میری بڑی خواہش تھی کہ وہ لائن ملے اور اپنی بیوی سے بات کرنے تک زندہ رہے۔ یہ احساس میرے لیے بڑا عجیب تجربہ تھا کہ میں اس کی زندگی چاہتا تھا جو کچھ درپٹے میرے مقابل تھا تو میں اس کو موت کے گھاٹ اتار سکتا تھا

اور اس وقت بھی اگر وہ اچانک اٹھ کھڑا ہوتا تو میں اسے بلا توقف قتل کر دیتا مگر وہ بے بس تھا تو مجھے اس پر رحم آ رہا تھا۔

میں نے ریسور کو کان سے لگایا۔ دوسری طرف وہ عورت تھی جو بیوی سے اچانک پیہ ہو گئی تھی۔ ایک بار بیلو کتے وقت وہ سہاگن تھی۔ دوسری بار بیلو کتے والی عورت کا سہاگ اجڑ چکا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھ سے پوچھ رہی ہے کہ تم کون ہو کیا تم ہی ہو جس سے مجھ پر یہ احسان کیا؟ مجھے بیوی عطا کی اور میرے بچوں کو میٹھی؟

میرا کوئی تصور نہیں تھا۔ جو کچھ ہوا اس کے ذمے دار وہ حالات تھے جنہوں نے ہم دو انجینی یا آشنا انسانوں کو مخالف سمت سے لاکر وقت کے ایک موذیر ایک دوسرے کے سامنے اسلحہ اٹھائے پر مجبور کر دیا تھا اور باقی اپنے اپنے نوشتہ تقدیر کی بات تھی یا نامہ اعمال کا صلہ تھا کہ وہ مارا گیا اور میں نہیں مارا گیا۔ اس کے باوجود میرے دل میں جیسے ایک کانٹا سا چبھ کے ٹوٹ گیا۔

ریسور رکھ کے میں نے اس عورت کی آواز کو خاموش کر دیا۔ اس نے یہی سمجھا ہو گا کہ گھنٹی رانگ نمبر سے بجی تھی۔ اسے کبھی معلوم نہ ہو گا کہ زندگی میں آخری بار شوہر اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر بیوی کی آواز آنے سے پہلے موت آگئی تھی۔

میں نے ایک گہری لمبی سانس لی اور ایک مین سوچ کو آن کیا۔ اچانک روشنی نے کسی دیو بیکل سمندر کی لمبی طرح یلغار کی اور ساڑن نے یوں چھ ماری جیسے گولی لگنے سے پاگل کتا چلاتا ہے۔ میں نے گھبرا گئے اسے آف کیا اور دوسرے سوچ کا بجلی اوپر اٹھایا۔ ایک سیکنڈ میں گھبراہٹ سے میرے جسم پر پسینہ پھوٹ گیا تھا۔ میں نے بڑی خطرناک غلطی کی تھی۔ شاید اس سے گیت کے قریب جو گستاخگری ہوئی سونی بھی دہشت سے اچھل پڑی ہو گی۔

میں نے بیک کے باہر والے گیت سے نکل کے دیکھا۔ سونی کھل گیت کے آس پاس کہیں نظر نہیں آ رہی تھی مگر میں جانتا تھا کہ وہ وہیں ہے اور کہیں چھپ کر اچانک نمودار ہونے والے دشمنوں کا انتظار کر رہی ہے۔ میں نے اسے چلا کے آواز دی۔ مجھے سونی کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔

خطرے کے وجود کا یقین میرے اعصاب پر سوار تھا اور میرے خیالات پر قابض تھا۔ میں نے اسے پھر یکبارہ "سونی۔ گھبرا نا نہیں۔ میں نے غلط سوچ کو آن کر دیا تھا۔ تم کہاں ہو؟"

وہ میرے پیچھے ہنسی "میں ادھر ہوں باس۔"

میں اچھل پڑا "باس کی بیٹی مجھے ڈرا رہا۔"

مداری ☆ 241 ☆ ساتواں حصہ

"اگر تم ڈرپوک ہو تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟" وہ مصیبت سے بولی۔

میں نے کہا "تم انیس گیت پر روکنا چاہتی تھیں۔"

"بعد میں میرا ارادہ بدل گیا۔ میں نے سوچا کہ اگر وہ آتے ہیں تو انیس اندر آنے کا موقع دوں ورنہ وہ گیت سے ہی پلٹ کے بھاگ جائیں گے۔"

میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی "ویری گڈ خیال۔"

اب ذرا اندر آ کے دیکھ لو۔"

"اندر کیا ہے؟" وہ اندر آ گئی۔

میں نے کہا "یہ دیکھو۔ اس سے گیت کھلتا ہے اور بند ہوتا ہے۔ اس سوچ کو دباؤ۔"

اس نے سوچ دبا دیا۔ فولادی گیت گھر گھر کی آواز کے ساتھ رینگ پر کھٹکتا ہوا بند ہو گیا۔ سونی نے پھر مٹن دیا۔ گیت کے دونوں پٹ دور ہونے لگے۔

"یہ زیادہ اچھا ہے۔ سونی نے گیت کو پھر بند کر دیا۔"

میں نے فی وی مانیہ کو ان کی تودروازے کے باہر کا پورا منظر نظر آنے لگا "اب تم یہاں بیٹھ کے بھی تو کچھ سکتی ہو۔"

اس نے فی وی بند کر دیا "یہاں؟ تین لاشوں کے اور خون کے درمیان؟"

"ڈر لگتا ہے تمہیں؟"

"نہیں۔ ڈر کی کون سی بات ہے۔ زندگی میں کچھ نہیں کر سکے بے چارے تو مرنے کے بعد کیا بگاڑ سکتے ہیں میرا۔"

میں نے کہا "اگر کوئی آئے تو بتا دینا ہمیں" میں نے فی وی مانیہ کو پھر چلا دیا "تم یہاں نہ بیٹھو دروازے کے باہر سے دیکھتی رہو۔"

"مگر تمہیں کیسے بتاؤں گی میں۔"

میں نے کہا "دیکھو یہ نیچے کی لائن کا مین سوچ ہے۔ اسے آف کرتے ہی آن کر دینا۔ لائنیں مجھ کے پھر چلیں گی تو میں سمجھ لوں گا رائنٹ؟"

"رائٹ۔" اس نے مٹھی بند کر کے انگوٹھے کو بلند کیا۔

نیچے اب بال روشنی سے بھر گیا تھا۔ رئیس پورے بال میں بکھرے ہوئے سامان کا جائزہ لے رہا تھا "بے یار رہا ہے یہ سب آخر۔ اپنی سمجھ میں تو آیا نہیں۔"

میں نے کہا "یہ ورکشاپ ہے۔ جعلی نوادرات بنانے کی۔"

رئیس نے مجھے بھڑے میلے اور سیاہ دھات کے کچھ ٹکڑے دکھائے جو اس نے ایک بجٹی کے پاس سے اٹھائے

تھے "کیا ایسے ہوتے ہیں نوادرات؟"

میں نے ایک ٹکڑے کا غور سے معائنہ کیا "شاید اس سے قدیم سکے بنائے جاتے ہوں گے۔ سکندر اعظم یا اشوک کے دور حکومت کے یا اس دور کے جب ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت تھی۔"

"مگر بارے؟" اس زمانے میں بادشاہ سونے چاندی کے سکے جاری کرتے ہوں گے۔ اشرفیاں ہوتی تھیں۔"

میں نے کہا "تاہم، پیتل اور بھرت کے سکے بھی تھے۔ کیا تو کبھی میوزیم نہیں گیا۔"

"نہیں یار، مجھے تو کچھ عجیب سا لگتا ہے اندر۔ جیسے میں سیکڑوں سال پہلے کی دنیا میں پہنچ گیا ہوں۔ پرانی روحمیں گھومتی پھرتی نظر آتی ہیں ہر طرف۔"

میں نے کہا "اسی لیے مجھے کچھ پتا نہیں۔"

"آخر یہ کیا دھات ہے؟" وہ ایک ٹکڑے پر غور کرنے لگا۔

"ایسا لگتا ہے کہ سب کچھ ملا دیا گیا ہے اس میں۔ پرانا تانبا، لوہا، مٹی، رنگ اور کاربن، تاکہ یہ سیکڑوں سال پرانا سکے۔ اس سے سکے ڈھال کے ان پر نقش بناتے ہوں گے۔ نقاشی کے اوزار ہوں تو ایک سکے کو دیکھ کر کہی سکے بنائے جاسکتے ہیں۔ پیتل کے برتنوں پر نقاشی کے ماہر یہ کام بھی کر سکتے ہیں۔"

"مگر یہاں تو کوئی بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔"

میں نے کہا "ایسا لگتا ہے کہ وہ نکل گئے۔"

"اے کس طرف سے نکل گئے؟" رئیس نے ادھر ادھر دیکھا "باہر نکلنے کا کوئی اور بھی راستہ ہے یہاں؟"

"ہوگا۔ ابھی دیکھ لیتے ہیں" میں آگے بڑھ گیا۔

جعلی سکے ڈھالنے کا وہاں کوئی ثبوت نہیں تھا۔ بد وضع دھات کے چند ٹکڑوں یا قلعی گروں جیسی بجٹی سے کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا تھا۔ پانی کے جگ یا چائے کی پیتلی کا پنڈل ٹوٹ جائے تو اسے ظروف ساز ٹانگا لگے جوڑنے کے لیے بھی ایسی ہی بجٹی استعمال کرتے ہیں۔ پہلے اس کے لیے دھونکی بھی استعمال ہوتی تھی۔ لوہار کی بجٹی میں لوہا پگھلا کے آج بھی بہت سے اوزار اور برزے ڈھالے جاتے ہیں۔ زیادہ نفاست سے کام کرنے والے ستار ہاتھ سے گھومنے والے ٹکڑے کی ہوا سے بجٹی دھکاتے ہیں اور باریک ٹانگے لگاتے ہیں لیکن یہاں نہ ڈھلے ہوئے سکے تھے اور نہ ان پر نقاشی کے آلات نہ چھپے سانچے اور دھات کی مرس۔ شاید ضرورت پڑنے پر کارمگر سب چیزیں اپنے ساتھ لاتے تھے اور کام ختم

ہو جانے کے بعد اپنے ساتھ ہی لے جاتے تھے تاکہ ان کے جرماتہ ہر کا کوئی سراغ باقی نہ رہے۔

ہال کے دوسرے حصے میں عجیب و غریب وضع کے پتھر پڑے ہوئے تھے اور یہ اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ انہی پتھروں سے تاریخی حیثیت رکھنے والے برتن یا بجٹے تراشے جاتے ہوں گے اور ماہرین ان کو قدامت کا رنگ دیتے ہوں گے۔ ابھی یہ صرف پتھر تھے جن کے بارے میں میری معلومات صفر تھیں کہ وہ کہاں سے لائے گئے تھے۔ ان کے رنگ و ساخت میں کیا خاص بات تھی اور ایک پتھر کی کیمسٹری دوسرے پتھر سے کس طرح مختلف تھی۔

میرے پاس تحقیق یا تفتیش کے لیے وقت بھی نہیں تھا کہ میں ایک ایک چیز پر تفصیل سے غور کرنا اور قیاس کی بنیاد پر کوئی نتیجہ اخذ کرنا۔ یہاں میں ختم کو تلاش کرنا ہوا آیا تھا لیکن ابھی تک مجھے اس کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا اور وقت گزرتا جا رہا تھا۔ اس کا چہرہ اس کی آواز اور اس کے وجود کی خوشبو صرف میرے تصور میں زندہ تھی۔ وہ خود کہیں نہ تھی۔

اسلم چپ چاپ سب دیکھ رہا تھا۔ وہ کہہ چکا تھا کہ اس کو زینے سے نیچے قدم رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس سے کچھ پوچھنا حاصل تھا۔ رئیس کے ہر سوال کا اس نے ایک ہی جواب دیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم فی الحال ہم اسے چھاننے پر مجبور تھے۔ سچ سے جھوٹ کو الگ کرنے کے جو طریقے ہم جانتے تھے وہ یہاں نہیں آزمائے جاسکتے تھے۔

ہال کے ایک اور حصے میں مجھے چوڑے پرانے کینوس اور گتے کے ٹکڑے ملے۔ وہاں ہر قسم کے رنگ کی سیکڑوں ٹیوٹیں چھوٹے بڑے ڈبے اور ہر سائز کے برش بھی پڑے ہوئے تھے۔ اس پر پینٹ کے لیے ایک چھوٹی سی کپریئر مشین بھی موجود تھی چنانچہ شک کی کوئی بات نہیں تھی۔ میں اپنے یقین کی بنیاد پر کہہ سکتا تھا کہ یہاں مصوری کے پرانے شکاروں کی نقل بنائی جاتی ہوگی اور خطوطات تیار کیے جاتے ہوں گے لیکن اس یقین کی بنیاد پر میں کسی فنکار کو مجرم ثابت نہیں کر سکتا تھا۔ شاید یہاں آرزو ملنے پر مال بنایا جاتا تھا اور کارمگر اس وقت لائے یا بلائے جاتے تھے جب خاصی مقدار میں کوئی ایکسپورٹ پلائی کا کام ہو۔ وہ کون لوگ تھے۔ کہاں سے آتے تھے اور کیسے لائے جاتے تھے؟ کتنے بڑے لالچ میں یہ کام کرتے تھے۔ ایسے بہت سے سوالات کا جواب دینے والا کوئی نہیں تھا مگر یہ سوال کوئی مفروضہ نہیں تھا۔ ان کا حقیقی وجود ثابت ہوتا تھا۔ ایک نہ ایک دن مجھے اس وطن دشمن اور غیر قانونی کاروبار کے ہر شرکاء جرم کو بے نقاب کرنا تھا

لیکن ابھی میں خود بھی نہیں جانتا تھا کہ یہ کب ہوگا اور کیسے ہوگا؟

رئیس نے گھڑی دیکھی "یار! اب نکل جانا چاہیے۔"

میں نے کہا "اور کچھ نہیں ہے یہاں؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "سب کچھ دیکھ لیا ہے میں نے۔"

ادھر ایک دروازہ باورچی خانے کا ہے۔"

"کیا کچن بھی خالی ہے؟"

"کچن بھرا ہوا ہے۔ چار پانچ بندوں کے لیے کم سے کم ایک بننے کا راشن موجود ہے۔ آٹا، دال، چاول اور کھجی چینی چائے وغیرہ سب ہے اور ابھی کھل ریسوں یہاں کھانا بھی پکایا گیا تھا۔ جھوٹے اور اصلے برتنوں کو دیکھ کے اندازہ ہوتا ہے۔ فرج میں دودھ بھی رکھا ہے۔ انڈے ہیں، آلو قیر پکا رکھا ہے۔"

"اور یہ دوسرا دروازہ کیا غسل خانہ ہے؟"

"ہاں لیکن بارے؟" اپنی باتیں متعل بھی یہ بات تسلیم نہیں کرتی "وہ سرخاٹے لگا۔"

"کون سی بات؟"

"اے بی بی کہ نیچے بس ایک ہال ہے۔ یہاں کوئی پتھر بازی کا دھندلا ہوا ضرور ہے لیکن ثبوت کوئی نہیں۔ کسی قلعے جیسے سخت حفاظتی انتظامات کا کوئی مقصد تو ہوگا۔"

میں نے کہا "باہر نکلنے کا کوئی خفیہ راستہ بھی نہیں ملا؟"

رئیس نے نفی میں سر ہلایا "میں نے اچھی طرح دیواروں کو ٹھوک بھاگے دیکھ لیا۔ اس سڑک کے نیچے کے ریکارڈ کی سونی تو ایک ہی جگہ اڑی ہوئی ہے، مجھے نہیں معلوم۔"

اسلم منہ بسورنے لگا "اور میں کیا کہوں۔؟"

رئیس نے بڑی پھرتی سے اس کے ایک جھانپنا مار دیا۔

"سب معلوم کر لیں گے ہم سب کچھ کتنا معلوم ہے ابھی وقت نہیں ہے مگر اس خیال میں مت رہنا کہ ہم یقین کرتے جا رہے ہیں تیری ہر بات کلمہ بہ کلمہ بے وقوف نہیں ہیں۔"

وہ اپنا کال سلانے لگا "میں نے کب کہا ہے بے وقوف؟"

اچانک میرے کانوں نے ایک آواز سنی۔ یہ کسی عورت کی آواز تھی "یہ کس کی آواز ہے رئیس! تو سن رہا ہے؟"

"سن تو رہا ہوں" رئیس نے کان پر ایک ہاتھ رکھا۔

"شاید باہر ہے، گولی عورت چلا رہی ہے۔"

"عورت۔۔۔ ہاں عورت تو ہے۔ مگر شہم نہیں ہے۔" وہ

میں نے اس سے اتفاق کیا "ہاں لیکن رئیس ذرا غور کر۔ ہم زینے سے دائیں طرف گھوم کے اترے تھے۔ یہ جگہ بائیں طرف ہے۔ اور کوئی رہتا بھی نہیں۔ یہ جگہ بالکل مرئی خانے کے نیچے ہے۔"

"بالکل ٹھیک کہا تو نے۔ آواز اس دیوار کے پیچھے سے آرہی ہے مگر سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

میں نے اپنے کان دیوار سے لگا دیے۔ چند سیکنڈ بعد میرا شبہ یقین میں بدل گیا تھا۔ "عورت گالیاں بک رہی ہے اور کوسے دے رہی ہے۔"

رئیس نے بھی میری طرح کان لگا کے سنا "کے کوس رہی ہے؟"

میں نے اسلم کی طرف دیکھا تو اس کا سر دائیں بائیں ہلنے لگا "مجھے نہیں معلوم۔"

میں نے اس کی گردن دوجھٹی۔ وہ میری گرفت میں پھلا اور خود کو چمڑانے کے لیے ہاتھ پاؤں چلانے لگا مگر میرے ہاتھ کے شکنجے سے نہ نکل سکا۔ اس کا سانس رکنے لگا تھا اور آنکھیں حلقوں سے اُبل کر باہر آرہی تھیں۔ چند سیکنڈ میں اس کی زبان باہر لٹک گئی اور اس کا جسم ڈھیلا پڑنے لگا تو میں نے اسے تھوڑی سی مسلت دی اور وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔

"اسلم! دوسری طرف کیا ہے؟" میں نے اسے دیوار سے لگا کے اپنا گھٹنا اس کے پیٹ پر رکھا اور اس کے دونوں ہاتھوں کو دیوار پر دبا دیا۔

اس نے سانس لینے کے لیے پورا منہ کھول دیا "مجھے نہیں۔ معلوم۔"

میں نے گھٹنے کا دباؤ بڑھایا "اور جانے کا راستہ کہاں ہے؟"

وہ سر آگے جھکا کے جھولنے لگا "مجھے۔ مجھے۔ نہیں۔"

جب میں نے اسے چھوڑا تو وہ فرش پر گر گیا "رئیس۔ ہو سکتا ہے یہ جھوٹ نہ بول رہا ہو۔ اسے واقعی کچھ معلوم نہ ہو۔"

رئیس نے کہا "یار! بچے بھی رو رہے ہیں۔"

"بچے؟"

"ہاں! بہت سے بچے چار پانچ تو ضرور ہوں گے تو یہی سن۔"

میں نے پھر دیوار سے کان لگا کر بچوں کے رونے کی آواز بہت واضح نہیں تھی مگر عورت کے چلانے کی آواز کے پس منظر میں صاف سنی جاسکتی تھی۔ "یار! رئیس کیا کریں

رئیس نے فرش پر بکھرے ہوئے سامان کو دیکھا۔ اس میں مختلف سائز کے چھوٹے بڑے چھبی ہتھوڑے بھی تھے جو پتھروں کو توڑنے کاٹنے اور تراشنے میں استعمال ہوتے تھے۔

"ہم اس دیوار کو توڑ دیں۔"

میں نے کہا "یہی کریں گے اگر اندر جانے کا راستہ نہ ملا۔ پہلے میں ایک نظر دیکھ لوں۔"

رئیس نے کہا "کیا دیکھے گا تو۔ نیچے سب دیکھ لیا ہے میں نے۔"

"میں اوپر دیکھ کے آتا ہوں۔"

رئیس نے میرا بازو پکڑ لیا "کوئی فائدہ نہیں۔ اس میں گھنٹوں لگ جائیں گے مرئی خانے کے اندر اور احاطے کے باہر آتھ دس ایکڑ کا رقبہ ہے۔"

"دیوار تو زنا کون سا آسان ہوگا۔"

رئیس نے دیوار پر انگلی پھیری "دیکھ یہ اینٹوں کی چٹائی ہے۔ ایک پلہ سے دوسرے پلہ تک نہیں سے بھی ایک اینٹ نکال دیں ہم تو پھر کام آسان ہو جائے گا۔ آس پاس کی دوسری اینٹیں ہلانے سے بھی الگ ہو جائیں گی۔ آتھ دس اینٹوں کے خلا سے گزر سکتا ہے ایک آدمی۔ لا تو ہتھوڑا مجھے دے۔"

"یہ ہتھوڑا نہیں ہتھوڑی ہے۔ اس سے کیا ہوگا۔"

میں نے کہا۔

"تو دیکھتا رہ۔" رئیس نے ایک بار ہتھوڑی کو پوری قوت کے ساتھ دیوار پر مارا پھر دوسری بار "اس کا ہاتھ تو قطعاً انداز میں وار کرنے لگا۔ ایک جنوی اور دو مشینا خات کے سامنے وہ دیوار تو کیا تھالیہ بھی ہوتا تو راستہ دے دیتا۔ پہلے دیوار کا پلستر ٹوٹ کے گرا پھر اینٹ کے ٹکڑے گرنے لگے درمیان میں ایک گڑھا پڑ گیا اور اس گڑھے کے کنارے جھرنے لگے۔"

رئیس بانٹنے لگا۔ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ وہ میری طرف دیکھ کے مسکرایا "دیکھا تو نے؟" میں پانچ منٹ۔"

میں نے اس کے ہاتھ سے ہتھوڑا لینے کی کوشش کی۔

"لا! اب مجھے دے تو تھک گیا ہے۔"

"اب نہیں۔ قسم اللہ کی۔" وہ دیوانہ وار ہتھوڑے سے دیوار پر ضرب لگاتا رہا "ابھی سے تھکن کیسی 'فولادی ہیں بازو اپنے۔"

ایک اینٹ ٹوٹ کے دوسری پر جاگری۔ رئیس نے مسکرا کے مجھے دیکھا پھر اچانک اس کا ہاتھ رک گیا۔ وہ

گھنٹوں کے بل بیٹھ کے آتھ انچ لمبے اور چار انچ چوڑے سوراخ میں جھانکنے لگا۔ میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ دیوار کے دوسری طرف سے دو آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں جتنا خوف تھا اس سے زیادہ حیرانی تھی۔ وہ آنکھیں ایک عورت کی تھیں۔

بالآخر میں نے کہا "کون ہو تم؟"

اس کی آنکھوں میں عجیب سی بے یقینی اتر آئی۔ اس نے میرا ہی سوال دہرایا۔

رئیس نے کہا "اچھا۔ پیچھے ہو جاؤ۔"

میں جی پیچھے ہٹ گیا۔ رئیس زیادہ جوش کے ساتھ دائیں بائیں اور اوپر نیچے کی اینٹوں کو کرانے لگا۔ ایک اینٹ کے نکل جانے سے آپس کے ربط کی مضبوطی ختم ہو گئی تھی۔ دیوار کی ہر اینٹ دوسری اینٹ کو پکڑے رکھتی ہے۔ اسے ہلنے نہیں دیتی اور خود بھی نہیں ہلتی مگر ایک اینٹ نکل جانے تو باقی سب ہلنے لگیں اور کمزور پڑ جاتی ہیں۔ ایک شگاف بن جائے تو کمزور کے پاسوری طرح پھیلتا جاتا ہے جو بالآخر پوری دیوار کو نکل لیتا ہے۔

مشکل سے دس منٹ میں رئیس نے دیوار میں ڈیڑھ فٹ چوڑا اور اتنا ہی اونچا شگاف بنادیا تھا۔ شکستہ اینٹوں کا اور سینٹ کا چورا دیوار کے خلا کے دونوں جانب ڈھیر ہو گیا تھا۔ چونے اور سینٹ کے ذرات اڑ کے رئیس کے چہرے پر بیٹے والے پسینے میں شامل ہو گئے تھے۔

وہ ہتھوڑی چھینک کے پیچھے ہٹ گیا "تو۔۔ تو جا۔۔ دیکھ۔"

میں نے کہا "تو اپنا منہ دھولے ہاتھ رو م میں جا کے۔"

"یار! میری فکر چھوڑ۔" اس نے قمیص کا داامن اٹھا کر منہ صاف کیا۔

میں نے پہلے سر اندر ڈالا اور پھر جسم کو آگے بڑھایا۔ کسی جانور کی طرح میں اگلے دو بچوں یعنی اپنے ہاتھوں کے بل پر دوسری طرف اترتا پھر میں نے اپنی ٹانگوں کو ٹھیکچا اور ہاتھ جھاڑ کے سیدھا کھڑا ہو گیا۔

میرے مقابل چند قدم کے فاصلے پر عورت کچھ سستی ہوئی اور پھر حیران کھڑی ہوئی "اس نے لباس کے ٹامپر پر ایک بہت کم چوڑی پرانی اور پھٹی ہوئی چادر لپیٹ رکھی تھی جس سے ستر پوشی کا مقصد ذرا بھی پورا نہیں ہوتا تھا۔ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ میرے اندازے کے مطابق زیادہ سے زیادہ تیس سال مگر یہ تیس سال سختی حالات کا سامنا کرتے دکھ جھیلنے اور منہلی کا عذاب کاٹنے گزرے تھے چنانچہ اس کے

چہرے اور جسم کی ساری نرمی خوبصورتی اور تازگی قیل از وقت رخصت ہو چکی تھی اور وہ اپنی اصل عمر سے پندرہ بیس سال زیادہ کی لگتی تھی۔ خوشی اور خوشحالی میسر آتی تو یہی عورت حسن اور جوانی کو عمر کی ہر منزل پر کئی سال روکے رکھتی اور قلم اشارہ مائل کی طرح پینتیس سال میں بھی میں کی نظر آتی۔ اس کا رنگ صاف تھا مگر چہرے کی جلد مر جھاکے تنکے آلود ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھیں خوبصورت تھیں جاسکتی تھیں مگر دکھوں نے ان میں حسرتوں کی دیرانی بھری تھی۔

اسے اپنے نیم عریاں ہونے کا کوئی احساس نہیں تھا۔ پانچ پھولے پھولے بچے اس عورت کے پیچھے چھپنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے مجھے چوری چھپے دیکھنے میں مصروف تھے۔ وہ سب تقریباً ایک ہی عمر کے یعنی سات آٹھ سال کے بچے تھے۔ وہ سب لڑکے تھے اور سب نیچے کھڑے تھے لیکن اس کے باوجود غربت کا لباس ان کے جسموں پر دیکھا جاسکتا تھا۔ ان کے بال میلے 'کانوں تک بڑھے ہوئے اور اٹھے ہوئے تھے۔ ان کے معصوم چہرے قانون کے مارے نظر آتے تھے۔ بھوک ان کی آنکھوں میں ایک سوال بن کے نھر گئی تھی۔ ہر بچہ پیدائشی طور پر خوف اور بھوک کی جبلت ساتھ لے کر آتا ہے۔ وہ ذرا سی آہٹ معمولی سی آواز اور ہلکے سے ٹھٹکے پر چونک پڑتا ہے۔ جو چیز ملے منہ میں ڈالتا ہے لیکن شعور کی منزل تک پہنچتا ہے تو وہ اپنے ذہن پر قابو پالیتا ہے اور بھوک کو کنٹرول کر لیتا ہے۔ ان بچوں کے ساتھ ایسا نہیں تھا۔ شوقی، شرارت اور ہنسنے کھیلنے کی عمر کو بچے کے بھی وہ خوف زدہ تھے اور بھوکے تھے۔

میں نے ایک قدم آگے بڑھایا تو عورت دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ پانچ بچے نے پیچھے پیچھے ہو گئے "میرے پاس مت آنا۔"

میں نے اپنے چہرے پر دوستانہ مسکراہٹ سجائی "دیکھو۔ مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔"

عورت نے میرے چہرے سے نظر ہٹائے بغیر پوچھا "کون ہے تو؟" یہ سوال اس نے رحیم یار خان اور بہادری کے مخصوص لمبے والی سرانگی میں کیا تھا۔

میں نے کہا "میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ کیا تم یہاں قید میں ہو؟ اگر ایسا ہے تو میں تمہیں اور تمہارے بچوں کو اس قید سے رہائی دلا سکتا ہوں۔ تم میرے ساتھ چلو۔"

"میں تمہارے ساتھ کیوں چلوں؟" عورت نے تنکھے لمبے میں کہا "میں مجھے نہیں جانتی۔ پتا نہیں تو کہاں لے جائے گا مجھے۔ میں ٹھیک ہوں یہاں۔"

میں نے کہا ”پھر ابھی تم کے گالیاں اور کون سے دے رہی تھیں؟“
 ”کون سی تھی میں اس حرام کے بنے رحیم بخش کو۔
 مجھے یہاں لاکے خود پتا نہیں کہاں مر گیا ہے۔“
 میں نے کہا ”رحیم بخش کون ہے؟ تمہارا گھر والا؟“
 اس نے خاصے تذبذب اور سوچ بچار کے بعد اقرار میں سر ہلایا ”ہاں۔“
 میں نے کہا ”اور یہ تمہارے بچے ہیں؟“
 عورت نے کچھ نروس ہو کے بچوں کو دیکھا۔ بچوں نے عورت سے آنکھوں ہی آنکھوں میں جیسے سوال کیا کہ کیا ہم جواب دیں؟ پھر انہوں نے سر کو اوپر نیچے ہلا کے ایک کورس میں کہا ”یہ ہماری ماں ہے۔“
 اب عورت نے بھی کہا ”ہاں۔ یہ میرے بچے ہیں۔“
 ”یہ سب؟“

”ہاں سب مگر تو کیوں پوچھ رہا ہے؟“ اس نے چونکا ہو کے ایک دفاعی انداز اختیار کر لیا ”تو ماں ملتا ہے ان کا؟“
 میں نے باری باری برتنے کی صورت کا جائزہ لیا۔ انہیں اپنے نگاہوں پر کسی قسم کی شرم محسوس نہیں ہو رہی تھی جو ایک عجیب بات تھی۔ ان سب کی صورتوں کے نقوش واضح طور پر الگ تھے۔ ایک کے بال کچھ بھورے تھے۔ ایک کی آنکھیں بھوری تھیں۔ ایک کا رنگ گورا تھا تو دوسرے کا خاصا کالا۔ وہ عورت مجھ سے جھوٹ بول رہی تھی۔ وہ بچے بھی کسی مصلحت یا مجبوری کے تحت ایک ہی جھوٹ کو دہرا رہے تھے۔
 میں نے کہا ”ان سب کی عمر ایک ہی لگتی ہے۔“

عورت مجھے غور تو رہی ”پھر؟“
 ”پھر یہ کہ۔“ میں نے ایک گہری سانس لے کر چ اور جھوٹ کے چکر میں پڑنے کا ارادہ مؤخر کر دیا ”ان کے پاس کپڑے کیوں نہیں ہیں اور تم بھی؟“
 اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بس اس کی نظریں جھک گئیں۔

”رحیم بخش کب سے غائب ہے؟“ میں نے پوچھا۔
 ”دو دن ہو گئے“ وہ روانی میں کہہ مئی اور پھر ذرا نے لگی۔
 میں نے پیچھے پلٹ کے دیکھا۔ رئیس دیوار کے شکاف میں منڈالے یہ ساری گفتگو سن رہا تھا۔ ایک انتہائی غیر متوقع صورت حال سامنے آئے سے وہ بھی بری طرح الجھن کا شکار نظر آتا تھا۔ ”اس سے پوچھ کہ یہ کہاں سے آئی ہے؟“

میں نے کہا ”تمہارا گھر کہاں ہے؟ کہاں رہتی ہو تم؟“
 عورت پر گھبراہٹ سوار تھی۔ ”نہیں ہے۔ لاہور میں گھر مجھے دینی جاتا ہے۔“
 میں نے کہا ”اور تمہارا شوہر تمہیں یہاں چھوڑ گیا ہے۔ وہ کہہ گیا ہو گا کہ میں نکلتا اور وہ بڑے کا انتظام کرنے جا رہا ہوں۔ دو دن سے تم یہاں بند ہو اور اس کی واپسی کا انتظار کر رہی ہو۔ تم نے کچھ کھایا ہے؟ کیا یہ بچے دو دن سے بھوکے ہیں؟“

ایک بچے نے میرے سوال پر عورت کا ہاتھ پکڑ کے ہلایا ”مجھے روٹی کھانی ہے۔ بہت بھوک لگی ہے مجھے۔“
 عورت نے اس کے بڑی بے رحمی سے اٹلے ہاتھ کا جھانپ مارا ”چپ کر توروں“ روٹی روٹی کرتا رہتا ہے ہر وقت۔ کہاں سے لاؤں گی میں روٹی تو مجھے کھالے حرامی!“
 میں نے کہا ”بچوں کو مت مارو۔ آخر یہ کب تک بھوکے رہ سکتے ہیں اور بھوکے ننگے ہونے کے باوجود یہ تمہارے جھوٹ کو نہار رہے ہیں۔“
 ”میں نے۔“ کوئی جھوٹ نہیں بولا ”وہ بولی۔“
 ”جھوٹ تو یہ بھی ہے مگر اس وقت میں تمہیں سارا سچ بتانے کے لیے مجبور نہیں کروں گا“ میں نے کہا۔

وہ اپنی بات پر اڑی رہی ”میں نے سچ بولا ہے۔“
 وہ ایک ان پڑھ قسم کی عورت تھی جسے جھوٹ بولنا سکھایا گیا تھا اور غالباً یہ رٹا ہوا سبق وہ اسی رحیم بخش کے ذر سے دہرا رہی تھی جسے وہ اپنا شوہر کہہ چکی تھی۔ میں نے پلٹ کے رئیس سے مشورہ کیا جو دیوار کے شکاف سے منڈ نکائے کچھ کچھ دیکھ اور سن رہا تھا۔ اسے اسلم کا خیال نہ ہوتا تو وہ بھی دیوار سے نکل آتا۔

”ابے یہ کیا نیا ڈراما شروع ہو گیا؟“ وہ چیخے ہٹ گیا۔
 میں نے کہا ”ڈراما میری سمجھ میں آ گیا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہم اس چکر میں نہیں پڑ سکتے۔“
 ”پھر کیا انہیں چھوڑ جاؤں یا ر“ ایسے ہی؟“
 ”یہی تو مسئلہ ہے۔“

رہیں نے کہا ”یار وہ حرام زادہ رحیم بخش آخر کیا کہاں؟ کیا لگتا ہے وہ اس عورت کا؟“
 ”جہاں تک میرے یقین کی بات ہے“ پتو نہیں۔ یہ بچے بھی اس عورت کے سیں ہیں مگر میں ان کے جھوٹ سچ سے کیا۔ یہ دو دن سے یہاں بند ہیں اور بھوکے ہیں۔ ان کے کچھ کھانے پینے کا بندوبست تو ہونا چاہیے۔“
 ”اب کیا ہم ان کے لیے کھانا لینے جائیں؟ یہاں تو کچھ

بھی نہیں ملے گا۔ لاہور نہ سہی، میں روٹ تک تو جانا پڑے گا۔ آنے جانے میں کم سے کم بھی ایک ڈیڑھ گھنٹا لگ جائے گا اور ان کے پاس تو کپڑے بھی نہیں ہیں۔“
 میں بڑی پریشانی میں پڑ گیا ”یار رئیس۔ ہم اتنے بے حس کیسے ہو سکتے ہیں کہ جان بچھڑا کے نکل جائیں۔“
 ”ہم کچھ نہیں کر سکتے یا ر اور کرنے کا فائدہ بھی کیا ہے۔ ہمیں اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے“ رئیس بولا۔
 ”تو جو کچھ کہہ رہا ہے“ سچے دل سے کہہ رہا ہے؟“
 رئیس نے نفی سے کہا ”جھوٹے سچے دل کی بات نہیں۔ دماغ سے سوچ۔ ہم یہاں آئے ہیں صرف جہنم کو تلاش کرنے۔“

”اور اس تلاش کے دوران میں ہم اور کچھ نہیں کریں گے کوئی ہمارے سامنے پاسا مرجائے“ ہم اسے پانی تک نہیں پلائیں گے کہہ دیں گے کہ وقت نہیں ہے ہمارے پاس۔ کسی عورت کی عزت کو لٹا دیکھیں گے تو سوری کہہ کے نکل جائیں گے کہ ہمیں پلے جہنم کو جانا ہے۔“
 رئیس نے ایک ٹھنڈی سانس لی ”دیکھ۔ ایک کچن ہے یہاں۔“

میں اچھل پڑا ”وام۔ کیا بات ہے تیرے دماغ کی۔ میں تو بالکل بھولا ہوا تھا۔“
 ”کچن میں ایک ہنسنے کے لیے راشن ہے۔ ان کو ادھر لے آتے ہیں۔ باقی کام یہ خود کر لیں گے عورت کو کھانا پکانا تو آتا ہو گا۔“

میں نے کہا ”بالکل ٹھیک۔ اب مسئلہ وہ گیا ان کے کپڑوں کا۔“
 رئیس بولا ”یار۔ انہیں ایسے کیوں رکھا گیا ہے آخر؟“
 میں نے کہا ”شاید اس لیے کہ اس حالت میں وہ بھاگ نہیں سکتے۔ ایک طرف تو انہیں باندھ کے رکھنے کا۔ رحیم بخش ان کے کپڑے اتروا کے اپنے ساتھ لے گیا۔ عورت کو شاید یہ چادر اندر ہی مل گئی ہوگی جو اس نے پیٹ لی۔“
 ”تو اتارنے یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتا ہے کہ انہیں یہاں بٹکا بھوکا رکھنے والا رحیم بخش ہے۔“

میں نے کہا ”اور کون ہو سکتا ہے۔ عورت نے اسی کا نام لیا تھا۔“
 ”واپس آ کے وہ کیا کرے گا۔ پوچھے گا نہیں کہ دیوار توڑ کے تم کچن میں کیسے آ گئے اور یہ کپڑے کون دے گیا تھیں۔“
 میں نے جھجکا کے کہا ”یار بعد میں جو ہو گا اس کے لیے

ہم کیوں سوچیں۔“
 رئیس نے کہا ”ادھر سے راستہ بھی کھلا ہوا ہے اوپر جانے کا۔ اگر یہ عورت بچوں کو لے کر بھاگ گئی۔ پھر؟“
 ”پھر کیا۔ ہم اسے بتا دیں گے کہ راستہ کھلا ہوا ہے۔ آگے اس کی مرضی۔ بھاگنا چاہے تو بھاگ جائے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ وہ جائے گی نہیں۔“
 ”کیوں نہیں جائے گی؟“ رئیس بولا۔
 میں نے کہا ”اس لیے کہ وہ واپس جانے کے لیے نہیں آئی تھی۔ وہ کوئی نو عمر لڑکی نہیں ہے جو اپنے چاہنے والے کے ساتھ گھر چھوڑ آئی ہو۔ اسے دینی جاتا ہے۔“
 ”یہ سالار رحیم بخش آخر کون ہے کوئی خر کا رہے۔“

نہایت سحر خیز شہزاد خان فلم سے ایک مہلک شکار کا رول

زندگیاں میں پھول

قیمت 300 روپے

لکھنے والے: جعفر جعفری، تخریر: جعفر جعفری اور

وزیر تبلیغ: ڈوئی الیکٹریٹی ڈائریکٹری

ایک حادثے کے نتیجے میں باپ کی موت سے محروم ہو کر وقت اور حالات کی سختیوں کے رحم و کرم پر رو جانے والے چاروں بھائیوں کی کہانی، جن کی بد قسمتی نے ان کی اپنی ماں کو بھی ان سے بچا نہ کر دیا۔

یہ ایک ایسی کتاب ہے جسے آپ اپنے گھر میں رکھنا اور اپنے دوستوں کو تحفہ میں دینا پسند کریں گے

بہترین کتابت، خوبصورت گرد و پیش اور عمدہ طباعت کے ساتھ

بازار دست شگالہ کراچی

علی میاں پبلیکیشنز

۲۰ عزیزانیکریٹ اردو بازار لاہور 7247414

علی بکسٹال

نسبت روڈ، چوک میو ہسپتال، لاہور

میں نے کہا "خرکاروں کا ایجنٹ ہو سکتا ہے جو ادھر ادھر سے بچے پکڑ کر لاتے ہیں اور خرکاروں کو بیچ دیتے ہیں۔" ریشم بولا "کیا یہ عورت اس کی سا مٹی ہے؟"

"مجھے بھی شک ہے۔ رجم بخش نے اس عورت کو ذریعہ بنایا۔ پانچ بچے یہ عورت اپنے ساتھ لے آئی ہوگی" اسے بھی پیسوں کا لالچ ہو گا مگر رجم بخش جیسے لوگ ایسی عورتوں کو آزاد قتل کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ قتل کے بعد آزاد قتل کو ضائع کر دیا جاتا ہے۔"

"یہ خود ہی جانے کی بات کر رہی ہے۔ وہ جھوٹ ہے؟" میں نے کہا "سچ کیا ہے اس کی بات میں" کچھ بھی نہیں۔"

ریشم سوچ میں پڑ گیا "پھر تو اسے پولیس کے حوالے کر دینا سب سے بہتر ہو گا۔"

"کون کرے گا؟ نہیں پولیس کے حوالے؟ اور کیا بتائے گا پولیس کو ان کے بارے میں؟" میں نے کہا۔

"یار! اپنا فریضہ عبادی کر سکتا ہے یہ کام" ریشم بولا۔

"بالکل کر سکتا ہے لیکن نہیں کرے گا" میں نے کہا۔

"آخر کیوں نہیں کرے گا۔ نیکی ہے اور ثواب کا کام ہے۔"

میں نے کہا "ثواب کی اولاد یہ نیکی کا زمانہ نہیں ہے۔ الٹی نیکی اپنی برائی بن کے گلے پڑ جاتی ہے۔ وہ جو محاورہ تھا کہ نیکی کو دیا میں ڈال۔ وہ اب یوں ہو گیا ہے کہ نیکی کرنے والے کو دیا میں ڈال۔ پتا نہیں عورت تھانے میں کیا بک دے۔"

ریشم مایوس نظر آنے لگا "تو بھی سچ کہہ رہا ہے۔ ایک جال ہے یہ بھی۔ خرکار ان کے ایجنٹ اور پولیس سب نے مل کے ایک مافیا بنا رکھی ہے۔"

"او یار! یہ تو بڑی ناقابل یقین بات مگر ایسا بھی ہوتا ہے والدین کے عزیز رشتے دار خود ہی بچوں کو بیچ دیتے ہیں کیونکہ وہ ان کے اخراجات کا بار نہیں اٹھا سکتے یا اٹھانا نہیں چاہتے۔ یہ عورت کہتی ہے بچے میرے ہیں اور بچے انکار نہیں کرتے۔"

ریشم نے ایک آہ بھری "چل پھر ہم انہیں چھوڑ جاتے ہیں ان کی تقدیر پر۔"

میں نے کہا "ہمارے اپنے چکر بہت ہیں۔ کسی اور چکر میں پھنس کے ہم اپنے مقصد سے بھی دور ہو جائیں گے۔ اس دنیا میں ہر قدم پر ہمیں ایسی آزمائش کا سامنا ہو گا۔ ہم زبانی کہہ سکتے ہیں کہ۔ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے۔"

لیکن اس درد کا علاج ہمارے پاس نہیں ہے۔" ریشم نے سر ہلایا "چل آئیں ادھر لے آ" پھر ہم چلتے ہیں۔"

میں نے کہا "ہاں" بہت سہل مت لی گئی ہمیں۔ مجھے تو جرت ہے کہ ابھی تک کوئی آیا کیوں نہیں۔"

عورت خاموش کھڑی ہماری باتیں سن رہی تھی۔ اس کے پیچھے کھڑے ہوئے بچے بھوک سے بڑھ چکے تھے اس لیے جب کھڑے تھے ان میں سے ایک فرش پر لیٹ کے سو گیا تھا۔ میں نے عورت کی طرف دیکھا تو وہ ایک گڑبڑی اور دو گڑبڑی کے دو بچے جیسی چادر میں اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کرنے لگی مگر یہ ممکن نہیں تھا۔ گھٹنوں سے نیچے ٹانگوں اور شانوں کو دو گڑبڑیوں میں مستور نہیں کیا جاسکتا تھا۔

میں نے کہا "دیکھو۔ تم ادھر چلی جاؤ۔ اس دیوار کے ادھر کچن ہے۔ میرا مطلب ہے باورچی خانہ۔ وہاں آنا چاول دال بھی سب ہے۔ پکاکے خود بھی کھاؤ اور انہیں بھی کھاؤ۔"

وہ تذبذب میں وہیں کھڑی رہی۔ پہلے جھاڑ کھانے والا بچہ شاید بھوک سے زیادہ بے تاب تھا یا دوسروں کے مقابلے زیادہ بہت رکھتا تھا۔ وہ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کے بلانے لگا۔

"میں دال چاول کھاؤں گا۔"

پھر دو سرا بولا "میں بھی۔"

تیسرا سر ہلا کے بولا "جلدی کہ۔ مجھے بھی بہت بھوک لگی ہے۔"

وہ عورت ایک دم ان بچوں پر ہل پڑی۔ اس کی زبان سے گالیوں اور کوسنوں کا غلیظ دریا بہ نکلا۔ اس نے ایک ایک بچے کو بڑی بے رحمی سے بال پکڑ کے تھپڑ لگائے اور انہیں پیچھے گرا کے لائیں مارنے لگی۔ "حرامیو۔ بھوک کی بات کی تو جان سے مار دوں گی۔ کتے کے بچے کھا دوادوں گی ایک ایک کا جو کسی نے آواز بھی نکالی۔ نہیں ہے یہاں کھانا۔ تمہاری ماں چھوڑ کے نہیں گئی ہے دال چاول تمہارے لیے۔"

اچانک ایک بچہ اس سے پاگل کتے کی طرح چٹ گیا۔ اس نے عورت کے پاؤں پر کاٹ لیا پھر اس کے ہاتھ پر کاٹا اور پھر اس کے دوپٹے جیسی لمبی ہوئی ساری مٹی کی جیسے اس نے ایک بل دے کر جسم کے درمیانی حصے پر پیٹ رکھا تھا۔ دو گڑبڑیوں کی اوقات ہی کیا تھی۔ عورت نے ایک بیچ مار کے اسے گالی دی مگر جواب میں بچے نے اسے زیادہ بڑی گالی دی اور اس کا لباس لے کر بھاگ گیا۔ عورت چیختی رہ گئی۔ وہ اس کے پیچھے چند قدم دوڑی اور پھر سٹ کے فرش پر بیٹھ گئی۔

میں نے کہا "تم نے جھوٹ بولا تھا مجھ سے۔ یہ تمہارے بچے نہیں ہیں۔ تم ان کی سوتیلی ماں بھی ہو تیں تو ان کے ساتھ ایسا سلوک نہ کرتیں۔"

ریشم نے طیش میں کہا "سالی کے مار دو جھانپو۔"

میں نے کہا "میرے پاس وقت نہیں ہے ورنہ تمہیں اور رجم بخش کو پولیس کے حوالے ضرور کرتا۔ سب معلوم ہو جاتا کہ یہ کیا چکر ہے۔"

ریشم نے کہا "اب ایسا ہی کرنا پڑے گا یار۔ میں فون کر کے پولیس کو بلانا ہوں۔"

اس عورت کی صورت پر دہشت کے آثار نمایاں ہو گئے۔ "نہیں۔ میں ان کو کھانا کھاتی ہوں۔ ابھی سب کو پکاکے دیتی ہوں۔"

اس عورت کا لباس لے کر بھاگ جانے والا دور کھڑا اسے بڑی خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ میرے دھاڑنے سے وہ بھی ڈر گیا تھا۔ میں نے اسے اپنے پاس بلایا "ادھر آؤ" یہ چادر دو اور اس۔"

بچے نے چادر اس عورت کی طرف بڑی حقارت سے پھینک دی۔

میں نے کہا "یہ عورت کون ہے؟"

"نڈیراں۔ بڑی۔ ہے۔ بچے نے پھر ایک گالی دی۔"

"یہ تمہاری ماں نہیں ہے۔"

"میری ماں ایسی نہیں تھی۔ یہ تو ہے" وہ بولا۔

"رجم بخش کون ہے؟" میں نے کہا۔

"اس کا گھر والا یہ کہتی ہے۔"

"زیادہ بکواس مت کہ۔ پتا ہے یہ کون ہیں" پولیس کی وردی نہیں ہے ان کی مگر یہ پولیس والے ہیں" عورت پھر چادر پیٹ کر کھڑی ہو گئی۔

میں نے دھاڑ کے کہا "تم جاؤ" دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ جا کے کچن میں چلو جلاؤ اور کھانا کھاؤ ان بچوں کو۔"

وہ باہر ناخوست آگے بڑھی "تم سب کو میرے ساتھ"

اس نے بچوں کو مخاطب کیا۔

"کھانا پک جائے گا تو یہ آجائیں گے مجھے ان سے کچھ پوچھنا ہے۔ چلو نکلو ادھر سے" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے اسے دیوار کی طرف دھکیلا۔

ریشم نے دوسری طرف سے غرا کے کہا "اب شرافت سے آئے گی ادھر میں ٹھہرتی کے لاؤں؟"

وہ دیوار کے شکاف سے نکل گئی۔ اس کوشش میں وہ کپڑا پھر کھل گیا جس نے اس کی عریانی کا بھرم رکھا تھا لیکن عریانی شاید اس کے لیے کوئی جذباتی مسئلہ نہیں تھی۔ اس نے کپڑے کو پھر لپیٹا اور ریشم کے ساتھ کچن کی طرف چلی گئی۔

میں نہ جانے کے باوجود اس دلدل میں پھنس گیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے لیے ہر لمحہ قیمتی ہے۔ اوپر سونے تخت نشین میں ہماری دایب کی خطر تھی۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا خطروں بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ میں خیم کی تلاش کے مقصد سے بہت گیا ہوں اور اس خیال میں ایک بجرانہ ندامت کی غلط تھی جس کا ایک الگ آزار تھا لیکن

سیدھے راستے پر چلتے ہوئے یہ دلدل میری راہ میں یوں حائل ہو گئی تھی کہ میں اس سے بچ کے نہیں نکل سکتا تھا۔ اس دلدل کا علم مجھے اس میں ایک قدم رکھ دینے کے بعد ہوا تھا اور اب میں پیچھے قدم نہیں ہٹا سکتا تھا۔

ریشم کی آواز سن کے میں نے دوسری طرف جھانکا۔ وہ اسلم سے پوچھ رہا تھا "تو نے جو شلوار پن ریکی ہے" اس کے پیچھے کیا ہے؟"

"کچھ۔ کچھ نہیں۔ بس یہ شلوار ہے۔" وہ ہوش میں آنے کے بعد کچھ ہکا بکا رہا تھا۔

"انڈر ویئر کیوں نہیں پہنتا پاگل کے بچے اچھا چل" قیص اتار۔

"کیا۔ قیص!"

"ہاں قیص۔ نیچے بنیان ہے نا" کالی ہے" ریشم نے چٹکی بجاتی "جلدی کرو ورنہ دونوں اترو لوں گا۔"

میں سمجھ گیا کہ قیص وہ اس عورت کو دے گا۔ یہ قیص ہی اتنی لمبی تھی کہ عورت کے جسم کو خنوں تک چھپا سکتی تھی۔ میں بچوں کی طرف متوجہ ہو گیا "دیکھو" میں تم سب سے باری باری سوال کروں گا۔ جھوٹ نہیں بولنا مجھ سے۔ میں پولیس والا نہیں ہوں مگر میں تم سب کو پولیس کے حوالے کر سکتا ہوں۔ تمہیں معلوم ہے وہ کیا کرتے ہیں؟"

سب سے پہلے بغاوت کرنے والے کا نام حاد تھا۔

"پہلے وہ نکال کر کے اٹا کادیتے ہیں اور پھر۔" وہ مجھے تفصیل

مدارنی ☆ 249 ☆ ساتواں حصہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے تانے لگا۔

اس کی بات سن کے میں بھونچکا رہ گیا، وہ بات قابل اشاعت نہیں ہے مگر ایک محصوم بچے کے منہ سے تھانے میں ہونے والے تشدد کی معلومات کا اعتراف سننا میرے لیے ایک انتہائی افسوس ناک تجربہ ہے۔ معلوم نہیں وہ تھانے میں سب دیکھ چکا تھا یا اسے دہشت زدہ کرنے کے لیے یہ سب بتایا گیا تھا۔

باقی بچوں سے ان کے بارے میں جان کے مجھے سخت دکھ ہوا۔ ان میں سے دو کو خود ماں باپ نے رجم بخش کے حوالے کیا تھا کہ وہ ان کو دینی لے جانے کسی کے پاس ملازم رکھوادے۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ دینی میں اور دوسری عرب ریاستوں میں کام کرنے والوں کو بہت پیسے ملتے ہیں۔ چھوٹے بچے گھروں میں اور بھولوں میں کام کرتے جتنی رقم رپال اور درہم کی صورت میں کماتے ہیں وہ پاکستانی کرسمی کے حساب سے ہزاروں میں ہوتی ہے۔ گاؤں کے لوگوں نے لاہور کراچی جیسے شہروں میں بچوں کو یہی کام کرتے دیکھا تھا۔ وہ کیسے جان سکتے تھے کہ چائلڈ لیبر کے قوانین پر باہر کتنی سختی سے عمل ہونا ہے اور وہ بچے جو یہاں سے جاتے ہیں وہ کیا کرتے ہیں۔ ان سے کس قسم کے غیر قانونی اور غیر اخلاقی کام لے جاتے ہیں اور ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے۔ میں نے کہا "حامد تم کس گاؤں کے ہو اور رجم بخش کو کیسے جانتے ہو؟"

اس نے مجھے رجم یا رخان کے ایک دور افتادہ گاؤں کا نام بتایا "رجم بخش گاؤں میں آتا رہتا ہے۔ اس نے بت سے لوگوں کو دینی میں نوکری دلائی تھی۔"

"نذیراں بیوی ہے اس کی؟"

حامد نے سوچ کے کہا "ہوگی۔ مجھے پتا نہیں، مگر وہ ہمارے گاؤں کی ہے۔ پہلے اس کا شوہر شرفو تھا۔"

"پھر کیا شرفو نے چھوڑ دیا ہے؟"

بچے جیسے لگے "شرفو تو مر گیا تھا۔ نرس سے کٹ کے۔"

"اچھا؟" میں نے حیران ہو کے کہا "یہ کب کی بات ہے؟"

"اس بات کو سال ہو گیا۔ شاید زیادہ۔"

میں نے کہا "پھر گھروالوں نے نذیراں کی شادی رجم بخش سے کر دی۔"

بچے پھر شینے۔ انہیں میری کم علمی پر حیرانی تھی "نہیں جی۔ یہ پہلی گئی تھی دینی۔ وہاں کسی کے گھر میں کام کرتی تھی۔ اور پھر اس نے خود ہی رجم بخش سے شادی کر لی۔"

یہاں اس کا کوئی نہیں تھا۔

میں نے پوچھا "پھر وہاں کیوں آئی تھی؟"

حامد نے پھر سوچا "پہلی بار آئی تھی تو ماسی سکھان کی بیٹی کو اور۔۔۔ ماسی غلام دین کی ایک بیٹی کو ساتھ لے گئی تھی۔ نوکری دلانے، وہ گھر میں کام کرتی ہیں۔"

"کیا وہ واقعی دینی میں ہیں؟ اور کیا کسی نے بھی دینی جا کے انہیں دیکھا؟ وہ واقعی گھر میں کام کرتی ہیں؟"

"لوٹی، کام نہ کرتیں تو پیسہ کیسے آتا گھروالوں کے لیے؟"

اس بچے سے میں براہ راست یہ نہیں پوچھ سکتا تھا کہ دینی جانے والی لڑکیوں کی عمر کیا تھی۔ رنگ روپ کیا تھا اور چل چلتی کیسا تھا۔ پیسہ تو وہ یقیناً کماتی ہیں مگر ان کے کام کی نوعیت کیا ہے؟ یہ دن کی کمائی ہے یا رات کی؟ وہ کیسے ماں باپ تھے جنہوں نے جو ان کی کمائی لے کر اپنے دینی جانے والے کسی ایسا تو نہیں کہ وہ دینی کے بجائے بنگال یا بانک بنگل چلی گئی ہوں؟

میں نے کہا "اور کس کو لے گئی تھی نذیراں؟"

"گاؤں کے تین چار منڈے بھی گئے ہیں۔ اور بہت پیسے ملتے ہیں مگر انہوں نے گھروالوں کو کچھ نہیں بھیجا۔"

بہت خوب۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ کماتو بہت کچھ نہیں بھیجتے اور لڑکیوں کی کمائی ماں باپ کوئی سوال کیے بغیر کھا رہے ہیں۔

"اب یہ بتاؤ حامد کہ تمہارے ماں باپ کو رجم بخش نے کتنا پیسہ دیا تھا؟"

"میں نے پوچھا۔"

"پھر ایک ہزار؟" بات وہ جانتا تھا۔

"اچھا۔ دینی جا کے تم کیا کرو گے؟"

"نذیراں نے بتایا تھا کہ گھر کے اندر بہت کام ہوتے ہیں۔ جہاز پونچھ، بچوں کو کھانا، دو چار سال بعد جب میں بڑا ہو جاؤں گا تو کسی ہوٹل یا ورکشاپ میں کام مل جائے گا۔"

حامد بولا "میں خوب پیسہ کمائوں گا پھر شہر میں مکان بناؤں گا اور گاڑی خریدوں گا۔"

اس نے دوسرے ساتھی بچوں کے بارے میں اس نے بتایا کہ ایک کی ماں مرجھ گئی تھی اور باپ دوسری شادی کر کے اسے بھول گیا تھا۔ باقی تین کے ماں باپ دونوں ہی نہیں تھے۔ چنانچہ وہ رشتے داروں کے گھر میں رہتے تھے۔ وہ سب ایک ایک ہزار نقد وصول کر کے بہت خوش ہوئے تھے کہ ان کی جان چھوڑا۔ بچوں سے انہوں نے یہی کہا تھا کہ باہر جا کے ان کا مستقبل سنو رہا ہے گا۔ وہ ایک مہینے سے لاہور میں

تھے۔ پہلے ان کو ایک گھر میں رکھا گیا تھا جہاں وہ بہت آرام سے تھے۔ ان کے پاس پیسے کے لیے اچھے کپڑے تھے۔ انہیں کھانے کو اچھا ملتا تھا اور دوبار رجم بخش ان کو گاڑی میں بھر کے لاہور شہر کھانے بھی لے گیا تھا۔ وہ چڑیا گھر دیکھ کے بہت خوش ہوئے تھے پھر ایک رات نہ جانے کیا ہوا کہ دوسری رات کے وقت انہیں جگا دیا گیا اور وہ بڑی افرا تفری میں رجم بخش کے ساتھ یہاں آ گئے۔ رجم بخش نے نذیراں کو بہت مارا۔

میں نے پوچھا "کس بات پر؟"

"رجم بخش کہتا تھا کہ تو نے انہیں اطلاع دی۔"

میں نے کہا "انہیں یعنی پولیس کو؟"

"پتا نہیں جی۔ ویسے جب ہم رات کے وقت نکلے تھے تو رجم بخش یہی کہہ رہا تھا کہ جلدی کرو ورنہ پولیس آجائے گی۔"

حامد نے کہا "یہاں وہ آپس میں لڑنے لگے۔ رجم بخش اور نذیراں۔"

"تم بہت سمجھ دار ہو۔ یہ بتاؤ کہ لڑائی کیوں ہوئی تھی۔"

کیا کچھ بیسوں کا معاملہ تھا؟ میں نے پوچھا۔

حامد نے اقرار میں سر ہلایا "نذیراں کہتی تھی کہ مجھے دس ہزار بھی دے۔ دینی جانے سے پہلے ورنہ میں تیرے ساتھ نہیں جاؤں گی اور سب کو بتا دوں گی۔"

میں نے کہا "نذیراں میں رجم بخش مارا تھا اسے؟"

"ہاں۔ پہلے وہ کہتا تھا کہ یہاں میرے پاس دس ہزار نہیں ہیں۔ میں گے تو دوں گا مگر نذیراں کہتی تھی کہ بعد میں تو مجھے پچانے گا بھی نہیں۔ ابھی مجھے میری ضرورت ہے۔"

میری مدد کے بغیر تو کیسے لے جائے گا ان کو۔"

"اچھا، اب یہ بتاؤ۔ نہ رجم بخش تمہارا باپ ہے نہ نذیراں کسی کی ماں ہے، پھر تم نے جموٹ کیوں بولا تھا مجھ سے؟"

وہ لڑو اور دھرم دیکھ کے بولا "رجم بخش نے کہا تھا کہ کوئی پوچھے تو یہی کہتا۔"

"اچھا۔ اور کیا کہا تھا؟"

وہ سوچنے لگا "اور سمجھایا تھا کہ۔۔۔ میں اس کے ساتھ پیدا ہوا تھا۔ گھڑو کے ساتھ۔ آٹھ دسہرا انہیں سوا کیا۔"

"یعنی تم دونوں جڑواں بھائی ہو؟"

"ہاں اور یہ دونوں بھی جڑواں ہیں۔ ایک سال بعد پیدا ہوئے تھے۔"

اس نے دو بچوں پر ہاتھ رکھا۔

میں نے ان سے پوچھا "کیا تمہیں اپنی پیدائش کی تاریخ یاد ہے؟"

وہ ایک ساتھ بولے "سترہ نومبر انیس سو پانچ۔"

"ویری گڈ۔ یعنی تم دونوں یکساں سال کے ہو۔ حامد اور گڈو سے ایک سال چھوٹے ہو اور یہ پانچواں؟"

پانچویں سے کہا "میں دس سال کا ہوں۔"

میں نے کہا "تم اکیلے ہی آئے تھے دنیا میں۔ تمہارا ساتھ نہیں دیا کسی نے بھی۔ خیر کوئی بات نہیں، اب یہ بتاؤ کہ تم دینی کب جا رہے ہو؟"

حامد ان سب کے مقابلے میں تیز تھا۔ "ہم انشاء اللہ اسی ہفتے۔"

"جہاز گئے کیسے؟"

"ہوائی جہاز سے۔" اس نے ہاتھ سے جہاز اڑایا "رجم بخش نے کہا تھا کہ بس وہ مل جائیں، وہ کیا ہوتا ہے؟"

"پاسپورٹ اور ویزا؟" گڈو نے اس کی مدد کی۔

"ہاں۔ اس کے بعد ہم ٹکٹ لے کر جہاز میں بیٹھ جائیں گے۔ رجم بخش نے کہا تھا کہ ہر سوال کا صحیح جواب دنا ورنہ ہوائی اڈے پر پولیس روک لے گی اور یہ بھی سمجھایا تھا کہ اپنا نام کیا جانا ہے۔"

صاف ظاہر تھا کہ نذیراں اور رجم بخش نے ایک ایک ہزار میں یہ بچے خرید لیے تھے اور اب انہیں اپنے بچے ظاہر کر کے ساتھ ہی لے جا رہے تھے۔ انہوں نے بڑی چالاکی سے عمروں کے فرق کو بھی گور کر لیا تھا۔ ان بچوں کو کتنے نام دیے گئے تھے جو اصل سے بالکل مختلف تھے۔ ان کا پاکستان کا رہائشی پتا بھی غلط تھا چنانچہ ایک بار ملک سے نکل جانے کے بعد کوئی بھی ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کر سکتا تھا کہ انہیں اونٹوں کی دوڑ کے لیے بچے خریدنے والوں کے ہاتھ بیچ دیا گیا یا کسی بوسوالمس کی جنسی غلامی میں دے دیا گیا۔ دینی کا صرف نام تھا۔ غلاموں کی منڈی میں عورت مراد اور بچوں کی تجارت دنیا کے سب مذہب کھلانے والے ممالک میں بھی ہو رہی تھی۔ جہاں دولت تھی وہاں انسان کا جسمانی استحصال ایک منافع بخش کاروبار کی حیثیت سے بڑے پیمانے پر اور انتہائی منظم انداز میں جاری تھا۔ جنوب مشرقی ایشیا کے بہت سے ساحلی شہروں میں جہاں دنیا بھر کے ٹورسٹ ڈالر لے کر آتے تھے، چائلڈ PROSTITUTION کی فنت، انسانیت اور شرافت پر خندہ زن تھی۔ دولت مند عیاش یوزھے جن کو ذہنی مریض ہی سمجھنا چاہیے پھولوں کے ساتھ کچی کلیاں بانٹتے تھے۔ عورتیں نو عمر لڑکے اور نومند جوان خریدتی تھیں۔ ہم جنس پرستی نے تو ترقی یافتہ ممالک میں دوا کی شکل اختیار کر لی تھی۔ مردوں اور عورتوں نے اپنے کلب اور اپنی

مداری ☆ 251 ☆ ساتواں حصہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

”جب ایک آدمی گرتا ہے تو اس کی گراوٹ کی حد کوئی نہیں ہوتی۔“

رئیس نے اگلے دروازے کے آلے کا نشانہ لیا ”کیسی سزا مل رہی ہے اس قوم کو اس کے اعمال کی۔ ملک جیسے لوگ عوام کے دونوں سے منتخب ہو کے اسمبلی میں ان کی نمائندگی کر رہے ہیں۔“

میں نے کہا ”یہ تو قانون قدرت ہے۔ اللہ نے کہا ہے کہ جب کسی قوم کے اعمال مجبوزات ہیں تو ان پر ایسے ہی ظالم اور غلاب دینے والے حکمران مسلط کر دیے جاتے ہیں۔“

اگلے کمرے کا آٹا بھی ٹوٹ گیا۔ یہ کراخانہ تھا مگر دیوار پر کیلوں سے کپڑے ننگے ہوئے تھے۔ ان پر ایک نظر ڈالتے ہی میں سمجھ گیا کہ یہ اسی عورت کے اور پانچ بچوں کے کپڑے تھے جو رحیم بخش جاتے ہوئے یہاں لٹکا گیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے خیال آیا کہ میں واپس جا کے یہ کپڑے انہیں دے دوں مگر مایوسی کے رد عمل نے مجھے ان کی طرف سے متفرق کر دیا تھا۔ ان کے لیے کچھ بھی کرنا حاصل تھا۔

اچانک میرے پیچھے کمرے کا دروازہ بڑی آواز کے ساتھ بند ہوا۔ یہ اسلم تھا جو موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فرار ہو گیا تھا۔ اس نے پیچھے والا دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔

رئیس نے سب اختیار راستے ایک گالی دی اور دروازے پر لٹ مار دی مگر دروازے پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ رئیس اپنا پاؤں پکڑ کر اڑنے لگا۔ ”یاس میں نے سوچا تھا ٹوٹ جائے گا۔“

میں نے کہا ”کوئی فائدہ نہیں رئیس۔ وہ دروازے کے پیچھے ہمارے انتظار میں کھڑا نہیں ہو گا۔ وہ بھاگ گیا ہو گا۔“

”بھاگ کے بھی وہ کہاں جاسکتا ہے؟“ اس نے دروازے کو ٹکرماری۔

میں نے کہا ”مت کوشش کر۔ تیرا کندھا بھی ٹوٹ جائے گا۔“

رئیس بولا ”وقت نہیں ہے ہمارے پاس ورنہ وہی کے نہیں جاسکتا تھا۔“

میں نے کہا ”اسلم سے ہمیں کوئی خطرہ نہیں۔“

کمرے کے آخری حصے میں مجھے زندہ نظر آیا۔ زمین کے نیچے کا نقش میرے ذہن میں تھا پانچ قیاس یہ کتا تھا کہ زمین سے چراگ کے ہم سطح زمین پر اسی جلد طلوع ہوں گے جہاں سے سرفی خانے میں داخل ہوئے تھے اور میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ آخری دروازہ وہاں تھا جہاں ہم نے ٹرک کھڑا کیا تھا۔ اسے کھولنے کے لیے بھی رئیس کو فائر کرنا پڑا۔

باہر آتے ہی میں نے سونی کو دیکھا۔ وہ اپنی کھاشکوف کا رخ ہماری طرف کیے کھڑی تھی ”ہمت دیر گزری تم نے فائرنگ کی تو انیس من من کے مجھے بڑی پریشانی لاحق ہو رہی تھی۔“

”خورتوں کو کچھ آتا ہے پریشان ہونے اور پریشان کرنے کے سوا“ رئیس بولا۔

سونی گرم ہوئی ”یہاں کھڑی کیا میں آئس کریم کھا رہی تھی؟“

”تم نے کون سی قوب چلائی“ رئیس بولا۔

”تم تو مجھے ہوتے تھے زمین میں چوہ کی طرح۔ کوئی آتا تو متاں بل مجھے ہی کرتا پڑتا“ وہ تیز ہو کے بولی۔

”ڈر لگتا ہے تو کس نے کہا تھا یہ ذمہ داری لینے کو۔“

”رئیس میں کوئی مار دوں گی۔ میں نے کب کہا ہے کہ مجھے ڈر لگتا ہے“ وہ چلائی۔

میں نے کہا ”کیا پاگل ہو گئے ہو تم دونوں۔ یہ جگہ ہے لڑنے کی؟ اتنا اونچا بول رہے ہو کہ ایک میل دور کوئی من لے۔“

”اس ڈاکو کی بیٹی کی آواز ہے کالے انجن کی سنی جیسی“

رئیس نے آہستہ سے کہا۔

”خبردار جو پھر بھی مجھے وکی بنی کہا۔ میرا باب ایک شریف آدمی تھا۔ نچر تھا وہ۔ تم جیسے جاہلوں کو پڑھا لکھا کے انسان بنا تھا۔ سونی رو بائیں ہو گی۔“

میں نے ان دونوں کے آگے ہاتھ جوڑے ”خدا کے لیے چپ ہو جاؤ۔“

”تم بھی مجھے ہی کہہ رہے ہو۔“ سونی کا لہجہ شدت جذبات سے روئے ہوا تھا۔

میں نے کہا ”میں غیبت اب کوئی بات کی ایسی دیکھی تو میں سنی۔“

”وہ سنی منٹ لے مجھ سے۔“

”وہ سنی گا“ میں تو بالکل خاموش ہوں۔“

”میں چھوڑوں گی نہیں جو اب کچھ کتا تو“ سونی اسے گھورتی رہی۔

”وہ ٹرک تو کیا جس پر سوار ہو کے ہم یہاں آئے تھے۔ اب ہم چلتے ہیں اور۔ جہاں ہماری گاڑیاں کھڑی ہیں۔“ میں نے کہا۔

رئیس نے احاطے کی دیوار کو دیکھا ”سرج لائنس کو ان کو دینا چاہیے۔“

”وہ کس لیے۔ ہم اندھیرے میں ہی نکل جائیں تو اچھا ہے۔“ سونی نے کہا۔

میں نے کہا ”یہ تو خدا کا شکر ہے کہ دو ذہانی گھنٹے خیریت سے گزر گئے۔ کوئی آیا نہیں۔“

”یار ایسی بات تو مجھے شک میں مبتلا کرتی ہے“ رئیس بولا ”فرض کروہ باہر انتظار کر رہے ہوں ہمارا۔ جیسے گیٹ بند کر کے اور سونی خھر تھی کہ کوئی اندر آئے تو اس کا استقبال گولیوں سے کیا جائے کیا ایسے ہی گیٹ کے باہر وہ ہمارے خھر نہیں ہو سکتے۔“

رئیس کی بات میرے دل کو لگی ”بالکل ہو سکتے ہیں۔ جو بات ہمارے دماغ میں آئی وہ دشمن بھی سوچ سکتا ہے۔“

”مگر سرج لائنس روشن کرنے سے کیا ہو گا؟“ سونی نے کہا۔

”ہم دیکھ لیں گے انہیں۔ وہ اندھیرے کی چادر میں روپوش ہوں گے تو نظر آجائیں گے“ رئیس بولا۔

”مگر وہ بھی تو دیکھ لیں گے ہمیں بے وقوف“ سونی نے کہا۔

میں نے کہا ”پہلے میں جا کے دیکھتا ہوں۔ گیٹ کی سائڈ کو چھوڑ دو۔ لمبائی کے رخ کی دیوار سڑک کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ میں دائیں بائیں چوڑائی کے رخ والی دیوار۔“

ادھر چڑھ کر دیکھوں گا۔“

سونی نے کہا ”لیکن دیوار پر کانٹوں والی تار کی باڑھ ہے اور تاروں میں بجلی بھی ہو گی۔“

”مجھے معلوم ہے اس کے لیے مجھے بس ایک پلاس چاہیے جس پر رہ رہو۔ اس سے تار کاٹے جاسکتے ہیں۔ اگر دیوار کے دوسری طرف کوئی نہیں ہو گا تو میں باہر اتر جاؤں گا۔“

میں نے کہا۔

”کار کاٹنے ہی الارم چلانے لگے گا“ سونی نے کہا۔

”نہیں۔ اس کا سوچ آف ہے۔ سرج لائنس اور الارم کا ایک ہی کنٹرول ہے کیا تم نے دیکھا نہیں تھا۔“

رئیس بولا ”اور دوسری طرف کوئی ہوا پھر؟“

”پھر کیا۔ منٹ لیں گے اس سے بھی۔“

”ابے کیا وہ موقع دے گا مجھے دیوار پر تیری شکل دیکھتے ہی گولی مار دے گا اور پھر پوچھے گا کہ کون ہے؟“ رئیس نے کہا۔

سونی نے اس کی تائید کی ”تار کاٹنے سے آواز ہو گی اور دیوار پر کوئی چیخنی کی طرح نہیں چڑھ سکتا۔“

میں نے چڑ کے کہا ”یار اب اتنا رسک تو لینا ہی پڑے گا۔ یہ کیا ضروری ہے کہ جہاں سے میں تار کاٹوں اور دیوار پر

چڑھوں“ میں اسی جگہ دوسری طرف کوئی موجود ہو۔ اگر آئے تو کتنے لوگ آئیں گے چار چھ یا آٹھ دس زیادہ سے زیادہ۔ احاطے کی دیوار اتنی لمبی ہے کہ ہر دس گز کے فاصلے پر ایک آدمی کھڑا کرنے کے لیے کم سے کم بھی پچاس آدمی چاہئیں۔ ان کی زیادہ توجہ ہو گی گیٹ پر اور سامنے کی طرف۔ ہم بالکل مخالف سمت کی سائڈ سے نکل سکتے ہیں۔“

سونی نے کہا ”میں پلاس لاتی ہوں۔ اندر ایک دراز میں سارے نول پڑے ہیں ڈائریکٹری ہے۔“

”دیکھ لینا اس پر جو رہ چڑھا ہوا ہے وہ کیس سے کتا ہوا نہ ہو ورنہ چار سو پچاس دولت کا ایک جھکا کافی ہو گا مجھے۔“

”وہ خود بھی یہی نول استعمال کرتے تھے۔ خراب کیسے ہو سکتے ہیں“ سونی نے کہا۔

سونی پلاس بھی لائی تھی مگر میں نے وائر کٹر رکھ لیا۔ دہری انسولیشن کے لیے ربر کے اوپر نیپ بھی لپیٹ دیا تھا۔ سونی نے مجھے ایک ٹارچ بھی پیش کی ”اگر خھر کوئی نہ ہو تو لائٹ ایک بار جلا کے آل کھینچ کر کھنکھل دے ورنہ۔“

”ورنہ دیوار جلا کے خطرے کو اپنے پاس بلالینا۔ کبھی تو

قلم کے نواب محی الدین نواب کا ایک طویل ناول

150

اندھیرنگری

محی الدین نواب

چار جلدوں میں مکمل

ایکشن اور تھرس کا نر دلا سلسلہ آپ کی رگوں میں ابھرے گا

سیاست کے سانپ اور ان کی زہریلی سازشوں کا حال

چوری، نیار بھرائی کرنے والے ”خفیہ ہاتھ“ کی سازشوں کا حال

بھارتی خفیہ ایجنسی ”راکی پاکستان میں تحریکی کارروائیوں کی داستان

”سندھ کے دہریوں کی“ ”خدا کی“ کی ناقابل یقین داستانیں

اپنے باکرہ پاپے شہر کے براہ راست ہمسایا سے طلب فرمائیں

ناشر: الرفاعی پبلشرز اینڈ ڈسٹریبیوٹرز لاہور

ایڈس: علی میاں پبلیکیشنز ۲۰، منگل پور، لاہور

۵۷۲۸۷۶۱۴

غلطی سے عقل کی کوئی بات کرلو۔" رئیس نے اسے ڈانٹا۔
سونی کہاں سے سننے والی تھی "تمہارے پاس عقل ہے
میری بات سمجھنے کے لیے۔"
رئیس ہنس پڑا "ہناؤ عقل تو عورت کی ذات کمالاتی
ہے۔"

میں نے کہا "ناقص العقل۔ جاہلی کی اولاد۔"
"بے باں بوی" رئیس نے خفت سے سر کھینچا۔
سونی نے کہا "کیوں اپنا وقت ضائع کرتے ہو سمجھانے
میں۔ جاہل تو جاہل ہی رہتا ہے۔"

"اور تم کہاں کی ایم اے پی ایچ ڈی ہو۔" رئیس کا پارا
چڑھ گیا۔

"بند کمر" یہ بکواس! میں نے گیٹ والی دیوار کے
دائیں جانب والے آخری کونے کا رخ کرتے ہوئے کہا
"خطرے کی کوئی بات نہیں ہوگی تو میں دیوار کو عبور کرنے سے
پیلے لائٹ کا مشکل دون کا پھر سب اور مری سے نکل جائیں
گئے ورنہ دوسری طرف کی دیوار کو دیکھیں گے۔"

"آخر ہم سب ایک ساتھ کیوں نہیں جاسکتے؟" سونی
نے پوچھا۔

"کم سے کم ایک کو یہاں موجود رہنا چاہیے۔ اگر کوئی
اچانک گیٹ کی طرف سے آگیا یا دیوار کے اوپر سے تو اسے
کون روکے گا؟" میں نے کہا۔

"سونی۔ تم جاؤ تاہم کے ساتھ" رئیس بولا "میں یہاں
رہوں گا۔"

سونی میرے ساتھ چل پڑی اور پھر رک گئی "میںوں نہ
میں دوسری طرف جاؤں۔ اگر ادھر سے راستہ صاف ملا تو میں
دیکھ لوں گی ڈورنہ واپس آجاؤں گی۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے" میں نے کہا "مگر دیکھو" احتیاط سے
کام لیتا۔ میں ہمدردی سے مقابلہ کرنے کے مقابلے میں بزدلی
کے ساتھ فرار ہو جانے کو ترجیح دوں گا۔"

میں نے سونی کو مخالف سمت میں جانے دیکھا۔ احاطے
کے اندر کی روشنی میں وہ کچھ دور جانے کے بعد ایک سائے
کی طرح نظر آنے لگی۔ میں احاطے کے اس کونے کی طرف
چل پڑا جو گیٹ سے انتہائی فاصلے پر تھا۔ احاطے کی دو
دیواریں دوسرے کونے میں ملتی تھیں اور گیٹ سے آخری
کونے کو ملایا جاتا تو یہ اسی مثلث کا وتر ہوتا۔

میں نے جو بات سونی کو سمجھائی تھی اسے ایک پالیسی
بیان یا میری حکمت عملی کا حصہ سمجھا جاسکتا تھا۔ میں نہ
پولیس کے ساتھ مقابلہ چاہتا تھا اور نہ سب سے معاملات کی فوج

سے خون خرابے سے ہر ممکن حد تک گریزی بہتر تھا۔ مجھے
بلا مقابلہ اپنی شکست اور گرفتاری منظور تھی لیکن کسی کی
موت نہیں۔ کلاشکوف ہاتھ میں ہو تو اندھا دھند گولیاں
برساتے ہوئے اپنے سے دس گنا یا سو گنا طاقتور دشمنوں کی
یلفار کو کام ہٹانے کے مقابلے سے ایسے نکل جانا کہ ہیرو کو
خراش تک نہ آئے لیکن دشمنوں کے کشتوں کے پٹے لگ
جائیں۔ یہ صرف فلموں میں ہی ممکن ہوتا ہے۔

دیوار کے قریب پہنچنے کے میں نے پھر سونی کو دیکھا۔ وہ
مخالف سمت کی دیوار کے اوپر چڑھ رہی تھی۔ اس کے پاس
پلاس تھا چنانچہ وہ بھی جلی کے شاک سے محفوظ تھی۔ اس کا
جسم دھلا پتلا اور ہلکا تھا اور اسے یقیناً ریکس بھی درنہ
دیوار کی بلندی تک پہنچنے کے مار کاٹنا مشکل کام تھا۔ خود مجھے

عملی مشکلات کا اندازہ دیوار کو دیکھ کے ہوا۔ اگر میں
کلاشکوف ایک کندھے پر لٹکا لیتا۔ وائر کٹر اور نارنج کو پتلون
کی سائڈ پکٹ میں ڈال لیتا تو آسانی سے چپ لگا کے اوپر
والے کنارے کو نہیں پکڑ سکتا تھا۔ اس سے میرے قدموں
کی دھمک پیدا ہوتی۔ شاید نارنج یا وائر کٹر کی دیوار پر رگڑ سے
آواز پیدا ہوتی یا کلاشکوف دیوار سے ٹکرائے شور پیدا
کرتی۔

میں نے ادھر ادھر نگاہ ڈالی تو مجھے کچھ تختے بڑے نظر
آئے۔ ان تختوں کی لمبائی پندرہ فٹ کے قریب تھی اور یہ
پاس کے ساتھ ملا کے بانڈھے جاتے تھے راج مستری ان پر
کھڑے ہو کے چٹائی کرتے تھے اور پلستر کرتے تھے عمارت
کی اونچائی کے ساتھ ساتھ پاس کو پاس کے ساتھ جوڑتے
جاتے تھے اور پراچ کو اوپر اٹھاتے جاتے تھے میں نے اس
انتہائی خطرناک دسی طریقے سے پہنچاؤ اور چھ منزلہ عمارتوں کی
بلندی تک راج مستریوں کو انتہائی مہارت سے کام کرتے
دیکھا تھا۔ وہ جی جی جان پھیلی پر رکھ کے کام کرتے تھے اور
بعض اوقات توازن بگڑنے سے گر کے ہلاک بھی ہو جاتے
تھے۔

میں نے ایک تختے کو ان کی دیوار کے ساتھ اس طرح
لگایا کہ اس کا اوپر والا کنارہ دیوار کے کنارے سے مل گیا۔
اس کا زمین کی سطح کے ساتھ تقریباً ساٹھ ڈگری کا زاویہ بنایا تھا
اور یہ چڑھائی تقریباً عمودی تھی لیکن میں چڑھائی کا زاویہ بدل
کر پینتالیس ڈگری پر رکھتا تو تختے کا اوپر والا کنارہ دیوار کی
بلندی تک نہ پہنچتا۔

تختہ ایک رانچ سے زیادہ موٹا اور بہت مضبوط تھا۔ اس
کے درمیان سے ٹوٹنے کا کوئی امکان نہیں تھا مگر میں نے اس

پر چڑھنا شروع کیا تو تختہ درمیان سے ٹک کھانے لگا۔ میں
احتیاط سے قدم جاتا اور توازن پر رقرار رکھتا اور چڑھتا گیا
یہاں تک کہ دیوار پر لگی ہوئی کانٹے والی تاروں کی باز
میرے سامنے آگئی۔

میں نے ٹانج کو دیوار پر رکھ دیا اور تار کانٹے والا پلاس
نکال کے سب سے نیچے والی لائٹ کاٹ دی۔ تار کے دو حصے
الگ ہو کر دیوار سے نیچے ٹھکے لگے۔ دوسرا تار ایک فٹ اوپر
تھا اور چھ فٹ بلندی تک تاروں کی پانچ لائٹس نظر آرہی
تھیں۔ ان تاروں کو سپورٹ کرنے والے فولادی جھبے میں
میں فٹ کے فاصلے پر تھے۔ درمیان سے کانٹے جانے والے
ہر تار کے دو حصے ہو جاتے تھے۔ دس فٹ کا ایک ٹکڑا دائیں
جانب کے پول سے لگا رہا تھا۔ دوسرا بائیں پول سے
منسلک رہتے ہوئے نیچے جمولنے لگا تھا۔

الیکٹرک شاک کے خطرے سے محفوظ ہو جانے کے بعد
میں نے دیوار پر چڑھ کے باہر کے سارے منظر کو غور سے
دیکھا۔ چوڑائی کے رخ دیوار سڑک تک پھیلی ہوئی تھی۔
جہاں تک میری نظر اندھیرے میں دیکھ سکتی تھی مجھے کسی
انسان کا سایہ تک نظر نہ آیا۔ دائیں ہاتھ کی طرف خالی پلاٹ
پر ایک کتے نے سوتے سے سر اٹھا کے مجھے دیکھا اور غرا ہوا
اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے سارے جسم میں سرخی کی لہریں

دوڑ گئی۔ سانپ اور بچھو سے میں اتنا نہیں ڈرتا جتنا کتے سے
ڈرتا ہوں۔ شاید یہ کوئی نفسیاتی خوف ہے بالکل اسی طرح
جیسے خواتین کا کوچ یا چھپکلی سے ڈرتی ہیں۔ میں اپنی جگہ
پر بے حرکت ہو گیا اور کتے نے مجھ پر ترس کھاتے ہوئے چپا
ارادہ بدل دیا۔ وہ کچھ دور جا کے پھر لٹ گیا۔ اگر وہ میری
طرف منہ کر کے بھونکنے لگتا تو دیوار پر میری موجودگی کا راز
فاش ہو جاتا۔ کسی جھپے ہوئے دشمن پر جس کی موجودگی ابھی
تک ثابت نہیں تھی۔

میرا پہلے ارادہ تھا کہ میں دیوار کے دوسری طرف
اتر جاؤں جہاں اندھیرا تھا اور دیرانی تھی۔ کسی فارم ہاؤس یا
مرئی خانے کے لیے خریدے ہوئے پلاٹ ابھی تک بے مصرف
پڑا ہوا تھا۔ اس کی حد بندی کے لیے چاروں طرف ایک ایک
فٹ کی چٹائی کڑی گئی تھی۔ پلاٹ پر خود رو گھاس اور
مجازیوں کے ساتھ جمونے جمونے درخت بھی نظر آرہے
تھے جو باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت لگائے گئے تھے مگر ابھی
بڑھ رہے تھے۔

پھر میں نے بائیں جانب چوڑائی کے رخ کی دوسری دیوار
کو دیکھا تو درے روشن آسمان کے پاس منظر میں مجھے سونی

دیوار پر سیدھی کھڑی نظر آئی۔ وہ ایک سائے کی طرح دیوار
کے اوپر حرکت کر رہی تھی اور اس وقت میں نے سوچا کہ یہ تو
کوئی مشکل کام نہیں۔ دیوار ایک فٹ کے قریب چوڑی تھی
لیکن تار اور جھبے اس کے بیچ میں تھے چنانچہ تاروں کے باہر
رہتے ہوئے میں چھ انچ جگہ کو پاؤں رکھنے کے لیے استعمال
کر سکتا تھا اور تاروں کو پکڑ کے آگے جاسکتا تھا۔

دس فٹ تک نامرئی نہیں تھے۔ کتے ہوئے تار نیچے
لٹکے ہوئے تھے۔ کسی دشواری کے بغیر میں اگلے کھمبے تک
گیا۔ پانچ میں سے اگلے کھمبے تک میں فٹ کی باز کھٹ گئی۔
میں دیوار پر سیدھا چلا جاتا تو سڑک کے نوڑ تک پہنچ سکتا تھا
جہاں لمبائی کے رخ والی دیوار بھی مگر اچانک مجھے اپنا منصوبہ
بدلنا پڑا۔ میں اسی وقت جب مجھے یقین آئے لگا تھا کہ باہر
کوئی بھی نہیں ہے "اندھیرے موڑ پر ایک سایہ نمودار ہوا۔

میں فوراً دیوار پر بیٹھ گیا اور پھر لٹ گیا۔ وہ سایہ آہستہ
آہستہ آگے بڑھتا ہوا میری طرف آ رہا تھا۔ کتا اسے دیکھ کے
بھی غرایا اور دوسری بار کچھ آگے جا کے سویا۔ بنیادی طور پر
وہ ایک امن پسند اور معقول کتا تھا۔ اس نے اپنی نیند میں
مداخلت کرنے والوں پر ناگواری کے جذبات کا اظہار کر دینا
کافی سمجھا تھا۔

سایہ مجھ سے کافی فاصلے پر رک گیا۔ غالباً وہ مطمئن ہو گیا
تھا کہ ادھر کچھ بھی قابل غور نہیں۔ اندھیرے کی وجہ سے
اس کی صورت واضح نہیں تھی اور یہ بھی پتا نہیں چلتا تھا کہ
جو کچھ اس نے پہن رکھے ہیں وہ سایہ ہیں، سٹیلے یا کسی
کمرے رنگ کے اس کے ہاتھ میں کلاشکوف البتہ بہت
نمایاں تھی۔

جب وہ پلٹ گیا تو میں نے کچھ دیر انتظار کیا پھر وہ موڑ پر
غائب ہو گیا۔ میں نے اٹھنے سے پہلے دوسری طرف دیکھا تو
مجھے سونی نظر نہیں آئی۔ دیوار پر سیدھا چلتے ہوئے میں نے
ادھر ہاتھ بلایا جہر میں اٹھ کھڑا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس
کی نظر مجھ پر بھی ہوگی اور سونی پر بھی۔ وہ میرے ہاتھ کی
حرکت دیکھ لے گا۔ میں فٹ کے بعد میں نے آگے والی
تاروں کو کاٹا پھر میں قدم چلا اور یہی عمل دہرایا۔

میں موڑ کے بہت قریب تھا۔ دو کھمبوں کے درمیان
میں فٹ کا فاصلہ طے کرتے ہی میں لمبی دیوار پر سڑک کے
ساتھ ساتھ چل سکتا تھا اور گیٹ تک کا سارا علاقہ دیکھ سکتا
تھا۔ دوسری سمت سے سونی بھی ایسے ہی آسکتی تھی مگر وہ ادھا
فاصلہ طے کرنے سے پہلے ہی غائب ہو گئی تھی۔ اس کی ایک
ی وجہ ہو سکتی تھی جیسے ایک شخص مجھے نظر آیا تھا ایسے ہی

دوسرے کو سونی نے دیکھا ہوگا اور سونی نے آسمان سے نازل ہونے والی بلائے ناکامی کی طرح دشمن کو درپوش کے خاموش کر دیا ہوگا۔ اس کے برعکس کچھ ہوتا مجھے ممکن نہیں لگتا تھا۔ سونی بلندی پر بھی اور آسانی سے مغلوب بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس پر نیچے سے فائر ہو سکتا تھا مگر میں نے گولی چلنے کی کوئی آواز نہیں سنی تھی۔

وہی شخص پھر نمودار ہوا۔ غالباً وہ ایک محدود علاقے میں گشت اور پھرے پر مامور تھا۔ میں نے کتنے میں دیر نہیں کی تھی مگر مجھے پورا یقین نہیں تھا کہ اس شخص نے میری حرکت کو نہیں دیکھا۔ تاہم میں پوری طرح مستعد تھا اور ایک انگلی کلاشکوف کے ٹریگر پر رکھے پورا برست چلانے کے لیے تیار تھا۔ وہ شخص دیوار سے چند فٹ کے فاصلے پر چلتا ہوا آیا۔ اب وہ سرگیت بھی لپ رہا تھا۔

جب وہ میرے پاس سے گزرنے لگا تو دیوار سے پانچ چھ فٹ دور تھا۔ اس نے جیسے ہی سرگیت کا کش لینے کے لیے ہاتھ اٹھایا میں ایک جست میں اس کے اوپر جا کر ا۔ یہ ایک خطرناک ایکشن تھا۔ معمولی سی آہٹ پر وہ چوکنا ہو کے دائیں بائیں یا آگے پیچھے ہو جاتا تو میں چاروں خانے جیت فرش خاک پر بھد سے گرتا اور ظاہر ہے پھر نہ اٹھتا۔ اٹھتا تو دنیا سے اٹھتا۔ میرا دشمن بلا تذبذب مجھے چھلٹی کر دیتا۔

میں اس کے اوپر گرا تو وہ ایک آواز نکال کے نیچے گر گیا۔ میں نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر کلاشکوف کو دونوں ہاتھوں میں سر سے اوپر اٹھایا۔ اس کا ہت دشمن کے سر پر مار کے میں اسے لیے عرصے کے لیے بے ہوش کرنا چاہتا تھا مگر اچانک مجھے اس کے بے حس و حرکت ہونے کا احساس ہوا۔ وہ نہ نیچے سے نکلنے کی جدوجہد کر رہا تھا اور نہ مزاحمت میں نے اپنا ہاتھ روک لیا اور اس کے اوپر سے ہٹ گیا۔ وہ شخص پھر بھی بڑے مشکل خیز انداز میں ساکت پڑا رہا پھر مجھے اس کی گردن پیچھے کی طرف مڑی ہوئی تھی اور میں سمجھ گیا کہ اس کا موہوٹ گیا ہے۔ اتنی بلندی سے ایک سو ساٹھ پاؤنڈ وزن کی کوئی چیز اچانک اوپر اُگرے تو جھٹکے سے کوئی بھی گردن ٹوٹ سکتی ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی قضا اسے میاں لائی تھی اور اس کا ایسے مرنا پہلے سے طے تھا۔

اس کی جیب میں سے مجھے ایک بڑا ملا جو میں نے بغیر دیکھے نکال کے اپنی جیب میں رکھ لیا اور اپنی کلاشکوف کے ساتھ برے والے کی کلاشکوف اٹھائی۔ اس کا اضافی میگزین خاصا دانی تھا مگر میں نے "داشت آید کار" کے مقولے پر عمل کرتے ہوئے آئندہ کی کسی ضرورت کو اہم سمجھا۔

مونڈ پر پہنچ کے میں نے گیت کو دیکھا تو مجھے کچھ بھی نظر نہیں آیا۔ حملہ آوروں نے جوش میں سامنے آ کے حملہ کرنے کی بے وقوفی نہیں کی تھی۔ اس نے "دیکھو اور انتظار کرو" کی حکمت عملی اختیار کی تھی اور بلاشبہ بڑے نقصان سے بچ گئے تھے۔ اگر وہ اندر آتے تو سب مارے جاتے۔ انہوں نے باہر پرے بٹھادیے تھے اور مورچے قائم کر لیے تھے۔ اس یقین کے ساتھ کہ ہم صبح تک انتظار نہیں کر سکتے۔ بلا ختم یہ فرض کر لیں گے کہ میدان خالی ہے تو فوراً نکل جانا چاہیے۔ یہ نہیں کی احتیاط بندی نے ہمیں بچالیا تھا۔

سڑک مجھ سے تقریباً دس فٹ دور تھی مگر درمیان میں ایک خاصا بڑا شیشم کا درخت تھا۔ میں تیزی سے نکل کے اس کے نیچے کی اوٹ میں چلا گیا۔ اب مجھے سونی کی فکر لاحق ہو رہی تھی۔ میرے اور اس کے درمیان شاید دو سو گز کا فاصلہ حاصل تھا اور یہ ایک طرح سے دشمن کا علاقہ ہو گیا تھا۔ درخت کی اوٹ سے میں نے گیت کے آس پاس دور تک دیکھا۔ میں یہ اندازہ کرنا چاہتا تھا کہ ہمارا راستہ بند کرنے کے لیے دشمن کے پاس ناکابندی کے کون سے STRATEGIC پوائنٹ ہیں جنہیں مجھے ایسی کوئی جگہ نظر نہیں آئی جہاں روپوش رہ کے وہ مؤثر کارروائی کر سکتے ہوں۔ گیت کے سامنے ایک سڑک اندر جاری تھی۔ دائیں بائیں بھی سڑک پھیلی ہوئی تھی۔ بڑے درخت کافی دور تھے۔ چھوٹے درخت اتنے چھوٹے تھے کہ کسی کو پناہ نہیں دے سکتے تھے۔

صرف ایک ہی جگہ ایسی تھی جہاں وہ اطمینان سے ٹھہرتے ہیں جہنہ سکتے تھے سڑک کے پار کسی کے پلاٹ کی چار فٹ اونچی دیواریں تھیں مگر ان عارضی دیواروں کا زیادہ حصہ کمزور ہونے کی وجہ سے گر گیا تھا اور مالکوں کو اس کا علم نہیں تھا یا انہوں نے پھر دیوار کھڑی کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ آرسی ہی بڑے کے ساتھ لگے ہوئے آٹھ فٹ اونچے بھاری فولادی گیت البتہ مغربی سے کھڑے ہوئے تھے ایک گیت میں مرغی خانے کے گیت کے مقابل تھا اور یہی وہ جگہ تھی جہاں دشمن مورچا لگا رکھا تھا۔ فولادی گیت ان کے سامنے ڈھال بنا ہوا تھا اور وہ چلڑی اوٹ میں رہتے ہوئے گیت پر نظر رکھ سکتے تھے۔

میرا اندازہ یہ تھا کہ دخل اندازی کرنے والوں کی یعنی ہماری سرکولی کے لیے کم سے کم چھ افراد کی سپاہ روانہ کی گئی تھی اور انہیں تاکید تھی کہ بر صورت میں انہیں زندہ کوئی گھلایا جائے تاکہ ان سے پوچھ گچھ کی جائے یہ تو معلوم ہو کہ وہ

کون ہیں۔ کس کے آدمی ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟ ابھی خود میرے ذہن میں کوئی بات واضح نہیں تھی۔ قبضہ کا سراغ لگاتے ہوئے میں اس مرغی خانے تک گیا تھا۔ میاں یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ مرغی خانے کی تڑ میں جلی نوادرات تیار کرنے کا دھندا ابھی ہوتا ہے اور شاید بڑھ فروش کا بھی مگر ایک تو ہمیں ثبوت کا مسئلہ درپیش تھا اور دوسرے کسی بھی کاروبار سے ملک رب نواز کا تعلق ثابت نہیں ہوتا تھا۔ قبضہ کا آگے کوئی سراغ نہیں ملا تھا اور میری حالت اس شخص جیسی تھی جو اپنی پالتوی کو ڈھونڈتا ہو اس کی بند لگی میں پہنچ کے پاگل کتوں میں بگڑ جائے۔

میں صرف فرض کر سکتا تھا کہ سونی بھی ذاتی عقل سے کام لیتے ہوئے گیت سے دور رہے گی۔ اگر اس نے ایک پھرے دار سے نمٹ لیا ہے تو وہ دوسروں کی موجودگی کو تسلیم کرتے ہوئے احتیاط سے پیش قدمی کرے گی۔ میرے خیال میں اس کے لیے بھی لائن آف ایکشن دینی ہو سکتی تھی جس پر میں چل رہا تھا۔ یہ کامن سینس کی بات تھی۔

میں نے کوئی آہٹ پیدا کیے بغیر ایک چیز سے دوسرے چیز تک جانے کے لیے لمبا راستہ اختیار کیا مگر رفتہ رفتہ میں ایک نیم دائرے میں حرکت کرنا ہوا اس فولادی گیت کے پیچھے پہنچ گیا جہاں میرے خیال میں چار مسلح افراد اس انتظار میں دم ساڑھے بیٹھے ہوئے تھے کہ ہم گیت سے برآمد ہوں تو وہ اپنے مورچے سے حکم دے کر ہمیں پینڈ زاپ کرالیں۔ ہم سے ہتھیار پھینک دینے کے لیے کہیں اور پھر گنا کر لیں۔

مجھے اس وقت بڑی خوشی ہوئی جب گیت سے تقریباً چار سو گز دور سامنے والی سڑک پر میں نے ایک بڑی سیٹ والی سوزوکی پک اپ دیکھی۔ اس کا سامنے والا اور پیچھے کا حصہ سرخ تھا اور اس پر جو بین کا بڈ لگایا گیا تھا اس پر بھی لال رنگ کیا گیا تھا چنانچہ سوزوکی اندھیرے میں دور سے نظر بھی نہیں آتی تھی۔ میں نے اس کے پیچھے حصے میں اور پھر کہیں میں جھانک کر دیکھا مگر اس میں کوئی بھی سوڈو نہیں تھا۔ کہیں کے گلوڈ پکار منٹ سے مجھے گاڑی کے کاغذات ہاتھ لگے جو میں نے اپنی دوسری جیب میں ٹھوس لیے۔

سوزوکی پک اپ کا نیا نیچر مائل تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کا انجن پیچھلے حصے میں اور فرش کے درمیان ہوگا۔ اس تک پہنچنے کے لیے مجھے پیچ کھول کے فرش کا ایک حصہ الگ کرنا پڑا۔ میں نے دوسری طرف جا کر دیکھا۔ آگے پیچھے کے دو ٹائروں کے درمیان باڑی کے نیچے۔ بیٹری کا خانہ تھا۔ اس کو ایک چھوٹے سے لاک سے بند کیا گیا تھا۔ میں نے دائرہ کڑ

کی مدد سے تانے کو بھی کاٹ دیا پھر میں نے دائرہ کڑ کو پلاس کی طرح استعمال کیا۔ بیٹری کے زمن کو ٹائٹ رکھنے والے نٹ اٹھیلے کرنے میں مجھے ایک منٹ بھی نہیں لگا اور پھولنی سی بیٹری میرے ہاتھ میں آگئی۔ اسے میں نے سوزوکی سے پچاس قدم کے فاصلے پر ایک کمرے کے کھلے میں ہول میں ڈال دیا۔

بیٹری کے گرنے سے ایک ہلکا سا دھماکا ہوا لیکن خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ جن کی سوزوکی تھی وہ میاں سے کافی دور تھے۔ میں ہاتھ بھاڑ کے اٹھنے لگا تو اچانک میری گردن پر کوئی سخت ٹھکی ٹھکی دھات کی چیز آگئی۔ میں اپنی جگہ پر جم کر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے نہ سوال کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ یہ کیا چیز ہے۔ میری گردن سے کس ریوالتور کی ٹیل لگی ہوئی تھی۔ جس ہاتھ میں یہ ریوالتور تھا وہ میرے دشمن کا تھا اور اس کی انگلی یقیناً ٹریگر پر تھی۔ میں جرم کرتے ہوئے رینگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ میں نے سوزوکی کو ناکارہ بنا دیا تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ میری گرفتاری پر مامور لوگ مشتعل ہو کے مجھے گولی مار دیں۔ آخر پولیس مقابلے تو ہوتے ہیں "شرمیں۔" میں نے ہاتھ اوپر اٹھا کے کہا "ٹھیک ہے۔ میں ہتھیار ڈالتا ہوں۔"

میرے دشمن نے کہا "کلہ پرموشہ عالم!" "شاہ عالم!" میں نے پورے جسم میں خوف کی سرد لہر کو محسوس کیا "کیا تم میری سنے بغیر مجھے مارو گے؟" "اگر تم شاعر ہو تو خبردار آواز غزل مت سنانا" وہ بولا۔ میں نے پلٹ کے اس کو ایک جمائیز مارا "الو کے پٹھے۔"

رئیس ایک دم بیٹھ گیا اور سونی نے خود کو بجالیا ورنہ تھپڑ اس کے منہ پر پڑتا۔ وہ دونوں منہ دبا کے کھی کھی کرنے لگے۔ حیرانی سے زیادہ مجھے ان کو سامنے پا کے خوشی ہوئی۔ "لعت ہے سالے تجھ پر فوراً ہتھیار ڈال دیے" رئیس بولا۔

میں نے جینپ کے کہا "تیری ہمداری کا بھی پتا چل جائے گا جیسے جس دن کسی نے یوں پیچھے سے گدی پر ریوالتور رکھا۔"

"دھوکا کھا گیا نا آواز سے؟" رئیس نے تعریف طلب نظروں سے سونی کو دیکھا۔

سونی نے سر ہلایا "ایکڑا اچھے ہو تر۔" میں نے کہا "آواز بھی ایسی بیانی تھی اس نے اور مجھے یہ خیال آئی نہیں سکتا تھا کہ رئیس خاں بھی شریف لائیکتے

ہیں۔ تو کیسے انکیا سونی کے ساتھ؟
"بس یار۔ ایک طرف سے تو بارہا تھا۔"

"میں کیسے بارہا تھا؟" میں نے چرائی سے پوچھا۔
"ہاتھ کے اشارے سے اور کیسے؟ دوسری طرف سے سونی نے کہا کہ آراؤ۔ تو میں نے سوچا کہ اس کرکوں مگر دل سے کہا کہ پیارے ساتھ دینا ہے تو اکیلی لڑکی کا۔"
میں نے کہا "تو نے غلط سمجھا تھا میرے اشارے کو مگر خبر نہ اچھا ہوا تم دونوں نکل آئے لیکن ابھر کیسے آگے تہ مجھے سونی کی طرف سے پریشانی لاحق ہو رہی تھی۔"

جواب میں جو کچھ انہوں نے بتایا اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ ایک جیسے حالات میں ہمارے ذہن بھی ایک ہی طرح سوچنے لگتے ہیں۔ سونی جب دیوار پر چل رہی تھی تو نیچے اسے بھی ایک سطح محض نظر آیا تھا جو اسی سمت میں دیکھا ہوا جا رہا تھا۔ سونی اس کے پیچھے چلتی گئی۔ دیوار کے موڑ سے اس کے واپس آنے کا امکان تھا چنانچہ اس سے پہلے ہی سونی دیوار پر لیٹ کے ساکت ہو گئی پھر جب وہ بالکل نیچے آگیا تو سونی نے اس پر شیرینی کی طرح جست لگائی اور اسے مزاحمت کا موقع ہی نہیں دیا۔ جب وہ نیچے گرا تو اس کا سر ایک پتھر سے لگ کے پھٹ گیا تھا۔

"کیا وہ صرف بے ہوش ہوا تھا؟" میں نے پوچھا۔
"نہیں نے نفی میں سر ہلایا "اس وقت تو بے ہوش تھا مگر اس کا زہر رہنا مشکل تھا۔ بہت خون بہہ گیا تھا اس کا۔"
میں نے کہا "ایک ہندو میرے ہاتھوں بھی بلا وجہ مارا گیا۔"

"یعنی آج کا اسکو ہو گیا یا پھر خیر ہم نے کسی کو آگے بڑھ کے نہیں مارا، ہم نے اپنا دفاع کیا ہے۔"
سونی نے اس کی تائید کی "اسے قتل نہیں کہا جاسکتا۔"
میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ اب ہم خاموشی سے نکل جائیں۔ مزید وقت ضائع کیے بغیر؟"

سونی ہنسی "وہ سب جو اپنی توپوں کا رخ گیت کی طرف کیے بیٹھے ہیں صبح تک بیٹھے رہیں گے۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔"

"جب ہم اپنی گاڑی اسٹارٹ کریں گے تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ صرف مرغی خانے کو محاصرے میں لیے بیٹھے ہیں۔" میں نے کہا۔

"وہ دوڑیں گے ہمارے پیچھے" میں نے بولا۔
"کیسے دوڑیں گے؟ ان کی گاڑی تو دوڑ ہی نہیں سکتی۔ میں نے اس کی بیڑی نکال کے یہاں ڈال دی ہے" میں نے

کہا۔

ہم تقریباً ایک کلومیٹر کے نصف دائرے میں غوم کے مرغی خانے کے گیت سے کافی فاصلے پر سڑک تک پہنچے۔ آہستہ آہستہ ہم بدل چلے کے بعد مجھے شک ہوا کہ ہم ٹھیک گئے ہیں۔ رات کے وقت بہت سی نشانیاں اندھیرے میں گم ہو چکی تھیں۔ ویسے بھی یہ سارا علاقہ ہم سب کے لیے اجنبی تھا۔

اچانک مجھے سونی کا خیال آیا "سونی۔ کیا ہم ٹھیک جا رہے ہیں؟"

سونی نے کہا "آپ بالکل غلط جا رہے ہیں اور ایسے چلے رہے ہو کہ دور نکل جائیں گے۔"

میں نے نفی سے کہا "یہ معلوم ہونے کے باوجود تم نے بتایا نہیں؟"

"نہیں نے کہا" اے یار تو بھی کس پر اعتبار کر رہا ہے؟ اسے کیا پتا؟"

میں نے کہا "سونی کو دعویٰ ہے کہ یہ جس راستے سے ایک بار گزرے وہ کبھی نہیں بھولتی۔ اسے وہ راستے یاد ہیں جن پر ہم نے گئے۔" اب کیا یہ بچپن کی ہے؟ اس کا بچپن ہی ہے پیارے ابھی۔ ایسی باتوں سے کبھی ثابت ہوتا ہے۔"

سونی ایک دم پھٹ گئی "چھاتم جاؤ" گاڑیاں تو ادھر ہیں۔"

میں نے رئیس کو اسے ساتھ کھینچ لیا "چل آجا یار۔ ابھی حقیقت معلوم ہو جائے گی۔"

حقیقت دس منٹ میں سامنے آگئی جب ہم نے اچانک اندھیرے میں کھڑی ہوئی گاڑیوں کو دیکھا "یہ محض اتفاق ہے" رئیس نے اعلانیٰ سے کہا۔

"یعنی تم نہیں جانتے کہ جو میں نے کہا تھا سچ کہا تھا؟" سونی رک گئی۔

"کیا تم زبردستی خواہو گی؟" رئیس نے کہا۔

"ہاں۔ اس لیے کہ تم مجھے جھوٹا کہہ رہے ہو۔" سونی نے ایک دم رئیس کا ہاتھ پکڑ کے گھمایا اور اپنے پیچھے سے اٹھا کے سامنے ڈھکیا۔

مجھے سونی کی یہ حرکت اچھی نہیں لگی "یہ کیا ہے ہودی ہے؟"

"یہ مجھے جھوٹا کہنے کی سزا ہے۔"

میں نے کہا "کیا اس کا فیصلہ یہاں اسی وقت ہونا ضروری تھا؟"

رئیس کو چوٹ نہیں آئی تھی۔ وہ کپڑے جھاڑ کے ہنستا ہوا کھڑا ہو گیا "چل جانے دے یار۔ ہم نے برا نہیں مانا۔ آپس کی بات ہے دوستی میں مذاق چلنا ہے۔"

لیکن مجھے رئیس کے لیے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اپنی جھینپ مٹانے کے لیے ایسا کہنے پر مجبور ہے۔

بالکل غیر متوقع طور پر سونی نے اس سے معافی مانگ لی "آئی ایم سوری رہیں۔ مجھے بہت جلدی غصہ آ جاتا ہے۔"

میں نے کہا "جب تم جانتی ہو تو غصے کو کنٹرول کرو۔"

"کو شش تو کر رہی ہوں۔" اس نے سر جھکا کے آہستہ سے کہا۔ "آہستہ آہستہ قابو پاؤں گی ساری بری عادتوں پر۔"

رئیس نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کہا "تو میرے ساتھ۔ مجھے بتاؤ کہ تمہیں اس غیر معمولی صلاحیت کا احساس کب ہوا اور کیسے؟"

مجھے ایک خوش گوار حیرت ہوئی "جب سونی نے بھی رئیس کا ہاتھ تھام لیا "پہلے بتاؤ" تم نے معاف کر دیا ہے مجھے؟"

رئیس بولا "معافی کیسی؟ جب میں نے برا ہی نہیں مانا تھا۔"

"لیکن میں نے زیادتی کی تھی" سونی نے اصرار کیا "آئندہ میں ایسی حرکت کروں تو میرے منہ پر پتھر بارنا۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو سونی۔ میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔" رئیس بولا۔

"میں بہت عزت کرتی ہوں تمہاری۔ میرا مقصد ہرگز تمہاری بے عزتی کرنا نہیں تھا۔ مجھے معاف کر دو۔"

میں نے جھٹکے کہا "اے معاف کر دے ورنہ ساری رات تم یہاں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے کھڑے رہو گے۔"

رئیس نے فوراً سونی کا ہاتھ چھوڑ دیا "پاکل ہے یہ لڑکی۔"

میں چھوٹی گاڑی میں بیٹھ گیا "ماشاء اللہ اور اب تو ایسا لگتا ہے مجھے کہ آپ بھی پاکل ہونے کے لیے بے قرار ہیں۔"

میری بات کا رئیس پر شاید اثر ہو گا مگر سونی کو پروا نہیں تھی۔ اس نے رئیس کا ہاتھ پھر پکڑ لیا "چلو" دیر ہو رہی ہے۔"

جس بات کے امکان کو میں محسوس کر رہا تھا وہ اچانک ایک حقیقت بن کے سامنے آگئی تھی۔ بالکل غیر شعوری طور پر ان کے درمیان ایک دوسرے کے لیے پسندیدگی کے

جذبات پروان چڑھ رہے تھے۔ اس میں معیوب بات کوئی نہیں تھی۔ سونی جیسی لڑکی نے شاید پہلی بار بے غرض اپنائیت کو اس وقت محسوس کیا تھا جب شریفوں کی بستی سے دور جنگل میں ایک ڈاکو نے اس کی صورت میں اپنی ہنر کو دیکھا تھا اور جذباتی ہو کے اس کا تحفظ بن گیا تھا لیکن وہ سرحال ایک ڈاکو تھا۔ اس کے ساتھ تحفظ کا احساس بھی اوجھڑا تھا اور عزت کا تصور تو سرے سے اپنا کوئی وجود نہیں رکھتا تھا۔ ہمارے ساتھ اس کو یقین آنے لگا تھا کہ وہ محفوظ ہے اور اس کی عزت بھی ہم جیسے عزت داروں سے کم نہیں۔

حیرت مجھے رئیس کی پسند کے معیار میں ناقابل یقین تبدیلی پر تھی۔ کہاں وہ شخص کہ دو سو پاؤنڈ سے کم وزن کی عورت کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتا تھا اور اپنے معیار حسن کے حق میں ایک سو ایک دلاں رکھتا تھا۔ تیرہ چودہ تو خیر مذاق کی بات تھی مگر میں نے پانچ چھ کے ساتھ اس کی جذباتی وابستگی کو عشق کی وارفتگی کے مقام تک پہنچے دیکھا تھا۔ وہ سب دو اڑھائی سو پاؤنڈ وزن رکھنے والی لڑکیاں تھیں ان کی عمریں زیادہ نہیں تھیں مگر موروثی اثرات یا بیار خوری کے باعث وہ گوشت کی چلتی پھرتی میاڑی بن گئی تھیں اور رئیس کو ان کی یہی اودا دیوانہ کر گئی تھی۔ اس نے مذاق میں ان کے نام باموشی "بٹی" "رس ملائی" وغیرہ رکھ چھوڑے تھے مگر ان کے عشق میں وہ بیٹھ اٹتا خنجر ہوا کہ شادی کا ارادہ کر لیا۔

مجھے حیرت ہوتی تھی کہ ان کی جوڑی کیسی ہوگی۔ پہلوئے خور میں لنگور خدا کی قدرت کا نمونہ تو اکثر دیکھنے میں آتا ہے مگر یہ تو آدم کے پہلو میں انچور خدا کی قدرت والی بات ہوتی۔ ہر بار بد قسمتی کسی نہ کسی بہانے رئیس کی خانہ آبادی کے ارادے کو شکست دیتی آئی تھی۔ کبھی اس کی صورت آڑے آتی تو کبھی سیرت۔ کبھی عادت نے بنا بنایا کھیل گاڑا تو کبھی فطرت نے ہر بار کند دیاں لٹائی "دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا۔"

واپسی کے راستے پر جھیرو کے پیچھے چلے ہوئے میں نے وقت کے انقلاب آفریں دوسرے پر غور کیا۔ جو لڑکی اب رئیس کی نظر کے راستے دل میں اتر گئی تھی وہ اس کی پسند کے سابق معیار کے بالکل برعکس تھی۔ دہلی چلی "ٹازک اندام" تند خور اور سرکش۔ بے نام و نسب اور خود اپنی نظر میں بے آبرو گردش حالات کی بے رحمی کا شکار اور حادثات زمانہ کے جبر سے بد حال۔ رسوا اور مایوس۔ یہ کسا جاسکتا تھا کہ رئیس کی بھڑدی کے جذبات نے چاہت کا انداز اختیار کر لیا مگر ایسا نہیں تھا۔ یہ پہلی نظر میں محبت کا واقعہ بھی نہیں تھا۔

انہوں نے دیکھ کے اور سمجھ کے 'جان کے اور مان' ملے کیا تھا کہ وہ ایک دوسرے کی ضرورت ہیں اور مجبوری ہیں۔ انہیں ایک دوسرے کی تکمیل کرنے کے لیے یکجا کر دیا گیا ہے چنانچہ ان کا ساتھ ناگزیر ہے۔

زندگی کے اسٹیج پر ہم سب ایکٹرز ہیں۔ ایک کھیل کا مکمل تک پہنچنے سے پہلے کتنے نظریہ رکھنا ہے۔ کمانی میں کتنے موڑ آتے ہیں۔ اس سے کھیل میں دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ آنے والا وقت کیا دکھائے گا۔ آوی یہ جان لے تو شاید جی نہ سکے شادو آج میرے لیے ایک بھولی بیری یاد ہے۔ جہاں میں دن رات آنسوؤں کا نذرانہ دینے جاتا تھا وہ قبر بھی نہ جانے کہاں ہے۔ میں نے چندا کی بے مری دیے اعتنائی کے عذاب کا زہر بھی پی لیا اور آج جہنم سے جدائی کا خیال میرے لیے سوہاں روح ہے۔ جب ایک مستقل اور غیر متبدل انداز میں پہلے خود اپنے آپ سے اور اپنی زندگی سے پیار کرتا ہوں اور کلیسا کی روحانی داستانوں یا قلموں کی طرح آئین عشق کی پاسداری نہیں کرتا۔ کتنی افسوس ناک اور شرمناک ہے یہ حقیقت مگر حقیقت ہے۔

رہیں خانے کے گیت پر پہنچ کے میں اپنے خیالوں کی گردن سے باہر آیا۔ میں نے اپنی کھائی کی گھڑی کو روشنی کے رخ کر کے دیکھا۔ رات کے ٹھیک بارہ بجے تھے۔ جہنم کو گم ہوئے بارہ گھنٹے سے زیادہ گزر گئے تھے اور اس کی تلاش میں سارے جہاں کی خاک چھان لینے کے باوجود میں بنو زقطہ آواز سے آگے نہیں گیا تھا۔ وہ معلوم نہیں کہاں تھی۔ کیا کر رہی تھی کیا سوچ رہی تھی؟ کیا جیل رہی تھی؟ اس کی یاد سے جڑے ہوئے ہر محسوس خیال نے میرے دل میں زہریلے دھنک گاڑ دیے تھے۔

سوئی کو میرے زخم پر بہت تشویش تھی۔ اس نے سب سے پہلے گرم پانی سے زخم کو صاف کیا اور پھر اس پر زخم کو خشک اور مندری کرنے والا سائیکائزین پاؤڈر چھڑک کے پی بانڈھ دی۔ خانے میں قیام کے دوران میں امیر جیسی کے لیے خاص خاص دوائیں سوئی کے کہنے پر رکھی گئی تھیں۔ اس وقت ان دواؤں کی افادیت ثابت ہوئی ورنہ کسی ڈاکٹر سے رجوع کرنا پڑنا تو کوئی کا زخم ایک قانونی مسئلہ بن جاتا۔ سوئی نے مجھے اس پر اور کوئی اپنی باونک دے کر کسی ڈاکٹر کی طرح کہا "فکر کوئی بات نہیں۔ معمولی زخم ہے" ٹھیک ہو جائے گا۔

"یہ زخم تو ٹھیک ہو جائے گا ڈاکٹر! زخم دل کا کیا ہوگا؟" میں نے ایک آہ بھری "کچھ علان اس کا بھی اسے چارہ

کراں ہے کہ نہیں؟" اپنے کمرے میں پہنچ کے میں سبز گر گیا۔ آنکھیں بند کر کے اور ایک ہاتھ سر پر رکھ کے میں نے خود سے سوال کیا "اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ کیا میں کچھ نہیں کر سکتا۔ سوائے انتظار کے اور میرے نہیں میرے کرنے کے لیے کچھ ضرور ہوگا۔"

تیس مارخان نے اندر آ کے کہا "حضرت! آپ غسل فرمائی یا بندہ طعام حاضر کرتی۔"

میں نے کہا "بھوک نہیں ہے مجھے۔ دل نہیں چاہتا ابھی کچھ کھانے کو۔"

"جناب عالی۔ آپ دل کا بات ماننی۔ بیت پر ظلم فرمائی۔ فائدہ کشی فرمائی تو بالآخر فوٹا پائی۔"

میں نے جڑے کہا "جانتا ہے یا میں جو تار سید کروں؟" اس نے جھک کے ایک جوتا اٹھایا اور اپنے دونوں ہاتھوں میں رکھ کے مجھے پیش کیا "آپ شوق سے خادم کے سر پر پلٹا فرمائی۔ ایک ہزار بار ایک لاکھ بار ایک کروڑ بار یہ جوتا سید فرمائی۔ ام پھر بھی گزارش سے باز نہیں آئی۔ امارا سرگند انماڑی طرح پلٹا ہو جاتی تب بھی ام ایسا ہی عرض کرتی مجھے ہنسی آنے لگی "بڑی ذہین چیز ہو تم بھی۔ اچھا چلو" میں آتا ہوں۔"

لیکن میرے جانے سے پہلے رہیں اٹھیا "اب کیا سوچا ہے تو؟" میں نے کہا "میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔"

وہ بولا "بہتر ہوگا اگر ہم پولیس کو رپورٹ لکھوا دیں۔" میں نے کہا "دیکھو یا۔ اول تو اس سے کچھ بھی نہیں ہوگا لیکن ابھی وہ رپورٹ درج ہی نہیں کریں گے۔ وہ کہیں گے کہ خاتون کی گھڑی کو ایک دن بھی نہیں ہوا۔ آخر وہ عاقل بالغ اور خود مختار عورت ہے کہیں چلی گئی ہوگی اپنی مرضی سے۔"

"یار! اغوا کا کیس ہے۔ بالآخر اغوا کا۔" میں نے کہا "اے اغوا ہو آسے نہ دیکھا ہے؟ تو نے یا میں نے؟ جو دیکھنے والے تھے کیا وہ گواہی دیں گے؟ کیا وہ بیٹروں پپ کا لازم لڑکا اور سراج دیں کہیں گے کہ جہنم کو ان کی نظروں کے سامنے اغوا کیا تھا؟"

"وہ گواہ نہیں۔ شریک جرم ہیں۔ ان کا نام ہم ایف آئی آر میں طرز کی حیثیت سے لکھوا میں گے۔"

میں نے کہا "پھر گواہ کون ہوگا؟ ایک ایس ڈی ایم کا گھڑا ہوا سپوت؟ ایک پان والا ایک سارجنٹ۔ ان میں جت کوئی بھی گواہی میں پڑنے والا نہیں ہے۔ وہ صاف انکار کر دیں گے کہ ہم نے تو ایسا کوئی سین نہیں دیکھا۔ اس اغوا کے معاملے

کو ہم جہنم کی صفائی برادری پر چھوڑ سکتے ہیں۔ ان کا دباؤ تو پولیس شینے میں ملک رب نواز کو بھی نامزد کرنے پر مجبور ہو گیا پھر کیا ہم وقت گزرنے کا انتظار کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے؟"

میں نے کہا "اغوا کی رپورٹ دو چار دن گزرنے سے پہلے بر حال نہیں لکھوائی جاسکتی۔ خود اس کے ہم پیش صفائی یہ کہیں گے کہ ممکن ہے جہنم کسی استوری پر کام کر رہی ہو۔ ایسا ہوتا ہے۔ رپورٹ کسی کمانی کے چکر میں نکل جاتے ہیں اور رائج کا بچھا کرتے ہوئے بعض اوقات انہیں چھپ کر بھی رہنا پڑتا ہے۔"

"یار! کوئی اور چاہے نہ یقین کرے مگر آزاد صاحب ضرور مانیں گے ہماری بات۔"

میں نے کہا "بات تو مانیں گے لیکن وہ بھی کیا کریں گے؟ اپنی گویا اور چنانچہ سے ہمارے پیچھے چڑھیں گے کہ سارا تصور تھما رہا ہے۔"

رہیں نے کہا "پھر کیا خیال ہے۔ اس سال ملک سے صاف بات کی جائے؟"

"کیا کہ۔ ہم جانتے ہیں کہ جہنم کو تم نے اغوا کر لیا ہے۔ ہمارے پاس ثبوت ہیں اور جہنم دید گواہ ہیں۔ خیریت چاہیے ہو تو بتاؤ کہ وہ کہاں ہے؟"

"اور فرض کراں نے کہا کہ نہیں میں خیریت نہیں چاہتا۔ جہنم ہے میرے پاس مگر میں بتاؤں گا نہیں کہ کہاں ہے۔ پھر کیا؟"

"پھر کیا کریں گے؟ تم؟ تمہارا تے جانیں گے اس کے گھر اور کشوں کے بچے لگاتے اندر پہنچ کے جہنم کو قید سے آزاد کرالیں گے۔ خشیر آباد کے ایک بی وار سے اس کی ذخیریں کاٹ دیں گے اور گھوڑے دوڑاتے قید خانے سے نکل آئیں گے۔"

"یار! دماغ خراب مت کرنا میرا۔ اگر جہنم ہوگی وہاں تو اسے چھڑا کے لانا ممکن کام نہیں ہے۔"

میں نے کہا "لیکن یہ کام کیسے ہوگا؟ آخر؟ ملک رب نواز کے گھر کی حفاظت کسی ملے کی طرح کی جاتی ہے۔ ہم اس قلعے کو قید خانے کی مدد سے سر کریں گے یا ہوائی جہاز سے بمباری کر کے؟"

رہیں لاجواب ہو گیا "اس کا مطلب ہے کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا؟"

میں نے کہا "آزاد صاحب ہماری مدد کر سکتے ہیں۔" رہیں نے نفی میں سر ہلایا "اب وہ خطی بڑھا صرف

بک بک کر سکتا ہے۔"

میں نے کہا "نہیں یار۔ آزاد صاحب دیکھنے میں نکل سکتے ہیں اور باتوں سے دیوانے مگر وہ بہت ہوشیار اور مگرے آوی ہیں۔ زمانہ دیکھا ہے انہوں نے اور زمانے کو ہم سے زیادہ پہچانتے ہیں۔ میری اور تیری عمر کے برابر تو محاضرت کر چکے ہیں وہ اور جب میں اور تو پیدا ابھی نہیں ہوئے تھے۔ تب سے وہ ایسے بڑے ہیں۔"

"آخر کیا ثابت کرنا چاہتا ہے تو؟"

میں نے کہا "کیا کہ آزاد صاحب کے وسائل اور تعلقات کا مقابلہ ہم اپنی کوشش سے نہیں کر سکتے۔"

رہیں بولا "یعنی انہیں ہمارے ہم بیٹہ جا میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے کوشش کرنا ہی چھوڑ دیں۔"

"نہیں یار۔ ایسا میں نے کب کہا ہے۔ ایک ٹاکسی سے ہم بار نہیں مان سکتے۔ ہم بھی اپنی کوشش جاری رکھیں گے۔ ملک رب نواز سے بھی پوچھیں گے مگر ابھی نہیں۔ وہ صلاح کے کہاں جاسکتا ہے؟"

رہیں کی سمجھ میں میری بات آنے لگی تھی "دیکھ یار۔ تو مانتا ہے کہ یہ کام ملک رب نواز کے سوا اور کسی کا نہیں ہو سکتا۔" "میں مانتا ہوں۔" "اس کے سوا جہنم کی دشمنی اور کسی سے نہیں ہے۔" رہیں بولا۔

میں نے کہا "لیکن کسی ثبوت کے بغیر ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اس پر شک کا اظہار بھی نہیں کر سکتے۔"

تیس مارخان پھر حاضر ہوا۔ "جناب عالی! اخراک ایک دم بخ ہو کے خراب ہوئی۔ خادم کے دل کو خفیہ افسوس ہوئی۔"

میں نے کہا "پہل یار۔ یہ موت کا فرشتہ ایسے جان نہیں چھوڑے گا۔"

تیس مارخان کا چہرہ اڑ گیا۔ "آپ کیسا غلط مثال دیتی۔ ام آپ کا صحت اور زندگی کے لیے خدا فرما رہی۔ دعا عرض کرتی۔ خواہش کرتی کہ موت کا فرشتہ کبھی نہ آئی۔"

مجھے بھوک بالکل نہیں تھی مگر کھانا ایک جسمانی ضرورت تھا اور صرف سونے اور پریشان ہونے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا تھا۔ جہنم کے لیے مجھے پوری ذہنی اور جسمانی توانائی کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ میری قوت فیصلہ کی صحیح کارکردگی کا انحصار ایک تازہ دم اور پُر سکون دماغ پر تھا اور دماغ کو توانائی جسم سے ملتی تھی چنانچہ میں نے زبردستی اپنی نازل خوراک کا کوٹا حاصل کیا۔

حیرت انگیز طور پر سوئی پر گزشتہ تین چار گھنٹے کے

واقعات کا زیادہ اثر نہیں تھا۔ خشم کی طرف سے وہ بھی فکر مند تھی مگر مرنے والے خون خرابے نے اس کے اعصاب کو متاثر نہیں کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے زندگی کا کچھ حصہ ڈاکوؤں کے ایک گروہ کے ساتھ رہ کر گزارا تھا جہاں وہ محض خاموش اور بے بس ترشاشی نہیں تھی۔ اس نے عملی طور پر ان کی ساری سرگرمیوں میں حصہ لیا تھا چنانچہ خوف اس کے لیے بہت اور حوصلے کے حصول کا ذریعہ بن گیا تھا جو اسے ہر خطرے کے خلاف دفاع کی بھرپور صلاحیت عطا کرتا تھا۔ اس کی جگہ کوئی عام لڑکی ہوتی تو اس کا نروس بریک ڈاؤن لازمی تھا۔

”مجھے تو سخت نیند آ رہی ہے۔“ اس نے کھانے کے دوران میں کہا۔

”کیسی لڑکی ہو تم؟“

”کیسی لڑکی ہوں؟“ وہ جیسے لہجے میں بولی ”تمہیں کیسی لگتی ہوں؟“

”میرا مطلب تھا کہ ان حالات میں تم اتنی پرسکون ہو کہ سو سکتی ہو۔ ہماری تو نیند بھوک سب اڑی ہوئی ہے۔“

”بالکل ہو نہ تو۔ رات بھر جاگ کے کون سا پڑا کھو دو گے تم اور خشم کو نائے سے مار کے کیا حاصل ہو گا؟“

”یہ بے حس ہے تمہاری۔ خشم کے ساتھ کوئی جذباتی تعلق نہیں ہے تمہارا اس لیے تم پر اثر نہیں ہے۔“ ریمیں نے برہمی سے کہا۔

”میں مسلسل دو راتیں اور ایک دن جاگ سکتی ہوں۔ جاگتی رہی ہوں اور وہ بھی گھوڑے کی پیٹھ پر۔ کچھ کھائے پئے بغیر۔ اس مجبوری پر میرا کوئی اختیار نہیں تھا لیکن ابھی میں کھانا چھوڑوں اور جاگتی رہوں تمہارے ساتھ تو خشم کو کیا فائدہ ہو گا تمہاری کیا مدد ہو گی۔“

”میں نے کہا ”بالکل ٹھیک ہے تمہاری بات۔“

”ریمیں مجھ سے لڑنے لگا۔“ اب کیا ٹھیک ہے کیسے ٹھیک ہے؟“

”سوئی انڈھ کھڑی ہوئی ”جب کوئی کام نہیں ہے میرا تو۔“

”کام ہو یا نہ ہو۔ بس میں چاہتا ہوں کہ تم یہاں بیٹھی رہو ”میرے سامنے۔“

”سوئی پھر بیٹھ گئی ”اگر تم چاہتے ہو تو پھر ٹھیک ہے۔“

”پوچھو کی نہیں کہ میں کیوں چاہتا ہوں؟“ ریمیں ہنسنے لگا۔

”اگر تم چاہتے ہو یہ بھی۔ تو پوچھ لوں گی۔“ وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

رات کے ایک بجے میں نے آزاد صاحب کو ڈرتے

ڈرتے فون کیا۔ معمول کے مطابق وہ آخری کالی جوڑنے میں مصروف تھے انہوں نے فون پر ہیلو کہنے کے بعد بالکل انتظار نہیں کیا ”اے جوا ہر حال سنو کی بے نام اولاد۔ آخر وہ چیز ہے عقل سلیم کہتے ہیں ”گویا۔۔۔ اس کا زندگی میں کبھی استعمال فرمایا ہے یا خدا نے جیسی دی تھی جتنی بھی دی تھی ویسی ہی واپس مدفن میں اعمال کے ساتھ جائے گی۔ ہاں ابھی تم بھی بولو۔ بخدا ہمیں ذرا بھی فرصت نہیں ہے اور تم نے یہ آلہ سلامت ہمارے ہاتھ میں تھام لیا ہے گویا کہ گوشت پر آواز ہو جاؤ۔“

میں نے کہا ”جناب“ میں ناصر عظیم ہوں۔“

”اچھا ابھی۔۔۔ بڑی خوش ہوئی گویا آپ سے مل کے۔ ویسے آپ عظیم نہ ہوتے تب بھی ہمیں کیا فرق پڑتا۔ اف۔۔۔ ارے ہاں یہ کیا لگا رہا۔ مارگریٹ پیچھے کے شوہر۔۔۔ جی وہ بندہ محکوم و مظلوم جو بھی ہے نام تو اس کا مسٹر پیچری ہو گا ”گویا۔“

میں نے کہا ”حضرت۔۔۔ آپ کو کچھ علم ہے؟“

”لاحول ولا قوۃ۔ یہ تو گویا حد درجہ توہین آمیز سوال ہے علم نہ ہو تو توہم یہاں بیٹھے ہوتے؟ ابو بکر آزاد کھاتے کیسے گدھے چراتے نظر آتے گویا۔“

میں نے فوراً حضرت کی ”میرا مطلب تھا کیا آپ کو معلوم ہے کہ خشم کو اغوا کر لیا ہے کسی نے۔“

”اچھا؟“ جی ہاں ابھی دریافت فرماتے ہیں گویا۔ یہاں رپورٹ۔۔۔ ذرا ملاحظہ فرماؤ اپنی نااہلی۔ ابھی ابھی ہمیں کسی نے فون پر مطلع فرمایا ہے کہ خشم کا وہ ہو گیا گویا۔ اغوا اور مسز نا معلوم ”اچھا ہوتا اگر تم اغوا کرنے والے کے نام سے بھی مطلع فرماتے۔“

میں نے کہا ”دیکھئے“ آپ بات کو سمجھ نہیں رہے ہیں۔“ وہ خفا ہوئے گئے ”کیا سمجھتے ہو تم ہمیں گویا؟ نا سمجھ ہیں ہم۔ بخدا“ خشم کی پہلی قلم تھی غالباً چندا۔۔۔ ارے میرے چندا“ یہ لفظ تم زاد ہے جیسے آپ فرماتے ہیں چاہے داچتر گویا اور ہزار بادا است آپ نے۔۔۔ بھی یہ تم کیا مطلب بیٹھے ہو گویا۔ ہاں خوب یاد آیا، ہم یہ فرما رہے تھے کہ خشم کی ہر قلم بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ ملاحظہ کی ہم نے گویا لیکن یہ قصہ ہے جب کہ آتش جواں تھا اور اپنی ہی خشم بھی شعلہ بھی گویا۔“ وہ تھک مار کے بیٹھے۔

میں نے سر ہلکے کہا ”حضرت“ یہ اداکارہ خشم نہیں۔“

انہوں نے کہا ”اداکارہ نہیں تو کیا تھی وہ آخر؟“ جی مانا کہ روہن گھوش کی وہ بھی تھی گویا۔ شریک حیات۔ اس سے اظہار ہمدردی بھی فرمائی گئی ہم اور صبر کی تائیں بھی

کریں گے۔ نوادرات میں شمار تھا گویا سنو کا۔“

میں نے چلا کے کہا ”آپ کی رپورٹ خشم کو اغوا کر لیا ہے نئی ہے۔“

وہ چند سیکنڈ بعد بولے ”کیا کہا تم نے گویا۔؟ تم غالباً ناصر عظیم ہو ”ہم سمجھ گئے۔“

میں نے کہا ”جاننام بتایا تھا میں نے۔“

”اچھا“ خرمیتا ہو گا مگر یہ جو اطلاع دے رہے ہو تم اس وقت یہ صدقہ ہے گویا اور تم خود کہاں ہو۔ تم اغوائیں ہوئے گویا اس کے ساتھ۔ بڑے شرم کی بات ہے تمہارے لیے۔“

میں نے کہا ”بالکل ہے۔“

”ہم نے اسے تمہاری حفاظتی تحویل میں دیا تھا گویا پھر یہ کیسے ممکن ہوا اور یہ نامعقول کی بالکل انتہا ہے گویا۔ اس اندویشناک حادثے اور قابل مذمت سانحے کی بد جبری بھی تم ہمیں ایسے سنار ہے ہو چکے کوئی اطلاع عام کا اشتہار پڑھ رہے ہو۔ یہ کیا نامعقولیت وغیرہ ہے گویا۔ بخدا تم اس وقت عقلی سے ہمارے مقابل ہوئے تو ہم فی الفور تمہارا قتل عام فرما کے تم کو ختم رسید فرماتے۔“

میں نے کہا ”دیکھئے“ مجھے سخت افسوس ہے۔“

”اجی خاک افسوس ہے آپ کو۔ کس قدر باعث شرم ہونا چاہیے مجھوں پر یہ الزام کہ کبھی تم ہو جائے کیس دشت امکان میں اور وہ دیوانہ نہ ہو گویا اور دیوانگی میں جاں سے نہ گزر جائے اب ہمیں دیکھ لو ہمارا تو اس صدمہ جانکاہ سے گویا ہارٹ فیل ہو چکا ہے گویا۔ اللہ وانا الیہ راجعون۔ معلوم نہیں کون سی نحوست زدہ ساعت میں ہم نے خود کو مجبور مان کے اسے تمہارے سپرد کر دیا تھا۔ کہ لو چندا ”چاندی بواب تیرے حوالے تم ذرا غور فرماؤ گویا۔“

میں نے کہا ”جناب! مجھے آپ موقع تو دیں کچھ عرض کرنے کا۔“

”موقع۔۔۔ مزید موقع دیں گویا۔ اس وقت تو ہم تمہیں توجہ تک نہیں دے سکتے۔ بڑا نازک وقت ہے سانس اٹکی ہوئی ہے آخری کالی میں اور گویا وقت آخر ہے عالم نزع کی کیفیت سے گزر رہے ہیں ہم۔“

میں نے کہا ”بہت بہتر۔ میں کچھ دیر بعد فون کروں گا۔“

انہوں نے دباؤ کے کہا ”خیروار۔ خیروار جو پھر یہ گستاخی کی اور ایسی حماقت کا مظاہرہ کیا۔ لعنت اس آلہ گفت و شنید ہو گویا۔ تم بظلم خود حاضر ہو کے ساری تفصیل ہمارے گوش گزار کرو تاکہ ہم مناسب گونٹائی فرمائیں تمہاری فی البدیہہ اور خاطر خواہ طریقہ پر گویا۔“

میں نے کہا ”جیسا آپ کا حکم۔ میں خود حاضر ہو جاؤں گا۔“

”ہاں! بس نماز منہ آجاؤ۔ نماز فجر سے قبل گویا تو ہم لمبے گے تم کو پاپوش بدست اور تھر تھر کانپتے ہوئے عالم اشتعال میں۔“

میں نے فون نیچے رکھ کے سکون کا سانس لیا ”اے مارے گئے آزاد صاحب کا حکم ہے کہ فوراً آجاؤ جو تھے کھانے کے لیے۔ مجھے بے سخت خفا ہیں۔“

”مجھ سے کیوں خفا ہیں؟“ ریمیں بولا۔

”خفا اس بات سے ہیں کہ آخر خشم کے ساتھ میں کیوں اغوائیں ہوا۔“

”ریمیں بس برا“ یہ کیا تیرے اختیار کی بات تھی۔“

”مگر انہیں کون سمجھائے وہ کہتے ہیں کہ خشم کی حفاظت کرنا تمہاری ذمہ داری تھی۔ اور تم جیسے مجھوں ہو کہ لیلی پھرنی ہے مگر تم ابھی تک نہ پاگل ہوئے ہونہ اللہ کو پیارے ہوئے ہو۔“

”ریمیں سر کھجکے بولا ”یار! ماننا پڑے گا کہ کوئی بات ہوئی ہے مجھ سے۔“

”میں مانتا ہوں لیکن اسے میری خود غرضی“ بے وقوفی یا بے وفائی تو نہیں سمجھتا چاہیے یار۔ میں کیا جائے نوادرات پر موجود تھا اور جانتے بوجھتے بزدلوں کی طرح جان بچا کے بھاگ آیا تھا۔ یا اغوا کرنے والوں نے مجھے کوئی چوٹیں دیا تھا کہ بتاؤ کسے لے جائیں۔ جسیں یا خشم کو؟ اور میں نے کہہ دیا کہ خشم کو لے جاؤ“ مجھے چھوڑ دو۔“

”یار غصے میں مت آ۔ آزاد صاحب تو ایسے ہی بولتے ہیں۔“ ریمیں مجھے سمجھانے لگا۔

میں نے کہا ”اجی تو بات ہو رہی تھی فون پر اور ان کو بھی کچھ احساس ضرور ہو گا کہ چیخنے چلانے سے دوسرے لوگ بھی سنیں گے یہ بات بھی ان کو سامنے جا کے بتانا تو وہ چھڑی اٹھا کے مجھے مارنا شروع کر دیتے صدمہ بھی بہت ہے ان کو اور وہ غصے میں بھی ہیں۔“

”پھر تو بتانا اچھی خاصی شامت آئے گی تیری۔“

میں نے ایک گری سانس لی ”یہ سب شامت اعمال ہی تو ہے اب مجھے بھگتنا ہی پڑے گا یہ دہرا عذاب۔ مجھوں کا خطاب دے دیں رہے آزاد صاحب نے۔“

”دہرا عذاب کیا؟“

میں نے کہا ”فداری میں ہے ایک شعر۔ غرض دو گونہ عذاب است جان مجھوں را۔ خیال فرقت لیلی و فرقت لیلی۔“

”ترجمہ بھی کر دے اس کا سلیس اردو میں۔ ہم دونوں

کے لیے "ر نہیں بولا۔

میں نے کہا "مطلب یہ کہ مجھوں کے لیے دگنا عذاب ہے ایک تو بلی کا غم دوسرا اس سے بچھڑنے کا غم مجھے جو پریشان کرنے والے خیالوں نے پاگل کر رکھا ہے وہ الگ۔ آزاد صاحب کا اور الزام دینے والوں کا مسئلہ انسانی۔"

"اس عذاب میں ہم سب شریک ہیں پارسہ تو اکیلا کیوں سمجھتا ہے آخر خود کو۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آزاد صاحب کی فکر مت کر۔"

میں نے کہا "آزاد صاحب پر یہ خبر سن کے جو فوری رد عمل ہوا ظاہر ہے بہت شدید تھا۔ دو گھنٹے بعد ان کی جذباتی کیفیت ایسی نہیں رہی کہ پھر وہ ہماری مدد کریں گے وہ زیادہ ناراض ہوں گے اس بات پر کہ میں نے انہیں فوراً اطلاع کیوں نہیں دی اور یہ وقت جبکہ مار کے ضائع کیا۔ حالانکہ جبکہ نہیں ماری میں نے۔ میں نے اسی وقت کچھ سراغ تلاش کر لیے جو بعد میں نہ ملے۔"

"تم اس سے حاصل کچھ نہیں ہوا۔"

میں نے کہا "ہر کوشش کے کامیاب ہونے کی ضمانت کون دے سکتا ہے۔ ہاں میں کوشش ہی نہ کرتا تو مجھے الزام دیا جاسکتا تھا۔ ہم ایک ٹریک پر گئے جو غلط نہیں تھا۔ اب آگے جا کے سراغ کسی اور سمت میں لے گئے تو یہ ہماری بد قسمتی مگر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ہم اپنی ناقص عقل کے اندھے کھوڑے۔ بحر ظلمات میں دوڑاتے بھر رہے تھے۔"

سوئی نے کہا "پھر بھی ان کو بتا دیتے تو اچھا تھا۔"

دیسے ہیں کہ ایک سے سب کی سزا اور دوسرے سے آزاد۔ صرف سننے کے لیے تو ایک کان بھی کافی تھا۔"

سوئی خاموش بیٹھی سب سن رہی تھی اور کسی کمری سوچ میں گم نظر آتی تھی۔ اس نے اچانک کہا "ہم اسی وقت جاسکتے ہیں جنہم کو ڈھونڈنے پر چھو کماں؟"

ر نہیں نے چڑ کے کہا "ہمارا پوچھنا ضروری ہے؟"

سوئی نے میرا بازو پکڑ لیا "چلو ہم خود جا کے دیکھ لیں۔"

میں نے کہا "کیا پسلیاں بھجوا رہی ہو۔ کہاں جا کے دیکھ لیں۔"

"ملک رب نوازی کو بھی میں۔ ملک ہاؤس میں۔ وہ بہت جوش میں تھی۔"

میں نے اسے فور سے دیکھا "کیا تمہارے خیال میں یہ اتنی ہی آسان ہوگا؟ جیسے باہر گلی میں جھانک کے دیکھ لیا۔"

"ملک کی بیوی پہلے ہی بتا چکی ہے کہ جنہم اس کو بھی میں کیس نہیں ہے۔ کیا اس نے جھوٹ کہا تھا؟" ر نہیں بولا۔

سوئی نے اسے نظر تھام کے دیکھا "تم اسے سچا سمجھتے ہو؟"

ر نہیں کچھ ہنسیا "میں۔ میرے ماننے کی بات نہیں۔"

"مجھے بتاؤ کہ تمہاری کیا گلی ہے وہ۔ وہ ملک رب نواز کی بیوی ہے یا تمہاری؟"

مجھے یوں لگا جیسے اچانک میری نظروں کے سامنے پڑا ہوا خوش قسمی کا پردہ ہٹ گیا ہے۔ "تم نے بالکل ٹھیک کہا سوئی۔ ہم سے اس کا کوئی رشتہ نہیں۔"

"شوہر کو بچانے کے لیے ہر بیوی جھوٹ بول سکتی ہے۔"

سوئی نے بڑے یقین کے ساتھ کہا "اور صرف بیوی کیا؟ بہن ہو یا بیٹی۔ سب جھوٹا حلف تک اٹھا لیں گی اگر انہیں کسی اپنے کو بچانا ہو۔"

میں نے کہا "یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود ملک نے اپنی بیوی کو جھوٹ بولنے پر مجبور کیا ہو؟"

"ہاں" یہ بھی ہو سکتا ہے "سوئی نے کہا۔"

"مگر ہم اس کی تصدیق کیسے کریں؟" ر نہیں نے کہا۔

"ہم خود جا کے دیکھ سکتے ہیں۔ اندر جا کے۔"

ر نہیں نے اس کا مذاق اڑانے کے لیے کہا "ہاں" گاڑی لے کر چلتے ہیں۔ گاڑی کو ملکا۔ ہاؤس کے گیٹ پر روک کے چوکیدار سے کہیں گے کہ اگر آپ کو ذمت نہ ہو تو دروازہ کھول دیں۔ ہمیں ذرا اندر جا کے جنہم کو تلاش کرنا ہے اور وہ خندہ پیشانی سے مسکراتے ہوئے کہے گا کہ جو حکم میرے آقا ہم گاڑی کو سیدھا اندر لے جائیں گے اور کسی

ملازم سے کہیں گے کہ سمان خانہ کھلو۔ ذرا تنگ روم میں بیٹھ کے ہم حکم دیں گے کہ ملک رب نواز کو حاضر کیا جائے وہ دست بستہ حاضر ہو کے ہمیں یعنی معزز سمانوں کو خوش آمدید کہے گا۔ خاطر تواضع سے فارغ ہو کے ہم اپنی تشریف آوری کا مقصد بیان کریں گے اور ملک سینے پر ہاتھ رکھ کے رکوع میں چلا جائے گا کہ تشریف لائے میرے ہمراہ۔ میں آپ کو ہر دو روزہ کھول کے دکھاتا ہوں۔"

سوئی بڑے جذبہ کے ساتھ ر نہیں کی بات سنتی رہی اور اسے خنجر نظروں سے گھورتی رہی "بہن یا کچھ اور؟ ختم ہو گئی تمہاری بکواس۔ بڑی مزاحیہ تقریر تھی تمہاری مگر بہن کی کو نہیں آتی۔"

"دونوں شکلیں زیادہ بڑھ چکی ہیں گی ہنسنے ہوئے۔"

"تم کیا سمجھتے ہو؟ میں پاگل ہوں؟"

ر نہیں نے کہا "میرے سمجھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا یہ پیدائشی خرابی ہے۔"

"ر نہیں خاں۔ اگر میں پاگل ہوں۔ تو تم بزدل ہو اور وہ۔ اس نے زخموں کے مخصوص انداز میں تابی بولی۔"

ر نہیں کا چہرہ سرخ ہو گیا "کوئی اور لڑکی ہوتی تو میں بتاتا۔"

"کیا بتاتے؟ مجھے بتاؤ۔ تم صرف باتیں کر سکتے ہو۔ وہ جج کے بولی۔"

میں نے جھگڑے کو بڑھنے نہیں دیا "سوئی۔ آخر کیا سوچ کے تم نے ایسی بات کی تھی؟"

"مہمت ہے تو بات کرو ورنہ چھوڑو۔"

"یہ کیسی بے وقوفی کی بات ہے۔" ر نہیں بولا "اس لڑکی کو یہ نہیں معلوم کہ بہت اور حماقت میں بڑا فرق ہے۔"

میں نے کہا "دیکھو سوئی۔ اگر تمہارے دماغ میں۔"

ر نہیں جج میں بولا "بھوسا ہے یا گوبر۔ تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔"

"دیکھو تاہم غصہ کیا مجھے تو میں گالی دوں گی یا ہاتھ مار دوں گی اس کے پھر مجھے مت کہنا" سوئی کا یار اچھڑ گیا۔

میں نے کہا "تمیں سوئی۔ تم ایک اچھی اور سمجھ دار لڑکی ہو۔ تم نے وعدہ کیا تھا کہ اپنی بری عادتیں چھوڑ دو گی۔"

"تم اسے کچھ نہیں کہو گے؟ جو مجھے پیش دلا ہے۔"

میں نے کہا "اچھا جاؤ۔ تم ابھی سی کافی بنائے لاؤ تاکہ تمہارا غصہ بھی ٹھنڈا ہو جائے۔ اتنی دیر میں ر نہیں کا دماغ بھی درست کر دوں گا میں۔"

"مجھے کافی بنانا نہیں آتی" وہ منہ پھلا کے بولی "تمیں"

مارخان کو کیا اس کی گھروالی کو بلاؤ۔"

میں نے کہا "ر نہیں" تمہیں چھیڑتا ہے۔ دل سے مانتا ہے کہ تم جین ہو۔"

ر نہیں بیٹھے گا "ابے یار میری طرف سے اتنا جھوٹ مت بول۔"

"تم اس کی طرف مت دیکھو۔ مجھ سے بات کرو۔ یہ خیال کیسے آیا تمہیں کہ ہم ملک ہاؤس میں داخل ہو سکتے ہیں؟"

"ملک ہاؤس کوئی انک کا قلعہ تو نہیں ہے؟" وہ بولی۔

"راش۔ مجھے تمہاری بات سے قائل کیا ہے کہ ملک کی بات غلط بھی ہو سکتی ہے۔ اب مجھے یہ سمجھاؤ کہ ہم اگر ملک کے گھر میں ٹھہنا چاہیں تو اس کے لیے کون سا دقت موزوں ہوگا۔"

"ابھی۔ اسی وقت چلو میں نے تو کہا تھا۔"

میں نے اپنی گھڑی دیکھی "دو بجنے والے ہیں۔"

"ہاں۔ کم سے کم تین گھنٹے ملیں گے ہمیں" وہ بولی۔

"اس دال پانی سے کوچ کرنے کے لیے؟" ر نہیں بولا۔

میں نے کہا "دال پانی نہیں دارخان کی باہل کی اولاد۔"

وہ سر کھینچے گا "ابے ہاں وہی مگر یار خود کشی کے آسان طریقے بھی ہیں۔"

"ٹھیک ہے" تم مویاں آسان طریقے سے زندگی گولیاں تو ہیں نہیں۔ تم کوئی چوہ مار گولیاں کھا کے ایک بول فس کی بیو اور ڈاکارے کے سوا جاؤ مسکراتے ہوئے مگر تارے واپس آنے سے پہلے مر جانا۔"

ر نہیں برا مان کے بولا "اور نہ مرا تمہارے بغیر تو؟"

"تو میں آکے مار دوں گی۔ گھاکھونٹ کے چلو اصرار۔"

"کیسی جلد صفت لڑکی ہے۔ پھر کا دل ہے اس کا۔"

ر نہیں جینپ کے ہنسنے لگا۔

میں نے کہا "سوئی ذرا مجھے سمجھاؤ کہ اس وقت ہمارے اندر جا کے زندہ سلامت واپس آجانے کے امکانات کیا ہیں۔"

تم نے تو اندر کا نقشہ دیکھ رکھا ہے اور سب کے معمولات کا بھی علم ہے تمہیں۔"

"ہاں۔ اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ یہ کام مشکل لگتا ہے مگر ناممکن بہر حال نہیں ہے۔" وہ بولی۔

"تو ہم کیا ایسے ہی چلیں؟" بس اللہ کا نام لے کر روانہ ہو جائیں۔" ر نہیں نے کہا۔

"نہیں تو کیا بیٹہ باپ کے ساتھ جاؤ گے؟ ہاتھی گھوڑے اور توپ خانہ ساتھ لے جاؤ گے؟" سوئی نے کہا۔

اچانک مجھے سونے کی تجویز قابل عمل نظر آنے لگی تھی۔ کچھ عقل سے کچھ بلائنگ سے اور کچھ تقدیر پر مجھوسا کرتے ہوئے ہم یہ کام کر سکتے تھے میرے کہنے پر ہمیں نے سونے کے سامنے ایک کاغذ رکھ دیا۔ اس پر سونے نے ملک باؤس کے اندر کے سب راستوں کا نقشہ بنایا۔ نیز مجھے تیرے خطوط سے وجود میں آنے والے اس نقشے کو میں نے اس لیے سمجھ لیا کہ ساتھ ساتھ سونے کی کنسری بھی جاری تھی۔ کس کمرے کا راستہ کدھر سے ہے۔ بچے کس کی خواب گاہ ہے۔ اوپر کون ہوتا ہے۔ ملک اور اس کی بیوی کہاں سوتے ہیں؟ ان کا بیٹا کہاں ہوتا ہے۔ اس کے آنے جانے کا وقت کیا ہے اور سروٹ کو راز کہاں ہیں۔ وہاں کون رہتا ہے؟ کھر کے اندر زندہ کدھر ہے اور لاش کہاں ملتی رہتی ہے۔

یہ سب سمجھ لینے کے بعد مجھے شب خون مارنے کا منصوبہ بہت آسان اور قابل عمل لگا۔ ہم تینوں مل کے یہ کارنامہ ایسے سرانجام دے سکتے تھے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ سونے والے سوتے رہ جائیں اور جو جاگ رہے ہوں انہیں سلا دیا جائے۔ ہم زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے میں اندر جا کے واپس آسکتے تھے اور اگر تقدیر کی یادری سے ختم مل جائے تو اسے بھی ساتھ لے سکتے تھے۔

کسی بھی کامنڈریشن کے لیے سونے ایک مڈر ڈین اور بھروسے کے قابل شریک کار تھی۔ اس کے سپرد کوئی بھی کام کیا جاسکتا تھا اور یہ امید کی جاسکتی تھی کہ غیر متوقع اور مشکل صورت حال سے وہ ہراساں نہیں ہوگی۔ اس کا لڑکی ہونا ہمارے لیے مسئلہ نہیں ہے گا اور بد قسمتی سے وہ محصور ہوگئی تو ہمارے لیے خطرے کا سبب نہیں بنے گی۔

سونے نے میرا ہاتھ پکڑ کے بلایا "اب کس سوچ میں پڑ گئے؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ بس ایسے ہی خیال آیا تھا کہ یہ معمولی سی بات آخر ہماری عقل میں کیوں نہیں آتی؟"

رہیں بولا "ہمارے غیر معمولی دماغ غیر معمولی باتیں سوچتے ہیں۔"

میں نے کہا "ہم نے ملک کی بات پر آنکھ بند کر کے یقین کر لیا تھا۔ یہ سوچا ہی نہیں کہ وہ جھوٹ بول سکتی ہے۔"

رہیں نے کہا "ایک بہت اہم بات پر آپ اس وقت بھی غور نہیں فرما رہے ہیں۔"

"اب بلاوجہ دیر مت کراؤ شک میں ڈال سکے"

"ناؤن لڑکی۔ سمندر میں چھلانگ لگانے سے پہلے سب دیکھ لینا چاہیے کہ کس طرح طوفانی تو نہیں ہیں۔ پانی میں چٹانیں تو

نہیں ہیں۔ ذہریلے آبی جانور اور پوسے تو نہیں ہیں اور ہم تیرا جانتے ہیں یا نہیں۔"

میں نے کہا "میری تمہید مت باندھ۔"

رہیں بولا "یار مانا کہ ملک کی نے جھوٹ بولا اور شوہر کو بچانے کے لیے بولا تو کوئی نگاہ نہیں کیا لیکن فرض کر۔ اس وقت جب سونے نے فون کیا تھا تو ملک بھی وہیں موجود تھا۔"

"اس وقت وہ باہر ہوتا ہے" سونے بولی۔

"ہاں۔ عام دنوں میں یقیناً باہر رہتا ہوگا لیکن اس کو ایک پلان پر عمل کرانا تھا اس نے سب کو ہدایات دے دی تھیں اور اس پلان پر عمل کرتے ہوئے ملک کے آدمی ختم ہو گئے۔ اٹھالاکھ وہ ان کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا اور گھر سے باہر نہیں جاسکتا تھا۔ جب حکم کے غلاموں نے اپنی اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ختم کو اس کی خدمت میں پیش کیا تو ملک نے انہیں ڈرائنگ روم میں نہیں رہیو کیا ہوگا۔"

"ظاہر ہے۔ ملک باؤس میں زیر زمین بہت کچھ ہے۔ ختم کو وہیں رکھا گیا ہوگا۔"

"تم سے پوچھا ہے کسی نے؟ بلاوجہ دخل در معقولات مت کرو" رہیں نے اسے ڈانٹا "میں تمہارے فنون اعتراض کا جواب دے رہا تھا۔"

میں نے کہا "اوکے۔ ملک گھر میں تھا۔"

رہیں بولا "جب سونے نے فون کیا اور کہا کہ میں ختم کی بہن بول رہی ہوں تو ملک کی نے اوپر اوپر چھاپے مارے اور بالآخر وہاں پہنچ گئی جہاں ملک صاحب ختم سے مذاکرات کر رہے تھے یا گفتیش کر رہے تھے۔ ملک کی نے کہا ہوگا کہ تمہارا دماغ خراب ہے کیا تم جانتے نہیں کہ یہ عورت ایک مشہور رپورٹر ہے۔ تم نے اسے اسے گھر میں قید کر رکھا ہے؟ کتنا بڑا خطرہ مول لیا ہے تم نے۔ اگر پولیس نے چھاپا مار کے ختم کو برآمد کر لیا تو معلوم ہے کیا ہوگا تمہاری خاندانی عزت اور سیاسی ساکھ دونوں کا جنازہ نکل جائے گا۔ ملک جیسے شوہر بیوی کو پاؤں کی جوتی کے برابر بھی نہیں سمجھتے۔ اس نے دباؤ کے کہا ہوگا کہ الو کی بھی تو کیا مجھے کدھا سمجھتی ہے؟ میں اتنا سمجھ ہوں کہ تو مجھے یہ سب سمجھانے آتی ہے۔ یہاں پولیس کا باپ نہیں آسکتا اور ملک کی نے شاید کہا ہوگا کہ ملک صاحب کسی غلط فہمی میں مت رہنا۔ اس کی بہن کا فون آیا تھا۔ اسے شک ہے کہ ختم کو اغوا کرانے والے تم ہو اور تم نے ہی اسے یہاں قید کر رکھا ہے۔ اس کے بعد ملک نے رسید کیا ہوگا اس کے ایک جھانپہرہ پاگل کی بچی جس نے بھی فون کیا تھا مجھے وہ تیری ہے ورنہ تو تو لاٹھی سے فائدہ

"میرا خیال ہے کہ اسے بھی انتظار ہوگا ہمارا۔ سونے کے فون سے اس نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ ختم کے ساتھ ساتھ ہاتھ پر جیش آنے والے واقعات کی خبر بھی مل چکی ہو۔"

میں نے کہا "یہ خبر تو اسے بہت پہلے مل چکی ہوگی۔ چونکہ اسے انتظار ہو گیا تھا اور شاید سراج دین کے فرار میں بھی چونکہ اس کی مدد شامل ہوگی۔"

"اب ملک رب نواز ہمارے لیے چشم براہ ہوگا۔ ختم کی حیثیت چارے جیسی ہوگئی ہے۔ اس پر شکار آتا ہے یا نہیں۔ اس کا ملک کو یقین بہت ہے۔ جیسی سے انتظار ہوگا۔ ہم جائیں گے اور زہر ہو جائیں گے۔ وہ کے گا کہ بہت خوب آپ شرف لے آئے بالآخر۔ وہ یقیناً جانا چاہتا ہوگا کہ ختم کے ساتھ یا اس کے گروہ کے ارکان کون ہیں؟"

"یہ بات تو میرے دماغ میں نہیں آتی تھی" سونے نے سادگی سے کہا۔

"آجی نہیں ملتی تھی خاتون۔ آپ تو ہمیں لے جا رہی تھیں گھر کر۔ جیسے شیر کو پانکا کرنے والے اوپر جانے پر مجبور کر دیتے ہیں جہر حریجے تو بندھا ہوتا ہے۔ قربانی کا بکرا اگر اوپر بیٹھا ہوتا ہے شکاری ہاتھ میں بندھ کر لے لے۔"

سونے نے کہا "میر بھی گھبراہٹ کی کوئی بات نہیں۔ شیرینو شیر۔ کیدڑ کی طرح ڈر کے بھاگو نہیں۔"

"ایسی بھاری سے ہم باز آئے" رہیں نے اس کے سامنے ہاتھ توڑے۔

وہ بولی "دیکھو۔ ایک بات ہمیں معلوم ہوگئی کہ دشمن بے خبر نہیں ہوگا۔ اس نے مقابلے کے لیے سو، چاندی کی بولی اور ہم نے حمل کیا تو بے خبری میں ہم مارے جائیں گے۔ اب ہم اپنی حکمت عملی بدل دیتے ہیں۔"

"بڑی اچھی بات کی اس وقت تم نے" میں نے کہا "اب فرض کرو کہ ملک نے ہمارے استقبال کے لیے خصوصی انتظامات کئے ہیں۔"

"ہاں۔ چاروں طرف حصار ہے۔ تمہیں تو یہیں لگا دی ہیں۔ شنگ کھڑے کر دیے ہیں۔ پھتے پھتے راز مخوم رہا ہے اور قدم قدم پر کمانڈو کھڑے ہیں اور ہر جگہ زمین پر لینڈ مائنز بچا دی ہیں۔" رہیں بولا۔

"لینڈ مائنز؟ سونے نے کہا۔

"مناف کرنا میں انگریزی بول گیا۔ بارودی سرنگ کو کہتے ہیں" رہیں نے کہا۔

"مجھے مت سمجھاؤ۔ تم نے تو بس نام پڑھا ہے۔ میں نے

دیکھی ہے بارودی سرنگ "سونی غرائی۔"

"تم نے کہاں دیکھی ہے۔ تم کیا جہاد افغانستان میں حصہ لینے بھی گئی تھیں؟" رئیس نے پوچھا۔

وہ بولی "ان ڈاکوؤں کے پاس چار تھیں۔ شاید کون سے لائے تھے۔ سردار نے ایک دن مجھے دکھائی تھی اور بتایا تھا کہ اسے زمین میں دبادیتے ہیں۔ کسی کا پاؤں پڑ جائے تو دم کا ہوتا ہے۔"

میں نے افسوس سے کہا "موسیٰ افغانستان سے جاتے وقت ہزاروں بارودی سرنگیں دہلی ہوئی چھوڑ گئے تھے۔ ہر سال ہزاروں بے گناہ لاپتہ ہو جاتے ہیں۔"

رئیس بولا "یار بات کیا ہو رہی تھی۔ سچ میں بارودی سرنگوں کا ذکر کہاں سے کیا۔"

سونی نے کہا "آپ نے ہی شروع کی تھی یہ بات۔ ناصر نے تو صرف خصوصی انتظامات کا ذکر کیا تھا۔ میرا خیال یہ ہے کہ ان سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"ہاں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ ہم مارے جائیں گے۔" رئیس بولا۔

میں نے کہا "یار تو سرپس نہیں ہو سکتا تو خاموش رہ۔" سونی اس کی طرف دیکھ کے بولی "ویسے تو ہم اس کے خصوصی حفاظتی انتظام کی بھی ایسی نہیں کر سکتے ہیں لیکن وہ کیا شل ہے کہ گڑے مرنے والے کو زہریوں دو۔"

"گڑ بھی بنانا پڑتا ہے۔ ایسے ہی گنا مارو اور لٹا دو۔" رئیس بولا۔

سونی کو ہنسی آگئی "نہیں۔ ہم ابھی کچھ نہیں کریں گے۔ ملک آخر تک انتظار کرے گا؟ دو تو بج گئے ہیں۔ اب اتنا امید نہیں ہوگی ہمارے آنے کی۔ میں سمجھنے اور غصہ جاذبہ پانچ بجے اذان ہوتی ہے۔ اسی وقت چوکیدار دروازے کو لاک کر کے مسجد تک جاتا ہے نماز پڑھنے کے لیے۔ اس کے ساتھ پڑوس کی کوٹھی کا چوکیدار بھی جاتا ہے۔

دونوں پھان ہیں اور ایک ہی ملائے کہ۔"

"کیا وہ نماز باجماعت ادا کرتے ہیں؟"

"نہیں۔ دن میں پانچ بار ڈیوٹی چھوڑ کے جانے کی اجازت کہہ دیتا ہے۔ لیکن وہ کسی کو تباہے بغیر نکل جاتا ہے۔ ایک ملک میں رہتے ہیں اس وقت۔ آوے گئے تھے میں وہ وہ آتا ہے۔"

"بے شک ادا ہے فرض پر پابندی عائد نہیں کی جاسکتی لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سب سے زیادہ چوریوں اسی وقت ہوتی ہیں۔ جب چوکیدار ذرا سی دیر کے لیے غائب ہو جاتے ہیں کہ رات بھر میں کوئی نہیں آیا تو پندرہ میں منٹ

میں کون آئے گا لیکن چور اسی وقت کے انتظار میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ وہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔"

"تو تم سب کو چوروں کی صف میں شامل کر رہا ہے۔" رئیس نے کہا۔

"یہ کام چوری ہے۔ نہیں تو کیا علی الاعلان کریں؟" میں نے کہا "میں قائل ہوا تمہاری ذہانت سے۔ ملک رب نواز تو خیر اب ماوس ہو کے سونے چلا گیا ہوگا۔ صبح پانچ بجے تک خصوصی محافظ بھی سو جائیں گے ورنہ ٹھنڈے ہو گے بیٹھ جائیں گے کہ رات گزر گئی۔ اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا۔"

"نہیں وہی سب سے مناسب وقت ہوگا اندر جانے کے لیے راستہ بنانے کا۔" سونی نے کہا۔

میں نے کہا "اس پر مجھے جنگ کی حکمت عملی کا ایک تاریخ ساز واقعہ یاد آ رہا ہے۔ D-DAY کا جانا ہے۔ اسے LONGEST DAY بھی کہتے ہیں۔ ۶ جون ۱۹۴۵ء کو برطانیہ نے فرانس میں نارمنڈی کے مقام پر حملہ کر کے جرمن فوجوں کا صفایا کر دیا تھا۔ اس رات شدید بارش اور طوفانی موسم تھا چنانچہ جرمن کچھ اپنی ہو گئے تھے کہ ایسے موسم میں فوجی طیارے کیسے پرواز کر سکتے ہیں اور اسی سے برطانیہ نے فائدہ اٹھایا۔ ٹھیک ہے، ہم بھی انتظار کریں گے۔ اگر تم چاہو تو تمہیں سمجھنے کے لیے سوچاؤ۔"

سونی نے رئیس کو دیکھا "مجھے دگائے گا کون؟"

رئیس مسکراتے لگا "میں جاگ رہا ہوں نا تمہیں دگادوں گا پانچ بجے۔"

سونی اٹھ کھڑی ہوئی "تم واقعی الو ہو۔"

اس کے جانے کے بعد رئیس نے کہا "یار یہ الو کی مزنٹ کو کیا کہتے ہیں؟"

"س الویا مزا الو مگر تو بے الو کا پھل۔ تو تیری مزنٹ کھائے گی الو کی بھی۔ تو کیوں پوچھ رہا ہے آخر؟"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "بس ایسے ہی پیارے؟" میں نے کچھ دیر آنکھیں بند کر کے خاموش لیٹنے کی کوشش کی اور ناکام رہا۔ جینم کے بارے میں سوچتے سوچتے نہ جانے کب میری آنکھیں خود بخود کھل جاتی تھیں۔ اندر صبرے میں اس کا تصور قائم ہوتا تھا۔ اجالے میں وہ غائب ہو جاتی تھی۔ خاموشی میں اس کی آواز مجھے کھانے لگتی تھی۔ اس کی سرگوشی ہوا میں خوشبو کی طرح تھرتھاتی تھی۔ آخر تم آتے کیوں نہیں۔ کب آؤ گے تم؟ انتظار کی حد ختم ہو جانے کے بعد؟ یہ جان تو آتی جانی ہے اس جان کی تو کوئی بات نہیں مگر میرا انتظار کہیں رانگاں نہ جائے۔ غور و مشق کو شکست

نہ ہو۔

دوسرے صوفے پر دراز رئیس نے سر اٹھا کے مجھے دیکھا "کیا لائٹ آف کر دوں؟"

میں نے کہا "اس سے کیا ہوگا؟"

وہ اٹھ بیٹھا۔ "ہاں اس۔۔۔ کچھ نہیں ہوگا۔ جو کہتے ہیں کہ خیر سولی پر بھی آ جاتی ہے سب غلط کہتے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ سارا عذاب اس منحوس مورتی کے سر کا ہے۔"

رئیس بیٹنے لگا "تو بھی ایسا سمجھتا ہے؟"

"مجھے کچھ ایسا لگتا ہے کہ وہ مورتی کا سر ملک کو دے کے ہم جینم کو واپس حاصل کر سکتے ہیں۔ ملک نے جینم سے سودا کرنے کی کوشش کی تھی مگر ناکام رہا پھر وہ جینم کے پیچھے یہاں تک آ گیا تھا لیکن اندر گھسنے میں ناکام رہا۔ اب بازی اس کے ہاتھ میں ہے۔"

"مگر ابھی تک اس نے کسی سے رابطہ نہیں کیا۔"

رئیس سوچ میں پڑ گیا۔

"پچاس لاکھ سے زیادہ ہے اس کی قیمت" میں نے کہا "وہ رابطہ کرے گا۔"

"کس سے؟ اور کہاں؟" رئیس بولا۔

"آزاد صاحب سے۔ ان کے آفس میں۔ ممکن ہے آج رات ہی وہ انہیں فون کرے۔ جینم سے یہ معلوم کرنے کے بعد کہ مورتی کا سر محفوظ ہے۔"

"یعنی جینم بتا دے گی ات؟" رئیس متحیر ہو گیا۔

"جینم کی جگہ تو ہوتا تو کب تک نہ بتاتا؟ وہ بہ حال ایک عورت ہے اور ایک مورتی کے سر کی خاطر اسے جان دینے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ لعنت پچاس لاکھ پر۔"

"مگر جینم رئیس خانے کا چا نہیں بتائے گی۔" رئیس بولا۔

"کیوں؟" میں نے کہا "رئیس خانے میں کیا ہے؟ یہ کون سا کسی خفیہ فوجی تنظیم کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ اگر ملک رب نواز کے بندے یہاں آکے وہ مورتی کا سر لے جاتے ہیں تو لے جائیں گے۔"

رئیس نے مجھے حیرانی سے دیکھا "ایسے ہی لے جائیں؟"

میں نے کہا "میرا مطلب ہے جینم کو ساتھ لائیں پھر میں خود ان کی چیز انہیں دے دوں گا۔ مجبوری دونوں کی ہوگی۔"

رئیس کچھ دیر بعد بولا "یعنی تیرے خیال میں ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ جینم کے ساتھ یہاں پہنچ جائیں؟"

"بالکل ہو سکتا ہے۔"

"اور وہ جینم سے رئیس خانے کا پتا معلوم کر کے اچانک پہنچ گئے اور انہوں نے اندر گھس کے مورتی کا سر زبردستی لے جانے کی کوشش کی۔ پھر؟"

میں نے کہا "یہ کیسے ہو سکتا ہے وہ سب مارے جائیں گے۔ وہ ایسا رسک نہیں لے سکتے۔"

"میں آج تک سمجھ نہیں سکا کہ آخر اس میں پچاس لاکھ کی کیا چیز ہے۔ ملک رب نواز اس کے لیے اتنا پریشان کیوں ہے؟" رئیس نے کہا۔

میں نے کہا "یہ واقعی ایک معما ہے۔ بظاہر اس کی کوئی قیمت نہیں۔ وہ عام پلاسٹر آف پیرس کا پتا ہوا مورتی کا سر ہے۔ اس کی کوئی تاریخی حیثیت نہیں اور نہ وہ مجسمہ سازی کے فن کا شکار ہے۔"

رئیس بولا "میں اسے اٹھا کے لاتا ہوں پھر دیکھتے ہیں اسے۔"

میں اور رئیس مورتی کے اس سر کو مالٹ لیٹ کے دیکھتے رہے۔ جینم کی تحقیق کے مطابق وہ کسی مشہور شخصیت کے ہتھے کا سر نہیں تھا۔ اس کی صورت کے نقوش چچی یا جنتی صورت تھے مگر اس کی شناخت ناممکن تھی۔ ہماری عقل اس کو پڑی کے اسرار کو سمجھنے سے قاصر تھی۔

رئیس نے جھنجھلا کے کہا "مٹی چاہتا ہے ہتھوڑا مار کے سر بھاڑ دوں۔"

میں نے کہا "کیا پتا اندر میرے ہوں پچاس لاکھ کے۔"

"قلبی کانٹوں میں ایسا ہوتا ہے۔ اسمگلر ایسے ہی طریقے اختیار کرتے ہیں۔ میرے اسمگل کرنے کے لیے۔"

رئیس بولا۔

میں نے کہا "یا بیرون اسمگل کرنے کے لیے۔"

"کیا کیا تو نے؟" رئیس چونکا "ہیروئن؟ ہیروئن تو سفید ہوتی ہے۔"

میں اچھل پڑا "اور پلاسٹر آف پیرس بھی سفید ہوتا ہے۔"

رئیس میری طرف دیکھتا رہا۔ میں رئیس کی طرف دیکھتا رہا پھر ہم نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا یوں جیسے دو سائنس دان برسوں کی تحقیق کے بعد کسی مشکل سائنسی مسئلے کا حل تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے ہوں۔

"یہ تو کمال ہو گیا۔" رئیس بولا۔

میں نے کہا "خاک کمال ہو گیا۔ یہ بالکل سامنے کی بات تھی۔ ہمیں پہلے کیوں نہیں سوچا آخر؟"

”تو نے صحیح آدمی کا نام لیا۔ یہ کام اسی کو سونپ دیں گے۔“

”مگر اس کے لیے سر توڑنا پڑے گا“ رئیس بولا۔

”مگر ضروری ہوا تو کوئی حرج نہیں۔ ویسے تو ازیں پورٹ پر

کتے صرف بوسنگھ کے مسافروں کا سامان پکڑ لیتے ہیں۔“

رئیس نے کہا ”یار“ اب تو یہ چیز جتنی قیمتی ہے اتنی ہی

خطرناک بھی ہو گئی ہے۔ منشیات کا دھندا کرنے والے

ہمارے دشمن ہو گئے تو ہم مارے جائیں گے۔“

میں نے کہا ”دشمن تو ہو گئے ہیں۔ وہ شہنم کے پیچھے

پڑ گئے تھے اور بالآخر اسے اغوا کر لیا گیا۔ ان کا ایک حملہ

ہماری چالاکی یا خوش قسمتی سے ناکام ہو گیا تھا لیکن وہ پھر آسکتے

ہیں۔ زیادہ تباہی اور ملامت کے ساتھ۔“

”شہنم کے ساتھ۔“

”ہاں۔ اسے آسانی سے مجبور کیا جاسکتا ہے کہ بہر

وہاں لے کر چڑھ جائیں وہ مورچی کا سر ہے۔“

رئیس نے مورچی کے سر کو ہارنے اخباروں میں پسپا

ایک کونے میں رکھ دیا اور اس پر ایک مینے کے پرانے اڈ

بھر کر دیے۔ یوں جیسے ہم لوگ اخبار پڑھنے کے بعد اس

سلیقے سے نہ کر کے ایک طرف نہیں رکھتے۔ ایسے ہی کو۔

میں ڈال دیتے ہیں۔

پھر کال بیل بجی اور میں نے اپنی گھڑی دیکھی۔ صبح

ساڑھے چار بجے کون آسکتا ہے۔ میں نے کیٹ کی طرف

جاتے ہوئے سوچا۔ گھنٹی پھر بجی تو میں نے اندر سے ہی پوچھ

”کون ہے؟“ اور احتیاطاً اپنا ریوالور نکال لیا۔

”نامصر۔ میں۔۔۔ میں ہوں“ باہر سے کسی عورت۔

بڑے دھکی لیے میں کہا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکا۔ میں۔

ریوالور دالیں۔ جیب میں رکھ لیا۔

اندر سے رئیس نے چلا کے کچھ کہا مگر میں نے صرف

اس کی آواز سنی۔ اس کی بات نہیں سنی۔ مجھے اس وقت ا

ہوش بھی کہا تھا۔

میں نے کیٹ کھولا تو وہ ایک دم آگے آئی۔ میں اسے نہ

سمجھا کہ وہ نیچے گر جاتی۔

رئیس نے اسے سونگھا اور پھر زبان سے چمکا ”اوپر تو

ہیروئن نہیں ہے۔“

میں نے کہا ”ہیروئن نیچے کی تہ میں پلا سٹرف پیرس کے

ساتھ ملائی گئی ہوگی یا درمیان میں اس کی ایک تہ ہوگی۔ میں

گلوڈزن کے اس سر میں اگر انیس گلو پلا سٹرف پیرس کا وزن

ہوگا تو ایک گلو ہیروئن بھی ہو سکتی ہے۔“

رئیس بولا ”ایک گلو خالص ہیروئن کی قیمت ایک کروڑ

بھی ہو سکتی ہے۔“

میں نے کہا ”بعض نوادرات میں ایسے جتنے بھی شامل

کر دیے جاتے ہوں گے جن کی اپنی کوئی قیمت نہیں“ گلوڈزن

کے نوادرات۔ گلوڈزن کی ہیروئن۔ اب سمجھ میں آیا کہ

ملک رب نواز اتنا پریشان کیوں تھا؟“

رئیس نے مورچی کو اٹھالیا ”میرا خیال ہے کہ اس کو

چھپا دینا چاہیے۔“

”ضرور چھپا دے مگر ہمارا خیال غلط بھی ہو سکتا ہے۔ یہ

ابھی صرف ایک نظریہ ہے۔ اس کا ثبوت بھی چاہیے۔“

رئیس بولا ”یہ نظریہ غلط نہیں ہو سکتا یا رے۔ قسم اللہ

کی یہی بات ہوگی۔“

”اس کا تجربہ کرانا پڑے گا۔“ میں نے کہا ”مجھے تو کوئی

تجربہ نہیں کہ ہیروئن اور پلا سٹرف پیرس کے پاؤڈر میں فرق

کر سکوں۔“

”میں پہچانتا ہوں۔ ڈاسکے سے بھی بتا سکتا ہوں اور یار“

تجھ سے کیا پوچھ رہا ہوں ہیروئن لیتا رہا ہوں۔“

”سارے ہیروئن۔ یہ لت کیسے پڑ گئی تھی تجھے؟“ میں

نے کہا۔

وہ بولا ”تو جانتا ہے ان سب کو۔ اپنی چندال چوکرزی میں

کیسے لوگ تھے۔ ان کی صحبت میں کوئی اچھی عادت تو نہ نہیں

سکتی تھی۔ اللہ نے بچایا ورنہ آج پڑا ہوتا اپنا ڈھانچا کسی قبر

میں یا کسی فنڈ پاتھ پر۔ کسی قبرستان کی دیوار کے ساتھ یا کسی

پل کے نیچے۔“

میں نے کہا ”پھر تو اچھے مراسم ہوں گے تمہارے ہیروئن

فروڈوں سے۔“

اس نے شہتے ہوئے اعتراف کیا ”ہاں۔ اپنا پیر شیدا

ہستول تو پولیس کی وردی میں جا کے بستا بھی وصول کرتا رہا

اس دلچسپ ترین داستان کے بقیہ واقعات آٹھویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

یہ کہانی وطن کے ہر آشوب حالات کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔

آسمان تھم سہے اور دیکھ دیا جس دنیا میں شور مچتا ہے
یہ دنیا اک تماشا ہے اور سب انسان ماری ہیں
کیا کہتے ہیں، کیا کرتے ہیں، کیا کیا کھیل کھاتے ہیں
یہ لیڈر، ووٹر، پیر، شہید، شاگرد، استاد ماری ہیں
آؤ کیڑی آنکھوں سے انہیں ان سب کے ہاتھ میں ڈھکڑو ہے
یہ قوم کے خادم، دانشور، فن کار، وزیر ماری ہیں
ان چہرہ بدلنے والوں کو ایمان اصول و فاسے کیا
یہ ڈاکو، تاجر، پور افسر، عاشق معشوق ماری ہیں
آئین، الیکشن، یو این او، انصاف، حقوق انسانی
لے بچہ، چمورا یہ باتیں جو کرتے ہیں وہ ماری ہیں

احمد اقبال

PDFBOOKSFREE.PK